ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ

آسان بیان القرآن

جلد اوّل

از ابتدا تا ختم سورۃ النساء

تصنیفِ لطیف

حکیم الامتؒ مجدد الملتؒ حضرت مولانا **شاہ اشرف علی** تھانوی قدس سرہٗ

تسہیل نگار

حضرت مولانا **عقیدت اللہ** قاسمی (فاضل دار العلوم دیوبند)

نظرِ ثانی

حضرت مولانا مفتی **سعید احمد صاحب پالن پوری** دامت برکاتہم
شیخ الحدیث و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

اہتمام و پیشکش

مفتی عبد الرؤف غزنوی
فاضل و سابق استاذ و خطیب دار العلوم دیوبند (انڈیا)
استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ غزنوی کراچی
0333-2114000

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

آسان بیان القرآن

جلد اوّل

از ابتدا تا ختم سورۃ النساء

تصنیفِ لطیف

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ

تسہیل نگار

حضرت مولانا عقیدت اللہ قاسمی (فاضل دار العلوم دیوبند)

نظرِ ثانی

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

اہتمام و پیشکش

مفتی عبد الرؤف غزنوی

فاضل و سابق اُستاذ و خطیب دار العلوم دیوبند (انڈیا)

اُستاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ غزنوی کراچی

0333-2114000

نام کتاب ...... آسان بیان القرآن جلد اول

مؤلف ...... حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ

تسہیل نگار ...... حضرت مولانا عقیدت اللہ قاسمی (فاضل دارالعلوم دیوبند)

نظر ثانی ...... حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

اہتمام و پیشکش ...... مفتی عبد الرؤف غزنوی
فاضل و سابق استاذ وخطیب دارالعلوم دیوبند (انڈیا)
استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قانونی مشیر ...... خواجہ سیف الاسلام ایڈووکیٹ ہائی کورٹ سندھ

اشاعت اول پاکستان میں ١٤٤٠ھ-2019ء

ناشر ...... مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فون 0333-2114000

پریس :hafizsaeedalam@gmail.com :+92-321-4283 199
Karachi, Pakistan.

دوکان نمبر 13، سلام کتب مارکیٹ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی 0333-2114000

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

بقلم: عبدالرؤف غزنوی

فاضل وسابق استاذ: دارالعلوم دیوبند

حال استاذِ حدیث: جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن کراچی

الحمدلِلّٰه وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد!

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم العالیہ شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند سے احقر وقتاً فوقتاً مزاج پُرسی اور استفادہ وفیض حاصل کرنے کی غرض سے فون پر رابطہ کرتا رہتا ہے، اسی معمول کے مطابق جب میں نے پانچ اور چھ جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ کی درمیانی شب پاکستانی وقت کے مطابق تقریباً سوانو بجے رابطہ کیا اور ان کی خیریت معلوم کی! تو حضرت الاستاذ نے اپنی خیریت بتانے کے بعد فرمایا کہ:

"تفسیر ہدایت القرآن کا کام چونکہ مکمل ہو چکا ہے اس لیے میں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی مایۂ ناز اور مشہور زمانہ تفسیر بیان القرآن کے تسہیل شدہ مسوّدہ پر نظرِ ثانی کا کام شروع کردیا ہے، دارالعلوم دیوبند کے ایک پرانے باصلاحیت فاضل حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی نے پوری کتاب کی عمدہ انداز میں تسہیل کی ہے، اور مسوّدہ میرے حوالے کردیا ہے، اور میں نے تسہیل نگار اور حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زیدمجدہم مہتمم دارالعلوم دیوبند دونوں کی خواہش پر نظرِ ثانی اور کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری لے لی ہے، اور جیسے ہی جلد اول پر نظر ثانی کا کام مکمل ہوجائے گا میں اُسے ان شاء اللہ آسان بیان القرآن کے نام سے مکتبۂ حجاز دیوبند سے شائع کروں گا، اور اس کی فائل تمہارے پاس بھجوادوں گا تم اُسے بلاتاخیر مکتبۂ غزنوی کراچی سے بھی شائع کردو"۔

حضرت الاستاذ کا یہ حکم اور اجازت اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہوئے میں نے ان کے فرمان پر لبیک کہا اور جیسے ہی فائل موصول ہوئی اللہ کی توفیق سے اشاعت کا کام شروع کردیا۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت قُدِّس سرُّہٗ اور ان کی اس مایۂ ماز تفسیر بیان القرآن کا مختصر تذکرہ کیا جائے، اور اسی طرح تسہیل نگار حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی زیدمجدہم اور نظر ثانی فرمانے والے حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

دامت برکاتہم دونوں حضرات کے علمی مقام وحالاتِ زندگی کا بھی مختصر تذکرہ کیا جائے، تا کہ قارئین حضرات ''آسان بیان القرآن'' سے علیٰ وجہ البصیرت استفادہ کرسکیں! لیکن افسوس یہ ہے کہ حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی زید مجدہم سے میں براہِ راست واقف نہیں ہوں، اس لیے ان کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ دارالعلوم دیو بند کا فاضل ہونا اور دارالعلوم دیو بند کے مہتمم اور صدرالمدرسین مدظلہما دونوں کا ان کی تسہیل پر اعتماد کرنا ان کے تعارف کے لیے کافی ہے۔

البتہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدّس سرُّہٗ اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کے مختصر حالات اس وضاحت کے ساتھ قلمبند کرنے جارہا ہوں کہ میرا مقصد نہ تو ان دونوں بزرگوں کے مکمل سوانح حیات بیان کرنا ہے اور نہ ہی یہ دعویٰ ہے کہ ان کا تعارف میری اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کا محتاج ہے، ہاں! یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ ان دونوں حضرات کے تذکرۂ خیر سے خود مجھے ایک قلبی سکون واطمینان محسوس ہوتا ہے، اور ان کی یادوں کو اپنے لیے اور قارئین حضرات کے لیے باعثِ برکت وسعادت سمجھتا ہوں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے مختصر حالاتِ زندگی

ولادت باسعادت:

آپ کی ولادت بوقت صبح صادق بروز چہارشنبہ پانچ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو بمقام تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یوپی ہندوستان میں ہوئی، کسی نے مادۂ تاریخ ''کرم عظیم'' = ''۱۲۸۰'' نکالا ہے، آپ کے والد ماجد کا نام عبدالحق تھا جو ایک اہلِ دل فاروقی النسب بزرگ اور صاحبِ جائیداد رئیس تھے، اور والدہ محترمہ ایک صاحب نسبت علوی النسب اللہ والی خاتون تھیں، اس طرح حضرت تھانوی نسبت فاروقی اور نسبت علوی دونوں کے حامل وجامع تھے۔

ولادت کا واقعہ بھی عجیب تھا، جسے حضرتِ والا نے خود بھی اپنے بزرگوں سے سن کر قلمبند فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ:
''حضرتِ والا کے والدِ ماجد کو کوئی ایسی بیماری لاحق تھی کہ کسی دوائی سے فائدہ نہیں ہوتا تھا، آخر میں کسی ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ ایک دوائی سے بیماری تو چلی جائے گی البتہ وہ قاطع النسل دوائی ہے، جس کے استعمال کے بعد آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوگی! انہوں نے یہ کہہ کر دوائی استعمال کی کہ بلا سے اولاد نہ ہو، بقائے نوعی سے بقائے شخصی مقدم ہے، رفتہ رفتہ یہ بات حضرتِ والا کی نانی صاحبہ تک پہنچی جس سے وہ کافی پریشان ہوگئی، انہوں نے ایک دفعہ حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ سے جو ایک اللہ والے مجذوب بزرگ تھے شکایت کی کہ میری اس بیٹی (حضرت تھانویؒ کی والدہ) کی کوئی نرینہ اولاد نہیں! انہوں نے فرمایا کہ ان شاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے، ایک کا نام اشرف علی اور دوسرے کا نام اکبر علی رکھنا، دونوں صاحبِ نصیب ہوں گے، ان میں سے ایک میرا ہوگا یعنی حافظ ومولوی ہوگا اور دوسرا دنیادار

ہوگا''۔ (ماخوذ از اشرف السوانح، جلد اول، ص: ۴۵، ۴۶)

حضرتِ والا کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی کہ والدہ محترمہ کا وصال ہوگیا اور دونوں بھائیوں کی پرورش کی ذمہ داری ان کے والد ماجد رحمہ اللہ پر آ گئی، والدِ ماجد نے یہ ذمہ داری ایسی شفقت کے ساتھ سنبھال لی کہ انہیں والدہ محترمہ کے سایۂ عاطفت سے محرومی کا احساس تک نہیں ہونے دیا، اور ان دونوں کو ایسی محبت سے پالا کہ والدہ ماجدہ کے رنجِ جدائی کو بھی بھلا دیا۔

تعلیم و تربیت:

آپ کے والد ماجد اگرچہ عالم نہیں تھے مگر بڑے صاحبِ بصیرت اور نماز و روزہ، تلاوتِ قرآن اور ذکر و اذکار کے پابند تھے، انہوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تو انگریزی تعلیم کے لیے منتخب کرلیا تھا! تاہم اپنی خداداد بصیرت کے ذریعہ دینی علوم سے حضرتِ والا کی مناسبت کا اندازہ لگا کر انہیں بچپن ہی سے عربی و دینی علوم حاصل کرنے کے لیے منتخب فرمایا، اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی، ایک دفعہ آپ کی تائی صاحبہ نے آپ کے والد ماجد سے فرمایا کہ بھائی! تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کے کھائے گا، بڑا عربی پڑھ رہا ہے وہ کہاں سے کھائے گا؟ اس کے گزر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہوکر گزارہ کے قابل نہ رہے گی! یہ بات حضرت کے والد صاحب کو بہت ناگوار محسوس ہوئی اور باوجود اس کے کہ تائی صاحبہ کا بہت ادب و لحاظ فرماتے تھے لیکن یہ سن کر جوش آ گیا اور کہنے لگے کہ:

''بھابھی صاحبہ! تم کہتی ہو کہ یہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے؟ خدا کی قسم! جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جوتیوں میں لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رُخ بھی نہ کرے گا، تم نے یہ کہہ کر مجھے سخت تکلیف اور سخت رنج پہنچایا''۔

اپنے والد ماجد کا مذکورہ بالا جملہ نقل کرتے ہوئے حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اگر یہ بات کوئی درویش کہتا تو آج یہ اس کی بڑی کرامت سمجھی جاتی، لیکن والد صاحب تو بیچارے ایک دنیادار شخص سمجھے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور یقین کی برکت سے ایسا ہی کر دیا، میرے تو دل سے دعائیں نکلا کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو ٹھنڈی رکھے، میرے ساتھ بڑا احسان کیا، انہی کی بدولت یہ چار حرف سیکھ لیے ہیں جو کام آرہے ہیں، ورنہ ہم بھی نہ معلوم کس رنگ میں ہوتے، اور گو مجھے کچھ آیا گیا نہیں! لیکن اس پر بھی دیکھ دیکھ کر بھائی کو بارہا یہ حسرت ہوئی کہ مجھ کو والد صاحب نے عربی ہی کیوں نہ پڑھائی، اور الحمد للہ مجھے کبھی وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ مجھ کو انگریزی کیوں نہ پڑھائی''۔

تربیت پر والد ماجد نے بچپن ہی سے اتنی توجہ دی کہ حضرت تھانویؒ خود فرماتے ہیں کہ ''تراویح میں ختمِ قرآن کی جو

مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی اس میں والد صاحب ہمیں کبھی شریک نہ ہونے دیتے، بلکہ اس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اس سے زیادہ کھلا دیتے اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کے لیے جانا بے غیرتی کی بات ہے، اس خوبی کے ساتھ ہم لوگوں کو حرص سے بچاتے اور غیرت سکھاتے، ایک بار زمانہ طالب علمی میں میری زبان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے متعلق کسی سلسلۂ گفتگو میں یہ نکل گیا کہ مولانا پڑھے ہوئے نہیں، واقعی مولانا نے ظاہری علم نہیں پڑھا تھا، گو بڑے مدبر اور صاحب نسبت بزرگ تھے، یہ سن کر والد صاحب کو غصہ آگیا اور بہت ڈانٹا کہ بزرگوں کی شان میں کہیں ایسے الفاظ کہا کرتے ہیں! اس قدر خفا ہوئے کہ مارنے کو اٹھے گو مارا نہیں، غرض ہم لوگوں کے اخلاق کی بہت ہی نگہداشت رکھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی محبت اور شفقت بھی بے حد فرماتے تھے"۔

آپ نے عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے وطن تھانہ بھون میں حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھیں اور پھر دیوبند پہنچ کر دارالعلوم دیوبند میں پانچ سال مقیم رہے اور درسِ نظامی کی باقی تمام کتابیں اس وقت کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور دیگر اکابرین سے پڑھ کر چودھویں صدی ہجری کے پہلے سال یعنی ۱۳۰۱ھ کو اس مجدّدِ وقت نے درسِ نظامی سے فراغت حاصل کر لی، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُدھر چودھویں صدی ہجری کا آغاز ہو رہا تھا اور اِدھر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے تحت اس کے لیے مجدّد تیار ہو رہا تھا! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"انّ اللّٰہ عزّ وجلّ یبعث لھذہ الأمّۃ علیٰ رأس کل مائۃ سنۃ من یجدّد لھا دینَھا"۔ (رواہ ابو داؤد بسندٍ صحیح)

یعنی "اللہ عزوجل اس امت کی اصلاح کے لیے ہر صدی کے آغاز میں کوئی ایسا شخص مبعوث فرماتا ہے جو امت کے لیے دین کے اندر تجدید و اصلاح کا فریضہ انجام دے"۔

طالب علمی کے زمانے کے دو خواب اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی تعبیر:

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں دو خواب دیکھے تھے، جن کی تعبیر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ نے دی تھی! ایک خواب یہ تھا کہ:

"ایک مردانہ مکان ہے، جیسا حضرت استاذی حضرت مولانا محمود حسن کا ہے، اس کے چبوترہ پر ایک بزرگ بہت لطیف اور نازک، بہت سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک مکلف چارپائی اور ایک مکلف بستر پر تشریف رکھتے ہیں، انہوں نے مجھ کو ایک پرچہ لکھ کر اور مہر لگا کر دیا، یہ مہر پرچہ کی تمام جوانب میں جا بجا لگی ہوئی تھی، میں نے اس کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ ہم نے تم کو عزت دی، اور مہر میں تھا "محمد" (صلی

اللہ علیہ وسلم) پھراسی خواب میں ایک دنیادار کے مردانہ مکان میں ایک دنیوی حاکم کو میز کرسی لگائے دیکھا، اس نے بھی ایک پرچہ پراسی طرح لکھ کر اور مہر کر کے دیا، اس میں بھی یہی مضمون تھا کہ ہم نے تم کو عزت دی، مگر مہر کے حُروف پڑھے نہ جاتے تھے''۔

اس خواب کی تعبیر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ نے یہ دی تھی کہ ''تمہیں ان شاء اللہ تعالیٰ دین اور دنیا دونوں کی عزت نصیب ہوگی''۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ:

''ایک تالاب جس میں بجائے پانی کے چاندی فوارے کی طرح ابل رہی ہے، میرے پیچھے چلا آرہا ہے''، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے اس کی تعبیر یہ دی تھی کہ ''ان شاء اللہ تعالیٰ دنیا تمہارے پیچھے پیچھے پھرے گی اور تم اس کی طرف رُخ بھی نہ کروگے''۔

یہ دونوں خواب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سچے ثابت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الامتؒ کو دین ودنیا دونوں کی ایسی عزت عطا فرمائی جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے، لیکن حضرتِ والا نے اس عزت سے کوئی دنیوی نفع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ہمیشہ استغناء اور توکل علی اللہ کو ترجیح دی۔

حکیم الامت رحمہ اللہ سے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی دو پیشین گوئیاں:

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ سابق صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے متعلق ایک پیشین گوئی ان کی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی، اور دوسری ان کی فراغت کے وقت، اور ''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید'' کے مطابق وہ دونوں پیشین گوئیاں ہو بہو ثابت ہوئیں! ایک پیشین گوئی یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو طالب علمی ہی کے زمانہ میں فتویٰ نویسی کا کام سُپرد فرمایا تھا، ایک دفعہ ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی طویل اور مفصل و مدلل جواب لکھ کر انہوں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے پورا جواب پڑھ کر دستخط فرمادیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ تم کو فرصت بہت ہے، اور ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر کا ڈھیر تمہارے سامنے رکھا ہوگا اور پھر بھی تم اتنے لمبے لمبے جواب لکھوگے''، اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں ایسی ہی صورت پیدا کردی، چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے پاس روزانہ ڈھیر کے ڈھیر خطوط آتے رہے، اور حضرت والا رحمہ اللہ بہت مختصر مگر جامع جوابات تحریر فرماتے رہے۔

دوسری پیشین گوئی یہ تھی کہ حضرت حکیم الامتؒ اور ان کے ہم سبق ساتھیوں کی دستار بندی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، دستار بندی سے قبل جب حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو معلوم ہوا کہ دستار بندی

ہونے والی ہے تو اپنے ہم سبق ساتھیوں کو لے کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سندِ فراغ دی جائے گی! حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں، لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرمادیا جائے، ورنہ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی، کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی! یہ سن کر حضرت رحمہ اللہ کو جوش آگیا اور فرمایا کہ ''تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی، اور ایسا ہی ہونا چاہیے، باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے، باقی سارا میدان صاف ہے، اطمینان رکھو''۔

حضرت تھانویؒ اپنے استاذ کا مذکورہ جملہ نقل کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ''واقعی حضرت مولانا رحمہ اللہ کی پیشین گوئی کی یہ برکت ہوئی کہ الحمد للہ جہاں رہنا ہوا بڑے بڑے علماء بھی وقعت ہی کی نگاہ سے دیکھتے رہے، اور عوام اور خواص سب مجھ ہی کو اکثر کے مقابلے میں ترجیح دیتے رہے۔

درس وتدریس:

فراغت کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو ماہِ صفر ۱۳۰۱ھ میں مدرس کی حیثیت سے ''مدرسہ فیضِ عام کانپور'' بلائے گئے، آپ وہاں تشریف لے گئے اور چند مہینے تک کامیابی کے ساتھ تدریس کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، لیکن بعد میں اس بنیاد پر استعفاء دے دیا کہ اراکین مدرسہ یہ چاہتے تھے کہ حضرتِ والا اپنے مواعظ کے دوران مدرسہ کے لیے چندہ کی ترغیب بھی دے دیا کریں، لیکن حضرت والا کا مزاج اس عمل کو غیرتِ دینی کے خلاف سمجھتے ہوئے برداشت نہیں کرسکتا تھا! لہٰذا مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرلی، ''مدرسہ فیضِ عام'' سے علیحدگی کے بعد حضرتِ والا کانپور کو چھوڑ کر جانے والے تھے کہ شہر کے کچھ قدردان اور معزز لوگوں نے حضرت کے لیے جامع مسجد میں تدریس کا انتظام کرلیا اور ایک نیا مدرسہ جس کا نام حضرتِ والا کے مشورہ سے ''جامع العلوم'' رکھا گیا وجود میں آیا، حضرتِ والا کو درس وتدریس اور وعظ وتبلیغ دونوں میدانوں میں بڑی مقبولیت وترقی حاصل ہوئی اور مدرسہ کے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام مسلمان بھی آپ سے استفادہ کرتے رہے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمہ اللہ کی خصوصی توجہ اور حضرت تھانوی کو غائبانہ طور پر بیعت کرنا:

سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ولادت سے کافی پہلے ہندوستان سے مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، لہٰذا! حضرت تھانوی سے کسی قسم کا ذاتی تعارف نہیں تھا، لیکن من جانب اللہ ایسا ہوا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی توجہ غائبانہ طور پر خود بخود اس وقت سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی طرف مبذول ہونے لگی تھی جب وہ طالب علم تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے از خود حضرت تھانویؒ کے

والد ماجد منشی عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کو اطلاع کرائی کہ جب آپ حج کو آئیں تو اپنے ساتھ اپنے بڑے لڑکے کو بھی لیتے آئیں۔

اُس طرف حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی غائبانہ توجہ کار فرما رہی، اِدھر حضرت تھانوی کے دل میں بھی تزکیۂ نفس کا جذبہ موجزن رہا، اور ان کے سامنے اُس وقت سب سے پُر کشش اور جلیل القدر ہستی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی تھی، چنانچہ ایک دفعہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ دیوبند تشریف لے گئے تھے تو حضرت تھانویؒ نے ان سے بیعت کی درخواست کی! لیکن چونکہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے تزکیہ اور مراحلِ سلوک طے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو منتخب فرمایا تھا، اس لیے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ فرماتے ہوئے معذرت کی کہ زمانہ طالب علمی میں شغلِ باطن تحصیلِ علم کے لیے مخل ہوگا، حالانکہ اسی سفر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک ہم سبق طالب علم کو حضرت گنگوہیؒ نے بیعت فرمالیا تھا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ۱۲۹۹ھ کو حج پر جانے والے تھے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس مضمون کا ایک عریضہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں لکھ کر خود حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے ہاتھ بھیجا، کہ ''میں نے حضرت مولانا سے بیعت کے لیے عرض کیا تھا انہوں نے انکار فرمادیا، آپ مولانا سے فرمادیں کہ مجھے بیعت کرلیں''، حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں جب یہ عریضہ پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ ''اچھا میں خود ہی ان کو بیعت کیے لیتا ہوں''، اور حضرت تھانویؒ کو بھی تحریر فرمایا کہ ''میں نے خود آپ کو بیعت کرلیا ہے، مطمئن رہیں''۔

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ سے دست بدست بیعت:

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ ۱۳۰۱ھ کو مدرس کی حیثیت سے کانپور تشریف لے گئے، اسی سال ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ حضرت اپنے والد ماجد کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ سے ملاقات ہوگئی اور ان سے دست بدست بیعت ہونے کا شرف حاصل ہوا، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ یہ بھی چاہ رہے تھے کہ حضرت تھانویؒ چھ ماہ تک ان کے پاس رُکے رہیں، لیکن ان کے والد ماجد نے شفقت پدری کے تحت جدائی کو گوارا نہیں فرمایا اور حضرتِ والا کو اپنے ساتھ واپس لے آئے، تاہم! حاجی صاحب رحمہ اللہ نے حضرتِ والا سے یہ فرمایا کہ اگلی بار جب حج کو آنا ہو تو کم از کم چھ ماہ کے قیام کے ارادے سے آنا۔ حج سے واپسی کے بعد تدریس و وعظ کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اپنے شیخ سے خط و کتابت کے ذریعہ استفادہ بھی فرماتے رہے، اور ان کے اس ارشاد ''میاں اشرف علی! تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ'' کو عملی جامہ پہنانے کی حسرت بھی دل میں برابر باقی رہی، یہاں تک کہ دس سال کا عرصہ اسی کیفیت کے ساتھ بیت گیا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں دوسری حاضری اور ان کی طرف سے اجازت وخلافت:

حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کی خدمت میں پہلی حاضری اور دست بدست بیعت ہونے کے بعد کانپور میں درس وتدریس، وعظ وتبلیغ اور ذکر وشغل کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا، اور بالآخر ۱۳۱۰ھ کو پھر حج پر جانے اور وہاں پر چھ ماہ تک اپنے شیخ کے ارشاد کے مطابق ان کی خدمت میں رہ جانے کا پروگرام بنا، حاجی صاحبؒ ایسے ہی موقع کے منتظر تھے، چنانچہ حضرت والا کے پہنچنے سے بے حد مسرور ہوئے، اور نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ ان کی تربیت باطنی کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کو خصوصی توجہات وعنایات سے نوازا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کا سینہ معارف وحقائق کا خزینہ اور انوار وبرکات کا آئینہ بن گیا۔ اُدھر حضرت حاجی صاحبؒ کی خصوصی عنایت اور توجّہ کی برکت اور اِدھر حضرت والا کی طلبِ صادق اور سچے جذبے کا اثر تھا کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اس درجہ مناسبت پیدا ہوگئی کہ حضرت حاجی صاحبؒ بے ساختہ فرمانے لگے کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو اور حضرت والا کو خلعتِ خلافت اور منصبِ ارشاد وتلقین سے نوازا، اور بوقت رخصت یہ فرمایا ''میاں اشرف علی! میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے تم کو تمام معاصرین پر خاص فضیلت عطا فرمائی ہے'' اور پھر دو وصیتیں کرتے ہوئے انہیں رخصت کیا، پہلی وصیت یہ کہ ''دیکھو میاں اشرف علی! ہندوستان پہنچ کر تم کو باطنی کیفیات میں ایک حالت پیش آئے گی، گھبرانا نہیں، مجھے مطلع کرتے رہنا'' دوسری یہ کہ ''جب کانپور کے تعلق سے دلبرداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکّل بخدا! تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا''۔

بہر صورت! حضرت والا نے اپنے مرشد کے پاس تصوف کے مدارج ومراحل طے کر کے ان کی اجازت سے مکہ معظّمہ سے واپس کانپور جانے کا ارادہ کیا اور وہاں پر درس وتدریس، وعظ وتبلیغ اور ارشاد وتلقین میں مشغول ہوگئے، اور خواص وعوام نے آپ سے بھرپور استفادہ کیا اور آپ کو مقبولیت تامّہ حاصل ہوگئی۔

کانپور سے تھانہ بھون منتقلی:

حضرت تھانوی قُدِّس سرُّہٗ نے کانپور میں چودہ سال قیام فرمایا، اس دوران جہاں خواص وعوام ان سے فیضیاب ہوتے رہے، وہاں خود ان کی کیفیات میں بھی ترقی وتبدیلی آتی رہی، چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کی پیشین گوئی کے مطابق آپ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ کانپور جیسے محبوب مقام اور درس وتدریس جیسے دلچسپ شغل سے دلبرداشتہ ہونے لگے، اور بالآخر ۱۳۱۵ھ کو مدرسہ کی ملازمت سے معذرت پیش کرتے ہوئے حاجی صاحبؒ کی وصیت کے مطابق تھانہ بھون تشریف لے گئے اور ان کو مطلع بھی فرمایا، حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف سے یہ جواب آیا:

''بہتر ہوا آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری اور باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ اور خانقاہ کو از سرِ نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور

آپ کا مجھے خیال رہتا ہے''۔

تھانہ بھون کی خصوصیت اور حضرت تھانویؒ کی خدمات:

تھانہ بھون ایسی ممتاز ہستیوں کا مرکز رہا ہے جن کی نسبت سے اس قصبے کو عالمی مقبولیت اور دائمی شہرت نصیب ہوئی، ان ممتاز ہستیوں میں سرِ فہرست سید الطائفہ حضرت امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی، حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں۔ خانقاہ تھانہ بھون ابتداءً حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کے فیوض و برکات کا مرکز رہی، لیکن ۱۲۷۴ھ کے مشہور معرکۂ شاملی میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی شہادت اور ۱۲۷۶ھ کو سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی مکہ مکرمہ ہجرت اور ۱۲۹۶ھ کو حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی رحلت کے بعد اس ''دکانِ معرفت'' کی رونق میں جب کمی نظر آنے لگی تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے جو مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مدرس تھے تدریس کا سلسلہ ترک کر کے اپنے شیخِ عالی مقام حضرت حاجی صاحبؒ کی نصیحت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی تسلی و ہمت افزائی پر عمل کرتے ہوئے بے سروسامانی کی حالت میں ۱۳۱۵ھ کو خانقاہ تھانہ بھون سے اصلاح و تزکیہ کا سلسلہ شروع فرما کر اس کی رونقوں کو نہ صرف یہ کہ بحال کر دیا بلکہ ان میں چار چاند لگا دیئے، اور اُس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ (۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ) تک جو تقریباً نصف صدی پر محیط ہے اس خانقاہ میں تشریف فرما ہو کر وعظ و نصیحت، ارشاد و تلقین اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ شریعت و طریقت اور تزکیہ و اصلاحِ اعمال کے انوار پھیلاتے رہے۔

بدعات و رسومات کا قلع قمع:

علمِ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس، اصلاحِ اعمال اور قرآن و سنت کی تعلیمات پر اخلاص و استقامت کے ساتھ عمل کرنا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اکابرین و اسلافِ امت نے علمِ تصوف کے ذریعہ بے شمار لوگوں کی اصلاح فرمائی ہے، لیکن! اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف ادوار میں بعض خود غرض اور دنیا پرست جعلی پیروں نے تصوف ہی کے نام سے اس میں مختلف بدعات و رسومات شامل کر کے اس کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی ہے، تاہم! اللہ تعالیٰ نے ان بدعات و رسومات کو مٹانے کے لیے ماضی میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ جیسے اہل علم کو منتخب فرمایا اور بعد میں علمائے دیوبند کو بالعموم اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی شخصیات کو بالخصوص بدعات و رسومات کی سرکوبی اور علم تصوف کو نکھارنے کے لیے منتخب فرمایا۔

حضرت تھانویؒ نے قرآن و سنت کی روشنی میں تمام باطل عقائد، غیر اسلامی رسومات اور گمراہ کن اصطلاحات کی تردید فرمائی اور بے شمار مواعظ کئے اور انہیں قلمبند بھی کروایا اور اس موضوع پر متعدد کتابیں تحریر فرمائیں اور یہ واضح کر دیا کہ تصوف و سلوک

درحقیقت اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام تعلیمات پر اخلاص واستقامت کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے! صرف چند ہی عبادات اور حقوق اللہ کی ادائیگی پر انحصار کافی نہیں، نیز یہ بھی ثابت کردیا کہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے ہٹ کر تصوف کے نام پر جو باطل رسومات انجام دیئے جارہے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ سب باطل ہیں۔

اللہ کی طرف سے دستگیری:

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی معصوم عن الخطا نہیں، اس لیے شیطان لعین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر مسلمان بالخصوص اہل علم کو کسی نہ کسی کوتاہی میں مبتلا کردے، اہل علم کو عام طور پر غرور وتکبر اور خود بینی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن! اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور متقی بندوں کی دستگیری فرماتے ہوئے ایسے موقع پر انہیں شیطان کے فریبوں سے بچا دیتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

''ان الذین اتقوا اذا مسّھم طائفٌ من الشیطٰن تذکّروا فاذا ھم مبصرون'' (الاعراف ۲۰۱)

یعنی'' بے شک جولوگ پرہیزگار ہیں جب انہیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال آکر چھوتا ہے تو وہ فوراً چونک اٹھتے ہیں پھر وہ سیدھا راستہ دیکھنے لگتے ہیں۔''

حضرت تھانویؒ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم کا یہ معاملہ رہا کہ اگر شیطان نے انہیں بہکانے کی کوشش کی، اللہ نے دستگیری فرمائی اور انہیں بچایا، اس سلسلہ کا ایک واقعہ جو حضرت تھانویؒ نے خود بیان فرمایا ہے نقل کیا جارہا ہے:

''ایک دفعہ مجھے خیال پیدا ہوگیا کہ مجھ میں کچھ قوت بیانیہ زباندانوں کی سی نہ سہی مگر کچھ تو کہہ ہی لیتا ہوں، اس کے بعد ایک دن گڑھی خام میں وعظ کہنے بیٹھا تو مطلق نہ چل سکا، بہتیرا سوچ ساچ کر پھیر پھار کر بیان کرنا چاہا مگر کچھ بیان نہ ہوسکا اور بالکل تقریر نہ چل سکی، کوئی مضمون ہی ذہن میں نہ آیا، آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا بس پھر طبیعت بند! مرادفات بڑھا کر مکرر ترجمہ کیا کہ شاید اسی سے کچھ طبیعت کھلے اور آگے کو سلسلہ چلے، لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہوا، مجبور ہوکر میں نے چاہا کہ لاؤ کوئی مضمون پہلے کا بیان کیا ہوا ہی بیان کروں، کیونکہ آخر بہت سے مضامین پہلے کے بیان کئے ہوئے بھی اور پڑھے ہوئے بھی تھے ہی، لیکن اس وقت کوئی ایسا مضمون بھی یاد نہیں آتا تھا اور ذہن کچھ کام ہی نہیں دیتا تھا، اب مجھے معلوم ہوگیا کہ اس وقت مجھ کو دراصل بیان پر قدرت ہی نہیں رہی، لہٰذا مجبور ہوکر میں نے مجمع سے کہہ دیا کہ صاحبو! اس وقت کوئی مضمون ہی ذہن میں نہیں آتا، کیا بیان کروں! بس آپ دعا کیجیے، چنانچہ دعا کرکے بیان ختم کردیا، شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کردیا، شرم بھی آئی کہ وعظ کا سامان فرش چوکی وغیرہ سب کچھ ہوا، لوگ بھی وعظ سننے کے لیے بہت اشتیاق کے ساتھ جمع ہوئے لیکن مجھ سے کچھ بیان ہی نہ ہوسکا، سب کو تعجب تھا، کیونکہ ایسا کبھی ہوا ہی نہ تھا، لیکن مجھے کچھ تعجب نہ تھا! کیونکہ مجھ کو معلوم تھا یہ اللہ تعالیٰ نے میرے ناز کا علاج کیا ہے، اور

میرے اس خطرہ کا جواب دیا ہے جو مجھ کو اس واقع سے پہلے کبھی کبھی گزرتا تھا کہ مجھے بیان پر قدرت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ یہ سب ہماری توفیق ہے ورنہ تمہیں کچھ بھی قدرت حاصل نہیں، چنانچہ میں نے اس خیال سے توبہ کی، بس پھر کبھی ایسا نہیں ہوا، عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ یہ صورت واقع ہوئی، اللہ تعالیٰ نے عمر بھر کے لیے سبق دے دیا، تاکہ کبھی وسوسہ بھی نہ آئے کہ ہم جب چاہیں بیان کر سکتے ہیں، اور یہ دکھلا دیا کہ جو بیان ہوئے ہیں اللہ ہی کی توفیق سے ہوئے ہیں''۔ (اشرف السوانح، جلد اول، ص: ۱۰۶، ۱۰۷)

تصنیف و تالیف:

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اپنے شیخ کے آثارِ علمیہ سے متعلق مضمون میں لکھتے ہیں: ''ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہیں''۔ (مآثر حکیم الامت، تالیف: حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ، ص: ۲۹۴)

ان سب تصانیف کو اللہ تعالیٰ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ ان کی حیات ہی میں بعض تو ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ گئیں، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے حضرت حکیم الامتؒ کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے کہ ''مخالفین سب اپنی اپنی کوشش کر لیں، آپ دیکھیں گے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ میری کتابیں ایسی پھیلیں گی ایسی پھیلیں گی کہ کسی کے روکے نہ رکیں گی'' چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آپ کی تصانیف کو ایسی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی کہ بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں ان کے مطالعہ سے انقلاب آیا، یہاں تک کہ بہت سے انگریزی خوانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنیں اور ان میں سے بعض ایسے پکے اور متقی مسلمان بن گئے کہ حضرت حکیم الامت کی طرف سے مجاز بیعت و تلقین بھی ہو گئے۔

تصانیف کی مقبولیت کی بنیادی وجہ:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف کی مقبولیتِ تامہ کی بنیادی وجہ ان کا اخلاص و تقویٰ ہے، انہوں نے مسلم معاشرہ میں جہاں کوئی قابلِ اصلاح عمل کو دیکھا بلا خوف لومۃ لائم اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اس کی اصلاح فرمائی، کچھ لوگوں نے سخت مخالفت کی، یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی لگائے اور ان کے خلاف مختلف سازشیں کیں! لیکن انہوں نے ہمیشہ ذاتی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دینی مصلحت کو ترجیح دی اور حق بات کہنے اور لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا، آپ نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی تصانیف میں سے کسی تصنیف کے حق طباعت محفوظ نہیں کرایا، بلکہ عام اجازت دی کہ جس تصنیف کو جو چاہے اور جتنی تعداد میں چاہے چھاپ سکتا ہے، چنانچہ طباعت کرنے والوں نے آپ کی کتابوں سے بہت پیسے کمائے اور آپ نے ان پر کوئی شرط عائد نہیں کی اور نہ ہی ان سے ایک نسخہ ملنے کی توقع رکھی، ہاں! اگر کوئی چھاپنے والا آپ کی خدمت میں محبت سے آپ کی کسی کتاب کا کوئی نسخہ ہدیۃً پیش کرتا تو لینے سے انکار نہیں فرماتے۔

بیان القرآن سے متعلق ایک انگریز کی حیرت:

جب حکیم الامت رحمہ اللہ نے تفسیر بیان القرآن لکھی اور اس کی شہرت ہوئی تو ایک انگریز نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو تفسیر کے لکھنے میں کتنے روپے ملے؟ جب حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ کچھ بھی نہیں، تو اس نے تعجب کیا اور کہا کہ پھر اتنی بڑی کتاب لکھنے کی آپ نے محنت ہی کیوں کی؟ حضرت والا نے فرمایا کہ ہم لوگ اس کے قائل ہیں کہ اس دنیوی زندگی کے علاوہ ایک زندگی اور بھی ہے جس کو آخرت کہتے ہیں، میں نے یہ محنت اس توقع پر کی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ مجھے اس کا عوض اس دوسری زندگی میں ملے گا! اور ایک اس سے دنیا کا فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ جب میں دیکھوں گا کہ میرے مسلمان بھائی پڑھ پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

مجدّد الملّت حضرت تھانویؒ کی یہ تقریر سن کر انگریز پر خاص اثر ہوا اور اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے قلب میں اس جواب کی بڑی وقعت ہوئی۔

حضرت حکیم الامت کا وصال اور ایک کرامت کا ظہور:

حکیم الامت مجدد الملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اس دار فانی میں بیاسی سال تین ماہ گیارہ دن گزار کر ۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ شب سہ شنبہ یعنی ۱۹ر اور ۲۰ر جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب نماز عشاء کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے پیچھے تقریباً آٹھ سو تصنیفات کا عظیم ذخیرہ اور بے شمار معتقدین و مستفیدین اور خلفاء و مریدین کو چھوڑا، امید قوی ہے کہ ان صدقات جاریہ علمیہ سے تا روز قیامت لوگ استفادہ کرتے رہیں گے اور جنت الفردوس میں حضرت حکیم الامتؒ کے درجات بلند ہوتے رہیں گے۔

وصال کے وقت ایک ایسی کرامت کا ظہور ہوا جس سے حضرت حکیم الامتؒ اور ان کی تصانیف کی مقبولیت عند اللہ کی ایک نشانی سامنے آگئی، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے الفاظ میں واقعہ قلمبند کیا جا رہا ہے:

> ''حضرت چھوٹی پیرانی صاحبہ نے بوقتِ نزع یہ دیکھا کہ جب سانس زور سے اوپر کو آتا تھا تو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کے درمیان پشت کی طرف گھائی میں ایک ایسی تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہو جاتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بجلی کے دو قمقمے اس وقت روشن تھے، پھر بھی اس کی چمک غالب ہو جاتی تھی، پھر دوسرے سانس میں وہ چمک غائب ہو جاتی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھیں کہ برسات کا موسم ہے ابر چھایا ہوا ہے ترشح ہو رہا ہے کوئی جگنو آ بیٹھا ہے، چونکہ کوئی موذی جانور تو تھا نہیں اس لیے اس کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی، لیکن جب دیر تک ایسا ہی ہوتا رہا تو پھر انہوں نے دوسری مستورات کو بھی جو اس وقت ان کے قریب موجود تھیں دکھایا کہ مجھے دھوکہ ہو رہا ہے یا تمہیں بھی چمک نظر آ رہی ہے؟ چنانچہ سب نے دیکھ کر تصدیق کی! سانس بند

ہوجانے کے بعد وہ چمک بند ہوگئی، پھر نظر نہ آئی۔ اس عجیب واقعہ کو سن کر ایک اہلِ علم اور صاحبِ ذوق خادم ومجاز حضرتِ اقدس نے اس کی بہت لطیف توجیہ بیان کی جو سب کو پسند آئی، فرمایا کہ عجب نہیں یہ نور اس وجہ سے ظاہر ہوا ہو کہ ان ہی دو انگلیوں سے بڑے بڑے علوم اور دقائق ومعارف وحقائق ایک مدت تک معرضِ تحریر میں آتے رہے ہیں، یہ نور اسی کا ہو، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال''۔ (تتمہ اشرف السوانح، ص:۸۳)

کسی نے حضرت حکیم الامت قُدِّس سرُّہ کی تاریخِ وفات کا مادہ اس طرح نکالا ہے ''اشرف علی نور اللہ مرقدہٗ'' = ''۱۳۶۲ھ''، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر انوار وبرکات کی بارش فرمادے اور ان کو جنۃ الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

(نوٹ) حضرت تھانویؒ کے حالاتِ زندگی سے متعلق مضمون میں ''اشرف السوانح'' اور حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (غزنوی)

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کا علمی مقام

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند عصرِ حاضر کے ان چیدہ علمائے ربانیین میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ علومِ دینیہ کی خدمت کے لیے وقف کیا ہوا ہے، وہ تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور اصلاحی وتربیتی بیانات کے ذریعے دینِ مبین کا اتنا بڑا کام انجام دے رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق وعنایت کے بغیر صرف ایک ہی آدمی عادۃً اسے ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔ آپ ایک طرف عالمِ اسلام کے سب سے بڑے عالی شان خالص دینی وعلمی مرکز ''دارالعلوم دیوبند'' کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے باوقار علمی منصب پر فائز ہوکر تشنگانِ علومِ نبوت کو سیراب کررہے ہیں اور دوسری طرف تصنیف وتالیف کے میدان میں آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''تفسیر ہدایت القرآن''، پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ''، بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری''، آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی'' اور علمی واصلاحی موضوعات سے متعلق دیگر متعدد کتابیں تحریر فرماچکے ہیں، اور فی الحال ''تفسیر بیان القرآن'' کی تسہیل پر نظرِ ثانی کا کام جاری ہے۔

حضرت الاستاذ کی ترقیوں اور غیر معمولی مقبولیت کا راز احقر کی نظر میں ان کا اخلاص وتقویٰ، قرآن کریم سے والہانہ محبت، انتظامی امور ودنیا سے بے رغبتی اور ان کا غیر متزلزل عزم وہمت ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی شخصیت کو علمی حیثیت سے شہرت حاصل ہوجاتی ہے اور لوگ ان کے معتقد بن جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے معتقدین کی دلجوئی کے لیے ان کے اجتماعات میں شرکت، ان کے بلانے پر سفر کرنے اور اسی طرح دینی وعلمی اداروں میں انتظامی مناصب قبول کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے علمی وتحقیقی کاموں کی رفتار میں ترقی کے بجائے سستی پیدا ہوجاتی ہے! البتہ احقر نے اپنی زندگی میں دو ایسی شخصیات دیکھی ہیں جو عالمی شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود ان کے علمی وتحقیقی

مشغلہ میں کوئی فرق نہیں آیا، اورانہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو غیر علمی مشاغل سے دور رکھا، ایک شخصیت عالم عرب کے ممتاز عالم دین حضرت الاستاذ سماحۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدّہ حلبی شامی قدس سرہٗ کی تھی جن سے جامعۃ الملک سعود ریاض میں احقر نے پڑھااوران کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور دوسری شخصیت حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کی ہے جن سے دارالعلوم دیوبند میں احقر نے دورۂ حدیث کی متعدد کتابیں پڑھیں اور مدرّس بننے کے بعد خارجی اوقات میں ان کے پاس حفظِ قرآن پاک بھی کیا، اور رواں صدی ہجری کے شروع سے تادمِ تحریر (جو تقریباً چالیس سال کا عرصہ بنتا ہے) ان سے اوران کی کتابوں سے برابر استفادہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

قرآن پاک سے والہانہ تعلق:

حضرت مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تکمیلِ افتاء میں داخلہ لیا اوراسی دوران فضیلۃ الشیخ المقری محمود عبدالوہاب مصری کے پاس حفظ قرآن کیا جو قرآن کریم کے جید حافظ وقاری اور جامعۃ الازہر کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث تھے، شیخ محمود عبدالوہاب مصری کی قرآن پاک سے ایسی گہری محبت تھی کہ جب وہ تلاوت کرتے یا دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں امامت کرتے تو خود ان پر اور سننے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی، ان کی صحبت نے قرآن پاک سے حضرت مفتی صاحب کے ذاتی والہانہ تعلق کو دوآتشہ بنادیا تھا۔

انہوں نے اپنے شاگرد حضرت مفتی پالن پوری صاحب کی صلاحیتوں اور قرآن پاک سے گہری وابستگی کو دیکھ کر ان کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی کہ ''الشیخ سعید: سیکون له شأن'' (شیخ سعید کو عنقریب ایک بڑا مقام حاصل ہوگا) اللہ تعالیٰ نے اس مردقلندر کے اس مختصر اور جامع جملہ کو ہوبہو ثابت کردیا اور آج صرف برّصغیر ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کی ممتاز علمی ہستیوں میں حضرت مفتی صاحب کو شمار کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک سے اسی محبتِ خالصہ کا نتیجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) اور اپنے سارے بچوں کو اپنے تمام علمی وتحقیقی مشاغل کے باوجود خود ہی حفظِ قرآن کرایا، اوراسی سچی محبتِ قرآن پاک کے تحت انہوں نے آٹھ ضخیم جلدوں میں تفسیر ہدایت القرآن تحریر فرمائی، اوراسی تعلق ووابستگی کی بنیاد پر تفسیر بیان القرآن کی تسہیل پر نظرثانی کی ذمہ داری کو قبول فرماتے ہوئے جلداول کا کام مکمل کردیا جو آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے اور باقی جلدوں کا کام جاری ہے، اللہ تعالیٰ پایۂ تکمیل تک پہنچادے۔

تفسیر بیان القرآن کی اہمیت

تفسیر بیان القرآن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قُدّس سرہٗ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ اور حضرت علّامہ سید سلیمان ندویؒ کی تصریح کے مطابق حضرت حکیم الامتؒ نے اس کے لکھنے میں ڈھائی سال لگائے، ترجمہ وتفسیر کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الامتؒ نے خواص کے فائدے کے لیے حاشیہ میں سورتوں کا تعارف، وجوہ بلاغت، مغلق تراکیب کا حل، اختلاف قراءات اور دیگر علمی باتوں کا بھی اضافہ کردیا، اور ۱۳۲۶ھ میں پہلی بار ''بیان القرآن'' کے نام سے شائع ہوگئی، اس کے بعد حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی نظر ثانی کے تحت اور بعض اہل علم کے مشوروں کے پیش نظر متعدد مقامات میں ترمیم واضافہ فرمایا اور اپنے دو مستقل رسالے جو قرآن سے متعلق تھے ایک ''مسائل السلوک'' (جس میں سلوک کے مسائل پر قرآن پاک سے استدلال کیا گیا ہے) اور دوسرا ''وجوہ المثانی'' (جس میں قراءات سبعہ کو ضبط کیا گیا ہے) ان دونوں کا بھی بیان القرآن کے ساتھ اس طرح اضافہ فرمایا کہ ''مسائل السلوک'' کو متعلقہ مقامات پر حواشی میں درج کردیا اور ''وجوہ المثانی'' کو ہر جلد کے آخر میں درج فرمایا اور نام ''مکمل بیان القرآن'' تجویز فرمایا، ''بیان القرآن'' کو ''مکمل بیان القرآن'' کے مرحلے تک پہنچانے میں حضرت حکیم الامتؒ کا مزید وقت خرچ ہوا، اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں حضرت حکیم الامت کے بارہ سال خرچ ہوئے، جیسے کہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے بھی ''پیش لفظ'' میں یہی جملہ نقل فرمایا ہے۔

تفسیر بیان القرآن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی، چنانچہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی زندگی میں اس کو خواص وعوام میں یکساں مقبولیت نصیب ہوئی، حضرت علّامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیو بند کا مندرجہ ذیل ملفوظ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے نقل فرمایا ہے: ''بیان القرآن دیکھ کر تو مجھے اردو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا، ورنہ میں سمجھتا تھا کہ اردو کی کتابوں میں علومِ عالیہ کہاں؟'' (اشرف السوانح، جلد سوم، ص:۸۲)

حضرت حکیم الامتؒ نے ایک بار خود فرمایا: ''تفسیر بیان القرآن میں سب الہامی مضامین ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے جو الفاظ ومعانی الہام فرمائے بعینہ میں نے وہی لکھے، بجز دو، ایک مقام کے جن کی میں نے نشاندہی کردی ہے، یہ تفسیر میں نے کامل شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے، اس کی قدر تو ان لوگوں کو ہوگی جنھوں نے کم از کم بیس معتبر تفاسیر کا مطالعہ کیا ہو وہ دیکھیں گے وہ مقامات جہاں سخت اختلافات واشکالات واقع ہوئے ہیں ان کا حل کیسی سہولت کے ساتھ قوسین کے اندر صرف چند الفاظ بڑھادینے سے ہوگیا، یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے''۔ (مآثر حکیم الامت، تالیف: ڈاکٹر عبد الحی عارفیؒ، ص:۳۲۲)

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ جنھوں نے انگریزی میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی ہے اور ان کے مطالعہ میں

متقدمین و متاخرین سب کی دستیاب تفاسیر رہتی تھیں وہ حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھی ہوئی اپنی ایک تحریر میں بیان القرآن سے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں: ''اس کام میں جتنا گہرا اترتا گیا ہوں، بخدا! اُسی قدر آپ کی تفسیر کی عظمت ورفعت دل میں عقیدت مندی کی بنا پر نہیں، علیٰ وجہ البصیرت بڑھتی گئی''۔ (نقوش وتاثرات، ص: ۴۴۹)

تفسیر بیان القرآن کے مزید امتیازات وخصوصیات کتاب کے شروع میں خود حضرت حکیم الامت کے قائم کردہ عنوان ''خطبۂ تفسیر بیان القرآن'' اور اسی طرح دوسرے عنوان ''بعض ان امور کا ذکر جن کی اس تفسیر کے لکھنے میں رعایت رکھی گئی ہے'' کے تحت خود حضرت تھانویؒ کی زبانی ملاحظہ کیا جائے۔

بیان القرآن کی تسہیل کی ضرورت:

مذکورہ تمام خصوصیات کے باوجود موجودہ دور میں علمی اور تحقیقی مزاج کے فقدان اور اصطلاحات کی تبدیلی کی وجہ سے بیان القرآن سے استفادہ کرنا مشکل ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی زید مجدہم کو جنہوں نے بڑی محنت وعرق ریزی کے ساتھ اس کی تسہیل فرمائی، اور پھر صرف اپنے اوپر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کو نظر ثانی کے لیے منتخب کیا جو دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، تفسیر ہدایت القرآن اور دیگر متعدد علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف اور افہام وتفہیم کے بے نظیر ملکہ سے مالا مال ہیں۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ کی تفسیر بیان القرآن کی تسہیل کا حق حضرت مفتی صاحب جیسی شخصیت کے تعاون کے بغیر ادا نہیں ہوسکتا تھا، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی زندگی میں صحت وعافیت کے ساتھ برکت نصیب فرمائے جنہوں نے اپنے تصنیفی مشاغل کو موقوف کر کے نظر ثانی کے لیے وقت نکالا اور ''مکمل بیان القرآن'' کو ''آسان بیان القرآن'' بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

واضح رہے! ''آسان بیان القرآن'' کے اندر ''مکمل بیان القرآن'' کے حواشی میں درج شدہ علمی مباحث اور ''مسائل السلوک'' اور اسی طرح ہر جلد کے آخر میں درج شدہ ''وجوہ المثانی'' کو شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کی تسہیل کی گئی ہے، اور نہ ہی ''آسان بیان القرآن'' کا یہ مقصد ہے کہ اس کے بعد ''مکمل بیان القرآن'' سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے! بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکیم الامت قدس سرہٗ نے جو قرآن پاک کی تفسیر کی ہے وہ آسانی کے ساتھ عام پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اتر جائے، اہل علم حضرات کو مزید علمی تحقیقات کے لیے ''مکمل بیان القرآن'' کی طرف رجوع کرنا چاہیے، واللہ ولی التوفیق۔

عبدالرؤف غزنوی

خادمِ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

۲۸/۷/۱۴۴۰ھ = ۴/۵/۲۰۱۹ء

فہرست مضامین

سورۂ بقرہ

سورۂ آلِ عمران

سورۃ النساء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آسان بیان القرآن

مکمل بیان القرآن: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں حضرت کے بارہ سال خرچ ہوئے ہیں، اب چار دانگ عالم میں اس کی شہرت ہے، ایک دنیا اس سے مستفید ہورہی ہے، اس میں حضرت قدس سرہٗ نے علمی زبان استعمال کی ہے، جب وہ طبع ہوئی اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کے مطالعہ میں آئی تو آپ نے فرمایا کہ ”میرا خیال تھا کہ علوم عربی میں ہیں، اب اندازہ ہوا کہ اردو میں بھی ہیں“ اس ارشاد سے بیان القرآن کا مقام ومرتبہ آشکارا ہوتا ہے، یہ تفسیر گنجینۂ علوم ہے، خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے شبہات کا تشفی بخش جواب اس میں ہے۔

جب حضرت قدس سرہٗ نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تو دیگر لواحقات ولوازمات کا التزام نہیں کیا تھا پھر سورۃ المائدہ سے اس کا التزام شروع کیا اور حاشیہ میں عربی میں لغات، روایات، نحو وصرف، بلاغت ومعانی، اور ملحقات ترجمہ کا اضافہ کیا اور مسائل السلوک حاشیے پر چڑھائی، پھر اس کا ترجمہ کیا، اس طرح وہ ایک مستقل کتاب بن گئی، باقی باتیں حضرت نے عربی میں لکھی تھیں، اس آسان بیان القرآن میں اس کا ترجمہ اور تسہیل نہیں کی گئی، کیونکہ یہ چیزیں خواص کے لئے تھیں، بلکہ اخص الخواص کے لئے تھیں، لیکن اصل تفسیر بیان القرآن سبھی لوگوں کے لئے تھی، اس لئے اس کو اردو میں لکھا تھا، مگر زبان علمی استعمال کی تھی اور عنوانات فارسی میں لکھے تھے، اس لئے وہ تفسیر عوام کی دسترس سے باہر ہوگئی، بلکہ علماء بھی اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی اس کی تسہیل کرتا، مگر لوہے کے چنے کون چباتا!

اللہ کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک پرانے فاضل جناب مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی (فراغت ۱۹۷۷ء) کو یہ سعادت نصیب ہوئی، موصوف صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں، اس لئے آسان زبان لکھنے پر قادر ہیں، انھوں نے ہمت کی اور پوری بیان القرآن کی تسہیل کی، یہ انھوں نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

پھر وہ اس کو لے کر میرے پاس آئے، انھوں نے چاہا کہ میں اس کو شائع کروں، میں نے ان کو مشورہ دیا کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کو دیں، حضرت قدس سرہٗ کی کتاب دارالعلوم دیوبند کے مکتبہ سے شائع ہوگی تو اس کی شان بڑھے گی، وہ مسودہ لے کر حضرت مہتمم صاحب کے پاس گئے، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا

ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہٗ نے مسودہ رکھ لیا، پھر انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا، میں نے عرض کیا کہ پہلے کسی استاذ کو دکھائی جائے، اس لئے کہ بڑے حضرت کی کتاب ہے، دارالعلوم کو اطمینان کر کے شائع کرنا چاہئے۔

مہتمم صاحب نے مسودہ مولانا نسیم صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) کے پاس بھیج دیا، انھوں نے رپورٹ دی اور تسہیل کی خوب ستائش کی، حضرت مہتمم صاحب نے پھر مجھ سے رابطہ کیا، میں نے عرض کیا صرف تسہیل پڑھ کر مولانا نے جو رپورٹ دی ہے وہ کافی نہیں، تسہیل کو اصل کتاب سے ملانا ضروری ہے، تسہیل نگار نے صحیح ترجمانی کی ہے یا نہیں؟ اس کا اطمینان کرنے کے بعد ہی دارالعلوم کو شائع کرنا چاہئے، اس لئے کہ حضرت قدس سرہٗ کی زبان بیان القرآن میں اردوئے معلی ہے، تسہیل کرنے والا اسے سمجھا ہے یا نہیں؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے، اور بعض حقائق ودقائق تو حضرت نے عرش پر بیٹھ کر لکھے ہیں، اس کو تسہیل نگار فرش پر لا سکا ہے یا نہیں؟ اور بعض شبہات کے جوابات منطق وفلسفہ کی دنیا میں گھس کر دیئے ہیں اور ایک جگہ تو یہ اطلاع عام لکھی ہے کہ اس مضمون میں عام لوگ غور نہ کریں، اس لئے اس تسہیل کو اصل کتاب سے ملانا ضروری ہے۔

مہتمم صاحب مدظلہ نے مزید گفتگو کے لئے مجھے بلایا اور فرمایا کہ اتنا بڑا کام کون کر سکتا ہے؟ ساری کتاب کو اصل سے ملانا بڑا مشکل کام ہے! میں نے عرض کیا کہ مسودہ مجھے دے دیجئے، میں پوری کتاب اصل سے ملاؤں گا، پھر اپنے کمپیوٹر سے کتابت کراؤں گا، پھر تصحیح بھی خود کروں گا، پھر حرف آخر کر کے دارالعلوم کو دوں گا۔

مگر جب کام شروع کیا تو خیال آیا کہ پوری کتاب جو غالباً چھ جلدوں میں مکمل ہوگی، اس کی طباعت میں اتنی تاخیر مناسب نہیں، اس لئے میں جلد جلد شائع کر رہا ہوں، پھر پورا ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند چاہے گا تو وہ بھی شائع کرے گا۔

حضرت مہتمم صاحب نے میری یہ بات خوشی سے منظور کر لی۔ میں نے عرض کیا کہ فی الحال میں تفسیر ہدایت القرآن میں مشغول ہوں، جب اس سے فارغ ہوؤں گا تو یہ کام ہاتھ میں لوں گا، اس لئے کہ نفسِ ناطقہ بیک وقت دو کاموں کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکتا، مہتمم صاحب نے میری یہ بات بھی منظور فرمالی، یوں یہ مسودہ لوٹ کر میرے پاس آ گیا، میں نے مسودہ کمپوز کے لئے دے دیا، کاتب نے تقریباً آٹھ سو صفحات کمپوز کر ڈالے، اور میں تفسیر ہدایت القرآن میں مشغول رہا۔

اب میں بفضلہٖ تعالیٰ تفسیر ہدایت القرآن سے فارغ ہو گیا ہوں، مگر میرے ذمے ایک قرض ہے، میں نے وہ قرض اتارنا چاہا، سال دو سال پہلے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے یہ تجویز پاس کی تھی کہ صدر المدرسین صاحب "دیوبندیت کیا ہے" کے عنوان پر لکھیں، جب تفسیر پوری ہوئی تو میں نے اس موضوع پر لکھنے کا اعلان کر دیا۔

مگر معاً خیال آیا کہ بیان القرآن کی تسہیل رکھی ہوئی ہے، پہلے یہ کام کیوں نہ نمٹا دیا جائے، دیوبندیت کو سمجھنے والے تو ابھی بہت سے حضرات ہیں، اور حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی کتاب "علمائے دیوبند کا دینی رخ

اور مسلکی مزاج" امت کے ہاتھوں میں ہے، اس لئے وہ کام فوری کرنا ضروری نہیں، اور بیان القرآن کی تسہیل کپوز شدہ رکھی ہے اس لئے حاضر میں حجت نہیں غائب کی تلاش نہیں۔

میں نے اس تفسیر میں کیا کام کیا ہے؟

(۱) حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی نے جو تسہیل کی ہے، اُس میں انھوں نے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے اصل ترجمہ کی بھی کہیں کہیں تسہیل کی ہے، مشکل لفظ کو آسان لفظ سے بدلا ہے، پس وہ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ نہ رہا؛ اس لئے میں نے آیات کے بعد ترجمہ کے عنوان سے حضرت کا بعینہٖ ترجمہ رکھا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اس میں کوئی مشکل لفظ ہوگا تو عنوان کے بعد جو تفسیر آئے گی اس سے حل ہو جائے گا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے حاشیہ میں "ملحقات الترجمہ" بھی لکھا ہے، کہیں کہیں حضرت نے اس کی وضاحت کی ہے کہ میں نے یہ ترجمہ کیوں کیا ہے؟ اس کو کتاب میں شامل کرنا چاہئے تھا؛ مگر وہ اہلِ علم کے لئے اشارے تھے، اس لئے ان کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۲) بیان القرآن میں عناوین فارسی میں تھے، تسہیل نگار نے ان کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، ان کے علاوہ دورانِ تفسیر میں نے اور بھی عناوین بڑھائے ہیں اور مضامین کے پیراگراف قائم کئے ہیں۔

(۳) جہاں کہیں عبارت دقیق تھی اور تسہیل سے بات واضح نہیں ہوئی تھی اُس مقام کی میں نے تسہیل کی ہے؛ مگر دقیق بات تو دقیق ہی ہوتی ہے، کتنی بھی کوشش کی جائے اس کو عوامی سطح پر نہیں لایا جاسکتا، مگر میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہوسکا!

آخر میں قارئین کرام کی طرف سے مولانا عقیدت اللہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے یہ بہت بڑا کام بہ حسن وخوبی انجام دیا، مولانا زید مجدہ ہمت نہ کرتے تو شاید یہ میدان سر نہ ہوتا۔ فاللّٰہ یجزیہ خیر الجزاء، وصلی اللہ علی محمد وآلہ وصحبہ أجمعین، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

کتبہٗ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۲؍ جمادی الاخری ۱۴۴۰ھ

۱۸؍ فروری ۲۰۱۹ء

تمہید نظر ثانی

از حضرت مفسر علام قدس سرہٗ

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ایک عرصہ ہوا احقر نے بیان القرآن کے نام سے قرآن شریف کی تفسیر لکھی تھی، جو بحمد للہ ۱۳۲۶ھ میں شائع بھی ہوگئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس کو مفید بنایا اور مقبول فرمایا۔ اس درمیان میں خود مجھے بارہا اس پر جگہ جگہ سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور میرے بہت سے احباب نے تو اس کا شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ مطالعہ کیا۔ اس نظر اور مطالعہ کے درمیان مجھے خود بھی اور احباب کی زبانی یا تحریری طور پر بھی اور توجہ دلانے اور درخواست کرنے سے بھی بعض مقامات ترمیم اور اضافہ کے قابل معلوم ہوئے۔ اور پہلی بار کے چھپے ہوئے حاشیوں وغیرہ کی تحریر میں بھی بعض مقامات پر میری تجویز کے خلاف ترمیم کردی گئی تھی جو مجھے پسند نہیں تھی۔ اسی بنا پر جی چاہتا تھا کہ یہ تفسیر ترمیم واضافہ سمیت اسی طرز پر، جس پر میں نے اصل مسودہ لکھا تھا، طبع ہوجائے، اللہ کا شکر ہے کہ میری یہ تمنا بھی اسی طرح پوری ہوئی کہ میرے بھتیجے مولوی شبیر علی سلمہ مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اسی طرح اس کی طباعت کا فیصلہ کیا اور ترمیم واضافہ کے قابل مقامات میں مجھ سے ترمیم واضافہ کرنے کی درخواست کی۔ میں نے اس درخواست کو خوشی کے ساتھ منظور کیا اور نظر ثانی اس طرح کی کہ مولوی عبدالکریم سلمہ گم تھلوی پہلے ان مقامات کا مطالعہ کرکے جو اہل علم کے متوجہ کرنے سے مشورہ طلب ثابت ہوئے، شبہات کے مقامات کو نوٹ کرلیتے تھے، پھر ان مقامات کو میرے سامنے پیش کرتے تھے، میں نے ان پر غور کرکے تفسیر میں جگہ جگہ مناسب ترمیمیں کردیں۔ اور ان مقامات کا ایک بہت بڑا حصہ وہ بھی ہے جو ترجیح الراجح کے سلسلہ میں شائع ہوچکا ہے۔ اور بعض اہل علم نے کئی مقامات سے متعلق کچھ عبارتیں حاشیہ کے طور پر لکھ کر پیش کیں۔ اب انہیں حاشیہ میں داخل کردیا گیا اور امتیاز کے لئے ان کے آخر میں لفظ "محشی" لکھ دیا گیا ہے۔

چونکہ اب یہ تفسیر الحمدللہ ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی ہے، اس لئے اس کا نام بھی مکمل بیان القرآن تجویز کرتا ہوں [1] حق تعالیٰ مذکورہ برخوردار سلمہ کی اس سعی کو قبول فرمائیں اور اس کار خیر میں ان کی امداد فرمائیں۔ اور اس سے انہیں دینی ودنیاوی ہر قسم کا فائدہ عطا فرمائیں۔ اور عافیت وحسن وخوبی سے اس کار خیر کو انجام کو پہونچائیں۔ وباللہ التوفیق وھو خیر رفیق۔

اشرف علی

۲۰؍ شوال المکرم ۱۳۵۳ھ

(۱) چونکہ عربی حواشی، مسائل السلوک اور وجوہ المثانی اس تسہیل میں نہیں ہیں، اس لئے نام میں سے 'مکمل' لفظ حذف کرکے "آسان بیان القرآن" نام رکھا ہے ۱۲ سعید احمد پالن پوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ تفسیر بیان القرآن

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ټ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۾ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

مکتب قرآنی کا یہ طالب علم عرض کرتا ہے کہ بہت دن سے خود ہی اور احباب کے اصرار سے بھی کبھی کبھی خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر لکھی جائے، جو ضروریات کا احاطہ کرنے والی اور زوائد سے خالی ہو، مگر تفسیروں اور ترجموں کی کثرت دیکھ کر اس امر کو زائد سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمے شائع کرنے شروع کردیئے، جن میں کثرت سے شرعی قواعد کے خلاف مضامین بھر دیئے، جن سے عام مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا، اس کے باوجود کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کی برائیوں سے باخبر کر کے ان نقصانوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی، مگر چونکہ ترجمہ پڑھنے کا ذوق کثرت سے پھیل گیا ہے، وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی ثابت نہ ہوئے، جب تک کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی ترجمہ بھی نہ دیا جائے، جن میں مبتلا ہو کر ان بدعتوں سے بھرے اور گھڑے ہوئے ترجموں سے بے توجہ ہو جائیں۔ اس کے باوجود کہ گذشتہ محققوں کے ترجمے و تفسیر، خاص طور پر خاندانِ عزیزیہ کے ہر طرح کافی ووافی ہیں، مگر پڑھنے والوں کی حالت وطبیعت کو کیا کیا جائے کہ بعض تفسیروں میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری، بعض ترجموں میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر دلچسپی میں رکاوٹ بنا، غور وفکر اور مشورے سے بھی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے، جس کی زبان وطرزِ بیان اور مضامین کی تقریر میں ان کے مذاق وضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے، اور اس کے ساتھ ہی کوئی ضروری مضمون خواہ قرآن کا جزء ہو یا اس سے متعلق ہو، نہ رہ جائے۔ کچھ دن تک یہ رائے تجویز کی صورت اور تذکرہ کے پیرایہ میں رہی، آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ ومعائنہ میں آنے لگی۔ آخر اللہ کا نام لے کر اور محض اللہ کے بھروسہ سے پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہیں ہوں تو

کیا ہوا، موجودہ زمانہ کے بزرگ حضرات اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے، آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس کو شروع کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے مخلوق کو نفع پہنچانے کی پوری امید رکھتا ہوں۔ اس میں جن امور کی رعایت اور لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب اختصار کے ساتھ انہیں بیان کرتا ہوں۔

اول: قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے، جس میں قابلِ فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے۔

دوم: ترجمہ میں خالص محاورے دو وجہ سے استعمال نہیں کئے گئے: اول تو میں قصبہ کا رہنے والا ہوں، محاوروں پر عبور نہیں ہے، دوسرے یہ کہ محاورے ہر مقام کے مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، اگر دہلی کے محاورے لئے جاتے تو لکھنو والے نہ سمجھتے، یہاں کے محاورے وہاں نہ سمجھتے، ان دونوں کے محاورے حیدرآباد اور مدراس والے نہ سمجھتے۔ غرض ایسے محاورے عام فہم نہیں ہوتے، جبکہ اردو ترجمہ کم سے کم ایسا تو ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سارے حصوں کے لوگ اسے سمجھ جائیں۔ اس لئے کتابی زبان لی ہے کہ اس میں فصاحت کے ساتھ سلاست وروانی بھی ہے۔

سوم: نفسِ ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو ضروری دیکھا کہ اس پر ترجمہ کی توضیح موقوف ہے یا خود قرآن کے مضمون سے ظاہری طور پر کوئی شبہ پیدا ہوتا تھا، اس کا جواب یا مضمون کسی مشہور قرآنی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا، اس کی تحقیق یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی تو اسے "ف" بنا کر بڑھا دیا۔ باقی لطیفوں یا نکات یا طویل وعریض حکایتوں یا فضائل یا بہت سے مسائل وغیرہ سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا۔ غرض یہ کہ مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں، بلکہ محض قرآن کو حل کرنا اور ضرورت پوری کرنا مقصود رہا۔ لیکن اتنی رعایت کے باوجود بھی علماء وطلبہ کے لئے بہت سے مقامات میں علماء سے استغناء نہیں ہو سکتا، لہٰذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ وسمجھ داری پر اعتماد نہ فرمائیں، بلکہ حسبِ ضرورت علماء یا اعلیٰ درجہ کے طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں، ورنہ کم سے کم اتنا تو ضروری ہی ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرا سا بھی شبہ ہو، وہاں خود غور کر کے نہ نکالیں، بلکہ پنسل سے نشان لگا کر وہ عبارت علماء کے ذریعہ حل کر لیں، اس کے بغیر غلط فہمی کا احتمال بلکہ یقین ہے۔

چہارم: جس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، ان میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی، صرف اس کو لے لیا، باقی سے تعرض نہیں کیا، انہیں چھوڑ دیا۔

پنجم: قرآن کے مطلب کی تقریر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ربط خود ظاہر ہو جائے اور کہیں ربط کی سرخی لگا کر اس کی تقریر کر دی گئی۔

ششم: اختلافیات کی تفسیر میں صرف حنفی مذہب کو لیا گیا ہے اور دوسرے مذہب ضرورت کے مطابق حاشیہ میں لکھ دیئے گئے۔

ہفتم: چونکہ عوام کے نفع کے ساتھ خواص کے فائدہ کا بھی خیال آ گیا، اس لئے ان کے فائدہ کے واسطہ ایک حاشیہ

بڑھایا ہے، جس میں سورتوں اور آیتوں کا مکی و مدنی ہونا، مشہور لغتیں، بلاغت کی ضروری وجہیں، مغلق ترکیبیں اور خفی استنباط، فقہی وکلامی مسائل، اسباب نزول وروایات، قراءتوں کے ایسے اختلافات جو ترکیب یا حکم میں تبدیلی کرنے والے ہوں اور ترجمہ وتفسیر کی توجیہ مختصر طور پر بیان کی گئی ہیں، جسے درمیانی درجہ کا طالب علم بے تکلف سمجھ سکے۔ یہ حاشیہ درس وتدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے، اس حاشیہ کی عبارت اس لئے تجویز کی کہ عوام اس کو دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے تو بہت پریشان ہوتے [1]۔ اب اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ تفسیر مختصر یا طویل ترجمہ کہہ دیجئے، عوام وخواص سب کے کام کا ہوگا، اور اگر اہل علم پہلے صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذھن میں مجمل رہیں یا جو اشکال واقع ہوں انہیں ذہنوں میں بٹھا کر پھر اس تفسیر کو ملاحظہ فرمائیں تو ان شاء اللہ دوگنا لطف حاصل ہوگا۔ پڑھنے والوں سے یہ امید ہے کہ اس کو مطالعہ فرما کر میرے واسطے مغفرت ورحمت کی دعا کریں کہ اس مشقت سے بڑا لالچ یہی ہے۔

اے کہ برما میروی دامن کشاں ۞ از سر اخلاص الحمدے بخواں

اے وہ شخص جو ہمارے پاس سے دامن کشاں گذر رہا ہے خلوص سے ایک فاتحہ پڑھتا جا!

اس تفسیر کی اصطلاحات یہ ہیں کہ جو عبارت خطوطِ ہلالیہ (بریکٹ) سے باہر ہے، وہ ترجمہ ہے اور جو بریکٹ کے اندر ہے وہ ترجمہ سے زائد ہے اور ایک التزام یہ بھی کیا گیا ہے کہ عربی حاشیہ میں جہاں کسی کتاب کی بعینہٖ عبارت لی گئی، وہاں اس کتاب کا نام لکھ دیا ہے اور جہاں کچھ مناسب تصرف ہوا ہے وہاں کتاب کے نام سے پہلے لفظ ''من'' بڑھا دیا ہے۔ جہاں استاذی لکھا ہے، اس سے مراد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جہاں مرشدی لکھا ہے، اس سے مقصود حضرت مولانا الحاج محمد امداد اللہ مہاجر مکی صاحب قدس سرہٗ ہیں۔ جہاں کوئی ماخذ نہیں لکھا، وہ احقر نے اپنی رائے ویادداشت سے لکھ دیا ہے ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۞ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞﴾

الراقم: محمد اشرف علی التھانوی عفی عنہ

(۱) ہم نے ان عربی حاشیوں کو اس تسہیل میں شامل نہیں کیا ہے، کیونکہ یہ تسہیل عوام کے لئے کی گئی ہے، قاسمی

بعض ان امور کا ذکر جن کی اس تفسیر کے لکھنے میں رعایت کی گئی

ان میں سے بعض امور کا تو تفسیر کے خطبہ میں ذکر کردیا گیا ہے اور بعض امور ان سے علاوہ ہیں:

(۱) اس تفسیر کے لکھتے وقت میرے پاس یہ کتابیں رہتی تھیں: بیضاوی، جلالین، تفسیر رحمانی، اتقان، معالم التنزیل، روح المعانی، مدارک، خازن، تفسیر فتح المنان، تفسیر ابن کثیر، لباب، درمنثور، کشاف، قاموس، قرآن کے بعض ترجے، ان میں سے بعض کتابیں شروع سے میرے پاس رہیں اور بعض کچھ لکھنے کے بعد آئیں، اور بعض بالکل اخیر میں آئیں۔ چنانچہ حوالوں سے اس کی تفصیل وتعیین معلوم ہوسکتی ہے اور ضرورت کے وقت حدیث، فقہ وسیرت کی کتابوں کی طرف بھی مراجعت کی جاتی تھی۔

(۲) شروع سے آخر تک ہر سورت اور ہر آیت کا ربط نہایت آسان وعام فہم زبان میں التزام کے ساتھ بیان کیا گیا، اور اکثر سورتوں کے شروع میں ان سورتوں کا خلاصہ بھی بیان کردیا گیا۔

(۳) جتنی آیتوں کی تفسیر ایک ہی مضمون یا ملتے جلتے یا مناسبت رکھنے والے مضمون کی وجہ سے ایک جگہ جمع کر کے لکھی گئی ہے، ان کے شروع میں ان مضمونوں کا ایک جامع عنوان سرخی کے طور پر لکھ دیا گیا ہے، جس سے مختصر طور پر ان تمام آیتوں کا خلاصہ ذہن میں بیٹھنے کے بعد مفصل تفسیر سے جو کچھ نفع حاصل ہوگا، اسے پڑھنے والے خود دیکھ لیں گے۔ پھر ان آیتوں کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ ایک مسلسل تقریر معلوم ہوتی ہے۔

(۴) جن روایتوں پر تفسیر کی بنیاد رکھی ہے، ان میں اس امر کو لازم رکھا گیا ہے کہ وہ صحیح روایتیں ہوں، البتہ جہاں تفسیر کسی روایت پر مبنی نہیں تھی اور قرآن کے لفظ میں بھی فی نفسہ اس وجہ کا احتمال تھا تو احتمال کی تقویت کے لئے صحیح ہونے کی شرط کے ساتھ اس کو چلنے دیا۔

(۵) جواب صرف ان شبہات کے دیئے ہیں جن کا منشا کوئی صحیح دلیل تھی، جیسے کوئی آیت یا کوئی حدیث یا عقل یا حس سے ثابت کوئی امر۔ اور جن کا منشا کوئی صحیح امر نہیں ہے، بلکہ وہ شبہ خود دعوی بلا دلیل ہے، اس کے جواب میں چونکہ دلیل کا طلب کرنا ہی کافی ہے، اس لئے اس کو نہیں چھیڑا گیا، اور بہت سے شبہات ترجمہ کی تقریر ہی سے دور ہوگئے ہیں۔

(۶) کوئی مضمون ضرورت سے زیادہ نہیں لکھا، سوائے شاذ ونادر کے، جہاں کوئی خاص فائدہ ہوا۔

(۷) ترجمہ میں محاورہ کی اتباع کے مقابلہ میں ترکیب کی رعایت زیادہ رکھی گئی ہے۔

(۸) چونکہ احقر کی نظر گذشتہ آسمانی کتابوں پر بالکل نہیں ہے، اس لئے ایسے مضامین تفسیر حقانی سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

(۹) غالباً پوری تفسیر میں دو یا تین مقام ایسے ہیں کہ وہاں جیسا جی چاہتا تھا، ویسا شرح صدر نہیں ہوا۔ ایسے موقعوں پر احقر نے اس کی تصریح کر دی ہے، تا کہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر و تفسیر میسر ہو جائے تو اس کو ترجیح دے اور اس کو راجح سمجھے۔

(۱۰) فقہی و کلامی مسائل کی ہر آیت سے متعلق اسی قدر تحقیق پر اکتفا کیا گیا ہے جس پر قرآن کی تفسیر موقوف تھی۔

(۱۱) جو مضامین زیادہ تفصیل و تحقیق کے قابل کئی جگہ آئے ہیں، انہیں ایک جگہ مفصل لکھ کر دوسری جگہوں پر اس پہلی جگہ کا حوالہ دیدیا گیا ہے یا پہلی جگہ اس دوسری جگہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۱۲) تفسیر میں ہر جگہ سلف صالح کا اتباع کیا ہے، متاخرین یعنی بعد والوں کے اقوال کو جو سلف کے خلاف تھے نہیں لیا۔

(۱۳) جہاں مفسرین کے کئی اقوال ہیں ان میں سے جس کو روایت یا ذوق عربیت سے راجح سمجھا صرف اسی کو اختیار کرلیا، سب کو نقل نہیں کیا۔ البتہ کہیں کہیں اگر دونوں وجہیں برابر معلوم ہوئیں تو دونوں کو نقل کر دیا ہے۔

(۱۴) آیتوں کے مدلول کی تقریر میں منطقی میزانی قواعد کی پوری طرح رعایت کی گئی ہے، جس کا لطف ذہین علماء کے دل سے پوچھنا چاہئے۔

(۱۵) مجھے معلوم ہے کہ کہیں کہیں تقریر کسی قدر تنگ ہے، لیکن اس سے کفایت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ البتہ کم استعداد لوگوں کو اہلِ علم سے اس کے حل اور توضیح کی حاجت ہوگی، اسی طرح بعض جگہ ایسے مضامین بھی آگئے ہیں کہ ان کا سمجھنا مخصوص اہلِ علم کے ساتھ خاص ہے، اس لئے میرے نزدیک مطلقاً ضروری ہے کہ اس تفسیر کو ایک بار شروع سے آخر تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے اور جو مضمون اس کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے اس کو درسی علوم پر موقوف سمجھا جائے اور یہ امر یقینی ہے کہ اس سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط، معروف علوم میں مہارت اور اس میں بھی کسی مقام پر حیرانی اور تفسیروں سے مراجعت کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

(۱۶) ترجمہ و تفسیر میں اور بھی بہت سے ضروری و لطیف امور ایسے ملیں گے جو بیان کرنے سے خیال و سمجھ میں نہیں آسکتے، انہیں مطالعہ کے حوالہ کیا جاتا ہے۔

(۱۷) وہ لطیفے اور نکات جن کو تفسیر میں کوئی دخل نہیں تھا، نہ ہی وہ مقصود بالقرآن تھے، بالکل چھوڑ دیئے گئے۔ اصلی مقصود قرآن کے حل کو رکھا گیا ہے۔

(۱۸) جن آیتوں کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے، اس کے مقابلہ میں کسی کا قول نہیں لیا گیا۔

(۱۹) چونکہ مذکورہ امور کے التزام کی ضرورت کا خیال درجہ بدرجہ آتا رہا، اس لئے ممکن ہے کہ شروع کے حصوں میں التزامات کی رعایت چھوٹ گئی ہو اور چونکہ تفسیر کی تمام جلدوں میں کہیں تحقیقاً، اور کہیں سورت کے قریب ہونے کی وجہ سے کسی قدر کم یا زیادہ اور جلد اول متصلاً نہیں لکھی گئی، بلکہ درمیان میں وقفے اور اتفاقات ہوتے رہے، اس لئے خود اس کے حصوں میں اور پھر اس میں اور باقی جلدوں میں طرز وضع کے اعتبار سے کسی قدر فرق بھی ہے، جو دھیان سے دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

(۲۰) باقی جو مضامین حواشی عربیہ میں لکھے ہیں، وہ اہلِ علم کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کے التزامات پر متنبہ کرنے کی اس مقام پر حاجت نہیں۔ باقی ان سب معروضات کے بعد جو ناظرین کی مصلحت سے ظاہر کئے گئے، اپنی خاص حالت کے اعتبار سے یہ معروض ہے۔

نہ بنقش بستہ مشوشم، نہ بحرف ساختہ سرخوشم ❁ نَفَسے بیادتو میکشم، چہ عبارت وچہ معانیم (۱)

کتبہ: محمد اشرف علی عفی عنہ

(۱) یہ عبدالقادر بے دل دہلوی کا شعر ہے، ترجمہ: نہ اپنی تحریر پر حیران ہوں، نہ اپنی تحریر پر نازاں ہوں ÷ اللہ کی یاد میں کچھ وقت خرچ کر رہا ہوں، کیا میری عبارت اور کیا میرے معانی! حاصل کلام: میرا تفسیر لکھنے کا مقصد: اللہ کی یاد میں تھوڑا وقت لگانا ہے، نہ سخن سازی پیش نظر ہے نہ تحقیقات کی داد چاہتا ہوں۔

لغات: نقش بستہ: لکھا ہوا، مشوش (اسم مفعول): حیران، حرف ساختہ: لکھا ہوا، سرخوش میں لفظ سر زائد ہے اور دونوں جگہ م: ام کا مخفف ہے، نَفَس (فا کا زبر): سانس، یائے وحدت یعنی تھوڑا وقت، می کشم: کھینچتا ہوں یعنی لیتا ہوں اور چہ (مکرر) تسویہ کے لئے ہے ۱۲ سعید احمد

سورة الفاتحة مكية وهى سبع آيات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ع

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے، جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روزِ جزاء کے۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا۔ رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے۔

تفسیر: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑے مہربان، نہایت رحم والے ہیں[1] ﴿[2] اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو ہر عالم کے رب ہیں۔ ف: مخلوقات کی ہر جنس الگ الگ عالم کہلاتا ہے، جیسے: عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن وغیرہ۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ جو بڑے مہربان، نہایت رحم والے ہیں۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ جو روزِ جزا کے مالک ہیں۔ ف: روزِ جزا سے قیامت کا دن مراد

(۱) بعض لوگوں نے لکھا کہ بسم اللہ وغیرہ کے ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا لفظ کیوں لکھا؟ جبکہ ضروری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس انداز سے لیا جائے کہ وہ توحید کو ظاہر کرے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اول تو جی یہی چاہا کہ اللہ تعالیٰ کا نام تعظیم کے ساتھ لیا جائے۔ جہاں تک توحید کا تعلق ہے تو وہ ایسی مسلم ہے کہ اس کے عنوانات میں ایسے امور کا لحاظ رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے جگہ جگہ جمع کا لفظ استعمال کیا ہے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (ہم نے ہی ذکر (قرآن) کو نازل کیا) وغیرہ اور ایک مقام پر خطاب کے مقام پر بھی فرمایا ہے: ﴿رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا﴾: اس آیت میں من جملہ دیگر تفاسیر کے ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ بنا بر تعظیم بصیغۂ جمع باری تعالیٰ کو خطاب ہے۱۲ تبیان (یہ تبیان احقر کی بعض تقریرات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو میرے ہمشیرہ زادہ عزیزی مولوی سعید احمد مرحوم نے مجھ سے تفسیر کے مختلف مقامات پڑھتے وقت ضبط کر لی تھیں، مگر ان کی وفات ہو جانے سے اس کی تکمیل کی نوبت نہ آئی۔ اشرف علی)

(۲) عرض کیا گیا کہ سورۃ فاتحہ کی آیات میں تقریر ربط کیوں نہیں فرمائی گئی۔ ارشاد فرمایا کہ اس سورت کی آیات میں ربط ظاہر بھی ہے، نیز تفسیر لکھتے وقت ابتداء میں تقریر ربط کا التزام بھی ذہن میں نہ تھا، جیسے دیگر التزامات بھی نہ تھے۔ جوں جوں تفسیر لکھتا گیا ضرورتیں محسوس ہوتی گئیں، التزامات بڑھتے گئے، چنانچہ تقریباً تمام التزامات کا اہتمام سورۂ مائدہ سے شروع ہوا۔

ہے کہ اس دن سب اپنے کئے کا بدلہ پائیں گے۔ ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ ﴾ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد واعانت کی درخواست کرتے ہیں۔ ف: یہ بندہ کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں التجا ہے۔ ﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ﴾ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیجئے۔ ف: اس سے دین کا راستہ مراد ہے ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ ف: اس سے دین کا انعام مراد ہے۔ ان انعام والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بتا دیا ہے کہ وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ﴾ (اور جو شخص اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے گا تو ایسے لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، النساء:۶۹) ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ ﴾ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہوگئے ف: راہِ ہدایت چھوڑنے کی دو وجہیں ہوا کرتی ہیں: ایک یہ کہ اس کی پوری تحقیق نہ کرے، ضالین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ تحقیق کے باوجود اس پر عمل نہ کرے۔ ﴿ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ ﴾ سے ایسے لوگ مراد ہیں، کیونکہ اچھی طرح جانتے بوجھتے خلاف ورزی کرنے میں زیادہ ناراضگی ہوا کرتی ہے[1]

سورة البقرة مدنية وهي مائتان وست وثمانون آية

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

الٓمٓ ۝ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ

ترجمہ: ﴿ الٓمٓ ﴾ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

ربط: اس سورہ کا سورۂ فاتحہ سے ربط یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں راہِ ہدایت دکھانے کی درخواست کی گئی تھی، اور اس سورہ میں اس درخواست کی منظوری ہے کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے، اس پر چلو۔

﴿ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ﴾ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑے مہربان، نہایت رحم والے ہیں ﴿ الٓمٓ ﴾ ف: ان حروف کے معنی عام لوگوں کو نہیں بتائے گئے۔ شاید[2] رسول اللہ ﷺ کو بتا دیئے گئے ہوں، کیونکہ اللہ اور رسول

(۱) سورۃ الفاتحہ کی تفسیر حضرت حکیم الامت نے بہت مختصر لکھی ہے، یہ سورت ام الکتاب ہے، ضروری ہے کہ قارئین جانیں کہ پورے قرآن کے مضامین اس سے کیسے پھٹتے ہیں یا قرآن کے تمام مضامین اس میں کیسے سمٹے ہیں؟ اس لئے میرا ارادہ اضافہ کرنے کا تھا، مگر اس جلد کے صفحات میں گنجائش نہیں تھی، اس لئے یہ ضمیمہ ان شاء اللہ دوسری جلد کے شروع میں لکھوں گا ۱۲ سعید احمد پالن پوری

(۲) یہاں شاید کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، جہاں تک ایک قول پر اس شبہ کا سوال ہے کہ جب حضور ﷺ کو بھی نہیں بتایا تو کلام کو نازل کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خاص نفع کی نفی سے مطلق ←

نے اہتمام کے ساتھ ہمیں وہی باتیں بتائی ہیں جن کے نہ جاننے سے دین میں کوئی حرج واقع ہوتا ہو۔ان حروف کے معانی نہ جاننے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے ہمیں بھی ایسے امور کی تفتیش کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے (۱)۔﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ ﴾ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ف: یعنی قرآنِ مجید ایسی کتاب ہے جس کے اللہ کی جانب سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔مطلب یہ ہے کہ یہ بات واقعی طور پر یقینی ہے، خواہ کوئی ناسمجھ اس میں شک کرتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے کے باوجود حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو کچھ دیا ہے ہم نے اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے، اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جاچکی ہیں۔اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے۔ اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔

مؤمنوں کی صفات:

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ اللہ سے ڈرنے والوں (۲) کی رہنمائی کرتی ہے۔ف کیونکہ جسے خوفِ خدا نہ ہو، وہ قرآن کا بتایا ہوا طریقہ نہیں دیکھتا (۲) ﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ اللہ سے ڈرنے والے وہ لوگ ایسے ہیں کہ غیب پر یقین

← نفع کی نفی لازم نہیں آتی۔ممکن ہے اس میں تعلیم نبوی کے علاوہ کوئی اور نفع ہو۔اگر وہ نفع ہمیں معلوم نہیں ہے تو ہمارے نہ جاننے سے سرے سے اس کا نہ ہونا لازم نہیں آتا ۱۲ تبیان

(۱) اس سے مقطعات کے کچھ معنی نہ لکھنے کا عذر بیان کرنا مقصود ہے، کیونکہ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ مقطعات متشابہات میں داخل ہیں یا نہیں؟ اور فرمایا کہ علماء کا متشابہات میں جو اختلاف ہے، وہ اصلاً لفظی اختلاف ہے، حقیقی نہیں۔کیونکہ جو لوگ علم کی نفی کرتے ہیں، وہ تفسیر یعنی مراد کی تعیین کے درجہ میں نفی کرتے ہیں اور جو لوگ علم کا اثبات کرتے ہیں، وہ تاویل یعنی مراد کے احتمال کے درجہ میں ثابت کرتے ہیں۔اس طرح جس درجہ کی یہ نفی کرتے ہیں، اس کو وہ ثابت نہیں کرتے اور جس درجہ کو وہ ثابت کرتے ہیں اس کی یہ نفی نہیں کرتے ۱۲ تبیان

(۲) تقویٰ سے لغوی معنی مراد لئے ہیں، پس اب وہ مشہور اعتراض وارد نہیں ہوتا، نہ ان تکلف کے جوابوں کی ضرورت ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقویٰ سے اصطلاحی تقویٰ مراد لیا جاوے مگر عند التکلم۔اور معنی یہ ہونگے کہ جو لوگ وقت التکلم متقی ہیں، ←

رکھتے ہیں ف یعنی جو چیزیں ان کے حواس اور عقل سے پوشیدہ ہیں، انہیں صرف اللہ اور رسول کے فرمانے سے صحیح مان لیتے ہیں[۱] ﴿ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ ﴾ اور نماز کو قائم رکھتے ہیں۔ف: قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے ہیں اور اس کے شرائط اور ارکان کو پورا کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ اس کتاب پر بھی یقین رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی جا چکی ہیں۔ف: مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں توریت وانجیل وغیرہ پر بھی ہے۔

مسئلہ: ایمان کا مطلب ہے: سچا سمجھنا، رہا عمل کرنا تو یہ دوسری بات ہے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر جتنی کتابیں نازل کی ہیں، ان سب کو سچا سمجھنا فرض اور ایمان کے لئے شرط ہے، یعنی یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں۔اور خود غرض لوگوں نے جو کچھ تغیر وتبدل کر دیا وہ غلط ہے۔رہ گیا عمل تو وہ صرف قرآنِ کریم پر ہوگا، پہلی سب کتابیں منسوخ ہوگئی ہیں، اس لئے ان پر عمل جائز نہیں۔

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ اور وہ لوگ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ تو بس[۲] یہ لوگ اس راہِ راست پر ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے۔ ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں۔ف: یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں یہ نعمت ملی کہ راہِ حق نصیب ہوئی اور آخرت میں یہ دولت نصیب ہوگی کہ ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہوگی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ: بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں، خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لائیں گے۔بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر۔اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے سزا بڑی ہے۔

ربط: یہاں تک ان لوگوں کا ذکر تھا جو زبان اور دل سے قرآن اور دین کو ماننے والے ہیں۔آگے ان لوگوں کا ذکر ہے

← ان کو یہ تقویٰ اس کلام کی وجہ سے حاصل ہوا پس متقی میں مجاز نہ ہوگا ۱۲ تبیان

(۱) یعنی غیب سے مراد ما غاب عنا ہے، اصطلاحی معنی نہیں، کیونکہ اصطلاح میں غیب اس کو کہتے ہیں جس پر کوئی بھی دلیل قائم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ایمان اسی چیز پر ہوگا جو کسی دلیل سے ثابت ہو ۱۲ تبیان

(۲) ''بس'' ہماری زبان میں ثمرۂ کلام پر داخل کیا جاتا ہے، لہٰذا اشارہ اس طرف ہے کہ اولئک إلخ ماسبق کا ثمرہ ہے ۱۲ تبیان

جو نہ زبان سے مانتے تھے اور نہ دل سے۔ ایسے لوگ قرآن کی اصطلاح میں کافر کہلاتے ہیں۔

کافروں کی خصلتیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾ بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں، ان کے حق میں برابر ہے کہ چاہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

انتہائی بدبخت کے لئے نصیحت کا نفع بخش نہ ہونا:

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ کافر تو بہت سے ایمان لے آتے ہیں۔ اس آیت میں سارے کافروں کا بیان نہیں ہے، بلکہ خاص ان کافروں کا ذکر ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ اور اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے اور احکام سنانے کی ضرورت نہیں، یہ تو رسولِ مقبول ﷺ کا خاص منصبی کام تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان لانے کی فکر نہ کریں، اور ان کے ایمان نہ لانے سے مغموم نہ ہوں۔ ان کے ایمان لانے کی امید نہیں۔

شقی ازلی کو نصیحت کرنے کا فائدہ:

اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر ایسے لوگوں کو احکام کا سنانا عبث و بے کار رہا، تو عبث فعل رسول اللہ ﷺ کو کیوں سونپا گیا؟ دراصل عبث اسے کہتے ہیں جس میں کوئی بھی فائدہ نہ ہو۔ یہاں اگر ان لوگوں کو فائدہ نہ ہو تو نہ سہی، رسولِ مقبول ﷺ کو تو فائدہ ہوگا کہ پیغام کی ادائیگی کا ثواب ملے گا، پھر عبث کیسے ہوا؟

شقی ازلی کا کفر میں معذور نہ ہونا:

کوئی یوں بھی نہ سمجھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ایمان نہ لانے کے سلسلہ میں یہ خبر دیدی، اور اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف کچھ بھی ہونا محال ہے تو اب ایمان نہ لانے میں ان کو معذور سمجھا جائے۔ یہ فرمانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب حاذق، دق (ٹی بی) کے مرض میں مبتلا شخص کے بارے میں کہے کہ اس کا مرض آخری درجہ میں پہنچ گیا ہے، اب یہ اچھا نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اس طبیب کے کہنے سے مرض میں مبتلا نہیں ہوگیا، وہ تو اپنی کسی بے احتیاطی کے سبب پہلے سے اس کیفیت سے دوچار ہو چکا ہے۔ اب طبیب کا یہ کہنا خود اس کے اس حالت سے دوچار ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ اس کافر کا ایمان کے قابل نہ ہونا، اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے نہیں ہوا، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ایمان کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ہے اور ناقابلِ ایمان ہونے کی صفت خود اس کی شرارت اور حق کی مخالفت وعناد کے سبب پیدا ہوئی ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب آدمی کسی کی مخالفت پر آمادہ و کمربستہ ہو جاتا ہے اور

ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے تو موافقت اور مصالحت کی صلاحیت واستعداد گھٹتی چلی جاتی ہے، حتی کہ بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ قبولِ حق کی استعداد رکھی ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، مگر یہ شخص خود اپنی نفسانی خواہش اور خود غرضی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتا ہے، حتی کہ وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ طبیب روحانی کہہ سکے کہ اب یہ حق کو قبول نہ کرے گا، کیونکہ اس کی استعداد درست نہیں رہی، اس طرح اب اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں رہا۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۟﴾
اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر بند لگا دیا ہے، اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بڑی سزا ہے۔

ف: اس میں بھی اس قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب خود ان کے حواس کو ماؤف کر دیا تو اب وہ معذور ہو گئے۔ اصل بات یہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا کہ انھوں نے شرارت اور عناد کر کے خود اپنے اختیار سے اپنی قبولِ حق کی استعداد برباد کر لی ہے، اب استعداد کی اس تباہی کے ذمہ دار تو وہ خود ہی ہیں، مگر چونکہ بندوں کے تمام افعال کا خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے، اس لئے اس آیت میں اپنے خالق ہونے کو بیان کر دیا کہ جب وہ استعداد کی تباہی کے فاعل ہوئے اور اس کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنا چاہا تو ہم نے بھی ان کے قلوب وغیرہ میں بد استعدادی کی وہ صلاحیت پیدا کر دی۔ بند لگانے سے اسی بد استعدادی کا پیدا کرنا مراد ہے۔ سو یہاں بھی ان کا یہ فعل اس ختم کا سبب ہوا۔ ختم الٰہی اس فعل کا سبب نہیں ہوا، اس طرح ان کی معذوری کی کوئی وجہ نہیں۔

امر تکوینی کے مطابق استعداد کی مثال:

اس فرمانِ الٰہی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شریف امیر نے رحم وکرم کے جذبہ سے کسی مفلس کی تنخواہ سو روپے مقرر کر دی، مگر وہ ناقدر شناس ان روپیوں کو آتے ہی کسی کنویں یا دریا میں پھینک آتا ہے، جو نہ اس کے کام آویں نہ کسی دوسرے کے۔ اس امیر نے چند بار اسے اس نامعقول حرکت سے منع بھی کیا، مگر اس نے بات نہ مانی اور نہ ہی یہ امید رہی کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے گا۔ اب چونکہ ایسے شخص کو روپے دینے سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے امیر نے وہ تنخواہ بند کر دی۔ اور افسوسناک بات یہ کہ اس شخص کو اس تنخواہ کے بند کرنے کا بھی کچھ غم وافسوس نہ ہوا، نہ اس نے کچھ معذرت کی۔ اس وقت وہ امیر اپنی رعایا کو اطلاع دینے کی غرض سے کہے کہ جب اس نمک حرام نے ہمارے عطیہ کی ایسی ناقدری کی تو ہم نے بھی وہ تنخواہ بند کر لی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس مثال میں موردِ ملامت خود وہی نمک حرام ہوگا نہ کہ آقائے کریم۔ اسی طرح اس مضمون کو سمجھ لینا چاہئے۔

خلق وفعل کی حقیقت کی ایک مثال کے ذریعہ توضیح:

اب فعل وخلق اور ان کی حقیقت میں جوفرق ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بڑا پتھر ہے جسے زید جو کہ آقا ہے، تنہا آسانی سے اٹھاسکتا ہے، مگر وہ عمرو سے جو کہ غلام ہے، ہلتا بھی نہیں۔ زید عمرو سے کہتا ہے کہ اس پتھر کا اٹھانا ہمارے قانون میں جرم ہے اور اگر چہ اس کو کوئی اٹھا نہیں سکتا، مگر ہم نے بطور امتحان یہ طے کیا ہے کہ جو اس کو اٹھانے کے ارادہ سے ہاتھ لگاتا ہے، ہم اسے اٹھوادیتے ہیں، مگر یہ اٹھانا اس کا عمل اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ اس نے ارادہ کیوں کیا، جس کی وجہ سے ہم نے اٹھوایا۔ اگر وہ ارادہ نہ کرتا تو ہم اس پتھر کو نہ اٹھواتے اور وہ مجرم قرار نہ دیا جاتا۔ اب زید کے اس قانون اور معمول سے آگاہ ہونے کے بعد عمرو نے پتھر کے پاس پہنچ کر اس کو اٹھانے کے ارادہ سے ہاتھ لگایا اور اٹھانے کی کوشش کی، تب زید نے اپنے معمول کے مطابق فوراً وہ پتھر اٹھوادیا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ہر سمجھدار شخص عمرو ہی کو مجرم قرار دے گا، زید کو کوئی الزام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندے کو ارادہ اور کسب کی قوت عطا فرمائی ہے، مگر وہ ایجاد فعل کے لئے کافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا معمول مقرر کیا کہ جب بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا کردیتا ہے، پس مذکورہ بالا مثال کے مطابق جو کچھ اعتراض ہے، وہ بندہ پر ہے، اللہ تعالیٰ سبحانہ پاک ومنزہ ہے۔

فعل کے قبیح ہونے پر قیاس کرکے خلق کے قبیح ہونے کے شبہ کا ازالہ:

اگر یہ شبہ ہو کہ اگر قبیح فعل کا ارتکاب قبیح ہے تو قبیح کا خلق بھی تو قبیح ہونا چاہئے۔ یہ قیاس غلط ہے، کیونکہ فعلِ قبیح اس لئے قبیح ہے کہ اس میں مفاسد غالب ہیں اور اس کے فعل میں کوئی حکمت واقعی صحیح نہیں ہے۔ بخلاف خلقِ قبیح کے کہ اس میں ہزاروں مصلحتیں اور حکمتیں ہوتی ہیں، البتہ ان حکمتوں کا تفصیلی علم ہر شخص کو نہیں ہوتا، مگر کسی شے کا علم نہ ہونے سے خود اس شے کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ فعلِ قبیح میں حکمت نہ ہونے اور خلقِ قبیح میں حکمت موجود ہونے کے لئے صرف یہ اجمالی دلیل کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عقل ونقل کے نزدیک متفقہ طور پر حکیم ہے اور حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اور فعلِ قبیح سے خود اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، تو لازمی طور پر فعلِ قبیح حکمت سے خالی ہے، اسی لئے حکیم نے منع کیا ہے۔ اور خلقِ قبیح خود ان کا فعل ہے تو لازمی طور پر اس خلق میں کوئی حکمت ہوگی، اسی لئے اس کو اختیار کیا۔ اس فرق کو سمجھنے سے بہت سے شبہات آسانی سے دفع ہوجاتے ہیں۔

بندہ کے افعال میں ارادہ کی تاثیر سے متعلق شبہ کا ازالہ:

اگر یہ شبہ [1] ہو کہ اگر چہ خلقِ قبیح بندہ کے ارادہ کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور اس لئے خالق پر کوئی الزام نہیں آتا، مگر اس فعل کے ساتھ ارادۂ خداوندی کا جو تعلق ہے وہ تو ارادۂ بد کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود بندہ کا ارادہ اس کا نتیجہ ہے، تو اب اشکال پھر لوٹ

(۱) خلاصہ اعتراض کا یہ ہے کہ ارادۂ خداوندی ارادۂ عبد وفعلِ عبد دونوں پر مقدم ہے، کیونکہ اول ارادۂ خداوندی ہوتا ہے کہ بندہ ←

آئے گا۔ تو یہ شبہ بھی مذکورہ بالا تقریر سے زائل ہوگیا، کیونکہ وہ ارادۂ خداوندی ہزار ہا ہزار مصلحتوں پر مشتمل ہے، اس لئے وہ قبیح نہیں، بخلاف فعلِ عبد کے کہ وہ مفاسد کی وجہ سے قبیح ہے۔

بندہ کے اختیار کی نفی کے شبہ کا ازالہ:

اگر یہ شبہ ہو کہ اگر چہ اللہ کے ارادہ اور خلق سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی مگر بندہ کا غیر مختار ہونا لازم آگیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ارادۂ خداوندی خاص اس طریق سے متعلق ہوا ہے کہ بندہ خود اپنے اختیار سے یہ فعل انجام دے گا، اس لئے بندہ کے اختیار کا وجود تو اور بھی زیادہ تاکید کے ساتھ ثابت ہوگیا، وہ مسلوب اور معدوم نہیں ہوا۔ جیسا کہ خود ارادۂ خداوندی یقیناً افعالِ خداوندی کے ساتھ متعلق ہے اور پھر بھی اہلِ ملت کے نزدیک متفقہ طور پر اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں غیر مختار نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ کے فضل سے، تقدیر سے متعلق تمام اشکال دور ہوگئے، مگر فہم وانصاف اور حق کی طلب شرط ہے۔

تقدیر سے متعلق شبہات کا مختصر واطمینان بخش تقریر کے ذریعہ ازالہ:

یہ تفصیل اس شخص کی رعایت سے لکھی گئی ہے جس کو اپنے آپ شبہ پیدا ہو جائے، ورنہ خالی الذہن کے لئے اس تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جس کے ذہن میں اس تفصیل کے بعد بھی کوئی وسوسہ پیدا ہو، اسے بھی آگے غیر ضروری الجھن میں پڑنا جائز نہیں، بلکہ ان دونوں قسم کے لوگوں کے لئے یہ عقیدہ قائم کر لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور مالک کو بحیثیت مالک کے اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے، جیسے کوئی شخص زمین کے کسی حصہ پر کوئی شاندار عمارت تعمیر کر دے، جس میں مختلف درجات ہوں، کسی حصہ میں اپنی نشست گاہ بنائے جسے ہزاروں قسم کے ساز وسامان سے آراستہ کرے۔ دوسرے حصہ میں بیت الخلا یا کوڑا گھر بنا دے، جہاں روزانہ سیکڑوں کو نٹل نجاست ڈالی جائے۔ اب بیت الخلا یہ سوال نہیں کرتا کہ میں نے کیا جرم کیا تھا کہ اس سزا کا مستحق قرار دیا گیا اور زمین کے فلاں حصہ نے کیا انعام کا کام کیا تھا جو اس عنایت کا اہل قرار پایا؟ ہر صاحبِ عقل ودانش یہی کہے گا کہ مالک کو اختیار ہے، جہاں جو چاہے بنائے[1]۔

منافقوں کے حالات:

ربط: یہاں پہنچ کر ان لوگوں کا ذکر بھی ختم ہوگیا جو قرآن اور دین کو نہ زبان سے مانتے تھے نہ دل سے۔ اب ان لوگوں

→ یوں ارادہ کرے اس کے بعد بندہ ارادہ کرتا ہے، پھر اس پر خلقِ فعل مرتب ہوتا ہے، پھر اس پر بندہ کی جانب سے کسبِ فعل ہوتا ہے، پس در حقیقت فعلِ عبد مرتب ہے خلق پر، اور وہ مرتب ارادۂ عبد پر، اور وہ مرتب ارادۂ باری پر ہے، لہٰذا اثر یعنی فعلِ عبد وارادۂ عبد اگر قبیح ہے تو اس کا مؤثر یعنی ارادۂ خداوندی بھی قبیح ہونا چاہئے اور تقریرِ جواب ظاہر ہے ۱۲ اتبیان

(۱) البتہ اتنا شبہ باقی رہتا ہے کہ کم از کم اس مالک کی نسبت اگر اس نے عمدہ قطعۂ زمین میں پاخانہ بنایا ہے تو یہ کہہ سکتے ←

کا بیان ہے جو کسی مصلحت یا دباؤ کے سبب زبان سے مانتے تھے، مگر دل سے بالکل نہ مانتے تھے۔ایسے لوگوں کو شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۞

ترجمہ:اور لوگوں میں بعضے ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر، حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں (یعنی محض چالبازی کی راہ سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں) اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے، ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کو مرض اور ان کے لئے سزا ہے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

تفسیر:اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ''ہم اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لائے'' حالانکہ وہ بالکل بھی ایمان والے نہیں ہیں (بلکہ) وہ اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں، چال بازی کرتے ہیں (یعنی وہ محض چالبازی کی غرض سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں) جبکہ واقعہ میں تو وہ خود اپنی ذات کے سوا کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چال بازی کا انجام خود انہی کو بھگتنا پڑے گا) ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا۔

فائدہ:لفظِ مرض میں ان کی بداعتقادی وحسد اور ہر وقت کا اندیشہ وخلجان سب آ گیا، چونکہ اسلام کو روز بہ روز ترقی ہوتی جاتی تھی، اس لئے اس کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں یہ امراض ترقی پاتے جاتے تھے۔اور ان کے لئے دردناک سزا ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی وہ ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے)

﴿يُخٰدِعُوْنَ﴾ میں خداع یعنی چال اپنے حقیقی معنی میں ہے، اس سے خاص اہلِ ایمان کے بارے میں چال بازی کرنا مراد ہے، خواہ وہ چال اللہ کے سامنے نہ چلے اور خواہ ان کا مقصد بھی نہ ہو کہ اللہ کے سامنے چال چل جائے گی، مگر یہ فعل خود چال ہے کہ اللہ کے سامنے بھی خلافِ واقع امر کا اظہار کیا۔پھر خداع یعنی چال بازی کی جزا کو بطریق عمومِ مجاز خداع کہا گیا ہے۔مرض سے عمومِ مجاز مراد لیا گیا ہے تا کہ حقیقت بھی اس کا ایک فرد ہو جائے تو اندیشہ اور خلجان تو حقیقتاً

← ہیں کہ اس نے مصلحت کے خلاف کیا۔تو کیا یہ سوال حق تعالیٰ کی نسبت نہیں ہو سکتا کہ ایسا امر مناسب نہ تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال اس شخص کے افعال میں ہو سکتا ہے جس کے افعال میں حکمت سے خلو محتمل ہو اور افعالِ خداوندی چونکہ حکمت سے ہرگز خالی نہیں، اس لئے وہاں یہ احتمال اور یہ سوال ہی نہیں جیسا کہ اوپر بھی آ چکا ہے ۱۲ تبیان

مرض ہیں اور بداعتقادی کو مجازاً مرض کہا گیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ مَثَلُھُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَھُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یادرکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں، لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ۔ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا ایمان لائے ہیں یہ بیوقوف؟ یادرکھو بے شک یہی ہیں بیوقوف، لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے۔ اور جب ملتے ہیں وہ منافقین اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی، بجائے ہدایت کے، تو سودمند نہ ہوئی ان کو یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو، پھر جب روشن کر دیا ہو اُس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو، ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ دیکھتے بھالتے نہ ہوں۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے۔

تفسیر: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ ﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو تو کہتے ہیں: ہم تو صرف اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔

فائدہ: یعنی جب ان کی ان منافقانہ کارروائیوں سے مختلف انواع واقسام کے فساد و فتنے وقوع میں آنے لگے، جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ منافق کی وجہ سے ہمیشہ فساد ہی بڑھتا ہے۔ یہاں ان کا کوئی مستقل فساد مراد نہیں ہے، جس کو وہ کرتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تم یہ نفاق چھوڑ دو جو فساد کا سبب بنتا ہے۔ کسی خیرخواہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی کارروائی فساد کا سبب ہوتی ہے، اس کو چھوڑ دو تو وہ اس کے جواب میں خود کو مصلح بتاتے ہیں۔ غرض ان کی کند ذہنی یا شرارت اس حد

تک بڑھ گئی ہے کہ وہ فساد کو اصلاح کہتے ہیں۔﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ یاد رکھو بیشک یہی لوگ مفسد ہیں، لیکن یہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

فائدہ: اپنی کند ذہنی یا شرارت کی وجہ سے ان لوگوں کی ایک جہالت تو اس سے معلوم ہوئی کہ وہ اپنے عیب کو ہنر سمجھتے ہیں۔ آگے ان کی دوسری جہالت کا بیان ہے کہ اوروں کے ہنر کو جو کہ ایمان خالص ہے، عیب اور حقیر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ، جیسا کہ اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا یہ بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ یاد رکھو بے شک یہی بے وقوف ہیں، لیکن یہ اس کا علم نہیں رکھتے۔

فائدہ: منافق لوگ ایسی بے باکانہ گفتگو ان غریب مسلمانوں کے سامنے کر گزرتے تھے، جن سے انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا اور بااثر لوگوں کے سامنے تو وہی نفاق وخوشامد کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس تقریر سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ وہ لوگ تو اپنے کفر کو چھپاتے تھے، پھر ایسی کفر کی باتیں مسلمانوں سے کیسے کر سکتے تھے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایسی بات اپنی ہی جماعت سے کرتے ہوں۔ لیکن ظاہراً پہلے احتمال کو اس لئے ترجیح ہے کہ یہ قول آمِنُوا کے جواب میں ہے اور آمِنُوا کا خطاب خود ان کی جماعت کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾ اور وہ منافق جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب اپنے شریر سرداروں کے پاس خلوت میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم بیشک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں۔ ف: یعنی ہم مسلمانوں سے تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ ورنہ ہم دل سے تو تمہارے ہی ہم مشرب ہیں۔ اللہ نے ان سے پہلے بھی ان کا یہ قول "ہم ایمان لائے" نقل فرما دیا ہے اور یہاں پھر نقل کیا ہے، سو اس کو تکرار نہ سمجھا جائے کہ تکرار وہ ہے جہاں اعادہ میں کوئی اور نئی غرض نہ ہو، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ پہلے مقام پر ان کا عقیدہ بیان کرنا مقصود تھا کہ گو وہ زبان سے ایمان کا دعوی کرتے ہیں، مگر ان کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اور یہاں ان کا مسلمانوں سے اور اپنے لوگوں سے برتاؤ بتانا مقصود ہے۔ یعنی ایک جگہ ان کا اعتقاد مذکور ہے اور دوسری جگہ ان کا عمل۔ اس طرح تکرار نہ ہوئی۔ اور سارے قرآن میں جہاں جہاں تکرار معلوم ہوتی ہے، وہاں اغراض میں ایسا ہی تفاوت ہے۔

آگے ان کے اس استہزاء کا جواب دیا ہے کہ وہ بیچارے مسلمانوں سے کیا استہزاء کرتے ہیں ﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ[1] بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ ﴾ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں اور ان کو ڈھیل دیے چلے

(۱) یعنی آیت میں جملہ یمدھم اپنے معطوف علیہ اللہ یستھزء بھم کا بیان ہے (تبیان)

جاتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران وسرگرداں ہورہے ہیں۔ف: وہ استہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دے دی گئی ہے کہ جب خوب کفر میں کامل ہوجائیں اور جرم سنگین ہوجائے، اس وقت دفعتہً پکڑ لئے جائیں، چونکہ یہ معاملہ ان کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا، اس لئے اس کو بھی استہزاء کہہ دیا گیا۔﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ ﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے ہدایت کے بجائے گمراہی لے لی، تو یہ تجارت ان کے لئے سودمند نہ ہوئی اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ف: یعنی انہیں تجارت [1] کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی اچھی چیز چھوڑ دی اور گمراہی جیسی بری چیز لے لی۔

منافقوں کی پہلی مثال:

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ ﴾ ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو [1]، پھر جب اس آگ نے اس شخص کے اردگرد سب چیزوں کو روشن کردیا ہو، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی [۳] کو سلب کرلیا ہو اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا ہو کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں۔ف: تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ہمراہی روشنی ہونے کے بعد اندھیرے میں رہ گئے، اسی طرح منافق لوگ حق واضح ہونے کے بعد ظلمت، ضلالت، گمراہی کی تاریکی میں جا پھنسے اور جس طرح اس اندھیرے میں ان آگ جلانے والوں کے آنکھ، کان وزبان سب بے کار ہوگئے۔ اسی طرح ظلمت وضلالت میں پھنس کر ان لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ ﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ ﴾ بہرے ہیں، گونگے

---

(۱) مطلب یہ کہ آیت میں ﴿ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴾ سے ہدایت دینی مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی نفی ہو بلکہ نفی تجارت میں ہدایت کی ہے کہ انھیں تجارت کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا (تبیان)

(۲) اس کا نکتہ بیان فرمایا کہ ﴿ اسْتَوْقَدَ ﴾ کو مفرد لایا گیا پھر ﴿ بِنُورِهِمْ ﴾ میں جمع کی ضمیر لائی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی آگ سلگاتا ہے، جب وہ دہک اٹھتی ہے تو دوسرے لوگ بھی تاپنے کے لئے جمع ہوجاتے ہیں۔ اس طرح استیقاد یعنی آگ جلانا ایک شخص کا فعل ہے، اس لئے مفرد کا صیغہ لایا گیا، اور روشنی سلب کرنے کے وقت سب جمع تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ﴿ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ﴾ میں ضمیر کو مفرد کیوں لایا گیا، حالانکہ یہ استیقاد کے بعد ہے اور سبھی کے لئے عام ہے؟ فرمایا کہ لوگ اس وقت جمع ہوتے ہیں کہ آگ کی روشنی ان تک پہنچے اور انھیں معلوم ہوجائے کہ آگ سلگ گئی، لہٰذا اول ﴿ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ﴾ مستوقد ہی کی ہوئی (تبیان)

(۳) قولہ ان کی روشنی الخ، یہ جمع اس اعتبار سے ہے کہ وہ شخص اپنے ہمراہیوں سمیت مراد ہے، چنانچہ تفسیر میں اس کی تصریح بھی کردی ہے، اور چونکہ ﴿ حَوْلَهُ ﴾ میں مفرد کی ضمیر ہے اور ﴿ بِنُورِهِمْ ﴾ میں جمع کی ضمیر ہے۔ اس لئے دونوں جگہ ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا۔

ہیں، اندھے ہیں۔ سواب یہ رجوع نہ ہوں گے۔

فائدہ: یعنی حق سے بہت دور ہوگئے ہیں کہ ان کے کان حق بات سننے کے قابل نہ رہے، ان کی زبان حق بات کہنے کے لائق نہ رہی، آنکھیں راہِ حق دیکھنے کے کام کی نہ رہیں، سواب ان کے حق کی طرف رجوع ہونے کی کیا امید ہے؟ منافقوں میں دو قسم کے لوگ تھے، بعض تو خوب دل کھول کر کفر کو اختیار کیے ہوئے تھے، یہ مذکورہ مثال تو ان کی تھی کہ بالکل اندھیروں میں رہ جانے والوں کے مشابہ قرار دیئے گئے، بعض ایسے تھے کہ ابھی انہیں اسلام کے حق ہونے میں کبھی کبھی تردد ہوتا تھا۔ اور اس کی خوبیاں دیکھ کر کچھ کچھ ادھر میلان ہونے لگتا تھا، مگر پھر جب نفسانی اغراض کا غلبہ ہوتا تو پھر وہ میلان انکار میں بدل جاتا۔ آگے ان کی مثال دیتے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ، وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ع

ترجمہ: یا (ان منافقوں کی ایسی مثال ہے) جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے، اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد و برق بھی، جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے۔ اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہیں کافروں کو۔ برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب اُن پر تاریکی ہوئی تو پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے گوش و چشم سب سلب کر لیتے، بلاشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

منافقوں کی دوسری مثال:

یا ان منافقوں کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو، اس میں اندھیرا اور تاریکی بھی ہو، اور رعد و برق (کڑک، گرج و بجلی) بھی ہو۔ جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں، وہ کڑک و گرج کے سبب موت کے اندیشہ سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ بجلی کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان کی بینائی اب لی۔ جہاں ان کو بجلی کی ذرا چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا اور جب ان پر تاریکی چھائی تو پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان وآنکھ سب سلب کر لیتے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

فائدہ: جس طرح یہ لوگ بارش کے طوفان میں کبھی چلنے سے رک جاتے ہیں، کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں، اسی

طرح یہ منافق غلبۂ اسلام کی علامتوں کے ہجوم میں کبھی نورِ اسلام کی جھلک کو دیکھ کر ادھر کو بڑھنے لگتے ہیں اور کبھی خود غرضی کی ظلمت میں پڑ کر پھر حق سے رک جاتے ہیں۔ اسی مضمون کے ضمن میں اخیر میں انہیں ایک دھمکی بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی قدرت کے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ اور ان کے آنکھ و کان (قوت بصارت و سماعت) کے سلب کر لینے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ سو حق کو چھوڑ کر انہیں مطمئن نہ ہونا چاہئے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ: اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور اُن لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردۂ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں کی غذا کو تم لوگوں کے واسطے، پس اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو۔ اور اگر کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے، اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلّہ ہو، اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں، اگر تم سچے ہو۔

ربط: یہاں تک تینوں قسموں کی جماعتوں کا بیان ہو چکا۔ اب سب کو خطاب میں جمع کر کے وہ کام بتایا جا رہا ہے جسے انجام دینے کے لئے یہ کتاب مقدس نازل کی گئی ہے۔ جس کے دو اصول ہیں: (۱) توحید اور (۲) تصدیق رسالت۔ پہلے توحید کا مضمون بیان کیا جا رہا ہے۔

توحید کی تعلیم:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، کیا عجب ہے (کچھ عجب نہیں) کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ ف: شاہی محاورہ میں ''عجب نہیں'' کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ﴾ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعہ تمہارے واسطے پردۂ عدم سے غذا نکالی۔ ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ اب تو تم جانتے بوجھتے اللہ پاک کے

مقابل (شریک) مت ٹھہراؤ۔ف: یعنی اس بات کو جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی تصرفات کرنے والا نہیں تو اس صورت میں یہ کب زیب دیتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں دوسروں کو معبود بناؤ۔

رسالت کی دلیل:

اس کے بعد رسالت کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں، یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ نبوت کی واضح اور روشن دلیل معجزہ ہوتا ہے، چنانچہ رسولِ مقبول ﷺ کو بھی بے شمار معجزے عطا ہوئے، جن میں سب سے بڑا معجزہ قرآن شریف ہے کہ نبوت کے اثبات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس کے معجزہ ہونے میں مخالف لوگ یہ شبہ ظاہر کرتے تھے کہ شاید اس کو رسول اللہ ﷺ خود تصنیف کر لیا کرتے ہوں۔ اس صورت میں اس کا معجزہ ہونا مشکوک ہو گیا اور نبوت کی دلیل مشتبہ ہو گئی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس شبہ کو اگلی آیت میں دور فرماتے ہیں تا کہ اس کا معجزہ ہونا ثابت ہو جائے۔ پھر موقع آنے پر قطعی دلیل بن سکے۔

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ اور اگر تم لوگوں کو اس کتاب کے سلسلہ میں کوئی خلجان ہے جو ہم نے اپنے خاص بندہ پر نازل فرمائی ہے تو اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو تو ذرا تم اس کے ہم پلہ ایک محدود ٹکڑا بنا لاؤ، کیونکہ آخر تم بھی عربی زبان داں ہو، بلکہ پیغمبر ﷺ تو مشاق بھی نہیں اور تم مشاق ہو۔ جب باوجود اس کے نہ بنا سکو گے تو بشرطِ انصاف بلا تامل ثابت ہو جائے گا کہ یہ معجزہ اللہ کی جانب سے ہے، اور بلا شبہ آپ پیغمبر ہیں۔ اور یہی مقصود تھا۔ اور اللہ کے علاوہ اپنے دوسرے حمایتیوں کو بھی (جو تم نے بنا رکھے ہیں) بلا لو۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار ہوئی رکھی ہے کافروں کے واسطے۔

کافروں کو ڈرانا:

پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر بچتے رہو دوزخ (کی آگ) سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، وہ تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔ف: یہ سن کر کہ قیامت تک بھی نہ کر سکو گے، کیسا جوش وخروش اور پیچ وتاب نہ آیا ہوگا اور کوئی دقیقہ سعی کا کیوں اٹھا رکھا ہوگا۔ پھر عاجز ہو کر اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہنا قطعی دلیل ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے۔ اور عادت کے لحاظ سے یہ امر محال ہے کہ کسی نے کچھ لکھا ہو اور وہ گم ہو گیا ہو، کیونکہ قرآن مجید کے حامی ہر زمانہ میں کم رہے ہیں، جب یہ محفوظ چلا آتا ہے تو اس تحریر کے حامی ومددگار تو قرآن کی مخالفت میں ہر زمانہ میں حامیانِ قرآن

سے تعداد میں زیادہ ہی تھے، وہ کیسے ضائع ہو سکتا تھا، اس لئے یہ احتمال بالکل لغو ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور خوشخبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کیے اچھے، اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہونگی ان کے نیچے سے نہریں، جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا، اس سے پیشتر، اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا، اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہونگی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہونگے۔

ربط: آیت بالا میں منکرین قرآن کے لئے وعید تھی، اب اس آیت میں تسلیم کرنے والوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے۔

مؤمنوں کو بشارت:

اور اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، اس بات کی کہ بیشک ان کے واسطے جنتیں ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جب کبھی ان لوگوں کو ان جنتوں میں سے کسی پھل کی غذا دی جائے گی تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا۔ اور انہیں ملے گا بھی دونوں بار کا پھل ملتا جلتا۔ اور ان کے واسطے ان جنتوں میں بیویاں ہوں گی، پاک صاف کی ہوئی، اور وہ لوگ ان جنتوں میں ہمیشہ بسنے والے ہوں گے۔

فائدہ: سورۃ کے شروع میں جو اہل ایمان کا ذکر تھا، وہاں قرآن مجید کی عظمت و برکت کا بیان کرنا مقصود تھا کہ اس کتاب پاک سے ایسے ایسے لوگوں کو ہدایت ملتی ہے تو ایمان کے فضائل کا بیان آ گیا تھا اور اس مقام پر خود ایمان کے فضائل وثمرات کا قصداً بیان فرمانا پیش نظر ہے۔ اس طرح مضمون میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان کو ملتا جلتا پھل ملے گا تو اکثر لطف کے واسطے ایسا ہوگا کہ دونوں بار کے پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی، جس سے وہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے، مگر کھانے میں مزہ دوسرا ہوگا، جس سے حظ وسرور کئی گنا بڑھ جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

ترجمہ: ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کردیں کوئی مثال بھی، خواہ مچھر کی ہو، خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو، سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال تو بہت موقع کی ہے، ان کے رب کی جانب سے۔ اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں، سو چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے۔ گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو، مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے، اس کے استحکام کے بعد۔ اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو وابستہ رکھنے کا۔ اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں، پس یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔

ربط: یہاں تک قرآن مجید کا مع اس کے متعلقات کے کلامِ الٰہی ہونا ثابت ہو گیا۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ مدعی کے ذمہ دو حق ہوتے ہیں: ایک اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرنا، دوسرے مخالف کی دلیل کا جواب دینا۔ سو یہاں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا دعوی کیا گیا، اس پر دلیل تو قائم ہو چکی کہ اس کے مقابلہ سے تمام انسان عاجز ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ہی کا کلام ہوگا۔ اب بعض مخالفین اس کے کلامِ الٰہی نہ ہونے پر یوں استدلال کرتے تھے کہ اس میں بعض بہت سی حقیر چیزوں کا ذکر ہے، جیسے: مکھی، مکڑی جیسا کہ بتوں اور بت پرستوں کی تمثیل میں ان کا ذکر آیا ہے، اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو ایسی ذلیل وحقیر چیزوں کا اس میں کیوں ذکر آتا؟ اس لئے اس مقام کا تقاضہ یہ ہوا کہ اپنی دلیل قائم کرنے کے بعد مخالفین کی اس دلیل کا جواب دیا جائے اور چونکہ اعتراض کرنے والوں نے اس عنوان سے اعتراض کیا تھا کہ توبہ توبہ! محمد کے رب ایسی چیزوں کے ذکر کرنے سے شرماتے نہیں؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جواب بھی اسی عنوان سے دیا ہے۔ ہاں! واقعی اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتے کہ کوئی بھی مثال بیان کریں، خواہ مچھر ہو، خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو، سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو، وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال ان کے رب کی طرف سے بہت موقع کے مطابق ہے۔ اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں تو چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ یوں ہی کہتے رہیں گے، وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے ارادہ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو اس کی وجہ سے ہدایت دیتے ہیں۔ اور وہ اس مثال سے کسی کو گمراہ نہیں کرتے، سوائے ان لوگوں کے جو نافرمانی کرتے ہیں، اور جو اس معاہدہ کو توڑتے رہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے۔ اور اس استحکام کے بعد ان تعلقات کو توڑتے رہتے ہیں جن کو جوڑ کر رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ پورے خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔

تمثیل کی تحقیق:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ ہاں! واقعی اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتے کہ کوئی بھی مثال پیش کردیں، خواہ مچھر ہو، خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں) ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو، وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال ان کے رب کی طرف سے بہت موقع کے مطابق ہے۔

فائدہ: وجہ اس کی ظاہر ہے کہ مثال کو اس چیز سے مناسبت ہونی چاہئے جس کی وہ مثال ہے، نہ کہ مثال دینے والے سے مناسبت کو ضروری قرار دیا جائے۔ کیونکہ مثال سے غرض کسی شے کی حالت کی توضیح ہوا کرتی ہے تو جب تک اس شے کے مناسب نہ ہوگی، اس کی حالت کی توضیح کے لئے کافی نہ ہوگی، اس لئے قرآن شریف میں جہاں مکھی مکڑی کا ذکر آیا ہے، بت پرستی کا لچر ہونا اور بتوں کا عاجز و مجبور ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی مثال میں حقیر وضعیف چیزوں کا لانا مناسب ہوگا یا عرش و کرسی کا لانا زیب دے گا جو حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان کی عظمت کے مناسب ہے جو مثال دینے والے ہیں؟ جس کے پاس ذرا بھی عقل ہوگی، اس کے نزدیک یہ بات واضح ہے، اس تقریر سے جو ﴿اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ کی تفسیر ہے، معترضین کا شبہ دور ہوگیا اور قرآن کی حقانیت کا دعویٰ اعتراض سے سالم ومحفوظ رہا۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں تو چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ یوں ہی کہتے رہیں گے، وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے ارادہ کیا ہوگا۔

فائدہ: چونکہ ایسی مثال سے، جو مثال والی چیز کی توضیح ہے، غرض اور مقصد بہت واضح اور بدیہی ہے اور وہ لوگ اس سے ناواقف نہ تھے، نہ سوال اس غرض سے تھا بلکہ محض شرارت کی غرض سے مثال کی حکمت کی نفی کرنا اور اس کے ساتھ تمسخر کرنا مقصود تھا۔ اس وجہ سے جواب میں حکمت کا بیان کرنا بھی ضروری قرار نہیں پایا، جس کا بیان جملہ ﴿اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ میں ہو چکا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جواب میں دوسرا طرز اختیار فرمایا ہے، جس کا اختیار کرنا ایسے ضدی لوگوں کے مقابلہ میں مناسب ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ تم یہ پوچھتے ہو کہ ایسی مثالوں کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ تو ہم سے سنو! مطلب یہ ہے: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو اس کی وجہ سے ہدایت دیتے ہیں۔

فائدہ: اس مضمون کی مثال[1] ایسی ہے کہ کسی طبیب شفیق نے چشمہ کے بہت سارے شیشے تراش تراش کر رکھے کہ

---

(۱) مثال کا حاصل یہ ہے کہ ذاتی طور پر اس کا اثر تو نفع اور ہدایت ہی ہے، مگر چونکہ بعض نے اس کو برعکس استعمال کیا، اس لئے ان کو نقصان پہونچایا اور یہ گمراہی اور مرض بڑھا تو اس کے برعکس استعمال سے، مگر یہ استعمال کرنا ہدایت کے آلہ سے متعلق ←

اپنے کمزور نظر والے مریضوں کو تقسیم کرے گا کہ یہ ان کے لئے باریک اور دور کی چیزیں دیکھنے میں مددگار ہوں گے۔ ان مریضوں میں سے ایک کوڑھ مغز شخص نے وہ شیشے اٹھا اٹھا کر اپنی آنکھوں میں چبھونے شروع کر دیے، جس سے رہی سہی آنکھیں بھی پھوٹ گئیں، تب اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ چشمے تو کسی کام کے نہیں ہیں، بلکہ یہ شیشے کے ٹکڑے تو آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں۔ طبیب نے اس کی بات سن کر اسے سمجھایا کہ یہ اس کے کام کے ہیں، مگر وہ اپنی ہی رٹ لگائے جاتا ہے اور جان بوجھ کر طبیب کی ضد میں یہی پوچھے جاتا ہے کہ صاحب! ان شیشوں کے بنانے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ اس صورت میں اس جاہل بددماغ کو یہی جواب دیا جائے گا کہ ان شیشوں کے بنانے کا مقصد یہی ہے کہ فلاں کی آنکھ کی روشنی بڑھا دیں اور تیری آنکھ پھوڑ دیں۔ حالانکہ اصلی غرض صرف روشنی ہی ہے اور جو اثر اس بددماغ مریض پر ظاہر ہوا ہے، وہ اس کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہاں اصل مقصد صرف ہدایت ہی ہے، جس کے واسطے قرآن نازل ہوا، مگر یہ دوسرا نتیجہ اس بددماغ کے عناد و جہالت کا جواب ہے۔

اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ اس کا اثر ذاتی طور پر تو نفع اور ہدایت ہی ہے، مگر چونکہ بعض لوگوں نے اس مقصد کے برعکس استعمال کیا ہے، اس لئے ان کو ضرر پہنچا، اور یہ گمراہی اور مرض بڑھا تو غلط استعمال سے، مگر یہ استعمال کرنا ہدایت کے آلہ سے متعلق ہے، بس اتنے التباس سے اس کی طرف منسوب کر دیا گیا اور اس حیثیت سے یہ اس کا اثر بالعرض ہوا۔

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ﴾ اور وہ اس مثال سے کسی کو گمراہ نہیں کرتے، سوائے ان لوگوں کے جو نافرمانی کرتے ہیں (کہ نافرمانی کی نحوست سے حق طلبی کی عادت نہیں رہتی) اور جو اس معاہدہ کو توڑتے رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے، اس کے استحکام کے بعد (جس کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ آیا ہے کہ سب کو آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر فہم و گویائی عطا کی اور ان سے توحید کا اقرار لیا) ان تعلقات کو توڑتے رہتے ہیں، جن کو جوڑ کر رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس میں وہ تمام تعلقات شرعی شامل ہو گئے جو بندہ اور رب کے درمیان ہیں یا باہم اعزا و اقارب کے درمیان ہیں، یا عام اہل اسلام یا بنی آدم سے ہیں، یا انبیاء علیہم السلام میں آپس میں ہیں، جن کا اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ (ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی

← ہے۔ بس اتنے تلبس سے اس کی طرف منسوب کر دیا گیا، لہٰذا اس حیثیت سے یہ اس کا بالعرض اثر ہوا اور یہ توجیہ مشہور توجیہ کے علاوہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ سے قریب تر ہے اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ بصیغہ لازم معروف کے ساتھ ہوتا۔ مگر چونکہ اس کا خالق حق تعالیٰ ہے اس لئے متعدی صیغہ سے لایا گیا، اور مشہور توجیہ بھی لطیف و بلیغ ہے۔ اور اس کی تائید سورۂ توبہ کی اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ ﴾

فرق وامتیاز نہیں کرتے) اور زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں (ویسے ظاہری فساد بھی کرتے تھے، کسی پر ظلم کر ڈالا، کسی کی آبرو خراب کر دی، کسی کی حق تلفی کر دی، اور باطنی فساد میں تو سارا ہی وقت صرف کرتے تھے۔ کفر کرنا، رسول اللہ ﷺ سے عداوت وحسد کرنا، نومسلموں کو بہکاتے رہنا) پس یہ لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں (کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے کھو بیٹھے، کیونکہ عداوت وحسد میں دنیا کا عیش بھی تلخ ہو جاتا ہے، آدمی ہر وقت اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ اپنے دشمن کو کس طرح گزند پہنچائے، اس کی ترقی میں کس طرح رکاوٹ پیدا کرے)

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ: بھلا کیونکر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کے ساتھ، حالانکہ تھے تم محض بے جان، سو تم کو جاندار کیا، پھر تم کو موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر ان ہی کے پاس لے جائے جاؤ گے۔ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب، پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف سو درست کر کے بنائے سات آسمان، اور وہ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

ربط: یہاں تک اس شبہ کے جواب کا سلسلہ تھا جو کفار نے پیش کیا تھا کہ کلام الٰہی میں ایسی ناقابل قدر چیزوں کا ذکر کیوں آیا؟ جسے مذکورہ جواب سے بخوبی واضح کر دیا گیا۔ اب اس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس کا اس سے اوپر آیت ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا ﴾ میں توحید کے متعلق ذکر ہوا تھا، جس میں ساتھ ساتھ توحید کی دلیل بھی بیان فرمائی گئی تھی، اس آیت ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ﴾ میں اسی مضمون پر کلام کو مرتب فرماتے ہیں۔ اور اس دلیل کا بھی پھر دوسرے رنگ میں اعادہ فرماتے ہیں۔

کفر پر نکیر:

جب اللہ تعالیٰ کا مربی اور خالق اور رازق اور محسن ہونے میں یکتا ویگانہ ہونا دلائل سے ثابت ہو چکا تو پھر بھلا اللہ کے ساتھ ناسپاسی وناشکری کیوں کرتے ہو؟ (کہ اس کے احسانوں کو بھلائے دیتے ہو اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو حالانکہ اس کے عبادت کے استحقاق میں یکتا ہونے پر دلائل قائم ہیں کہ) تم بالکل بے جان تھے (نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) پھر تمہیں جاندار بنایا، پھر تمہیں موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی قیامت کے میدان سے حساب وکتاب کے لئے بارگاہ میں پیش کئے جاؤ گے)

ربط: اس کے بعد اپنے کچھ انعامات واحسانات کا ذکر فرماتے ہیں کہ اگر دلائل سے کام نہیں لیتے جن میں قوت عقلی صرف کرنے کی ضرورت ہے اور یہ محنت کا کام کون کرے، تو خیر محسن کا حق ماننا تو طبعی امر ہے، یہی سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف

رجوع ہو جاؤ، اس لئے اپنی عام اور خاص نعمتوں کو یاد دلاتے ہیں، سو عام نعمت یہ ہے:

عام نعمتوں کا بیان:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے تمہارے فائدہ کے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں موجود ہے (خواہ کسی بھی قسم کا فائدہ ہو، کھانے کا، پینے کا، پہننے کا، نگاہ کو تازگی بخشنے کا، نفس یا روح کو حظ دینے کا، کسی چیز کو دیکھ کر صحیح توحید کا علم حاصل ہو جانے کا۔ اس تقریر کے بعد کوئی چیز ایسی نہ رہی جس میں کوئی فائدہ معلوم نہ ہو، اور بالفرض اگر معلوم نہ بھی ہو تو بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا فائدہ ایک شخص کو معلوم نہیں ہوتا، دوسرے کو معلوم ہوتا ہے، تو ممکن ہے کوئی چیز ایسی بھی ہو جس کا فائدہ کسی بھی مخلوق کو معلوم نہ ہو اور خالق سبحانہ وتعالیٰ کو معلوم ہو اور ہمارے علم میں آئے بغیر ہمیں اس کا فائدہ ہو رہا ہو۔ بچہ کو جن چیزوں سے فائدہ پہنچایا جاتا ہے، کیا اسے سب کا معلوم ہونا ضروری ہے؟ ہرگز نہیں۔

سوال: اور اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ پھر سب چیزیں حلال ہونی چاہئیں، کیونکہ سب میں کچھ نہ کچھ تو فائدہ ہے ہی، (جواب) صرف کوئی فائدہ ہونے سے، اس چیز کا قابل استعمال ہونا لازم نہیں آتا، کیا سمیات قاتلہ (مہلک زہروں) میں بھی کچھ نہ کچھ نفع نہیں ہوتا، پھر طبیب لوگ ان کے استعمال سے کیوں روکتے ہیں؟ صرف اس وجہ سے کہ گو اس میں نفع ضرور موجود ہے، مگر ضرر غالب ہے۔ اسی طرح شریعت کی حرام چیزوں کو سمجھئے کہ اگرچہ ان میں کچھ نفع بھی سہی مگر ضرر غالب تھا، جس کے لئے اللہ تعالیٰ کا جاننا کافی ہے، ہمارے جاننے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ وہاں طبیب کا جاننا کافی ہے، عوام کا باخبر ہونا ضروری نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا۔

پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق کی تکمیل کی طرف) تو انہیں سات آسمان درست کر کے بنا دیئے اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

زمین و آسمان کس ترتیب سے بنے ہیں؟

یوں تو زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر قرآن مجید میں سیکڑوں جگہ آیا ہے، مگر ترتیب کا بیان، پہلے کیا بنا اور بعد میں کیا بنا، غالباً صرف تین جگہ آیا ہے۔ ایک اس جگہ، دوسرے سورۂ حم السجدہ میں اور تیسرے النازعات میں، اور سرسری طور پر دیکھنے سے ان سب کے مضامین میں کچھ اختلاف سا بھی نظر آتا ہے۔ ساری آیتوں میں غور کرنے سے میرے خیال میں تو یہ بات آتی ہے کہ یوں کہا جائے کہ سب سے پہلے زمین کا مادہ بنا اور ابھی اس کی موجودہ ہیئت نہیں بنی تھی کہ اس حالت میں آسمان کا مادہ بنا جو دھویں کی صورت میں تھا۔ اس کے بعد زمین موجودہ ہیئت میں پھیلا دی گئی، پھر اس پر پہاڑ اور درخت وغیرہ پیدا کئے گئے، پھر اس دھویں جیسے سیال مادہ کے سات آسمان بنا دیے۔ امید ہے کہ اب ساری آیتوں میں تطبیق

ہوجائے گی، البتہ اصل حقیقت سے اللہ تعالیٰ بہتر طور پر واقف ہیں، اگر کسی کو یہ افسوس ہو کہ زمین وآسمان کی پیدائش کی تفصیلی کیفیت کیوں نہ بیان فرمادی تو اس سورہ کے شروع میں الٓمٓ سے متعلق جو مضمون لکھا گیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ اختصار کے باوجود ان شاء اللہ تسکین بخش ہوگا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب، فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خوں ریزیاں کریں گے، اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد للہ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں آپ کی، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے۔

خاص نعمتوں کا بیان:

ربط: جاننا چاہئے کہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک صوری، یعنی محسوس جیسے کھانا، پانی، روپیہ، مکان، جائیداد وغیرہ۔ دوسری: معنوی، جیسے عزت، آبرو، مسرت، علم وغیرہ۔ یہاں تک نعمت صوریہ کا بیان تھا کہ ہم نے تمہارے لئے زمین وآسمان بنائے، ان میں ہر قسم کا سامان پیدا کیا۔ اب نعمت معنویہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو علم کی دولت دی اور مسجود ملائکہ بنایا اور تمہیں ان کی اولاد میں ہونے کا فخر واعزاز عطا کیا، اس حوالہ سے اس قصہ کو شروع سے آخر تک بیان فرماتے ہیں۔

قصہ آدم علیہ السلام:

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا (مقصد استفسار یہ تھا کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو باطن کو بھی جانتے ہیں، حقیقت میں ان سے مشورہ لینا مقصود نہ تھا کہ اس کی حاجت ہی کیا ہے؟ بلکہ اس کا تو احتمال بھی محال ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا) کہ میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا۔ تو فرشتے کہنے لگے کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے، جو اس میں فساد اور خون ریزیاں کریں گے؟ اور ہم تو برابر بحمد اللہ آپ کی تسبیح وتقدیس کرتے ہی رہتے ہیں۔

خلافت کے معنی:

یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ میں اپنے احکام شرعیہ کے اجراء ونفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا۔

فرشتوں کی عرضداشت کا خلاصہ:

یہ ہے کہ ہم تو سب کے سب آپ کے مطیع وفرماں بردار ہیں، اور ان میں کچھ لوگ مفسد وسفاک بھی ہوں گے، اس لئے اگر یہ کام ہمیں سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اس کو انجام دیں گے۔ اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے، جو مطیع ہوں گے وہ تو دل وجان سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد وظالم ہوں گے، ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں؟ خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا، اور کوئی نہ ہوگا، اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ فرشتوں نے یہ بات بطور اعتراض کے نہیں کہی، نہ اپنا استحقاق جتایا جو ان مقدس خدمت گزاروں کے بارے میں شبہات پیدا ہوں، بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم کوئی نیا کام تجویز کر کے اس کے لئے ایک مستقل عملہ مقرر کرنا چاہے اور اپنے پرانے عملہ کے سامنے اپنے اس فیصلہ کا اظہار کرے اور وہ لوگ اپنی جاں نثاری کے طور پر عرض کریں کہ حضور! جو لوگ اس نئے کام کے لئے تجویز ہوئے ہیں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اس کام کو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض لوگ اس کام کو بالکل ہی بگاڑ دیں گے، جس سے حضور کا مزاج ناخوش ہوگا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں، ہر وقت حضور پر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں، اور حضور کی جان ومال کو دعا دیتے رہتے ہیں، کیسا ہی کام کیوں نہ ہو، حضور کے اقبال سے اس کو انجام دے ڈالتے ہیں۔ ہم غلاموں نے کبھی کسی خدمت کے انجام دینے سے عذر نہیں کیا، اگر وہ نئی خدمت بھی ہم کو سپرد ہو تو ہمیں کیا عذر وانکار ہوگا، ہم حضور کی مرضی کے مطابق اسے انجام دیں گے۔ اسی طرح فرشتوں کی عرض معروض نیازمندی کے اظہار کے واسطہ تھی، انہیں اس بات کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی طرح دے دیا ہوگا کہ بنی آدم میں بھلے برے سب طرح کے لوگ ہوں گے، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس بات کو جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے۔

بنی آدم کی تخلیق کی حکمت اور ملائکہ سے اس کی تکمیل نہ ہونا:

یعنی جو بات تمہارے نزدیک بنی آدم کی تخلیق میں مانع ہے، یعنی ان میں سے بعض کا مفسد وسفاک ہونا، اصل میں وہی امر، ان کی تخلیق کا باعث ہے، کیونکہ احکام وانتظام کا اجراء تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو۔

ہر کجا پستی است آب آں جا رود ❁ ہر کجا مشکلے جواب آں جا رود
ہر کجا دردے دوا آں جا رود ❁ ہر کجا رنجے شفا آں جا رود

(جہاں پستی ہوگی پانی اسی طرف جائے گا، جہاں کوئی مشکل پیش آئے گی، جواب اسی کا دیا جائے گا، جہاں درد ہوگا دوا وہاں ہی کام کرے گی، جہاں بیماری ہوگی شفا بھی وہاں ہی ہوگی)

تو یہ خاص مقصد تم فرماں برداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہوسکتا۔

جنات کے ذریعہ حکمت مذکورہ کی تکمیل نہ ہونا:

اب رہی یہ بات کہ جن تو پہلے سے موجود تھے اور ان میں نافرمان بھی تھے تو یہ مقصد ان کی موجودگی اور انہیں خلیفہ بنانے سے حاصل ہوسکتا تھا، پھر انسان میں نئی بات کیا ہوئی؟ اس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ اصلاح کے لئے جیسے کسی محل کی ضرورت ہے کہ اس میں فساد کی صفت بھی پائی جاتی ہو، اسی طرح اس محل کی قابلیت قریبہ کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ اصلاح وسعی کا زیادہ حصہ بے کار ہوجاتا ہے اور یہ قابلیت جنوں میں بہت ضعیف ہے۔ چنانچہ ملائکہ میں تو سرے سے فساد ہی نہ تھا اور جنات میں اصلاح کی قابلیت ضعیف تھی۔ اس لئے انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس میں فساد اور اصلاح کی مکمل قابلیت، دونوں مناسب طور سے موجود ہیں۔ اس طرح اس مقصد کی تکمیل کے لئے انسان کو پیدا کیا اور ملائکہ اور جن دونوں ناکافی قرار دیے گئے۔

مذکورہ حکمت کی ضرورت پر شبہ کا ازالہ:

اب رہی یہ بات کہ خود ایسی اصلاح ہی کی کیا ضرورت ہے جو فساد کے وجود پر موقوف ہو؟ اس سوال کا حاصل تکوین کی حکمت معلوم کرنا ہے۔ سو یہ دریائے خون ہے، اس میں قدم رکھنا خود کو ہلاکت عظیم میں ڈالنا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہ سمجھی جائے کہ اس میں کوئی معقول حکمت نہیں، ضرور ہے اور بیشک ضرور ہے، مگر ہماری عقلیں اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔ اس لئے:

بدریا در منافع بے شمار است ❁ اگر خواہی سلامت برکنار است

(دریا میں بے شمار منافع وفوائد ہیں، لیکن اگر سلامتی چاہتے ہو تو وہ کنارہ پر رہنے میں ہی ہے)

اس لئے شریعت نے شفقت کی غرض سے ایسے امور کی چھان بین کے پیچھے پڑنے سے روک دیا ہے اور ضروری کاموں میں لگادیا ہے۔

حدیث مطرب وے گو وراز دہر کم ترجو ❁ کہ کس نہ کشود نہ کشاید بہ حکمت ایں معمہ را

(شراب وسرود کی باتیں کرو اور دنیا کے رازوں کے پیچھے کم پڑو کہ حکمت کے ذریعہ اس معمہ کو نہ کوئی کھول پایا ہے نہ کھول سکتا ہے)

سورۂ بقرۃ کے شروع میں الٓمٓ کے ذیل میں یہی مضمون اختصار کے ساتھ عرض کیا ہے، اسے ملاحظہ کرلیا جائے۔

ربط: یہاں تک یہ تو معلوم ہوگیا کہ انسان کی تخلیق میں یہ حکمت ہے کہ ان کے ذریعہ شرعی اصلاح وانتظام کا عمل انجام پائے گا۔ اگرچہ کوئی مخالف اس قوت واستعداد سے جو اس کو کامل مقدار میں عطا ہوئی ہے، اس کی ناقدری کرکے فائدہ نہ اٹھائے

مگر سامان و وسائل و ذرائع جمع کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب اس میں فرشتوں کی جانب سے اس خیال کے اظہار کی گنجائش رہ گئی تھی کہ ٹھیک ہے، انسان کو پیدا کر دیا جائے اور ان کی اصلاح کی ذمہ داری ہمیں دے دی جائے۔ اس لئے اب اللہ تعالیٰ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آدمیوں کی اصلاح بھی آدمیوں سے ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ مصلح کے لئے علم کی ضرورت ہے اور جس خاص علم کی ضرورت ہے، وہ ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے۔ اگلی آیت میں اسی امر کا بیان ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۞

ترجمہ: اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو سب چیزوں کے اسماء کا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے عرض کیا: آپ تو پاک ہیں، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو کچھ ہم کو آپ نے علم دیا، بے شک آپ بڑے علم والے ہیں، حکمت والے ہیں۔

تفسیر: اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو (پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا علم دے دیا (ان چیزوں کے خواص و آثار سمیت، روئے زمین کے تمام موجودات کے ناموں اور خواص کا علم دے دیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں اور فرمایا کہ اگر تم (اپنے اس خیال و گمان میں) سچے ہو (کہ ہم طبیعتوں کی اصلاح اور شرائع و قوانین کے نفاذ و انتظام کی خدمت انجام دے سکیں گے جس کے لئے نائب و خلیفہ کی تجویز ہو رہی ہے) تو مجھے ان چیزوں کے اسماء (ان کے آثار و خواص سمیت) بتا دو۔

اس علم کی تحقیق و تعیین جس پر انسان کی اصلاح موقوف ہے اور اس علم کی انسان کے ساتھ تخصیص:

اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ ہر منتظم اور مصلح کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس چیز کا انتظام اور اصلاح کرنا چاہتا ہے، اس کی اصل و حقیقت اور اس کے ہر قسم کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف اور اس کا ماہر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حاکم اپنی رعایا کی عادات اور رسوم و مزاج اور مصلحتوں اور مضرتوں سے واقف نہ ہو تو اس کے ذریعہ انتظام کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب یہاں اللہ کے خلیفہ کو طبیعتوں کی اصلاح کا کام کرنا پڑے گا تو لازمی طور پر طبیعتوں کی کیفیتوں اور خصوصیتوں اور ان کے تغیر و تبدل سے اسے پوری طرح آگاہ ہونا چاہئے۔ یہ تو باطنی انتظام ہوا۔ رہا شریعت کا ظاہری انتظام کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے تو اس کے لئے بھی ان چیزوں کے بہت سے حالات و خواص اور منافع و مضرتوں کے علم کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً نشہ کی چیز حرام ہے، لیکن جو شخص نشہ کی حقیقت اور اس کے آثار کو نہیں جانتا، اگر اس کے سامنے کوئی شراب پی کر بدمست بھی ہو جائے تو بھی وہ اس کو زجر و توبیخ، تنبیہ اور نہی عن المنکر (ڈانٹ ڈپٹ اور برائی سے روکنے کا عمل) نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے نشہ ہی نہیں ہوا۔ اور یہ شخص اس کے دعوی کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کے برخلاف

جو شخص جانتا ہو کہ نشہ دار چیز کی کیا خاصیت ہوتی ہے، اور اس کے پینے سے کیا حالت ہو جاتی ہے، وہ شخص اس پر حجت اور دلیل قائم کر سکتا ہے اور اس کا احتساب کر سکتا ہے۔ یا مثلاً جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، رسول مقبول ﷺ نے ابتدا میں ان میں شربت رکھنے سے بھی منع فرما دیا، کیونکہ آپ طبیعتوں کے بارے میں جانتے تھے کہ بہت سے چالاک لوگ شربت کے بہانے سے شراب پینے لگیں گے۔ پھر جب آپ کو اطمینان ہو گیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں اس سے نفرت بیٹھ گئی ہے تو آپ نے اجازت دے دی۔ اگر آپ طبیعتوں کے ان خواص سے واقف نہ ہوتے تو یہ خاص احکام ہرگز صادر نہیں فرما سکتے تھے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مصلح کو اس جماعت کے متعلقہ احوال سے پوری واقفیت ہونی لازمی ہے۔ اسی طرح لغات ومحاورات کے تغیر وتبدل سے احکام میں فرق آجاتا ہے، جن سے واقفیت کے لئے ان سے اختلاط کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ احوال بشریہ سے جس طرح بشر واقف ہو سکتا ہے، ملائکہ یا جن ان سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتے۔ ملائکہ تو اس لئے کہ وہ خود متغیر ہونے والی طبیعتوں سے پاک ومنزہ ہیں، وہ اس کے انقلاب سے کیونکر واقف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جب فرشتوں کو بھوک نہیں لگتی تو وہ بھوک کی حقیقت وخاصیت کو کیسے جان سکتے ہیں؟ رہ گئے جن تو گو وہ طبیعت متغیرہ رکھتے ہیں، مگر چونکہ ان کی طبیعتوں میں شر غالب ہے، اس لئے انسان میں جو قوتیں خیر کو جذب کرنے والی ہیں، جنات ان کی کشش سے انسان کے برابر ماہر نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں وہ ان قوتوں کی تعدیل وتربیت اور ترقی کا کام کرنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے انسان کی کامل اصلاح انسان ہی کر سکتا ہے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ اگر ہر انسان کی اصلاح کے لئے طبیعتوں کے فقدان کی وجہ سے ملائکہ کافی نہیں تو وحی لانے کا کام ان سے متعلق کیوں کیا گیا کہ وحی تو اصلاح کا مبدا ہے؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جس طرح اصلاح کے لئے طبیعتوں کے اختلاف کی وجہ سے جنات کافی نہیں۔ اسی طرح انسان، جنات کی اصلاح کے لئے کیسے کافی ہوگا، کیونکہ طبیعتوں کا اختلاف تو یہاں بھی موجود ہے۔

انسان کی اصلاح میں ملائکہ کے دخل کا جواب:

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ علم خاص یعنی مذکورہ بالا مہارت تامہ اس مصلح کے لئے ضروری ہے جو اتالیق کی حیثیت رکھتا ہو، جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ امتوں کی اصلاح وتربیت کی خصوصیات ان کی رائے واجتہاد پر مبنی کی گئی ہیں اور ملائکہ علیہم السلام کی شان محض سفارت کی ہے کہ ایک متعین عبارت یا مضمون انبیاء علیہم السلام کو پہنچا دیا۔ اس کام میں اس مہارت کی ضرورت نہیں۔

جنات کی اصلاح میں انسان کا کافی ہونا:

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ انسان اور جنات میں شر کے غلبہ کی قوت تو مشترک ہے، صرف خیر کی قوت کے غلبہ میں

فرق ہے۔اس لئے جنات کی طبیعت کے آثار سے انسان ناواقف نہیں ہے، وہ ان کی تربیت کرسکتا ہے۔

ملائکہ کو اصلاح کا علم دیدیا جاتا تو وہ خلافت کے لئے کافی ہوجاتے:

اگر یہاں کسی کو خلجان ہو کہ جس طرح آدم علیہ السلام کو تعلیم فرمادینے سے ان کو وہ علم خاص حاصل ہوگیا اور خلافت کی صلاحیت واہلیت حاصل ہوگئی، اگر ملائکہ کو تعلیم فرمادیتے تو انہیں بھی وہ علم اور اس کے ساتھ خلافت کی صلاحیت میسر ہوجاتی۔اس طرح آدم علیہ السلام پر اس کا ظاہر فرمانا اور فرشتوں سے پوشیدہ رکھنا آدم علیہ السلام کو ترجیح دینے کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔

اس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تو ہر چیز پر ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی عادت یوں ہی جاری ہے کہ اکثر حوادث کو اسباب اور شرائط کے ساتھ مربوط اور متعلق فرمایا ہے تو جس علم سے متعلق یہاں بحث ہورہی ہے، اس کے حصول کے لئے ایک خاص استعداد کی ضرورت ہے۔جیسا کہ ہر علم میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جماع کی لذت کے لئے استعداد رجولیت (قوت مردانہ) شرط ہے۔مادرزاد نامرد کو اس لذت کا علم حاصل ہونا عادۃً ممتنع ہے۔اسی طرح اس خاص علم کی استعداد آدمی میں تو پیدا کی گئی ہے، مگر ملائکہ میں پیدا نہیں کی گئی۔جیسا کہ اوپر اجمال کے ساتھ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ بشری طبیعتوں کے احوال کے ادراک کے لئے بشری طبیعتوں کا ہونا ضروری ہے جو بشر کا خاصہ ہے اور ملائکہ میں مفقود ہے، سو آدم علیہ السلام کی تعلیم کے وقت اس علم کے ملائکہ سے پوشیدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل ہے۔جب ان میں اس علم کی استعداد ہی نہیں تو اگر تعلیم آدم کے وقت وہ اول سے آخر تک حاضر بھی رہے ہوں تو انہیں اس کا حاصل ہونا پھر بھی ممکن نہیں ہے۔اگر کسی طالب علم کو اقلیدس کی کوئی شکل سمجھائی جائے اور اس وقت عام مجمع ہو تو بھی جن لوگوں کو اس فن سے مناسبت نہیں، وہ اس تقریر سے کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

اصلاحکی استعداد ملائکہ کو کیوں نہیں عطا فرمائی؟

اگر یہ کہا جائے کہ پھر وہ استعداد جو خاص اس علم کے حصول کے لئے شرط ہے، فرشتوں کو کیوں نہ دے دی؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ استعداد بشر کا خاصہ ہے، اگر ملائکہ میں وہ استعداد پیدا کردی جاتی تو فرشتے، فرشتے نہ رہتے۔جیسے حس وحرکت حیوان کا خاصہ ہے۔ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ جمادات میں یہ صفت پیدا کردیں، لیکن اس صورت میں وہ جماد نہ رہے گا۔حیوان ہوجائے گا، گویا اس سوال کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو انسان کیوں نہ بنادیا۔تو ظاہر ہے یہ سوال بالکل بے معنی ہے اور اس کا جواب صاف ہے کہ جو حکمت ملائکہ کی تخلیق میں ہے، اس صورت میں وہ معطل ہوجاتی، اس سے ثابت ہوگیا کہ فرشتے، فرشتے رہ کر اس علم کو حاصل نہیں کرسکتے۔چنانچہ فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو (اس الزام سے) پاک ہیں (کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرمادیا اور ہم سے پوشیدہ رکھا۔آپ کی طرف سے تو

کوئی دریغ یا اخفا نہیں ہوا، مگر ہمیں اس کے سوا علم نہیں جو آپ نے ہمیں دیا (یعنی جس قدر ہماری پیدائش میں استعداد رکھی ہے اور اس کے مطابق ہمیں علم عنایت ہوا، اس کے سوا ہمیں دوسرے علم کو سمجھنے کی قوت نہیں ہے) بے شک آپ بڑے علم والے ہیں (کہ آپ کو سب علوم حاضر ہیں، ہماری اور آدمیوں کی معلومات سب حضور پر منکشف ہیں) حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت ہوئی، اسے اس قدر فہم وعلم عطا فرمایا)

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

ترجمہ: حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم ان کو ان چیزوں کے اسماء بتلادو، سو جب بتلادیے ان کو آدم نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا: میں تم سے کہتا نہ تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمین کی، اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کردیتے ہو اور جس بات کو دل میں رکھتے ہو۔

ربط وتفسیر: اس گفتگو سے فرشتوں کو اپنے عاجز ہونے کا تو مشاہدہ ہوگیا اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی قوت ومناسبت کا ہونا بھی ملائکہ عیاناً دیکھ لیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے آدم! تم ان کو ان چیزوں کے اسماء (مع حالات کے) بتادو۔

ملائکہ میں اس علم کی استعداد نہیں تھی تو ان کو اسماء کی تفصیلات بتانے کا کیا فائدہ؟

یہاں یہ خلجان نہیں ہونا چاہئے کہ جب ملائکہ میں خاص اس علم کی مناسبت ہی نہ تھی تو بتانے سے کیا فائدہ؟ اگر بتانے سے وہ کچھ سمجھ سکتے ہیں تو یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ انہیں اس سے مناسبت نہیں تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات خود تو آدمی ایک علم کو نہیں سمجھتا، مگر دوسرے کو تقریر کرتے ہوئے دیکھ کر موقع محل کے قرائن سے یہ یقیناً سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس علم میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ مثلاً استاذ نے دو طالب علموں کے سامنے کسی دقیق مشکل مسئلہ کی تقریر کی۔ پھر دونوں کا امتحان لیا، ان میں سے ایک بیان نہ کرسکا، جبکہ دوسرے نے فرفر تقریر شروع کردی۔ ممکن ہے کہ دوسرا طالب علم باوجودیکہ اب بھی اس مسئلہ کو نہ سمجھ سکا ہو، مگر اس کی برجستگی اور بیان کرنے کے انداز سے یہ یقیناً سمجھ سکتا ہے کہ واقعی یہ اس مسئلہ کو خوب سمجھ گیا ہے۔ تو 'بتادو' کے معنی یہ نہیں کہ ان کے ذہن نشین کرادو، انہیں سمجھادو، بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے سامنے اس کا اظہار اور بیان کردو۔ اگرچہ وہ مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو سمجھ نہ سکیں گے۔ اب یہ خلجان جاتا رہا کہ اگر مناسبت نہیں تھی تو بتانے سے کیا فائدہ؟ ہم بھی کہیں گے کہ مناسبت تو نہ تھی، لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ملائکہ اس قدر سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام ضرور اس علم کے ماہر ہوگئے ہیں۔

اور جب انہیں آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء بتادیے تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں نے تم سے کہا نہ تھا

کہ میں آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ ہر شخص کے حالات انہی دو میں منحصر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام حالات آفاقی اور انفسی سے باخبر ہوں۔ یہ مضمون ﴿ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ کی تفصیل ہے۔ وہاں اور الفاظ تھے، یہاں اور ہیں۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

آگے سے ربط: جب دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ خلافت کی صلاحیت کے لئے علوم کی ضرورت ہے اور وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، جبکہ ملائکہ کو ان میں سے صرف بعض علوم حاصل ہیں اور جنات کو تو ان علوم کا بہت ہی کم حصہ حاصل ہے جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو انسان کا شرف دونوں گروہوں (ملائکہ اور جنات) پر ظاہر ہو گیا۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس پوشیدہ حقیقت کو عملی جامہ پہنایا جائے اور ملائکہ اور جنات سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جائے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری (جو خوبیاں وہ سب رکھتے ہیں تم اکیلے ساری رکھتے ہو) کے مصداق ہیں اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جنات کے علوم وقویٰ کے جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر اوپر ذکر ہوا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، اسی لئے تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں۔ اور گویا بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں، وہ ان کے اندر یکجا ہیں۔ اس لئے جو عملِ تعظیمی تجویز فرمایا گیا، آگے اس کی حکایت بیان فرماتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے، اُس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا وہ کافروں میں سے۔

تفسیر: اور جس وقت ہم نے فرشتوں کو (اور جنات کو بھی جیسا کہ روایات میں آیا ہے، مگر غالباً فرشتوں کو بلا واسطہ حکم کیا ہوگا اور جنات کو کسی فرشتہ وغیرہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر کہا گیا ہوگا۔ اور قرآن مجید میں ابلیس کے سوا دوسرے جنات کے سجدہ کے لئے مامور ہونے کے ذکر کا اہتمام شاید اس لئے نہ کیا گیا ہو کہ اہل عقل سمجھ ہی جائیں گے کہ جب فرشتے جیسے مقربین سے آدم علیہ السلام کی تعظیم کرائی گئی تو جنات جو ان کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے، اس تعظیم کے مکلف کیوں نہیں ہوئے ہوں گے۔ غرض ان سب کو یہ حکم ہوا) کہ آدم کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ سب سجدے میں گر پڑے، سوائے ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

فائدہ: اس کے بارے میں کفر کا فتویٰ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس نے حکم الٰہی کے مقابلہ میں تکبر کیا اور حکم الٰہی کو قبول کرنے میں شرم و عار سمجھی اور اس کو حکمت اور مصلحت کے خلاف قرار دیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کا قول مذکور ہے کہ

یری اصل آگ ہے اور آدم کی اصل مٹی ہے، اس لئے میں اس سے افضل ہوں اور افضل سے غیر افضل کی تعظیم کرانا نامناسب ہے۔

مسئلہ: جو شخص اس طرح حکم شرعی کو رد کرے یا اس کا انکار کرے، وہ کافر ہے۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں، پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے، ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

تفسیر: اور ہم نے حکم دیا کہ تم اور تمہاری بیوی (حوا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا) جنت میں رہا کرو۔ پھر دونوں اس میں سے جس جگہ سے چاہو بہ فراغت کھاؤ۔ اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

فائدہ: یہ بات اللہ ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ وہ درخت کیا تھا، ہمارے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ نے اس کے کھانے سے منع فرما دیا جیسا کہ ہر آقا کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے گھر کی چیزوں میں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دے دے اور جس چیز سے چاہے منع کر دے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

ترجمہ: پھر لغزش دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے، سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے، اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے، اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ہے ایک میعاد معین تک۔

تفسیر: شیطان سجدے سے انکار کے جرم میں ملعون و مردود ہو چکا تھا، اور ملائکہ کی جماعت سے نکال دیا گیا تھا، اور چونکہ اس کو یہ زخم آدم علیہ السلام کی وجہ سے پہنچا تھا، اس لئے ان کا جانی دشمن ہو گیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ میں تو یوں مردود کیا گیا، اور ان کا یوں اعزاز کیا گیا تو وہ اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح آدم اور ان کی بیوی کو جنت کے عیش و عشرت سے محروم کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ نے بھی آدم علیہ السلام کو اس کی عداوت اور ایذا رسانی کی سوچ سے آگاہ فرما دیا تھا، غرض وہ آدم علیہ السلام کے پیچھے پڑا اور جس طرح بھی بن پڑا ان کو بہکانا شروع کیا۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کو کس طرح بہکایا؟

اس نے آدم وحوا علیہما السلام سے کہا: اصل میں اس درخت کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے کھانے سے ابدی حیات یا مَلَکِیَّتْ حاصل ہوجاتی ہے، مگر جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو منع کیا تھا اس وقت تمہاری حالت کے مناسب یہی تھا کہ ملکیت یا خلود کا کوئی سبب اختیار نہ کیا جائے، کیونکہ اس وقت تمہاری استعداد ضعیف تھی، اور ضعیف المعدہ کو قوی غذا سے منع کیا ہی کرتے ہیں، اب ماشاء اللہ تمہاری استعداد کمالِ قوت کو پہنچ گئی ہے، اس حالت کے لئے ممانعت نہیں، کیونکہ جب علت نہیں رہتی تو معلول بھی نہیں رہتا، جیسے معدے کی کمزوری رفع ہوجانے کے بعد سابقہ ممانعت باقی نہیں رہتی۔ پھر وہ معلون اس بات پر قسم کھا گیا، پس چونکہ تاویل (بات) بڑی نمکین تھی، اور اللہ تعالیٰ کا نام سن کر تو محبت والے گھل ہی جاتے ہیں، پھر لالچ دلایا حیاتِ ابدی اور ملکیت کا، جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اور نور علی نور ہوگیا، اور سبزہ آغاز چہرہ سامنے آیا، اور ممکن ہے اس ظالم کو پہچانا بھی نہ ہو، وہ بہروپیے کی طرح کسی نئی شکل میں سامنے آیا ہو، یا یہ بات ذہن میں آئی ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو دشمن بھی خیر کا سبب بن جاتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ اس کو دیکھو جو کہا گیا، اور اس کو مت دیکھو کہ کس نے کہا، اس مثل کو دستور العمل بنا کر اس درخت کو کھالیا (اس وجہ کا حاصل یہ ہے کہ شیطان آدم علیہ السلام سے ملا ہے، اور گفتگو کی ہے)

(دوسری وجہ:) اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے بغیر سامنے آئے، اور بغیر ملے ہی، اپنی جناتی طاقت سے مسمریزم والوں کی طرح دور ہی سے اثر ڈالا ہو، جیسا کہ تفسیر کبیر میں حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے، جس سے آدم علیہ السلام کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہو کہ یہ ایک اچھی رائے ہے، اور یہ خدشہ ذہن میں نہیں آیا کہ یہ خیال کسی بدخواہ کا پہنچایا ہوا اثر ہوسکتا ہے (اس وجہ کا حاصل یہ ہے کہ شیطان نے ملے بغیر دور سے اثر ڈالا)

غرض: اسباب ایسے جمع ہوگئے کہ اس درخت کے کھانے کو اس وقت ممانعت کے دائرے سے خارج سمجھ لیا گیا، لغزش کی درحقیقت یہ وجہ تھی، اب بفضلہٖ تعالیٰ اس تقریر کی بناء پر اس معاملہ میں کوئی عقلی ونقلی اشکال باقی نہ رہا۔

دوسری وجہ پر ردوقدح اور حضرت قدس سرہٗ کی تاویل

[ف۲ کی تسہیل جناب مفتی محمد نعمان صاحب سیتاپوری زید مجدہٗ (مفتی دارالعلوم دیوبند) نے کی ہے]

(۱) فائدہ: نمبر ایک اور فائدہ نمبر دو کے لکھنے میں وقفہ معلوم ہوتا ہے، یعنی: حضرت مولانا تھانویؒ نے فائدہ نمبر ایک لکھ کر بعض احباب کو دکھایا تو انھوں نے وہ کلام پیش کیا جو فائدہ نمبر دو میں نقل کیا ہے۔

(۲) بعض احباب کا کلام: عربی میں ہے، اور وہ کیف لافاھما تک مکمل ہوگیا ہے۔

(۳) ''یعنی'' سے حضرت تھانویؒ نے بعض احباب کے کلام کا خلاصہ پیش فرمایا ہے۔

(۴) ''میں کہتا ہوں'' الخ سے حضرت نے بعض احباب کے اعتراض کو تسلیم کیا ہے، پھر علمی انداز میں اسے مزید مدلل کیا ہے، پھر فرمایا کہ ترک ظاہر کی متعدد وجوہ ہوسکتی ہیں؛ لیکن وہ سب قابل اعتراض ہیں؛ اس لئے یہ احتمال کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔

ترک ظاہر کی پہلی وجہ: لفظ وسوسہ ہے جو سورۃ الاعراف میں ہے۔

اس پر اعتراض یہ ہے کہ لغت میں وسوسہ دل میں برا خیال ڈالنے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اگر زبانی گفتگو کے ذریعہ کسی کو گمراہ کیا جائے تو اسے بھی وسوسہ کہتے ہیں۔

اور ترک ظاہر کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ترتیب قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے سجدے کا واقعہ دخولِ جنت سے پہلے کا ہے، اسی لئے ﴿ اسْكُنْ ﴾ الخ کا امر بعد میں وارد ہوا ہے۔ اور جب سجدے کا واقعہ دخولِ جنت سے پہلے کا ہے تو ﴿ اخْرُجْ مِنْهَا ﴾ کی ضمیر غائب کا مرجع سماء (آسمان) ہوگا، پس جب ابلیس آسمان سے نکال دیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے تو دونوں کی ملاقات کیسے ہوسکتی ہے؟ اس لئے ﴿ قَاسَمَهُمَآ ﴾ کا ظاہر (ملاقات اور زبانی گفتگو) مراد نہیں لیا جاسکتا۔

اور اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ترتیب ذکری، ترتیب وقوعی کو مستلزم نہیں، یعنی: محض ترتیب کی بنا پر یہ کہنا کہ سجدے کا واقعہ جنت سے باہر آسمان میں پیش آیا محتاج دلیل ہے؛ بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ سب جنت میں پیش آیا اور ابلیس بھی اس وقت جنت میں تھا اور ﴿ اخْرُجْ مِنْهَا ﴾ کی ضمیر غائب کا مرجع جنت ہے، یعنی: سجدہ نہ کرنے پر اسے جنت سے نکالا گیا۔ اور دونوں کی ملاقات و مکالمت اس طور پر ہوئی ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام سیر کرنے کے لئے جنت سے باہر آئے ہوں اور شیطان سے ملاقات و مکالمت ہوئی ہو یا حضرت آدم علیہ السلام جنت کے دروازے پر ہوں اور ابلیس باہر رہ کر بات چیت کر رہا ہو۔

اور ترک ظاہر کی تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ واقعہ سجدہ کے بعد ﴿ اسْكُنْ ﴾ الخ کا امر آیا ہے، اس کا متبادر معنی احداث سکنی ہے نہ کہ ابقاء سکنی، یعنی: سجدے کا واقعہ دخولِ جنت سے پہلے کا ہے اور یہ جنت میں نہیں، بلکہ آسمان میں پیش آیا اور شیطان کو آسمان سے باہر کیا گیا؛ اس لئے ﴿ قَاسَمَهُمَآ ﴾ کا ظاہر مراد لینا مشکل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿ اسْكُنْ ﴾ کی دلالت احداث سکنی پر قطعی نہیں ہے، ابقاء سکنی بھی اس کا مدلول ہوسکتا ہے۔
(اس لئے یہ دوسرا احتمال کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے، پہلی توجیہ ہی صحیح ہے)

مابعد سے ربط: بہر حال درخت یا اس کے پھل کا کھانا تھا کہ سب عیش و آرام رخصت ہوگیا۔ اوپر سے جنت سے باہر آنے کا حکم ہوگیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ ﴾

ترجمہ: اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔

تفسیر: یعنی ایک سزا تو ظاہری ہوئی کہ یہاں سے نکلو اور زمین پر جاؤ اور دوسری سزا باطنی ہے کہ تم میں باہمی دشمنیاں بھی رہیں گی۔ جس سے زندگی کا لطف بہت کچھ کم ہو جائے گا۔ اگر شیطان اس وقت تک زمین پر نہیں آیا تھا، جیسا کہ کسی نوکر کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے مگر جو آقا کریم ہوتے ہیں، وہ اس کا بوریہ بستر فوراً ہی نکلوا کر نہیں پھنکوا دیا کرتے، آہستہ آہستہ نکال دیتے ہیں۔ تب تو اس خطاب میں وہ بھی داخل ہے، جبکہ آدم اور حوا کا خطاب میں شامل ہونا ظاہری ہے۔ اور اگر ابلیس زمین پر آ چکا تھا تو یہ خطاب آدم وحوا سے مع ان کی اولاد کے ہے، چونکہ ان کی اولاد ہونے والی تھی ہی، اس لئے آدم وحوا کو سنانا مقصود ہے کہ تمہاری اولاد میں بھی کبھی کبھی آپس میں دشمنی ہو جایا کرے گی۔ چونکہ اولاد کی نااتفاقی سے فطری طور پر والدین کو لازمی طور پر صدمہ ہوتا ہے، اس لئے انہیں یہ بات سنانا اس وقت کی حالت کا مقتضی تھا۔

لغزش میں مبتلا کئے جانے پر عتاب کی توجیہ:

اگر کسی کو خلجان ہو کہ جو خطا تاویل سے ہوتی ہے، وہ اس قدر دار و گیر کے قابل نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر فہم وسمجھ، خصوصیت اور لگاؤ زیادہ ہوتے ہیں، اس پر ملامت زیادہ ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: **حسنات الأبرار سيئات المقربين**: نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں اور غلطیاں قرار پاتی ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تم نے زیادہ توجہ اور دھیان سے کام نہیں کیا؟ تو یہ دار و گیر آدم علیہ السلام کے کمال اور ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: تمہیں زمین پر ایک میعاد معین تک ٹھہرنا اور کام چلانا ہے، یعنی وہاں بھی جا کر دوام نہ ملے گا۔ کچھ مدت کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آگے سے ربط: آدم علیہ السلام نے یہ خطاب وعتاب کہاں سنے تھے۔ وہ ایسے سخت دل بھی نہ تھے کہ یہ سن کر یونہی اڑا دیتے۔ بے چین ہو گئے اور فوراً عفو ودرگزر کے لئے التجا کرنے لگے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ: بعد ازاں حاصل کر لئے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بیشک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے، بڑے مہربان۔

تفسیر: چنانچہ ارشاد ہے: اس کے بعد آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ حاصل کر لئے، یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے اور ایسے موقع پر جب خطاوار اپنی خطا پر سخت نادم وبے چین ہو معذرت

کے کلمات کی تلقین کر دینے کا عمل وطریقہ دنیا میں رائج ہے۔ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ ملازم اپنی غلطی پر نادم ہو کر منہ بنا کر سامنے آ کر ہاتھ جوڑ کر گردن جھکا کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے اور ہیبت وشرمندگی وندامت کے مارے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے۔ ڈرتا ہے کہ کہیں منہ سے کوئی ایسی بے تمیزی کی بات نہ نکل جائے جس سے اور زیادہ عتاب ہونے لگے۔ یا اس غلطی کو اتنی بڑی سمجھتا ہے کہ اس کے لئے معذرت کے الفاظ نہیں ملتے۔ اس وقت آقا کا کرم جوش مارتا ہے، وہ مہربان ہو کر کہتا ہے کہ کچھ منہ سے تو بول، کیا چاہتا ہے؟ جب پھر بھی کچھ نہیں کہتا تو کہتے ہیں: اچھا عہد کر کہ پھر ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ وہ اس تلقین کے مطابق وہی الفاظ دہراتا ہے تب کہہ دیتے ہیں، جا معاف کیا، پھر ایسی کوئی غلطی مت کرنا۔ اسی طرح یہاں آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود اس معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے وہ کلمات کہے تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، یعنی توبہ قبول کر لی۔ ''بیشک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے، بڑے مہربان''

فائدہ: حضرت حوا کی توبہ کا ذکر سورۂ اعراف میں ہے: ﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ﴾: ان دونوں نے کہا: ''اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا'' اس طرح وہ بھی توبہ میں اور اس کی قبولیت میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک ہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ: ہم نے حکم دیا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہونگے۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہونگے دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

توبہ قبول ہونے کے بعد زمین میں رہنے کی حکمت:

چونکہ ان کے روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں: حدود قائم کرنا اور احکام شرعیہ کا اجرا وغیرہ مضمر تھیں جیسا کہ تخلیق سے قبل ہی فرما دیا گیا تھا: ﴿ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' انہیں خلافت کی ذمہ داریاں زمین ہی میں انجام دینی تھیں، اس لئے معاف فرمانے کے بعد بھی ہبوط (زمین میں اترنے) کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا۔

آگے سے ربط: البتہ طرز اور لہجہ بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ (اور عتابانہ) انداز میں تھا اور دوسرا حکم حکیمانہ (و مشفقانہ) طریقہ سے دیا گیا تھا۔ ارشاد ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ: ہم نے حکم فرمایا کہ سب کے سب جنت سے نیچے جاؤ پھر تمہارے پاس میری طرف سے جو بھی ہدایت آئے گی جو شخص میری اس ہدایت پر عمل کرے گا۔ اس کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ہی ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

تفسیر: یعنی قیامت کے دن انہیں یہ ثمرہ ملے گا۔ یہاں یہ خلجان نہ ہو کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز بڑے بڑے مقبول و مقرب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ خوف میں مبتلا نہ ہوں گے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ انہیں کوئی خوف و اندیشہ نہ ہوگا۔ یعنی عملاً انہیں کوئی خوفناک واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ خواہ خود اپنے دل میں کتنے ہی ڈرتے ہوں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کا مقدمہ کسی حاکم کے اجلاس یا کورٹ میں ہو اور قانون داں وکیل کہے کہ اس مقدمہ میں کوئی خطرہ و اندیشہ نہیں ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس شخص پر کوئی آفت آنے والی نہیں ہے جس کا کوئی اندیشہ ہو۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہوتا کہ خود اس کے دل میں طبعی خوف بھی نہیں ہے۔ اور چونکہ ان پر کوئی آفت واقع نہیں ہوگی، اس لئے حزن و غم کی مطلقاً نفی فرمادی۔ کیونکہ حزن اس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی مضرت کے واقع ہونے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف خوف کے کہ یہ ہمیشہ واقع ہونے سے پہلے ہوتا ہے، خواہ واقع کبھی بھی نہ ہو۔ اس طرح یہ ان لوگوں کا حال ہوگا جو ہدایت کی پیروی کرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہوں گے۔

آگے سے ربط: اب ان کے مدمقابل آنے والوں کا حال بیان فرماتے ہیں:

ع ۴

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہمارے احکام کی تکذیب کریں گے وہ دوزخ والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ۝

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! یاد کرو تم لوگ میرے ان احسانوں کو جو کیے ہیں میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے عہد کو، پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

ربط: یہاں تک عام معنوی نعمتوں کا بیان تھا جس کے ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے۔ آگے نعمت خاصہ کا بیان ہے جو خاص اس وقت کے علماء کو عطا ہوئی تھی۔ عرب کے مشرکوں میں تو اہل علم تھے نہیں۔ البتہ اہل کتاب میں پڑھے لکھے لوگ موجود تھے۔ ان میں بھی بنی اسرائیل کی کثرت تھی، جن پر پشت ہا پشت سے انعام واحسان

ہوتے آئے تھے، اور ان کو حسب ونسب وریاست وپیرزادگی سب طرح کا فخر وامتیاز حاصل تھا۔ اس لئے اب بنی اسرائیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انہیں وہ نعمتیں یاد دلاتے ہیں تاکہ وہ شرما کر ایمان لے آئیں۔ اور چونکہ یہ اہل علم تھے، ان کے ایمان لانے سے دوسرے عوام پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس لئے ان نعمتوں کو اولاً اجمال کے ساتھ یاد دلاتے ہیں، پھر اگلے رکوع سے تفصیل کے ساتھ پارہ کے ختم کے قریب تک ان کا ذکر چلے گا اور انعامات کی فہرست کے خاتمہ پر بھی اس قسم کی عبارت ہوگی، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو مقصود اعظم ہوتا ہے، کلام کو شروع بھی اس سے کیا کرتے ہیں اور دلائل وغیرہ قائم کر کے پھر نتیجہ کے طور پر اس کو ختم پر بھی لایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

بنی اسرائیل کو دی گئی نعمتوں کی یاد دہانی:

اے بنی اسرائیل! (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہ حضرت یعقوب کو اسرائیل کہا جاتا ہے) تم لوگ میرے ان احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے ہیں (تاکہ ایمان لانا جو اس نعمت کا حق ادا کرنا ہے۔ آسان ہو جائے۔ آگے اس یاد کرنے کی مراد بتاتے ہیں) اور تم میرے عہد کو پورا کرو (یعنی تم نے جو توریت کے بارے میں مجھ سے عہد کیا تھا، جس کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾: ''اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے اور اللہ تعالیٰ نے یوں فرمادیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، بشرطیکہ تم نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور میرے سب رسولوں پر ایمان لاتے رہو اور ان کی مدد کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر قرض دیتے رہو'' (المائدہ: ۱۲) اور میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا یعنی میں نے تم سے ایمان لانے کی شرط پر جو عہد کیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝۱۲ ﴾: ''میں تمہارے گناہ تم سے ضرور دور کردوں گا اور ضرور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بیشک راہِ راست سے دور جا پڑا (المائدہ: ۱۲) اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔

یعنی اپنے معتقد عوام الناس سے مت ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا تو ان سے ہونے والی آمدنی بند ہو جائے گی۔ آگے اس عہد کے وفا ہونے کا مطلب صاف لفظوں میں بیان فرماتے ہیں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کے کتابِ الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے) اور مت لو مقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر کو اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو۔ اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو جس حالت میں کہ تم جانتے ہو۔

کفر اور دین فروشی کی ممانعت:

اور اس کتاب پر ایمان لے آؤ، (یعنی قرآن مجید پر) اور تمہیں تو اس سے وحشت نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ میں نے اسے ایسی حالت میں نازل کیا ہے کہ وہ اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، سچ بتانے والی اور اس کی تصدیق کرنے والی ہے۔ یعنی توریت کے کتابِ الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بکثرت اس قسم کی آیتیں موجود ہیں: ''ہم ایمان لے آئے اس پر جو ہماری طرف اور تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ ﴿ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی ﴾ اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تمہاری طرف نازل کیا گیا اور تم سے پہلے بھی جو نازل کیا گیا۔ ہاں! جس قدر اس میں تحریف ورد و بدل ہوگئی ہے وہ خود توریت اور انجیل ہونے ہی سے خارج ہے۔ اور تم اس قرآن کے بارے میں سب سے پہلے انکار کرنے والے مت بنو (کہ تمہاری دیکھا دیکھی جتنے لوگ انکار کرتے جائیں گے، ان سب میں اول وبانی تم ہوگے تو قیامت تک کے انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں بھی درج ہوتا رہے گا) اور میرے احکام کے مقابلہ میں حقیر معاوضہ مت لو اور خاص مجھ سے ہی پوری طرح ڈرو۔ یعنی میرے احکام چھوڑ کر اور ان کو بدل کر اور چھپا کر عوام الناس سے دنیائے ذلیل وقلیل وصول مت کرو جیسا کہ ان کی عادت تھی۔

چنانچہ آگے تصریح فرماتے ہیں: ﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾: اور حق کو ناحق کے ساتھ خلط ملط مت کرو۔ اور جانتے بوجھتے حق کو چھپاؤ بھی مت۔

یعنی کہ یہ بری بات ہے خود غرض لوگ احکام شرعیہ میں تبدیلی دو طرح سے کیا کرتے تھے، ایک یہ کہ اگر قابو چلا تو اس کو ظاہر ہی نہ ہونے دیا، یہ کتمان ہے۔ اور اگر ان کے چھپانے سے نہ چھپ سکا، ظاہر ہو ہی گیا تو پھر اس میں خلط ملط کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں کاتب کا سہو قرار دے دیا، کہیں مجاز کا بہانہ پیش کر دیا، کہیں محذوف ومقدر نکال دیا، یہ تلبیس ہے۔ حق تعالیٰ نے دونوں سے منع کر دیا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

ترجمہ: اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ۔

ربط: یہاں تک تو ایمان لانے اور کفر کی باتیں چھوڑنے کا حکم تھا، جو کہ من جملہ اصول کے ہے۔ اب بعض عظیم الشان اسلامی فروع کا حکم فرماتے ہیں، تاکہ سب کے مجموعہ سے اسلام کی تکمیل کا مقصود و مامور بہ ہونا حاصل ہو جائے۔

فروعی عبادات کا حکم:

فروع اسلامی یعنی اعمال کی دو قسمیں ہیں: اعمالِ ظاہری اور اعمالِ باطنی۔ پھر اعمالِ ظاہری کی دو قسمیں ہیں: عبادتِ بدنی اور عبادتِ مالی۔ تو یہ تین کلیات ہوئیں۔ ان تینوں کلیات میں سے ایک ایک جزئی کا ذکر کر دیا۔ نماز، عبادتِ بدنی ہے، زکوٰۃ عبادتِ مالی ہے اور خشوع و خضوع عمل باطنی ہے، چونکہ تواضع باطنی میں اہل تواضع کی معیت کو بڑا دخل اور عظیم تاثیر ہے، اس لئے ﴿ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ کا اضافہ نہایت برمحل ہوا۔ یہ تینوں عمل عظیم الشان ہونے کے علاوہ بنی اسرائیل کی حالت کے بہت مناسب تھے۔ اس لئے ذکر میں ان کی تخصیص فرمائی، کیونکہ نماز سے ان کی حب جاہ کم ہوگی۔ زکوٰۃ سے حب مال گھٹے گی اور تواضع باطنی سے حسد وغیرہ میں کمی آئے گی۔ یہی امراض ان میں زیادہ تھے۔ چنانچہ ان کا مستقل علاج بھی آگے ان کو بتادیں گے۔ اس آیت میں ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ۝ ﴾ یہاں تک اسلامی اصول و فروع سب کی تاکید اور ترغیب دی گئی۔

آگے سے ربط: اب یہاں اس خیال کو رفع کرنے کے لئے جو کسی کے دماغ میں آرہا ہو کہ شاید رسولِ مقبول ﷺ کی نبوت اور رسالت کا ثبوت اور علم ہی نہ ہوا ہو، اس لئے کسی درجہ میں معذور قرار پاسکیں، ان لوگوں کے اس مسئلہ یعنی رسالت کے دعوی کی سچائی سے آگاہ ہونے کو ظاہر فرماتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ان علمائے بنی اسرائیل کے بعض قریبی لوگ اسلام قبول کر چکے تھے تو ان سے جب کبھی اس سلسلہ میں گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر ان سے یہی کہتے کہ بے شک حضور نور برحق پیغمبر ہیں، ہم لوگ تو کسی مصلحت کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کر سکتے، مگر تم اس مذہب کو مت چھوڑنا۔ اس سے صاف ثابت ہوا کہ یہ لوگ رسالت کے دعوی کی سچائی سے بخوبی واقف تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟

عالم بے عمل کو تنبیہ:

کیا غضب ہے کہ دوسرے لوگوں سے نیک کام کرنے کو کہتے ہو (یہاں نیک کام سے مراد رسولِ مقبول ﷺ پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ تم کتاب (یعنی توریت) کی تلاوت کرتے رہتے ہو (جس میں جابجا ایسے

عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں جو تلاوت کے وقت تمہاری نظروں سے گزرتی ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟ (کہ ہم بھی ان مذمتوں کے مصداق بنے جاتے ہیں)

فائدہ: اس سے یہ مسئلہ نہیں نکلتا کہ بے عمل کو واعظ بننا جائز نہیں، بلکہ یہ نکلتا ہے کہ واعظ کو بے عمل بننا جائز نہیں۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

آگے سے ربط: الغرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کے پاس ایمان نہ لانے کے سلسلہ میں کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ اور ایمان لانا بلاشبہ ان کے ذمہ واجب ہے۔ اب سمجھنا چاہئے کہ اگر چہ ان کے پاس کوئی قابلِ قبول عذر نہیں تھا۔ مگر دو خصلتیں انہیں ایمان نہیں لانے دیتی تھیں، ایک حب مال، دوسرے حب جاہ۔ اور انہی دونوں کی وجہ سے ان کے اندر حسد بھی پیدا ہوگیا تھا کہ انہیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اگر ہم نے رسولِ مقبول ﷺ کا اتباع اختیار کرلیا تو یہ آسان ہے، کیونکہ اس میں کوئی ضرر و نقصان نہیں ہے، مگر اس کے بعد اس پر ہمیشہ کے لئے قائم بھی رہنا پڑے گا تو یہ اس لئے مشکل ہے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ آمدنی اور قدر و منزلت و عزت تو سب جاتی رہے گی، خود آپ کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اور چونکہ مال اور جاہ کی محبت دلوں میں بیٹھ چکی تھی، اس لئے آپ کی فتوحات اور شوکت کی ترقی کو اپنے تنزل کا سبب سمجھ کر حسد کے مارے جلے مرتے تھے۔ اس طرح اصل مرض یہ دو تھے اور ان کی وجہ سے ایمان لانا دشوار ہو رہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس مشکل کے آسان ہونے کا طریقہ بتاتے ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ع

ترجمہ: مدد لو صبر اور نماز سے اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں، اور خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

مال و جاہ کی محبت کا علاج:

اور صبر اور نماز سے مدد لو (یعنی اگر تمہیں مال و جاہ کی محبت کے غلبہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو کہ صبر کی وجہ سے مال کی محبت گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے محبوب ہوتا ہے کہ یہ لذتوں، شہوتوں اور خواہشات کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب انہی کو ترک کرنے کا عزم کرلو گے تو مال بھی محبوب نہ رہے گا۔ اور نماز کی وجہ سے جاہ و مرتبہ، عزت و منزلت کی محبت کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ہر طرح کی پستی، عاجزی و انکساری اور خاکساری ہے، جب نماز کی عادت پختہ ہو جائے گی تو جاہ و منزلت کی محبت گھٹ جائے گی۔ یہی فساد کا مادہ تھا۔ اس کی اصلاح کے بعد

ایمان میں دشواری معلوم نہ ہوگی۔ یہ بھی سمجھ لو کہ صبر میں صرف بعض خواہشات وشہوات کو ترک کرنا پڑتا ہے اور نماز میں بہت سے افعال کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ عقلی وطبعی قاعدہ کی رو سے ترک (کسی کام یا چیز کا چھوڑنا) کے مقابلہ میں فعل (کسی کام کا کرنا) دشوار ہوتا ہے۔ خاص طور سے نماز کہ خیالات کے انتشار کی وجہ سے اس کی پابندیاں اور قیود بہت ہی گراں گزرتی ہیں، اس لئے صبر میں تو کچھ زیادہ مشقت ودشواری نہ ہوگی، البتہ نماز میں ضرور دشواری ہوگی۔ اور اس کو حب جاہ کا علاج قرار دیا ہے، مگر خود اس کی دشواری کا کیا علاج ہونا چاہئے؟

نماز میں دل لگانے کا آسان طریقہ:

اور بے شک نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع کا مادہ اور جذبہ ہوتا ہے، ان کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ اس میں نماز کے آسان ہونے اور دشوار نہ ہونے کی تدبیر بتادی، اس کے سبب کی تشخیص کر کے اس کے ازالہ کا طریقہ بتادیا جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے دشوار ہونے کے سبب کا پتہ لگانا اور اس کو سمجھنا چاہئے تو ظاہر ہے کہ انسان کا دل خیالات کی دنیا میں آزادانہ طور پر دوڑنے کا عادی ہے اور جسم کے اعضا اسی دل کے تابع ہیں تو وہ جوارح کی آزادی کا بھی متقاضی ہوتا ہے اور نماز میں پوری پوری پابندیاں اور قیدیں ہیں کہ نہ ہنسو، نہ بولو، نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ چلو، نہ پھرو وغیرہ وغیرہ۔ ان پابندیوں سے پہلے جوارح مقید ہوتے ہیں اور ان کی قید کا اثر قلب پر پڑتا ہے کہ وہ تنگ وپریشان ہوتا ہے۔

غرض اس گرانی ودشواری کی علت قلب کی حرکت ہے تو اس کا علاج، سکون کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ خشوع کو جس کی حقیقت سکونِ قلب ہے، آسانی کی علت فرمایا گیا۔ اور خود سکونِ قلب کی حقیقت، حرکتِ قلب کے مقابلہ سے معلوم ہوگئی۔ جب فکر یعنی سوچنا اس کی حرکت ہے تو قطع فکر (سوچ کی صورتوں اور راستوں) پر پابندی لگانا اس کا سکون ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہوگئی ہے کہ اگر مختلف قسم کے افکار ومتفرق خیالات کو کوئی شخص براہِ راست دل سے نکالنا چاہے تو یہ بڑی حد تک محال ہے۔ اس کی صرف ایک تدبیر ہے کہ چونکہ نفس ایک ہی وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، اس لئے اس کو اگر کسی ایک خیال میں مستغرق کردیا جائے تو دوسرے خیالات وافکار خود بخود فنا ہوجاتے ہیں۔ اس لئے خشوع کے بعد اس خیال کو بتاتے ہیں جس میں غرق ہوجانے کے بعد دوسرے خیالات دفع ودور ہوں اور ان کے دفع ہونے سے قلب کی حرکت کا سلسلہ ٹوٹ جائے۔ اور اس سے قلب کو سکون ہو اور اس سکون سے نماز میں آسانی ہو۔ اور اس میں آسانی ہونے سے اسے ہمیشہ ادا کیا جاسکے۔ اور اس کی ہمیشہ ادائیگی سے حب جاہ کم ہو۔ اور اس کی کمی سے ایمان پر ثابت قدم رہنے میں ہونے والی دشواریاں اور رکاوٹیں دور ہوں اور ان رکاوٹوں کے دور ہونے سے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ہو۔

سبحان اللہ کیا باقاعدہ ومرتب علاج اور مطب ہے۔ اس لئے اس خیال کی تعیین کی تعلیم فرماتے ہیں۔ خشوع کرنے

والے وہ لوگ ہیں جو اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیشک اپنے رب سے ملنے والے ہیں (تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا) اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں کی وجہ سے رغبت وہیبت پیدا ہوگی۔ کہ ہر خیال محمود میں غرق ہو جانا نیک کام کے لئے دلجمعی پیدا کر دیتا ہے۔ خاص طور سے رغبت اور ڈر وخوف کو تو نیک کام میں مستعد وسرگرم کر دینے کے لئے خاص طور پر دخل ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ؀

ترجمہ: اے اولاد یعقوب علیہ السلام کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس کو کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی۔

آگے سے ربط: یہی مضمون جس کا بنی اسرائیل کو مخاطب بنایا ہے کہ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور ان کی ناسپاسیاں جتائیں، یہاں تک بالکل اجمالی ہے۔ اب اس کو خوب تفصیل سے بیان فرماتے ہیں۔

اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد: تم لوگ اس نعمت کو یاد کرو، تا کہ شکر اور اطاعت کا جذبہ بڑھے، جو میں نے تمہیں انعام میں دی تھی اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں خاص خاص برتاؤ میں (۱) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی (اور یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے مخلوق کے ایک بڑے حصہ پر فوقیت دی تھی، مثلاً: اس زمانہ کے لوگوں پر)

تفسیر: ان خاص برتاؤں کا بیان ایک آیت کے بعد سے شروع ہوا ہے، اور ان میں سے زیادہ تر برتاؤ ان مخاطبوں کے باپ داداؤں کے ساتھ ہوا ہے، تاہم یہ یقینی بات ہے کہ باپ دادا کے ساتھ جو احسان کیا جاتا ہے، ایک حد تک اس سے اولاد کو ضرور نفع ہوتا ہے، جیسا کہ عام مشاہدہ ہے۔

آگے سے ربط: اس آیت میں تو اطاعت کی ترغیب ہے، آگے اطاعت نہ کرنے پر ترہیب یعنی دھمکی ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ؀

ترجمہ: اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرفداری

(۱) واضح رہے کہ خاص خاص برتاؤ کی قید لگا دینے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے قرب اور قبول کی فضیلت کے لازم ہونے کے شبہ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

چل سکے گی۔

تفسیر: اور تم ایسے دن سے ڈرو کہ جس میں نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکتا ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوسکتی ہے، (جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کی جائے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ ان لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

یہ دن قیامت کا ہوگا، مطالبہ سے مراد یہ ہے کہ جیسے کسی کے ذمہ نماز وروزہ کا مطالبہ ہو اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بے باق کردیا جائے۔ اور معاوضہ یہ ہے کہ کچھ مال وغیرہ دے کر بچالائے، تو ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ اور بغیر ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کی جو بات فرمائی ہے، دوسری آیتوں سے اس کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسوں کی اولاً تو خود سفارش ہی نہ ہوگی جو قبولیت کی گنجائش کا سوال پیدا ہو۔ اور طرف داری یہ ہے کہ کوئی زوردار حمایت لے آئے۔ مطلب یہ کہ مدد کے جتنے طریقے دنیا میں ہوتے ہیں، بغیر ایمان کے وہاں کوئی نہ چل سکے گا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۴۹

ترجمہ: اور جب کہ رہائی دی ہم نے تم کو متعلقین فرعون سے، جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری سخت آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولادِ ذکور کے، اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو، اِس میں ایک امتحان تھا تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری۔

ربط: یہاں سے دور تک مذکورہ بالا برتاؤوں کا بیان چلے گا۔

پہلا معاملہ: اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے تم (لوگوں کے آباء واجداد) کو فرعون کے متعلقین سے رہائی دی جو تمہیں سخت اذیتیں پہونچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے کہ تمہاری اولادِ ذکور (لڑکوں) کے گلے کاٹتے تھے اور تمہاری عورتوں کو یعنی لڑکیوں کو کہ بڑی ہوکر عورتیں ہوجائیں زندہ رہنے دیتے تھے اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا زبردست امتحان تھا۔

تفسیر: کسی نے فرعون کے لئے پیشین گوئی کردی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی۔ اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کردیا اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا، اس لئے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ دوسرے ان سے اپنا کام نکالنا تھا کہ ماما گیری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، تو یہ عنایت اپنے مطلب کے لئے تھی۔ اور اس واقعہ سے مراد یا تو یہ ذبح وقتل ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے یا رہائی دینا مراد ہے جو کہ ایک نعمت ہے کہ نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے اور اس نجات دینے کی تفصیل آنے والی آیت

میں ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب شق کردیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریائے شور کو، پھر ہم نے بچالیا تم کو اور غرق کردیا متعلقین فرعون کو اور تم معائنہ کررہے تھے۔

دوسرا معاملہ: یہ قصہ اس وقت واقع ہوا جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہونے کے بعد پیغمبر ہوگئے اور ایک مدت تک فرعون کو سمجھاتے رہے۔ جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر خفیہ طور پر یہاں سے چلے جائیں۔ راستہ میں انہیں ایک بڑا دریا ملا اور اسی وقت پیچھے سے فرعون مع لشکر آپہونچا تو حق تعالیٰ کے حکم سے دریا پھٹ گیا اور بنی اسرائیل کو راستہ مل گیا، جس سے یہ تو پار ہوگئے، مگر فرعون کے پہونچنے تک دریا اسی طرح رہا، تب وہ بھی تعاقب کی غرض سے اندر گھس گیا۔ اس وقت ہر طرف سے پانی آگیا اور اپنے حال پر رواں دواں ہوگیا، تب فرعون اور فرعونی سب وہاں ہی ختم ہوگئے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا، پھر تم لوگوں نے تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد اور تم نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔

تیسرا معاملہ: اور وہ زمانہ یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے ایک مدت [1] گزرنے پر توریت دینے کا وعدہ کیا تھا، جس میں دس راتوں کا اضافہ ہوکر چالیس راتوں کا زمانہ ہوگیا تھا، پھر تم لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد پرستش کے لئے گئوسالہ تجویز کرلیا اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی کہ ایسی بیجا بات کے قائل ہوگئے تھے۔

یہ قصہ اس وقت واقع ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بعض مفسرین کی رائے کے مطابق مصر میں واپس آکر رہنے لگے یا بعض مفسرین کے مطابق کسی اور مقام پر ٹھہر گئے، تب انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہوگئے ہیں، اس لئے اگر اب ہمارے لئے کوئی شریعت مقرر ہوجائے تو ہم اس کو اپنا دستور العمل بنالیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کوہِ طور پر آکر ایک مہینہ تک

(۱) یہ وعدہ اصلاً تیس راتوں کا کیا گیا تھا جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ﴿ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً ﴾ الخ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر دس راتوں کا مزید حکم دیا، اس طرح ان کے پروردگار کی مقرر کردہ پوری مدت چالیس رات ہوگئی (الاعراف آیت ۱۴۲)

ہماری عبادت میں مشغول رہو، اس کے بعد ہم تمہیں ایک کتاب دیں گے۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور توریت مل گئی۔ مگر اس دوران مزید دس روز عبادت میں مشغول رہنے کا اس لئے حکم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزے رکھنے کے بعد افطار فرمالیا تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کی بو پسند ہے، جو کہ معدہ کے خالی رہنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی گیس کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے مزید رکھیں، تا کہ وہ بو پیدا ہو جائے [1]۔ اس طرح یہ چالیس روزے ہو گئے۔ اس دوران موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے اور وہاں بنی اسرائیل میں ایک شخص نے جس کا نام سامری تھا، اس نے چاندی یا سونے کی بچھڑے کی ایک شکل بنا کر اس کے اندر وہ مٹی ڈال دی جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھائی ہوئی اس کے پاس تھی، اس کی وجہ سے بچھڑے کی شکل میں جان پڑ گئی اور بنی اسرائیل کے جہلا نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: پھر بھی ہم نے درگذر کیا تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

چوتھا معاملہ: پھر بھی ہم نے تمہارے توبہ کرنے پر تمہاری طرف سے شرک کی اتنی بڑی بات پیش آنے کے بعد بھی تم سے درگذر کیا، اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

اس توبہ کا بیان آگے آرہا ہے، اور توقع کا مطلب یہ نہیں کہ نعوذ باللہ خود باری تعالیٰ کو کوئی شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ درگذر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گذاری کا خیال آسکتا ہے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو۔

پانچواں معاملہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) اور فیصلہ کی چیز دی، اس توقع پر کہ تم سیدھی راہ پر چلتے رہو۔ فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شرعیہ کو فرمایا ہے جو توریت میں لکھے ہیں کہ شریعت کے ذریعہ تمام تر

(۱) اس سلسلہ میں جو یہ بات مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ کے بعد مسواک کر لی تھی، اس وجہ سے مزید دس روزے رکھنے کا حکم دیا، یہ بات بالکل بغیر ثبوت اور بغیر دلیل کے ہے۔ اگرچہ بعض تفسیروں میں نقل کر دی گئی ہے، پھر بھی بغیر سند کے ہونے کی وجہ سے حجت نہیں ہے۔ اور اگر یہ روایت کسی صحیح سند سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کی وجہ سے احناف پر اشکال نہیں ہوسکتا کہ وہ مسواک کو روزہ کی حالت میں جائز کیوں کہتے ہیں؟ کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کراہیت شریعت موسوی کے ساتھ خاص ہوگی اور احناف اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ خیر خصال الصائم السواک روزہ دار کی بہترین خصلت مسواک کرنا ہے۔ جیسا کہ الجامع الصغیر میں ہے ۱۲ منہ

اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یا معجزوں کو فرمایا ہے کہ ان سے سچے جھوٹے دعوی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یا خود توریت ہی کو فرما دیا ہے کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم! بیشک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنی اس گوسالہ کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا تمہارے خالق کے نزدیک۔ پھر حق تعالیٰ تمہارے حال پر متوجہ ہوئے، بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

چھٹا معاملہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! بیشک اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز کی وجہ سے تم نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔ سو اب تم اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو جاؤ، پھر تم میں سے بعض آدمی جنھوں نے گئوسالہ (پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنھوں نے گئوسالہ پرستی کی) قتل کریں، یہ (عمل) تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ پھر اس عمل کے نتیجہ میں حق تعالیٰ (اپنی عنایت سے) تمہارے حال پر متوجہ ہوئے، بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ: یہ اس طریقہ کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا یعنی مجرموں کو قتل کیا جائے جیسا کہ ہماری شریعت میں بعض گناہوں کی سزا توبہ کے باوجود قتل و جان لینا مقرر ہے۔ مثلاً قتلِ عمد کے بدلہ میں قتل اور گواہی کے ساتھ زنا کے ثبوت پر رجم کہ یہ توبہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس حکم پر عمل کیا جس کی وجہ سے وہ آخرت میں رحمت و عنایت کے مستحق ہو گئے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

ترجمہ: اور جب تم لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے، یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر، سو آپڑی تم پر کڑک بجلی اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

ساتواں معاملہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے یوں کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ تورات اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر خود دیکھ لیں، سو اس گستاخی پر تم پر کڑک، بجلی آپڑی، اور تم اس کا آنا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یہ قصہ اس طرح واقع ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے توریت لاکر پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے تو ان میں سے بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اگر خود اللہ تعالیٰ ہم سے کہہ دیں کہ یہ ہماری کتاب ہے تو بیشک ہمیں یقین آجائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے فرمایا کہ چلو کوہِ طور پر یہ بات بھی ہو جائے گی۔ تب بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے خود اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ ان لوگوں نے ایک نیا رنگ اختیار کرلیا کہ ہمیں تو کلام سننے سے اطمینان نہیں ہوا، نہ جانے کون بول رہا ہے، اگر اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو بیشک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لے اس گستاخی پر ان پر ایک بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

آٹھواں معاملہ: پھر ہم نے تمہارے مرجانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی وجہ سے تمہیں اس توقع پر زندہ کر اٹھایا کہ تم احسان مانو گے۔

لفظ موت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس بجلی سے مر گئے تھے، تب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ بنی اسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یوں کہیں گے کہ ان کو کہیں لے جا کر غصہ میں خود میں نے ہی کسی تدبیر سے مار ڈالا ہوگا، مجھے اس تہمت سے محفوظ رکھئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنی رحمت سے پھر زندہ کر دیا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر ابر کو اور پہونچائے ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں۔ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، اور انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

نواں معاملہ:

اور (میدانِ تیہ میں) ہم نے تمہارے اوپر ابر کو سایہ فگن کیا اور (غیب کے خزانہ سے) تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں پہونچائیں (اور تمہیں اجازت دی) کہ یہ نفیس چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ (مگر وہ لوگ اس میں بھی ہماری مرضی کے خلاف باتیں کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

یہ دونوں قصے وادیٔ تیہ میں واقع ہوئے تھے۔ وادی تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملک شام تھا۔ یہ

لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر آئے تھے اور یہاں ہی رہنے لگے تھے۔ادھر ملک شام پر ایک عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہو گیا۔جب فرعون غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے تو انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو اور اپنے اصلی وطن کو ان کے قبضہ سے آزاد کرا لو۔بنی اسرائیل مصر سے اس مقصد سے چلے،لیکن ان حدود میں پہونچ کر عمالقہ کے زور وقوت کا پتہ چلنے پر ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی یہ سزا دی کہ وہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں پریشان پھرتے رہے،گھر بھی پہونچنا نصیب نہیں ہوا۔تیہ کے معنی ہیں:سرگرداں،پریشان ہونا۔اس لئے اس میدان کو وادی تیہ کہتے ہیں۔وہ کھلا میدان تھا،نہ عمارتیں نہ مکان۔بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید باریک ابر کا سایہ کر دیا۔اور بھوک کا تقاضہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے درختوں پر کثرت سے ترنجبین پیدا کر دی جو ایک شیریں چیز ہے،یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے اور بٹیریں ان کے پاس جمع ہو جاتیں جو ان کے پاس سے بھاگتی نہ تھیں،یہ ان کو پکڑ لیتے اور دونوں لطیف پاکیزہ چیزوں سے پیٹ بھر لیتے۔چونکہ ترنجبین معمول سے بہت زیادہ تھی اور بٹیروں کا گھبرا کر ان کے پاس سے نہ بھاگنا بھی معمول کے خلاف امر تھا۔لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے قرار دی گئیں۔ان لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ خرچ اور ضرورت کے مطابق لے لیا کریں،جمع کر کے نہ رکھیں۔مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس بارے میں بھی حکم کی خلاف ورزی کی تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا۔اس کے بارے میں فرمایا کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ:اور جب ہم نے حکم دیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو،پھر کھاؤ اس سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے،اور دروازے میں داخل ہونا جھکے جھکے،اور زبان سے کہتے جانا کہ توبہ ہے،ہم معاف کر دیں گے تمہاری خطائیں اور ابھی ابھی مزید براں اور دیں گے ایسے نیک کام کرنے والوں کو۔

دسواں معاملہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم دیا کہ تم لوگ اس بستی میں داخل ہو جاؤ،پھر اس (کی چیزیں) تم جہاں سے چاہو بے تکلفی کے ساتھ کھانا اور یہ حکم بھی دیا کہ (جب اندر جانے لگو تو دروازے میں عاجزی کے ساتھ) جھکے جھکے داخل ہونا اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) اس صورت میں ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کر دیں گے اور نیک نیتی کے ساتھ نیک کام کرنے والوں کو اس سے بھی زیادہ دیں گے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ قصہ بھی وادی تیہ کے زمانہ ہی کا ہے کہ جب من وسلویٰ کھاتے کھاتے

اکتا گئے تو اپنے معمولی کھانوں کی درخواست کی۔ جیسا کہ دو آیات کے بعد آئے گا۔ اس وقت انہیں ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا کہ وہاں مزید معمولی چیزیں کھانے پینے کو ملیں گی۔ سو یہ حکم اس شہر میں جانے سے متعلق ہے۔ اس میں داخل ہونے کے قولی اور فعلی ادب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اندر جانے پر کھانے پینے میں توسیع کی گئی۔

قصہ کے اجزا کی ترتیب کی تبدیلی میں حکمت:

یہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پہلے کا قصہ بعد میں اور بعد کا واقعہ پہلے بیان ہوا ہے۔ مگر اس پر اشکال اس وقت ہوسکتا تھا جب قرآن مجید میں قصوں کا بیان کرنا اصل مقصود ہوتا۔ جبکہ اس میں اصلاً نظر نتائج پر ہے، اس لئے اگر ایک ہی قصہ کے اجزا میں سے ایک جز کا الگ نتیجہ ہو اور ان نتائج کے کسی اثر کا اعتبار کرتے ہوئے پہلے جز کو بعد میں اور بعد کے جز کو پہلے بیان کردیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ اور اشکال لازم نہیں آتا۔ دوسرے مفسرین نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اور تیہ کی مدت کے بعد پھر اس پر جہاد ہوا اور وہ فتح ہوا۔ اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے۔ یہ حکم ان کے واسطہ سے اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔ اور پہلے قول میں پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کرلینا مناسب ہے کہ من وسلوی کو چھوڑ کر معمولی کھانوں سے متعلق کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی تو گستاخی، لیکن خیر اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو معاف کردیں گے۔ اور اس کہنے پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی تاہم جو لوگ اخلاص کے ساتھ اعمالِ صالحہ کریں گے، ان کا انعام اس کے علاوہ ہوگا۔

> فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

ترجمہ: سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کی ان سے فرمائش کی گئی تھی اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک آفت سماوی، اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

گیارہواں معاملہ:

یہ سابق آیت کا نتیجہ ہے اور بدلا ہوا کلمہ یہ تھا حِطَّةٌ یعنی توبہ کی جگہ حَبَّةٌ فی شعیرۃ یعنی جو وغیرہ کی قسم کا غلہ کہنا شروع کردیا۔ ان پر نازل کی جانے والی آسمانی آفت طاعون تھی جو احادیث کی رو سے نافرمانوں کے لئے عذاب اور فرماں برداروں کے لئے رحمت ہے۔ اس شرارت پر ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی ہلاک ہوگئے۔

> وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جب موسیٰ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو، بس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے، معلوم کر لیا ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع، کھاؤ اور پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد سے مت نکلو، فساد کرتے ہوئے سرزمین میں۔

بارہواں معاملہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے پانی کی دعا مانگی۔ اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آئے گا، چنانچہ مارنے کی دیر تھی کہ) اس سے فوراً بارہ چشمے پھوٹ نکلے (اور بنی اسرائیل کے بارہ ہی خاندان تھے۔ چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا مقام متعین کر لیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ) اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور پیو۔ اور زمین میں (فتنہ) وفساد کرتے ہوئے (اعتدال کی) حد سے آگے مت بڑھو۔

یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ ہی میں پیش آیا۔ وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر سے صرف عصا کے مارنے کے نتیجہ میں قدرت خداوندی سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے ان میں سے ہر فرزند کی اولاد ایک ایک خاندان تھا اور انہیں انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ اور سب کے افسر بھی الگ الگ تھے۔ اس لئے چشمے بھی بارہ نکلے۔ یہاں کھانے سے مراد من وسلوی کا کھانا اور پینے سے مراد یہی پانی ہے۔ یہاں فتنہ وفساد، نافرمانی اور احکام پر عمل نہ کرنے کو فرمایا ہے۔

فائدہ: قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ ایسے خلاف معمول، خرق عادت کاموں کا انکار کرنا بڑی غلطی ہے کہ جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے خلاف قیاس، عقل سے بعید یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ لوہے کو جذب کر لیتے ہیں تو اگر اس پتھر میں یہ تاثیر پیدا کر دی کہ زمین کے اجزا سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے، ہمارے زمانہ کے عقلا کو اس تقریر کو سمجھ کر اس سے نتیجہ اخذ کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور یہ نظیر ومثال بھی سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ اگر خود اس پتھر کے اجزا میں پانی پیدا ہو جائے تو اللہ کی قدرت کے لئے کونسا محال لازم آتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے امور کو محال کہتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ

اللہِ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللہِ وَیَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ع ۷

ترجمہ: اور جب تم لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگا کرتی ہیں ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز، آپ نے فرمایا کہ تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے کسی شہر میں اترو، ضرور تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور جم گئی ان پر ذلت اور پستی، اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے، یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرۂ اطاعت سے نکل جاتے تھے۔

تیرھواں معاملہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! (روزانہ) ہم ایک ہی قسم کے کھانے (یعنی من وسلویٰ) پر کبھی نہ رہیں گے۔ آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگا کرتی ہیں (یعنی) ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز (وغیرہ) آپ نے فرمایا: کیا تم اعلیٰ درجہ کی چیزوں کے بدلہ میں ادنیٰ درجہ کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں پہنچ جاؤ۔ (رہنے لگو، وہاں) تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی۔ جن کی تم درخواست کرتے ہو۔ اور ایسی ایسی گستاخیوں کی وجہ سے ایک زمانہ کے بعد) ان پر ذلت وپستی مسلط ہو گئی (کہ دوسروں کی نظر میں ان کی کوئی قدر نہ رہی اور خود ان کی طبیعتوں میں اولوالعزمی نہ رہی) اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ احکام الٰہیہ کے منکر ہو جاتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیا کرتے تھے (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی ناحق ہوتا تھا) اور (یہ ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت وفرماں برداری نہ کی اور دائرۂ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔

یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ کا ہے۔ من وسلویٰ سے اکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی۔ اس میدان کے حدود یا گرد ونواح میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ، جوتو اور کماؤ اور کھاؤ۔ اور ذلت ومسکنت کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ یہودیوں سے، خود مختارانہ اور آزادانہ، سلطنت قرب قیامت تک کے لئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لٹیروں جیسا بے ضابطہ تھوڑا زور وشور دجال (یہودیوں) کا کل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا۔ اس کو کوئی عاقل، سلطنت نہیں کہہ سکتا۔ اور انہیں یہ امر موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتا دیا گیا تھا کہ اگر نافرمانی کرو گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف (آیت ۱۶۸) میں مذکور ہے: ﴿وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبۡعَثَنَّ عَلَیۡھِمۡ

اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾: اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے جب آپ کے رب نے (انبیاء کے واسطہ سے) یہ بات بتادی کہ وہ ان (یہود) پر قیامت تک (کسی نہ کسی) ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو شدید سزا (ذلت وخواری اور محکومیت) کی تکلیف پہونچاتا رہے گا۔ اور یہودیوں کے ہاتھوں سے مختلف اوقات میں بہت سے پیغمبر قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن ضد اور عناد نے انہیں اندھا بنا رکھا تھا اور یہود سے سلطنت چھینے جانے کے متعلق ایک شبہ کا جواب آگے سورۂ آلِ عمران کی (آیت ۵۵) ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ کے تحت مذکور ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ: یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین، جو شخص یقین رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر اور مطلوب کارگذاری اچھی کرے، ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے، ان کے پروردگار کے پاس اور کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہونگے۔

ربط: اس مقام پر یہود کی شرارتوں کا حال معلوم ہونے پر سامعین (قارئین) کو یا خود کسی یہودی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اب تو شاید اگر وہ معذرت وتوبہ کرکے ایمان بھی لانا چاہیں تو غالباً حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی قبول نہ ہو۔ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں اس سلسلہ میں ایک قانونِ کلی ارشاد فرماتے ہیں:

تفسیر: یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین (ان سب میں) جو شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات پر) اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہو اور (قانونِ شریعت کے مطابق) اچھی کارگذاری کرے، ایسے لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس (پہونچنے پر) ان کا حق الخدمت (اجر وجزا) بھی ہے اور (وہاں جاکر) ان پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ مغموم ہوں گے۔

قانونِ عام: جو بھی ایمان لائے گا مقبول ہوگا اور اس کی خدمت مشکور ہوگی:

اس قانون کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص اعتقاد اور اعمال میں پوری اطاعت اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی رہا ہو، ہمارے یہاں وہ مقبول ہوگا اور اس کی خدمت مشکور (قابل قدر) ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے نزول کے بعد پوری اطاعت، محمد ﷺ کے پیروی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے۔ جس کا مطلب واضح ہے کہ جو مسلمان ہوجائے گا، وہ اجر اور آخرت میں نجات کا مستحق ہوگا۔ اس بیان میں اس خیال کا جواب ہوگیا کہ اگر وہ ان تمام شرارتوں کے بعد بھی مسلمان ہوجائیں تو ہم معاف فرمادیں گے۔

صائبین ایک فرقہ تھا جس کے عقائد اور طرزِ عمل کے بارے میں کسی کو پورا علم نہ ہونے کی وجہ سے مختلف اقوال ہیں۔

قانونِ عام میں مسلمانوں کے ذکر کی وجہ:

اس قانون میں بظاہر مسلمانوں کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی، لیکن اس سے کلام میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون سب کے لئے عام ہے خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف۔ جو شخص اطاعت کرے گا، وہ عنایت کا حقدار ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سنانا تو اصل میں مخالف کو ہے۔ لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ موافقین پر ہماری جو عنایت ہے، اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ان کی موافقت کی صفت ہے، ہماری عنایت کا اصلاً اس پر مدار ہے۔ اس لئے اگر مخالف بھی موافقت کی اس صفت کو اختیار کرلے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا۔ اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

اور ہم نے جو اپنے ترجمہ میں (بین القوسین) ''وہاں جاکر'' کی قید لگائی ہے، اس سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا کہ مقبول بندے تو اکثر خوف زدہ اور مغموم ورنجیدہ رہا کرتے ہیں۔ شبہ دور ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ خوف اور حزن وملال نہ ہونا قیامت کے دن ملائکہ کی بشارت کی وجہ سے ہوگا، جیسا کہ سورۂ انبیاء (آیت ۱۰۳) ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ میں ارشاد ہے۔ اس لئے اگر بشارت سے پہلے کسی وقت کچھ خوف وغیرہ قیامت میں بھی ہو جائے تو اشکال لازم نہیں آتا۔ اس آیت کے ربط اور مضمون کی ایک اور تقریر بھی ہوسکتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں معمول یہ ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مضمون کی تکمیل اور مؤمنوں کی تسلی کے لئے اہل ایمان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس لئے مذکورہ بالا کفار کے ذکر کے بعد اہل ایمان کا بیان ہوا ہے کہ ان مختلف فرقوں میں اپنی اپنی شریعت کے زمانہ میں جو شخص علم اور عمل کے لحاظ سے دینِ حق پر قائم تھا، اس کو اجر ملے گا اور وہ نجات کا مستحق ہوگا۔ البتہ اب شریعتِ محمدیہ سے باقی سب منسوخ ہوگئے۔

> وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر معلق کر دیا کہ قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے، مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اس میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

چودھواں معاملہ:

قانون کے بیان یا مضمون کی تکمیل کے بعد پھر بنی اسرائیل کے معاملات کا بقیہ مذکور ہوتا ہے۔ اور (وہ زمانہ یاد کرو)

جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (قول وقرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر معلق کر دیا (اور اس وقت کہا) کہ ہم نے جو کتاب یعنی توراۃ تمہیں دی، اس کو (جلدی) مضبوطی کے ساتھ قبول کرو اور اس میں جو احکام ہیں انہیں یاد رکھو۔ جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر کتاب توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر قوم کو دکھائی، سنائی تو اس میں احکام کچھ سخت وشدید تھے، تاہم ان لوگوں کی حالت کے مناسب تھے کہ انھوں نے اول تو یہی کہہ دیا تھا کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے کہہ دیں کہ یہ میری کتاب ہے تب مانیں گے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کئے گئے۔ غرض ان ستر آدمیوں نے کوہِ طور سے واپس آ کر شہادت دی۔ گو اس شہادت میں بھی اتنی آمیزش کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کر لینا، جو نہ ہو سکے معاف ہے۔ اس طرح کچھ تو جبلی شرارت کچھ احکام کی شدت ومشقت، کچھ اس آمیزش سے حیلہ مل گیا۔ چنانچہ صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوتا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو حکم دیا کہ طور پہاڑ کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا۔ آخر انہیں مجبوراً ماننا پڑا۔

دین میں زبردستی کے اشکال کا جواب:

اس موقع پر کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ دین میں تو اکراہ وجبر نہیں ہے، پھر یہاں زبردستی کیوں کی گئی؟ اس کا جواب واضح ہے کہ دین میں جبر واکراہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے دین کے پیروکار کو اس دین کو قبول کرنے کے لئے جبر واکراہ نہیں یعنی کافروں پر یہ جبر نہیں کریں گے کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہیں مار ڈالیں گے، اسی لئے جہاد میں ایک جزیہ بھی ہے کہ اس کے قبول کرنے سے بھی جہاد رک جاتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد کا مقصد اسلام قبول کرانا نہیں، بلکہ اسلام اور جزیہ کے درمیان ایک امر مشترک ہے اور وہ عدل شرعی کے قانون کی اطاعت ہے جو مومنوں اور کفار سب کے حق میں عام ہے۔ زیر بحث معاملہ میں بنی اسرائیل کے لوگ پہلے ہی خوشی اور رغبت کے ساتھ ایمان لا چکے تھے۔ ایسے شخص کو ایمان پر قائم رہنے اور احکام کی بجا آوری کے لئے ضرور مجبور کیا جائے گا جس کی نفی پر نقلی یا عقلی کوئی دلیل قائم نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ: پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی پھر گئے سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو ضرور تم تباہ ہو جاتے۔

پندرہواں معاملہ:

پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے۔ سو اگر تم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو (اس عہد شکنی کا

تقاضہ تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے۔

مگر یہ ہماری عنایت ورحمت عام ہی ہے کہ تمہاری موجودہ زندگی کی مقررہ مدت کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے۔ لیکن آخر کب تک؟ مرنے کے بعد اپنے اعمال کی وبا میں مبتلا ہو گے۔ اور یہ رحمتِ الٰہی دنیا میں مؤمن اور کافر سب پر عام ہے جس کا اثر دنیوی عافیت وراحت ہے، جبکہ آخرت میں رحمت خاصہ کا ظہور ہوگا، جس کا نتیجہ نجات اور قرب ہے۔

اس آیت کے اخیر جز کے مخاطب ظاہراً وہ یہودی ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی کا ایک جز ہے، اس لئے انہیں بھی عہد شکنی کرنے والوں میں داخل کر کے بطور احسان فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی ایسا عذاب نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمان لوگوں پر ہوتا رہا ہے۔ یہ محض خدا کی رحمت ہے۔ اور چونکہ اب ایسے عذابوں کا نہ آنا احادیث کی رو سے رسول اللہ ﷺ کی برکت ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے فضل ورحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کردی ہے۔ اس مضمون کی تائید کے لئے آگے بے ایمان لوگوں کا ایک واقعہ نظیر کے طور پر اگلی آیت میں پیش کیا جارہا ہے کہ ایسا ہونا بعید نہ سمجھیں، ایسا ہو چکا ہے، جس کی تمہیں بھی خبر ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اور تم جانتے ہو ان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے تجاوز کیا تھا دربارہ یوم ہفتہ کے، سو ہم نے ان کو کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ، پھر ہم نے اس کو ایک عبرت بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد زمانہ میں آتے رہے اور موجب نصیحت بنایا ڈرنے والوں کے لئے۔

سولہواں معاملہ:

اور تم ان لوگوں کا حال جانتے ہی ہو جنھوں نے تم میں سے اس حکم کے بارے میں (شریعت سے) تجاوز کیا تھا جو ہفتہ کے دن سے متعلق تھا (کہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے انہیں (اپنے تکوینی قہری حکم سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ان لوگوں کے لئے بھی ایک عبرت (انگیز واقعہ) بنا دیا جو اس قوم کے معاصر (ہم زمانہ) تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو بعد کے زمانہ میں آتے رہے اور (اس واقعہ کو اللہ سے) ڈرنے والوں کے لئے بھی عبرت انگیز بنا دیا۔

یہ قصہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا۔ بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن (یوم سبت) معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اس دن مچھلی کا شکار بھی ممنوع تھا، یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور مچھلی کے شوقین تھے۔ ہزار جال ڈال کر مچھلی کا شکار کرنا تھا جو انھوں نے کیا۔ اس پر اللہ کا یہ عذاب شکل مسخ کرنے کا نازل ہوا، اور

تین دن بعد وہ سب مر گئے۔

نکال اور موعظت میں فرق:

اس واقعہ کے دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک نافرمان، تو ان کے لئے یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس کو ''نکال'' فرمایا اور دوسرے فرماں بردار، ان کے لئے یہ واقعہ فرماں برداری پر قائم رکھنے والا تھا۔ اس کو موعظت قرار دیا۔ واللہ اعلم۔

اب اگر اس واقعہ کو کوئی محال قرار دیتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ محال ہونے کی دلیل پیش کرے۔ اور جب جدید فلاسفہ یا سائنس دان بندر سے ترقی کر کے آدمی بن جانے کو ممکن قرار دیتے ہیں تو آدمی کے تنزل میں پڑ کر بندر بن جانے کو کیوں محال قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ زمانہ کا فرق کسی بھی طرح قابل لحاظ نہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا آپ ہم کو مسخرا بناتے ہیں، موسیٰ نے فرمایا: نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں۔

سترھواں معاملہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو تو) تم ایک بیل ذبح کرو[1] وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا آپ ہمارا ٹھٹھا کرتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق اور کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: نعوذ باللہ! جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں (کہ احکام خداوندی کے ساتھ تمسخر کرنے لگوں)

یہ قصہ اس طرح واقع ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کا قتل ہوگیا تھا جس کی وجہ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے اس مقتول سے اس کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کی درخواست کی تھی، جس سے اس نے انکار کردیا تو اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ لیکن اس وقت قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ معالم میں کلبی کا قول ہے کہ اس وقت تک اس بارے میں

---

(۱) یہی قول اور یہی استدلال اکلیل میں امام ابو منصورؒ سے منقول ہے اور تفسیر ابن کثیر میں بِکر کی تفسیر صغیرۃ لم یلقھا الفحل کے ساتھ گیارہ علماء سے نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علماء کی رائے میں وہ گائے تھی ممکن ہے کہ کثرت قائلین سے روایۃً اس قول کو ترجیح دی جاوے اور قوت دلیل سے درایۃً پہلے قول کو اقرب سمجھا جاوے۔ واللہ اعلم

توریت میں کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ توراۃ کے نزول سے پہلے کا تھا۔ غرض بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چل جائے۔ آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کے لئے فرمایا جس سے قاتل کا پتہ چلنے کا طریقہ قصہ کے آخر میں معلوم ہوگا۔ اس پر انھوں نے اپنی جبلت کے مطابق بحثیں شروع کر دیں، چنانچہ اگلی آیتوں میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں، سو اب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔

بنی اسرائیل کی حجتیں:

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ اپنے رب سے ہمارے لئے درخواست کیجئے کہ وہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو، نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان والا پٹھا ہو۔ سو اب (زیادہ حجت بازی مت کرنا بلکہ) جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے اسے کر ڈالو۔

فائدہ: حدیث میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں ان کے ذمہ نہ ہوتیں جس بقرہ (بیل) کو بھی ذبح کر دیتے وہی کافی ہو جاتا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ ہم سے یہ بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔

مکرر سوال:

کہنے لگے کہ (اچھا) ہمارے لئے اپنے رب سے (یہ بھی) درخواست کر دیجئے کہ وہ ہم سے یہ (بھی) بیان کر دیں کہ

اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو۔ جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ دیکھنے والوں کے لئے فرحت بخش ہو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ۭ وَإِنَّآ إِن شَآءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝

ترجمہ: کہنے لگے کہ ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ضرور ان شاء اللہ تعالیٰ ٹھیک سمجھ جاویں گے۔

تیسری بار سوال:

کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ (پہلی بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح کر کے) ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں۔ کیونکہ ہمیں اس بیل کے بارے میں (تھوڑا سا) شبہ ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب و غریب جس میں قاتل کی تحقیق کا خاص اثر ہو) اور ہم ان شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝ ع

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاوے اور نہ اس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، سالم ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو، کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی، پھر اس کو ذبح کیا اور ظاہراً کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

آخری سوال کا جواب:

موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب و غریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی قسم کا جانور ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی گئی ہو اور نہ (کنویں میں جوتا گیا ہو) اس سے کھیتوں میں آب پاشی کی گئی ہو (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو (یہ سن کر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری بات فرمائی ہے (قصہ مختصر یہ کہ ایسا جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کیا اور (اپنی بحثوں اور حجتوں سے تو) وہ (حکم پر عمل) کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی ۙ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کردیا، پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا، جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو، اسی طرح حق تعالیٰ مُردوں کو زندہ کردیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں، اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو۔

اٹھارہواں معاملہ ستر ہویں معاملہ کا تتمہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کردیا۔ پھر (اپنی برأت کے لئے اس کی ذمہ داری) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا، جس کو تم (میں سے مجرم ومشتبہ لوگ) چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے (بیل کے ذبح کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بیل) کے کسی ٹکڑے سے چھوا دو۔ چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہوگیا (آگے اللہ تعالیٰ قیامت کا انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) حق تعالیٰ (قیامت میں) اسی طرح مردوں کو زندہ کردیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس توقع پر اپنی (قدرت کی) نظیریں دکھاتے ہیں کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کو پہچانو)

اس مقتول نے زندہ ہوکر اپنے قاتل کا نام بتادیا اور پھر فوراً مرگیا، جو شخص ماں کے پیٹ میں گوشت کے بے جان لوتھڑے میں جان پڑنے کے معاملہ میں غور کرے گا کہ اس کی کل حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لطیف بخار کا گوشت کے لوتھڑے سے چھو جانا اور مل جانا ہے۔ وہ اس قصہ میں بیان کئے ہوئے خاص معاملہ کو کسی بھی طرح اللہ کی قدرت کے لئے بعید و دشوار نہ سمجھے گا اور ان دونوں اتصالوں میں کوئی معمولی عقلی فرق بیان نہ کرسکے گا۔

مقتول کے بیان کے حجت ہونے پر شبہ کا جواب:

اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض مقتول کا بیان ہی قاتل کی تعیین کے بارے میں کافی دلیل ہے، بلکہ اس موقع پر خاص طور سے وحی کے ذریعہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا بیان واقع کے مطابق ہوگا اور دوسرے مواقع پر کسی واقعہ کے لئے ایسی کوئی مطابقت کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں ہوسکتی۔

قصہ کی ترتیب بدلنے کی حکمت:

واضح رہے کہ اس آیت کا مضمون مذکورہ بالا آیات کے قصہ کے شروع کا حصہ ہے۔ اس کی ترتیب بدلنے میں ایک خاص نکتہ ہے، وہ یہ کہ بہت دور سے بنی اسرائیل کی بدعنوانیوں کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اور یہی ذکر اصل مقصود ہے اور اس قصہ

کے ضمن میں دو بدعنوانیوں کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ ایک قتل کر کے واردات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا، دوسرے اللہ کے احکام میں خواہ مخواہ حیل و حجت کرنا۔ چنانچہ اگر قصہ کو ترتیب کے ساتھ ہی بیان کیا جاتا تو ممکن تھا کہ ناظرین پہلے جز کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جز کو محض قصہ کا ضمیمہ قرار دیتے، جبکہ ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں ہی جز مقصود ہیں۔ ورنہ اگر دونوں جزء مقصود نہ ہوتے تو ترتیب نہ بدلی جاتی۔

یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو تو ویسے ہی زندہ کرنے کی قدرت تھی یا وہ تو بغیر زندہ کئے ہوئے بھی قاتل کے بارے میں بتا سکتے تھے، پھر یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی بھی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے اور ہر واقعہ کی پوری پوری حکمتیں حق تعالیٰ ہی کے علمی دائرہ میں آسکتی ہیں۔ دوسروں کو اس فکر میں پڑنا عمر عزیز کا ضائع کرنا ہے، کیونکہ جو بھی حکمت بیان کی جائے گی، وہ بھی ایک فعل ہوگا۔ اور یہی سوال اس کے بارے میں بھی ہوگا۔ اس لئے بہتر طریقہ سکوت اور تسلیم کر لینا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو، و راز دہر کمتر جو ❁ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

[گویے اور شراب کی باتیں کرو، اور دنیا کے راز کم سوچو÷ کیونکہ کسی نے اپنی عقل سے یہ معمہ نہ کھولا ہے نہ کھول سکتا ہے]

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: ایسے ایسے واقعات کے بعد تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں ان سے زیادہ۔ اور بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں۔ اور انہیں پتھروں میں بعضے ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور انہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔

یہود سے شکایت:

آگے ان واقعات کا اثر نہ لینے پر شکایت فرماتے ہیں کہ ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تو یہ تھا کہ تم لوگوں کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے۔ لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھروں کی سی ہے یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں ان سے بھی زیادہ ہیں اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعض پتھر تو ایسے ہوتے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ پڑتی ہیں اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر ان سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے

خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں (اور تمہارے دلوں پر کسی طرح کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (دلوں کی اس سختی کی وجہ سے جو برے اعمال انجام پاتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تمہیں اس کی سزا دیں گے)

پتھروں کے تین احوال اور ایک شبہ کا جواب:

اس موقع پر پتھروں پر ہونے والے تین اثرات بیان کیے گئے ہیں: ایک ان سے زیادہ پانی نکلنا۔ دوسرے کم پانی نکلنا، ان کے بارے میں تو کسی کو کوئی شبہ نہیں۔ تیسرے اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے آگرنا۔ اس میں شاید کسی کو شبہ ہو کہ پتھروں میں تو کوئی عقل اور حس نہیں ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے تو عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ حیوانات بے عقل میں خوف کا پیدا ہونا دیکھا جاتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ حس کا دارومدار زندگی پر ہے اور ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف زندگی پائی جاتی ہو جس کا ہمیں ادراک نہ ہوتا ہو۔ جیسا کہ جوہر دماغ کے احساس کا بہت سے عقلا کو بھی ادراک نہیں ہوا۔ لیکن بہت سے عقلا دلائل کی بنیاد پر اس کے قائل ہوئے تو قرآن کی ظاہر نص دلالت اور قوت میں ان طبعی دلائل سے کم نہیں ہے اور ہمیں اس دعوی کی ضرورت نہیں ہے کہ پتھر کے گرنے کی علت ہمیشہ یہی خوف ہوتا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں تو ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں بعض طبعی ہوں۔ اور ایک سبب یہ ہو۔

پتھروں کے احوال کے بیان میں حسن ترتیب:

اور اس مقام پر ان پتھروں کی قسموں میں ترتیب نہایت لطیف اور مقصود کا فائدہ پہونچانے میں نہایت بلیغ ہے۔ یعنی بعض پتھر ایسا قوی اثر لیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ جن سے مخلوق کو بڑا نفع پہونچتا ہے، جبکہ یہود کے دل ایسے بھی نہیں۔ بعض پتھروں پر اس سے کم تاثیر ہوتی ہے جس سے کم نفع پہونچتا ہے تو وہ پتھر پہلی قسم کے پتھروں کے مقابلہ میں کم نرم ہوئے، لیکن ان کے دل ان سے بھی سخت ہیں اور بعض پتھروں میں اگرچہ اس درجہ کا اثر نہیں، پھر بھی ان میں ایک اثر ہے تو یہ قسم اس وجہ سے کہ پہلی دونوں قسموں میں مذکورہ آثار کے ساتھ خوف بھی موجود ہے، سب سے کم تر اور نچلے درجہ کے اور اثر قبول کرنے میں سب سے کمزور اور کم تر ہیں، مگر ان کے دلوں میں اثر قبول کرنے کی یہ سب سے کمزور کیفیت بھی نہیں۔ سبحان اللہ! حقیقت میں بڑی پاکیزہ ترتیب اور بیان ہے۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ: کیا اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ ان میں کچھ لوگ ایسے

گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے، اس کو سمجھنے کے بعد اور وہ جانتے تھے۔

ربط: اب تک یہود کے برے احوال دکھلائے سنائے ہیں، اب مسلمانوں کو جو یہود کو مسلمان بنانے کی فکر و کوشش میں زحمت اٹھانی پڑ رہی تھی: ان کی امید قطع کر کے ان کی کلفت کو دور کرتے ہیں۔

انیسواں معاملہ: جس سے مسلمانوں کی کلفت دور کی ہے:

(اے مسلمانو!) کیا تم (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ان کی تو ایک اور بات یہ بھی ہے کہ) ان میں کے کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو سمجھنے کے بعد بھی اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے اور (لطف یہ بھی کہ وہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم برا کر رہے ہیں۔ اس طرح محض ذاتی و نفسانی اغراض ہی اس کاروائی کا باعث ہوتی تھیں)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے بے باک و گستاخ اور نفسانی اغراض کے شکار ہوں، وہ کسی کے کہنے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔ اور اللہ کا کلام یا تو توریت ہے اور سننے سے مراد انبیاء علیہم السلام کے واسطہ سے سننا ہے۔ اور تحریف (کچھ کا کچھ کر ڈالنے) سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں کو بدل ڈالنا ہے یا پھر کلام سے مراد وہ کلام ہے جو ان ستر آدمیوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کے معاملہ میں کوہِ طور پر سنا تھا۔ اور سننے سے مراد وہاں بلا واسطہ سننا ہے۔ اس صورت میں تحریف سے مراد قوم سے یہ کہہ دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے، وہ معاف ہے۔ جیسا کہ آیت ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ ﴾ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ بعض مذکورہ بالا امور کا صدور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں سے نہ ہوا ہو، لیکن یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اعمال کا نہ انکار کرتے تھے نہ ہی ان سے نفرت کرتے تھے، اس لئے حکم کے لحاظ سے یہ بھی ان جیسے ہی ہوئے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے دوسرے بعضے یہودیوں کے پاس، وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا مسلمانوں کو وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کر دی ہیں؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ یہ مضمون اللہ کے پاس ہے کیا تم نہیں سمجھتے؟

بیسواں معاملہ: مؤمنوں کی پریشانی دور کرنے کے سلسلہ کے گذشتہ مضمون کا تتمہ:

اور وہ لوگ (یہودی منافق) جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب یہ بعض (منافق یہودی) دوسرے بعض (علانیہ یہودیوں) کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں (تو ان سے ان

کے ساتھ اوران کے ہم مشرب ہونے کے دعوے کرتے ہیں، اس وقت) وہ (دوسرے یہودی) ان سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتادیتے ہو جن کا (ان کے مذہب کے معاملہ میں مفید ہونے کے لحاظ سے) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر انکشاف کردیا ہے۔ (مگر ہم مصلحت کی غرض سے چھپاتے ہیں) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو بحث وحجت میں مغلوب کردیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے۔ کیا (تم اتنی موٹی بات) نہیں سمجھتے؟

یہودی منافق کبھی کبھی ایک آدھ بات خود کو سچا مسلمان ومؤمن ظاہر کرنے کے لئے خوشامد میں مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت موجود ہے یا قرآن مجید کے بارے میں یہ خبر دی گئی ہے وغیرہ۔ اس پر دوسرے لوگ جو کھلے اعلانیہ یہودی تھے انہیں ملامت کرتے۔ اس آیت میں دفع کلفت کی توجیہ یہ ہے کہ جو لوگ ایسے چالاک اور چاند پر خاک ڈالنے والے ہیں، وہ تمہاری بات کیا مانیں گے۔

قرآن میں ایک بات بار بار آنے کا نکتہ:

منافقین کا ایسا ہی قول اسی سورۂ بقرۃ کے شروع میں (آیت ۱۴) میں بھی آیا ہے۔ وہاں ان کا مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ بتانا مقصود تھا۔ یہاں مسلمانوں سے ان کے ایمان لانے کی امید ختم کرائی جارہی ہے، مقصود کے اختلاف سے کسی بات کے بار بار آنے سے، تکرار کا اشکال دور ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اکثر جگہ باتوں کے دہرائے جانے کا معاملہ اسی قسم کا ہے اور اگر کہیں مقصود واحد بھی ہو تو بھی خود تاکید ایک طرح کا نیا مقصود اور مطمح نظر بلیغ اور مہتم بالشان ہے۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے، ان چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کردیتے ہیں۔

یہودیوں کی تحمیق:

اب اللہ تعالیٰ ان منافقوں اور ان ملامت کرنے والوں کو ان کی حماقت پر تنبیہ فرمارہے ہیں کہ خواہ یہ منافق مؤمنوں سے اپنا کفر چھپائیں یا یہ ملامت کرنے والے حضور کی بشارت وغیرہ سے متعلق مضامین چھپائیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، حق تعالیٰ کو تو سب خبر ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو دونوں مضمونوں سے جابجا مطلع فرمادیا ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝

ترجمہ: اور ان میں سے بہت سے ناخواندہ ہیں، جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن دل خوش کن باتیں اور وہ لوگ اور کچھ

نہیں: خیالات پکا لیتے ہیں۔

یہود کے عوام کا حال:

اوپر کی آیتوں میں یہود کے پڑھے لکھے لوگوں کا ذکر تھا، اب اس آیت میں ان کے ان پڑھ لوگوں کا ذکر فرماتے ہیں: ''اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ان پڑھ بھی ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے۔ ہاں کچھ ایسی (بغیر سند وثبوت کی) باتیں انہیں بہت یاد ہیں جو دلوں کو خوش کرنے والی ہیں۔ اور وہ لوگ صرف کچھ (بے بنیاد) خیالات پکا لیتے ہیں (بس اپنی بے بنیاد امیدیں و آرزو لئے ہوئے بیٹھے ہیں اور محض وہم وگمان پر چلے جارہے ہیں)

ایک تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص، پھر اصل تعلیمات میں ان کی اپنی ملاوٹ اور اوپر سے ان میں سمجھ کی کمی، پھر سوائے بے بنیاد خیالات کے واقعی حقائق کی کوئی تحقیق نہیں۔ گویا ''کریلا اور نیم چڑھا'' اس میں شیرینی کہاں؟

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: تو بڑی خرابی ان کی ہوگی جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں سے، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، غرض یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کرلیں۔ سو بڑی خرابی آ دیگی ان کو اس کی بدولت جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس کی بدولت، جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

یہودی علماء کی برائی:

چونکہ یہودیوں کی اس توہم پرستی کا بڑا سبب ان کے علماء کی خیانت ہے، اس لئے ان کے بگاڑ اور ان کی خرابی میں ان عوام سے زیادہ علماء کا ہاتھ ہے۔ اس آیت میں اسی بات کو بیان فرمارہے ہیں۔ اگرچہ پہلے بھی ان کا کچھ حال بیان کیا جاچکا ہے۔ (جب مذکورہ بالا عوام زجر وتنبیہ کے اور دھتکارے جانے کے قابل ہیں اور ان کی جہالت کے اصل ذمہ دار ان کے علماء ہیں) تو بڑی خرابی ان لوگوں کی ہوگی جو کتاب (توریت) کو ادل بدل کر خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) اللہ کی طرف سے (یوں ہی آیا) ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ کچھ تھوڑی بہت نقد رقم وصول کرلیں۔ چنانچہ ان پر اس (بدلی ہوئی کتاب) کی وجہ سے بھی بڑی خرابی (پیش) آئے گی، جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت بھی جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

فائدہ: عوام کو خوش کرنے کی غرض سے غلط سلط مسئلے بتادینے سے ان سے کچھ وصول بھی ہوجاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وجاہت بھی بڑھتی تھی۔ اس غرض سے توریت کے الفاظ یا معانی میں کچھ ردوبدل بھی کرتے رہتے تھے۔ اس

آیت میں ان کی اس ذہنیت پر وعید سنائی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور یہودیوں نے کہا کہ ہرگز ہم کو آتش چھوئے گی نہیں، مگر تھوڑے روز جو شمار کر لئے جائیں گے۔ آپ یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے یا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

اکیسواں معاملہ:

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہمیں (دوزخ کی) آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، سوائے گنتی کے چند دن کے۔ (اے محمد ﷺ) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے کہ کیا تم لوگوں نے (اس بارے میں) حق تعالیٰ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہیں کریں گے؟ یا (معاہدہ کے بغیر یوں ہی) اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

مفسروں نے یہودیوں کے اس قول کے مختلف مطلب بیان کئے ہیں، لیکن احقر کے دل میں یہ مطلب آتا ہے کہ یہ امر تو تحقیق شدہ ہے کہ مؤمن اگر گنہگار ہو تو اگرچہ گناہوں کی وجہ سے اس کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا، لیکن ایمان کی وجہ سے وہ وہاں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ گناہ کی سزا بھگتنے کے بعد اسے وہاں سے نجات مل جائے گی۔ پس اس طرح یہود کے دعویٰ کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے زعم کے مطابق حضرت موسیٰ کا دین منسوخ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مؤمن ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب رسول کریم ﷺ کی نبوت کے انکار کی وجہ سے کافر نہیں ہوئے۔ اس لئے اگر کسی گناہ کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے تو پھر نکال لئے جائیں گے۔ اور چونکہ ان کا دعویٰ فاسد (بناء الفاسد علی الفاسد) ہے کہ خود حضرت موسیٰ کی شریعت کے ابدی ہونے کا دعویٰ ہی غلط ہے، اس لئے حضرت عیسیٰ مسیح اور حضرت محمد (ﷺ) کی نبوت کے انکار کی وجہ سے وہ لوگ کافر ہوں گے۔ اور کفار کے لئے کچھ مدت کے بعد نجات کی بات کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں ہے، جس کو حق تعالیٰ کے عہد سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ دعویٰ بے دلیل، بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ع ۹

ترجمہ: کیوں نہیں جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا احاطہ کر لے سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہوتے

ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لاویں اور نیک کام کریں، ایسے لوگ اہل بہشت ہوتے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ربط: گذشتہ آیت میں ان کے دعوی کے رد کے ساتھ ایک ضابطہ بیان کیا جارہا ہے جس کی رو سے یہ لوگ مُخَلَّدُنِی النار ہوں گے (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے)

ضابطہ: دوزخ میں کون جائے گا اور جنت میں کون؟

تمہیں چند روز کے سوا جہنم کی آگ کیوں نہیں چھوئے گی، تمہیں تو ہمیشہ ہمیش کے لئے اسی میں رہنا پڑے گا۔ کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطائیں (اور قصور اس طرح) گھیر لیں (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) تو ایسے لوگ دوزخ والے ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسول پر) ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگ جنت والے ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

احقر نے خطاؤں کے گھیرنے کے معنی ترجمہ کے ضمن میں ظاہر کردیئے ہیں، گھیرنا اس معنی میں کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی نیک عمل مقبول نہیں ہوتا، بلکہ اگر کچھ اعمال کفر سے پہلے کے ہوں تو وہ بھی ضائع اور کالعدم ہوجاتے ہیں، اس لئے کفار میں سب بدی ہی بدی ہوگی۔ اس کے برخلاف اہل ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ اول تو ان کا ایمان ہی سب سے عظیم عمل صالح ہے۔ دوسرے دیگر فروعی اعمال بھی ان کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں۔ اس لئے مذکورہ بالا گھیرنا اہل ایمان کی حالت پر صادق نہیں آتا۔ خوب سمجھ لو۔

اس ضابطہ سے یہود کے ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں داخل ہونے کے مستحق قرار دیئے جانے کے استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رو سے کفار کا ہمیشہ ہمیش کے لئے داخل ہونا ثابت ہے اور موسیٰ علیہ السلام خاتم النّبیین نہیں ہیں، بلکہ ان کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی نبی ہیں، اور یہودی ان حضرات کی نبوت کے منکر ہیں، اور انبیاء کی نبوت کا انکار کفر ہے، لہٰذا یہودی کافر قرار پائے، اس لئے اس ضابطہ کی رو سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل ہوں گے۔ تو ان کا مذکورہ بالا دعوی قطعی دلیل کی بنیاد پر باطل قرار پایا۔

گنہگار مؤمنوں کے لئے ضابطہ:

جاننا چاہئے کہ اس مقام پر کافروں اور نیک عمل کرنے والے مؤمنوں سے متعلق ضابطہ بیان ہوا ہے اور بداعمال مؤمنوں سے متعلق ضابطہ دوسری آیتوں اور احادیث میں بیان کیا گیا ہے، مثلاً ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَ يَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کریں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو

شریک قرار دیا جائے۔ اور اس کے سوا دوسرے جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے (النساء ۱۱۶) اور اس مشیت کے وقوع کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ﴾ (تو جو شخص ذرہ برابر) نیک عمل کرے گا وہ اس کو پالے گا (الزلزال ۸) اور حدیثوں میں تو صراحت کے ساتھ ہے اور خود اپنے آپ میں بھی صحیح ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب لیا ہم نے قول وقرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا بجز اللہ تعالیٰ کے اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا اور اہل قرابت کی بھی اور بے باپ کے بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور عام لوگوں سے بات اچھی طرح کہنا۔ اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوۃ۔ پھر تم اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔

بائیسواں معاملہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے (توریت میں) بنی اسرائیل سے اس امر کا عہد لیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت مت کرنا اور اچھی طرح عبادت گذاری کرنا، ماں باپ کی بھی اور اہل قرابت کی بھی، یتیموں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور (جب) عام لوگوں سے (کوئی) بات (کہنی ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور نماز کی پابندی کرنا اور زکوۃ ادا کرتے رہنا، پھر تم (عہد کر کے) ''سوائے چند کے'' سب اس سے پھر گئے۔ اور عہد کر کے پھر جانا تمہارے لئے تو معمولی بات ہے۔

یہ گنتی کے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے کہ توریت کے منسوخ ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ کی شریعت پر قائم رہے اور توریت کے منسوخ ہونے کے بعد شریعت محمدی کی اتباع کرنے لگے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب ہم نے تم سے یہ قول وقرار لیا کہ باہم خوں ریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا پھر تم نے اقرار بھی کر لیا اور اقرار بھی ایسا جیسے تم شہادت دیتے ہو۔

مذکورہ بالا عہد کا تتمہ:

اور (وہ زمانہ بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ عہد (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کر کے) آپس میں ایک دوسرے کی

خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو اپنے ملک سے مت نکالنا، پھر (ہمارے اس قول وقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کرلیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

چونکہ بعض اوقات کسی کے بیان سے کسی امر کا اقرار معلوم ہوا کرتا ہے جبکہ صاف اور واضح اقرار نہیں ہوتا، اگرچہ عقل اور عرف کے لحاظ سے وہ بھی اقرار ہی ہوتا ہے، لیکن یہاں اس آخری قید کے ذریعہ اس شبہ کو بھی دور کردیا گیا اور بتادیا کہ مذکورہ بالا اقرار اتنا واضح اور صریح تھا جیسے شہادت اور گواہی واضح اور صاف ہوا کرتی ہے اور ملک سے نکالنے کی ممانعت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو آزار اور تکلیف پہونچا کر ایسا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ

ترجمہ: پھر تم یہ موجود ہو کہ بالکل قتل وقتال بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، ان اپنوں کے مقابلہ میں امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ اور اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کر کرا کر رہا کرادیتے ہو، حالانکہ یہ بات ہے کہ تم کو ان کا ترکِ وطن کرادینا نیز ممنوع ہے۔

عہد مذکور کی خلاف ورزی:

اب خاص طور پر اس حکم سے متعلق ان کی عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں: ”پھر اس واضح اقرار کے بعد تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ آپس میں قتل وغارت گری بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ملک بدر بھی کرتے ہو (اس طرح کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) گناہ اور ظلم کے ساتھ امداد کرتے ہو (چنانچہ ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو آسان سا سمجھا، اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہونچ جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو کچھ خرچ دے دلا کر رہا کرادیتے ہو) حالانکہ تمہارے لئے ان کا ملک سے نکال دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجۂ اولیٰ) بھی منع ہے۔

اس معاملہ میں انہیں تین حکم دیئے گئے تھے جن پر عمل کرنا واجب تھا: اول: قتل نہ کرنا۔ دوسرے: ملک سے نہ نکالنا۔ تیسرے: اپنی قوم کے کسی آدمی کو گرفتار اور قید میں دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے رہا کرادینا۔ لیکن ان لوگوں نے پہلے اور دوسرے حکم کو تو بالکل ہی ضائع کردیا تھا اور تیسرے کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مدینہ میں دو قومیں آباد تھیں: اوس اور خزرج، اور ان میں آپس میں مستقل طور پر دشمنی رہتی تھی اور کبھی کبھی قتل وقتال کی بھی نوبت آجاتی تھی اور مدینہ کے آس پاس دو قومیں یہودیوں کی آباد تھیں: بنو قریظہ اور بنو نضیر۔ اوس اور بنو قریظہ میں آپس میں دوستی تھی۔ اس طرح خزرج اور بنو نضیر آپس میں دوست تھے۔ چنانچہ جب اوس اور خزرج میں آپس میں لڑائی ہوتی تو دوستی کی وجہ سے

بنوقریظہ تو اوس کی مدد کرتے اور بنونضیر خزرج کی حمایت کرتے پھر جہاں اوس اور خزرج مارے جاتے اور ان کے گھر برباد ہوتے ان کے دوستوں پر بھی یہ مصیبت آتی اور ظاہر ہے کہ بنوقریظہ کے قتل اور اخراج میں بنونضیر کا لازمی طور پر اثر اور دخل ہوتا تھا، اسی طرح اس کے برعکس نبونضیر کے قتل وتباہی میں بنوقریظہ کا اثر اور دخل ہوتا تھا۔ البتہ اگر یہودیوں کی دونوں جماعتوں میں سے جنگ میں کوئی قید ہوجاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال ودولت کے ذریعہ راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دلادیتی اور جو کوئی اعتراض یا سوال کرتا تو کہتے کہ قیدی کو رہا کرانا ہم پر واجب ہے۔ اور اگر کوئی قتل واخراج میں مددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے: کیا کریں، اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دینے پر شرم آتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اسی کی شکایت فرمائی ہے اور جن مخالف قوموں کی امداد کا یہاں ذکر ہے ان سے اوس اور خزرج مراد ہیں کہ اوس، بنوقریظہ کی موافقت میں بنونضیر کے مخالف تھے اور خزرج بنونضیر کی موافقت میں بنوقریظہ کے مخالف تھے۔ آیت میں اِثْم (گناہ) اور (ظلم) دو لفظ لانے میں اس امر پر اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں۔ اللہ کا حق بھی کہ حکم الٰہی کی تعمیل نہیں کی اور بندہ کا حق بھی کہ دوسرے کو نقصان وآزار پہونچا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾

ترجمہ: کیا تو کتاب کے بعض پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے، سو اور کیا سزا ہو ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال سے۔

ملامت اور وبال:

اب اس عہد شکنی پر سزا کے بیان کے ساتھ ساتھ شکایت وملامت کی تصریح ہے۔ تو کیا (بس یوں کہو کہ) تم کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تو ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے۔ تو تم لوگوں میں سے جو شخص ایسی حرکت کرے اس کی (اس کے سوا) اور کیا سزا ہونی چاہئے کہ دنیوی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن بڑے سخت عذاب میں ڈال دئے جائیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے (برے) اعمال سے (کچھ) بے خبر نہیں ہیں۔

معصیت کو کفر قرار دینے کی وجہ:

باوجودیکہ یہ یہودی جن کے حالات کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے انکار کی وجہ سے کافر ہی تھے، لیکن اس مقام پر (﴿ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ میں) اس کفر کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا

ہے اس پر شرعی محاوروں میں اس کی شدت کے لحاظ سے کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے کہ اس سے مقصود اس امر سے شدید نفرت کا اظہار اور اس کو سخت قبیح قرار دینا ہوتا ہے، یہی معنی ایسی حدیثوں کے ہیں کہ من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر (جس نے قصداً نماز ترک کر دی اس نے کفر اختیار کر لیا) وغیرہ۔

اور اس مقام پر دو سزاؤں کا ذکر ہے: ایک دنیوی، یعنی رسوائی اور ذلت۔ چنانچہ اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضور ﷺ ہی کے زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑنے کے سبب بنو قریظہ قتل اور قید کئے گئے، اور بنو نضیر ہزار ذلت اور خواری کے ساتھ ملک شام کی طرف نکال دیئے گئے۔ چنانچہ بنو قریظہ کا قصہ سورۂ احزاب کے نصف پر اور بنو نضیر کا سورۂ حشر کے آغاز میں قرآن ہی میں واقع ہوا ہے۔

فائدہ: زیر گفتگو آیت میں وارد فقرہ ﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ﴾ کے سلسلہ میں دو اشکال ہیں: اول یہ کہ اس جملہ سے اس آیت میں مذکور فعل کے نتیجہ میں خزی یعنی دنیوی رسوائی کا واقع ہونا لازم معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی اس کفر پر خزی واقع نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جزا خزی میں منحصر معلوم ہوتی ہے، حالانکہ کبھی کبھی رسوائی کے ساتھ قتل وغیرہ بھی واقع ہوتا ہے۔ پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ حقیقت شناس حضرات کے نزدیک قابل مذمت اور قابل ملامت ہونا بھی خزی یعنی رسوائی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کلام سے مقصود جزا کے استحقاق کو بیان کرنا ہے نہ کہ وقوع کو۔ دوسرے کا جواب یہ ہے کہ قتل وغیرہ بھی خِزْیٌ میں داخل ہے اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حصر سے مقصود کمی کی نفی ہے نہ کہ زیادتی کی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ‌ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝ ع

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے دنیوی زندگانی کو لے لیا ہے بعوض آخرت کے، سو نہ تو ان کی سزا میں تخفیف دی جائے گی اور نہ کوئی ان کی طرف داری کرنے پاوے گا۔

وبال مع علت کا تتمہ:

(اور ان کے لئے اس سزا کی وجہ یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے (احکام کی مخالفت کر کے) آخرت (کی نجات جس کا ذریعہ اطاعت ہے) کے عوض میں دنیوی زندگی (کے فوائد) کو لے لیا ہے (اس طرح) اب نہ تو (تجویز کرنے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی کوئی (وکیل مختار یا دوست رشتہ دار) ان کی طرف داری یا پیروی کر پائے گا۔

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَقَفَّيۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ بِالرُّسُلِ‌ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ

وَاٰيَدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کو روح القدس سے تائید دی، کیا جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا، سو بعضوں کو تو تم نے جھٹلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

تیئیسواں معاملہ:

اور ہم نے (اے بنی اسرائیل! تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ ہی بڑے بڑے سامان وانتظام کئے، سب سے اول) موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) ایک ایک کر کے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے آخر میں) ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے۔ اور ہم نے ان کی روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) کے ذریعہ جو مدد کی (وہ بجائے خود ایک واضح دلیل تھی تو) کیا (یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود تم سرکشی کرتے رہے اور) جب (بھی) کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جنہیں تمہارا دل نہ چاہتا تھا، تم نے (ان پیغمبر کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح (ان پیغمبروں میں سے) بعض کو تم نے جھوٹا قرار دیا اور بعض کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

تفسیر: روح القدس: قرآنِ کریم اور احادیث میں جگہ جگہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہا گیا ہے، جیسے: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ (النحل ۱۰۲) اور حدیث میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ شعر: وجبريل رسول الله فينا ÷ وروح القدس ليس له كفاء: اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کئی طرح سے ہوئی ہے۔ اول ان کے دم کرنے سے حملِ عیسیٰ قرار پایا۔ دوسرے ولادت کے وقت شیطان سے چھوئے جانے سے حفاظت کی گئی۔ پھر یہودی کثرت سے آپ کے دشمن تھے، اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے لئے آپ کے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں ان کے ذریعہ سے آپ کو آسمان پر اٹھوالیا گیا۔ اور یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے، حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بھی۔ اور حضرت یحییٰ وزکریا علیہم السلام کو بھی قتل کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں۔

چوبیسواں معاملہ:

اور وہ (یہودی، فخر[1] کے طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے دل (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب کا جو کہ اسلام ہے اثر ہی نہیں ہوتا تو ہم اپنے مذہب پر خوب پختہ ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظ ہونا اور پختہ ہونا نہیں ہے) بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفرت کرتے اور بھاگتے ہیں اور جو مذہب منسوخ کردیا گیا ہے اس پر اصرار کرتے ہیں) اس لئے وہ بہت تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)

تفسیر: یہ تھوڑا سا ایمان ان امور کا ہے جو ان کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں، مثلاً خدائی کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان امور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوت محمدیہ اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے منکر تھے۔ اس لئے پورا ایمان نہ تھا، اور اس تھوڑے ایمان کو لغت کے اعتبار سے ایمان کہہ دیا کہ مطلق یقین کے معنی میں ہے، خواہ بعض اشیاء سے متعلق ہی ہو اور شرعاً یہ ایمان نہیں، کیونکہ اس کا مطلب شریعت میں وارد تمام امور کا یقین کرنا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: اور جب ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی جو منجانب اللہ ہے اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے، حالانکہ اس کے قبل بیان کیا کرتے تھے کفار سے، پھر جب وہ چیز آ پہنچی، جس کو وہ پہچانتے ہیں تو اس کا انکار کر بیٹھے، سو خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر۔

پچیسواں معاملہ:

اور جب ان کے پاس ایسی کتاب پہونچی (یعنی قرآن) جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو (کتاب پہلے سے)

(۱) یہ توجیہ مشہور توجیہ سے ہٹ کر ہے۔ لغوی معنی تو متحد ہیں یعنی ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، محمد جو کچھ لائے ہیں وہ ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشہور توجیہ میں یہ کہنا عذر اور معذرت کے طور پر تھا کہ ہم کیا کریں کہ ہمارے ذہنوں ہی میں نہیں آتا یا بعض کے نزدیک حق کو باطل قرار دینے کے استدلال کے طور پر تھا کہ ہر نفع بخش علم ہمارے ذہن تک پہنچ جاتا ہے اور یہ پہنچتا ہی نہیں ہے۔ اور میری توجیہ یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا بطور فخر ہے تاہم غرض کے بدلنے سے تفسیر کی تبدیلی لازم نہیں آتی اور تفسیر بالرائے میں داخل نہیں ہوتی۔ مجھے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کے جواب میں یہاں ﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ﴾ اور ایک جگہ ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا﴾ جو فرمایا گیا ہے اس پر یہ توجیہ زیادہ موزوں معلوم ہوئی، بعد میں تفسیر عزیزی میں بھی مجھے وہ بات مل گئی جو میری تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ والحمد للہ علی ذلک۔

ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ) اس کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے (یہ خود) کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے) بیان کرتے تھے (کہ ایک نبی آنے والے ہیں جو ایک کتاب لائیں گے) پھر جب وہ چیز آ گئی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے۔ تو بس ایسے منکروں پر خدا کی مار ہو (جو جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)

قرآن کو جو تورات کی تصدیق کرنے والا فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں جو محمدؐ کی بعثت اور قرآن کے نازل ہونے سے متعلق پیشین گوئیاں تھیں، ان سے ان کا سچا ہونا ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ توراۃ کو ماننے والا تو قرآن اور صاحب قرآن کو جھوٹا قرار دے ہی نہیں سکتا، ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

حق کی معرفت کے باوجود یہود کو کافر قرار دینا:

اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب حق کو حق جانتے تھے تو ان کو مؤمن کہنا چاہئے۔ پھر انہیں کافر کیسے کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حق کو باطل قرار دینا کفر ہے، اسی طرح حق کو جاننے کے باوجود اس کا انکار کرنا بھی کفر ہے، بلکہ عقل اور شریعت کے لحاظ سے یہ تو اول الذکر سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ دوسرے یہ جاننا اضطراری تھا جس کو وہ ناپسند کرنے والے تھے، اور ایمان تصدیق اختیاری کا نام ہے، جس میں اطاعت اور تسلیم و رضا ہو، کیونکہ اس کا حکم دیا گیا ہے اور مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہو) کا اختیاری ہونا لازمی ہے۔

ربط: آگے اس بات کا بھی بیان ہے کہ جان بوجھ کر پھر امر واقعی کا انکار کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ اس کا سبب حسد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝

ترجمہ: وہ حالت بری ہے جس کو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں یہ کہ انکار کرتے ہیں ایسی چیزوں کا جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی، محض ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو نازل فرماوے سو وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔ اور ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہو گی جس میں ذلت ہے۔

یہود کے انکار کا سبب:

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعم خود) اپنی جانوں کو (آخرت کی عقوبت سے) چھڑانا چاہتے ہیں (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ ایسی چیز کا (کفر) انکار کرتے ہیں جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل

فرمائی (یعنی قرآن۔ اور وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو (یعنی محمد ﷺ پر کچھ) نازل فرمادے تو (کفر کے ساتھ اس حسد سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور (آخرت میں) ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہے۔

ایک غضب تو کفر پر تھا، دوسرا غضب ان کے حسد پر ہو گیا اور عذاب میں ﴿ مُهِينٌ ﴾ کی قید سے کفار کی تخصیص ہوگئی۔ کیونکہ گنہگار مؤمن کو جو عذاب ہوگا وہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوگا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ اور جتنی اس کے علاوہ ہیں، ان کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ بھی حق ہیں اور تصدیق کرنے والی بھی ہیں اس کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ کہئے کہ پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے قبل کے زمانے میں اگر تم ایمان رکھنے والے تھے؟

یہود کے کفر وحسد کی دلیل مع جواب:

آگے یہود کا ایک قول بیان فرماتے ہیں جس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے اور حسد بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور جب ان (یہودیوں) سے کہا تا ہے کہ تم ان تمام کتابوں پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی شامل ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم (لوگوں) پر (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے ماسوا کتابیں) بھی (اپنے آپ میں) حق (اور واقعہ) ہیں (اور اپنے آپ میں حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنے والی بھی ہیں، اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر اس سے پہلے کے زمانہ میں اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے۔ اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے؟

یہود کے اس قول کا کفر ہونا تو واضح اور صریح ہے کہ خود ہی اقرار کرلیا کہ ہم تو صرف توراۃ پر ایمان لائیں گے، دوسری کتابوں پر ایمان نہیں لائیں گے اور اس فقرہ سے کہ ''ہم پر نازل کی گئی'' حسد بھی ظاہر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں اس لئے ان پر ایمان نہیں لاتے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس قول میں تین طرح رد فرمایا:

اول: یہ کہ جب دوسری کتابوں کا حق اور واقعی ہونا بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس کے انکار کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر اس دلیل میں کچھ کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے، محض انکار کی کیا وجہ ہے؟

دوسرے: دیگر کتابیں مثلاً قرآن ہی کو لے لو، جب توراۃ کی تصدیق کرنے والی ہیں تو اس کے انکار و تکذیب سے تو خود توراۃ کا انکار اور تکذیب بھی لازم آتا ہے جیسا کہ اوپر آیت ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ ﴾ کی تفسیر میں بھی اس کی تقریر آچکی ہے۔

تیسرے: یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رو سے کفر ہے۔ پھر تمہاری قوم کے لوگوں نے جو بہت سے نبیوں کو قتل کیا جبکہ ان کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی اور قاتلوں کو تم مقتدا اور پیشوا سمجھتے ہو تو یہ براہ راست توراۃ کے ساتھ کفر ہے، اس سے تو توراۃ پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط قرار پاتا ہے۔ غرض تمہارا یہ قول اور فعل ہر لحاظ سے بے محل ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں لائے اس پر بھی تم لوگوں نے گئوسالہ کو تجویز کر لیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور تم ستم ڈھا رہے تھے۔

یہود کے دعوۓ ایمان کے رد کا تتمہ:

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد گئوسالہ (کو معبود) تجویز کر لیا اور (تم اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

اس آیت میں مذکور لفظ ﴿ اَلْبَيِّنٰتِ ﴾ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس قصہ سے پہلے کہ ـــــ اس وقت تک توراۃ نہیں ملی تھی ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدق پر قائم ہو چکے تھے۔ مثلاً عصاء، ید بیضاء ندی کا راستہ دینا اور پھر فرعون اور اس کے ساتھ والوں کو غرق کرنا وغیرہ۔

اور رد سے متعلق تقریر کے رد کا حاصل ظاہر ہے کہ تم ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، جبکہ تمہارا یہ فعل تو کھلا شرک تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی کھلی تکذیب لازم آتی تھی۔

اور چونکہ اس سے پہلے گئوسالہ کو معبود قرار دینے کے قصہ سے صرف ان کے قبیح معاملات کا بیان کرنا مقصود تھا اور یہاں ان کے دعویٰ کی تکذیب کرنا مقصود ہے، لہٰذا نئے مقصود اور مختلف فائدے کی وجہ سے تکرار کا اشکال لازم نہیں آتا۔

اور یہی تقریر اگلی آیت میں بھی سمجھی جائے، جس میں عہد لینے کا ذکر ہے جو اوپر بھی آچکا ہے اور قرآن کے نزول کے زمانہ کے لوگوں پر گئوسالہ پرستی سے رد کرنا اسی مذکورہ بنیاد پر ہے کہ یہ لوگ ان کے طرف دار اور حامی تھے اور مقصود کی تقریر

اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ سے کفر کیا ان کے اخلاف سے محمد سے کفر کرنا کوئی زیادہ عجیب بات نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا اور طور پہاڑ کو تمہارے اوپر لا کھڑا کیا تھا، لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں، ہمت کے ساتھ۔ اور سنو! انھوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سن لیا اور ہم سے عمل نہ ہوگا، اور ان کے قلوب میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا، ان کے کفر کی وجہ سے۔ آپ فرمادیجئے کہ یہ افعال تو بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کررہا ہے، اگر تم اہل ایمان ہو۔

ردِ مذکور کا تتمہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد، قول وقرار لیا تھا (اور اس قول وقرار کے لینے کے لئے) پہاڑ کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) جو کچھ (احکام) ہم تمہیں دیتے ہیں، ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لو اور (ان احکام کو دل سے) سنو (اس وقت) انھوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کرلیا اور) سن لیا اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے زبان حال سے یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا۔ اور (وجہ ان کی اس بددلی کی یہ تھی کہ) ان کے دلوں (کے ریشہ ریشہ) میں ان کے (سابق) کفر کی وجہ سے وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا۔ (جیسا کہ دریائے شور سے اتر کر انھوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کردیا جائے) آپ فرمادیجئے کہ (تم نے اپنے ایمانِ مزعوم کے اعمال کو دیکھ لیا، سو) یہ افعال تو بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہیں تمہارا ایمان کررہا ہے اگر تم (بزعم خود اب بھی) اہل ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)

اس آیت میں مذکور اسباب اور مسببات کی ترتیب کا حاصل یہ ہوا کہ دریائے شور سے اتر کر ان لوگوں سے ایک کلمۂ کفر صادر ہوا۔ ہر چند کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زجر وتوبیخ سے توبہ کرلی، لیکن توبہ کے مراتب و درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کچھ ظلمت دل میں باقی رہ گئی، وہ ترقی پاکر گوسالہ پرستی کا سبب بنی۔ پھر اس کی توبہ میں بعض تو قتل ہی ہوگئے اور شاید بعض کو بغیر قتل کے معافی مل گئی، جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے، ان کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی۔ اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے، انہیں گوسالہ پرستی کرنے والوں سے جس قدر

نفرت کرنی چاہئے تھی وہ نہیں کی، بلکہ اس میں کوتاہی ہونے کی وجہ سے ایک حد تک اس سے راضی ہونے کے سبب شرک کی اس معصیت کا ایک طرح کا اثر ان کے دل میں باقی تھا۔ بہرحال توبہ کے ضعف یا نفرت نہ ہونے کے اثر کے باقی رہنے نے پھر سے دلوں میں دین کی سستی پیدا کردی، جس کی وجہ سے میثاق، عہد اور قول وقرار لینے میں طور پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کرنے کی نوبت آئی اور اس کو قبول کرنے میں بھی قول وعمل اور حال ایک دوسرے کے موافق نہ ہوئے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر عالم آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلاشرکتِ غیرے تو تم موت کی تمنا کر کے دکھلادو اگر تم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ ان اعمال کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں کی۔

چھبیسواں معاملہ:

(بعض یہودی دعوی کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتوں پر خالص ہمارا ہی حق ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کے اس دعوی کو باطل قرار دینے کے لئے فرمایا کہ اے محمد ﷺ) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (تمہارے دعوی کے مطابق) عالم آخرت بلاشرکت غیرے صرف تمہارے ہی لئے نفع دینے والا ہے تو تم (اس دعوی کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھادو۔ اگر تم (اس دعوی میں) سچے ہو اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ) وہ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہیں کریں گے۔ ان (کفریہ) اعمال کی وجہ سے جو وہ اپنے ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں اور حق تعالیٰ کو ان ظالموں (کے حال) کی اچھی طرح خبر ہے (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی، جرم سنا کر سزا کا حکم کردیا جائے گا)

یہود کا یہ دعوی ان آیتوں سے بھی سمجھ میں آتا ہے ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ﴾ (البقرۃ ۸۰) ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ﴾ (البقرۃ ۱۱۱) ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ﴾ (المائدۃ ۱۸) ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ (النساء ۴۹) وغیرہ۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دین حق پر ہیں۔ لہٰذا آخرت میں ہماری نجات لازمی طور پر ہوجائے گی۔ بس اتنا ہوگا کہ ہم میں جو گنہگار ہیں انہیں دوزخ کی تھوڑی سی سزا بھگتنی پڑے گی اور جو توبہ کر چکے ہیں یا جن پر رحم فرمادیا گیا ہے وہ ابتدا ہی میں جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ اور جو اطاعت کرنے والے ہیں وہ تو بیٹوں اور دوستوں کی طرح محبوب اور مقرب ہیں۔

اور یہ سب دعوے بعض عنوانات کے قبیح ہونے سے قطع نظر اپنے آپ میں کسی شخص کے دین حق پر قائم ہونے کی

صورت میں صادق ہیں۔ چونکہ وہ لوگ ان کے دین کے منسوخ ہوجانے کی وجہ سے واقعۂ دین حق پر نہیں تھے، اس لئے حق تعالیٰ نے مختلف طریقوں اور شکلوں سے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے۔

تکذیب کے انہی طریقوں میں سے ایک زیر بحث آیت میں مذکور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم لوگ روایتی طریقہ یعنی گفتگو کے ذریعہ فیصلہ نہیں کر سکتے تو ایک غیر روایتی خلاف عادت طریقہ سے فیصلہ کرلو جس میں علم وفہم اور گہری نظر، عقل ودانش کی بھی ضرورت نہیں ہے، صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم لوگ زبان سے اتنی بات نہیں کہہ سکتے کہ "ہم موت کی تمنا کرتے ہیں" اس پیشین گوئی کے ساتھ اب ہم تم سے کہہ سکتے ہیں کہ ذرا اتنی سی بات کہہ تو دو۔ اگر تم نے یہ کہہ دیا تو ہم ہارے اور تم جیتے اور اگر تم یہ نہیں کہہ سکتے تو پھر ہمارا سچا اور تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہوجائے گا۔ اس طریقہ پر اگر شرط وجزا میں مطابقت بھی نہ ہوتی تب بھی یہ کافی تھا، لیکن مطابقت سے حجت کے علاوہ لطافت اور بلاغت مزید ہوگئی۔

مطابقت ومناسبت کی وجہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو آخرت میں قرب یا کم سے کم نجات ہی کا یقین ہو جیسا کہ دین کے حق ہونے کا تقاضہ ہے تو اسے آخرت میں پہونچنے کی فی نفسہ ضرور رغبت اور خوشی ومحبت ہونی چاہئے۔ جس کا راستہ صرف موت ہے۔ اس لئے اس راستہ پر گامزن ہوجانے کی بھی خاص اس اعتبار سے ضرور تمنا ہوگی اگر چہ طبعی طور سے موت سے وحشت کرتا ہو یا معاصی کی سزا کے ڈر کی وجہ سے خوف زدہ ہو، کہ اس طبعی وحشت یا عقوبت کے خوف کا اثر اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ بغیر ضرورت کے موت کی تمنا نہیں کرے گا۔ لیکن جب کوئی ایسا ضروری تقاضہ پیش آجائے جو اپنی قوت اور اثر سے طبیعت پر غالب آجائے اور اس سزا کی طرف توجہ نہ رہنے دے یا اس معصیت کے کفارہ ہوجانے کی توقع ہو تو اس وقت وہ طبعی وحشت اور خوف ضرور زائل ہوجائے گا۔ اور فی نفسہ اس مرغوبیت ومحبوبیت کا ظہور ہوجائے گا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن حضرات پر کوئی باطنی کیفیت مثلاً شوق وغیرہ غالب ہوجاتی ہے تو وہ بے دھڑک موت وغیرہ کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس کو عین موت کے وقت رحمت ومغفرت اور رضائے حق کی بشارت کھل کر سامنے آجاتی ہے تو وہ بھی موت کا مشتاق ہوجاتا ہے، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے اسباب پیش آنے پر شرعاً موت کی تمنا کرنے کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیثوں میں ممانعت میں لضر نزل به کی قید لگانا واضح طور پر اس کے لئے دلیل ہے۔

جب یہ سب باتیں ذہن نشین ہوگئیں تو اب سمجھئے کہ اگر یہود بزعم خود حق پر ہیں تو اگر چہ موت کی طبعی کراہت ووحشت پر وہ قابل الزام نہیں، لیکن یہ بات بھی اس وقت تک کہ کوئی قوی تقاضہ نہ ہو اور اس سے بڑھ کر کیا تقاضہ وداعیہ ہوگا کہ عقلی اور سمعی دلیلوں کی بنیاد پر فیصلہ نہ ہونے پر فیصلہ کا مدار صرف یہ قرار پایا ہو کہ زبان سے تمنا کا اظہار کردو، تو اول تو یہ کہ اہل دین کو جس قدر دین محبوب ہوتا ہے اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر دین کی بلندی اور اس کی حقیقت کے اثبات اور

غلبہ کے وجود کے لئے سچ مچ جان نذر ہو جائے تو عین سعادت اور انتہائی مطلوب ہے، جیسے جاں باز ایسے وقت میں جان کی بازی لگا بیٹھتے ہیں تو اگر وہ سچ مچ مر بھی جاتے مگر دین کا بول بالا ہو جاتا تب بھی ہچکچاہٹ کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور یہاں تو صرف زبان ہی ہلانی پڑتی تھی، مگر چونکہ اضطراراً اپنے آپ کو باطل اور کفر پر اور جناب رسول اللہ ﷺ اور مؤمنوں کے حق اور ایمان پر ہونے کو خوب جانتے تھے جیسا کہ ﴿بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ﴾ میں یہی مراد ہے۔ اس لئے کچھ ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ کھلی، ورنہ انہیں جس قدر حضور سے عداوت ومخالفت تھی، اس کی وجہ سے آپ کی اس پیشین گوئی پر بڑا جوش آنا چاہئے تھا کہ ضرور کہہ ڈالتے، لیکن کچھ ایسے کھوئے گئے کہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

درحقیقت یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے جو اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اور ہمارے اس بیان سے اس معاملہ میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی اشکال نہیں رہا۔ مثلاً یہ کہ موت سے طبعی کراہت ہوتی ہے یا موت کے بعد معصیت پر سزا کا خوف ہوتا ہے، اس لئے تمنا نہ کی ہو یا یہ کہ موت کی تمنا کرنا منع ہے، پھر ان سے کیوں مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ جس حالت کا انہیں سامنا تھا اس میں نہ طبعی کراہت ہے نہ اس خوف کی طرف التفات ہے نہ شرعی ممانعت ہے۔

اب دو امر اور سمجھ لیجئے: ایک تو یہ کہ یہ حجت خاص ان یہودیوں کے ساتھ تھی جو حضور ﷺ کے مخاطب تھے، یہ خطاب ہر زمانہ کے یہودیوں سے نہیں ہے اور لفظ ﴿ اَبَدًا ﴾ انہی کی عمر کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ شاید کسی نے تمنا کا اظہار کر دیا ہو، مگر اس کی خبر نہ ہوئی ہو۔ جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخالفین ہمیشہ ہی مددگاروں کے مقابلہ میں زیادہ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو لازمی طور پر نقل ہوتا اور مشہور ہو جاتا۔

وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ ع ۱۱

ترجمہ: اور آپ ان کو حیات کا حریص اور آدمیوں سے بڑھ کر پاویں گے اور مشرکین سے بھی۔ ان میں کا ایک ایک اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جاوے اور یہ امر عذاب سے تو نہیں بچا سکتا کہ عمر ہو جاوے۔ اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال۔

مضمون سابق کا تتمہ:

(آگے ان کے تمنا نہ کرنے کے مضمون کا تتمہ ہے، اور اشارہ ہے کہ وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) انہیں دوسرے عام آدمیوں سے بھی بڑھ کر (دنیوی) زندگی کا حریص پائیں گے۔ اور دوسروں کا تو کیا ذکر، حیرت تو یہ ہے کہ بعض مشرکوں سے بھی بڑھ کر زندگی کا حریص دیکھیں گے۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں کا ایک ایک فرد اس ہوس

میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے۔ اور (بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا کسی کی) عمر کا (زیادہ) ہو جانا عذاب سے تو نہیں بچا سکتا۔ اور ان کے سارے اعمال حق تعالیٰ کی نظروں کے سامنے ہیں یعنی برے اعمال جن پر انہیں عذاب ہونے والا ہے۔

حیرت اور بعید قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے مشرک آخرت کے منکر تھے، اس لئے ان کے عیش، مزے اور لطف و آرام جو کچھ ہیں دنیا ہی میں ہیں، وہ اگر لمبی عمر کی تمنا کریں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، مگر یہودی تو آخرت کے قائل اور بزعم خود اس کی نعمت کے اپنے آپ کو مستحق قرار دینے والے ہیں، پھر بھی دنیا میں ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں، یہ نہایت بعید ہے۔ چنانچہ آخرت کے اعتقاد کے باوجود لمبی عمر کی تمنا کرنا صاف طور سے اس امر کی دلیل ہے کہ آخرت کی نعمتوں کے مستحق ہونے کی خصوصیت کا دعویٰ، خالی زبانی دعویٰ ہے۔ دل میں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ وہاں پہونچنے پر جہنم ہی نصیب ہوگی۔ اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: آپ یہ کہئے کہ جو شخص جبرئیل سے عداوت رکھے، سو انھوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچادیا ہے خداوندی حکم سے، اس کی یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی کتابوں کی اور راہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو جو شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو اور فرشتوں کا اور پیغمبروں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا تو اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

ستائیسواں معاملہ:

بعض یہودیوں نے حضور ﷺ سے یہ سن کر کہ جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں، کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، سخت اور مشقت میں ڈالنے والے احکام اور ہولناک واقعات انہی کے ذریعہ آتے رہے ہیں۔ میکائیل علیہ السلام بہت اچھے ہیں کہ بارش اور رحمت ان سے متعلق ہیں۔ اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے۔ حق تعالیٰ ان کے قول کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ آپ (ان سے) یہ کہئے کہ اگر کوئی شخص جبرئیل سے عداوت رکھتا ہے (تو وہ جانے، لیکن اس امر کا قرآن کے نہ ماننے سے کیا تعلق ہے؟ کیونکہ اس میں تو وہ محض سفیر ہیں) انھوں نے تو (سفارت کے طور پر اللہ کے حکم سے) یہ (قرآن) آپ کے دل تک پہونچا دیا ہے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے؟ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے، اور خود) اس کی یہ حالت ہے کہ یہ اپنے سے پہلے والی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے

اور (ضروری مصلحتوں کی) رہنمائی کر رہا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا رہا ہے اور آسمانی کتابوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس قرآن ہر حال میں قابل اتباع آسمانی کتاب قرار پایا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے اس کو نہ ماننا پوری حماقت ہے۔ اب رہا خود جبرئیل سے عداوت کا مسئلہ تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھنا یا اس کے دوسرے فرشتوں سے یا خود میکائیل سے جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، ان سب سے دشمنی رکھنا اور جبرئیل سے دشمنی رکھنا یہ سب برابر شمار کئے جاتے ہیں اور ان سب عداوتوں کے سلسلہ میں قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہوا اور اس کے فرشتوں کا اور پیغمبروں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا (ہو تو، ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

سفیر میں دو صفتوں کا ہونا کافی ہے:

پہلی آیت کے بیان کا تتمہ یہ ہے کہ سفارت کے صادق ہونے کے لئے سفیر میں دو صفتوں کا ہونا کافی ہے، اول مامور ہو، یعنی اسے سفارت کا کام دیا گیا ہو، دوسرے وہ امانت دار ہو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے امین ہونے سے تو ظاہراً یہود کو بھی انکار نہیں تھا، وہ صرف بطور عناد ظاہر میں اس کا انکار کرتے تھے کہ قرآن کا نزول اللہ کی طرف سے ہوا ہو۔ اس لئے یہاں اسی کو ثابت کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے نکتہ سے بھی یہ تفصیل اس مقام کے لئے موزوں و مناسب ہے، کیونکہ مامور سے کوئی معاملہ کرنے کا اثر عرف کے لحاظ سے سفیر کو مقرر کرنے اور اس کو حکم دینے والے تک پہونچتا ہے۔ اس طرح ان کی عداوت کا اللہ سے عداوت کے لئے لازم ہونا پوری طرح واضح ہو گیا۔ اور یہ بھی اس مقام کے مقاصد میں شامل ہے۔

﴿عَلٰى قَلْبِكَ﴾ سے وسوسہ کا جواب:

اور دوسری آیت میں فقرہ ﴿عَلٰى قَلْبِكَ﴾ سے کسی کو وسوسہ نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن کے الفاظ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں، صرف معانی ہی نازل شدہ ہیں۔ اس وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ قلب جس طرح معانی کا ادراک کرتا ہے اسی طرح الفاظ کا بھی تو ادراک کرتا ہے بلکہ اصلاً تو ادراک کرنے والا یہی ہے کہ کان وغیرہ حواس تو محض اس کے آلات ہیں، جیسے آنکھ کے سامنے عینک کہ یہ آنکھ کے لئے معاون اور مددگار ضرور ہے، لیکن اصلاً ادراک کرنے والی تو آنکھ ہی ہے۔ خاص طور سے وحی کی حالت میں کہ بے خودی طاری ہونے سے ظاہری حواس فاعل نہیں رہتے، اس وقت کان کے واسطہ کے بغیر الفاظ بھی قلب ہی پر وارد ہوں گے۔ جب اونگھتے یا سوتے میں کوئی خواب دیکھے اور اس میں کسی سے کچھ سنے تو ظاہر ہے کہ ظاہری کان پوری طرح معطل ہے، ورنہ اور باتیں بھی سنائی دیتیں، مگر یقینی بات ہے کہ اس میں الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات خواب بیان کرتے وقت یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ الفاظ تھے، بلکہ بعض اوقات الفاظ ایسے

بھی ہوتے ہیں جن کے معنی معلوم نہیں ہوتے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ جانے اس کے کیا معنی ہوں گے۔ اس کو خواب سے زیادہ کشف اور ریاضت والے سمجھتے ہیں۔ اور وحی کی شان تو ان سب سے ارفع واعلیٰ ہے اور عالم باطن سے اتصال میں سب سے زیادہ قوی ہے کہ ہم لوگ اس کی پوری حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ایسے عجیب وغریب معاملہ میں نص سے ثابت کسی شے کی نفی محض قیاس یا عدم فہم سے کرنا عظیم غلطی ہے اور قرآنِ کریم میں خود جگہ جگہ نزول کے ساتھ لسان عربی کی قید کا ذکر ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ میں وحی آتی تھی۔ اس لئے اس وسوسہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضحہ نازل کئے ہیں اور کوئی انکار نہیں کیا کرتا مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

اٹھائیسواں معاملہ:

اور (بعض یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی واضح دلیل نازل نہیں ہوئی جسے ہم جانتے پہچانتے ہوں، اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ تو ایک واضح دلیل کی بات کرتے ہیں) ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے واضح دلائل نازل کئے ہیں (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، اب ان کا انکار نہ جاننے کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ انکار عدول حکمی کی وجہ سے ہے) اور (قاعدہ کلیہ ہے کہ) ایسے (دلائل کا) کوئی انکار نہیں کیا کرتا، سوائے ان لوگوں کے جو نافرمانی اور حکم عدولی کے عادی ہیں۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا اور جب کبھی بھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا ہوگا اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو یقین ہی نہیں رکھتے۔

انتیسواں معاملہ:

بعض یہودیوں کو جب وہ عہد یاد دلایا گیا جو ان سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے بارے میں توراۃ میں لیا گیا تھا تو انھوں نے خود عہد کرنے ہی کا صاف انکار کر دیا۔ اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ کیا (اس عہد کے لینے سے انہیں انکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہے کہ) انھوں نے اپنے مسلّم عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان

لوگوں نے (دین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا، اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظرانداز کردیا ہوگا، بلکہ ان (عہد کی تعمیل نہ کرنے والوں) میں سے زیادہ تر تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے، تعمیل نہ کرنا تو فسق ہی تھا، اور تعمیل نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)

فائدہ: ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ ان میں سے بعض لوگ ان عہدوں کو پورا بھی کرتے رہے، حتی کہ آخر میں جناب رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تصدیق کر رہے ہیں، اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے: ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو گویا اصلاً علم ہی نہیں۔

سابق مضمون کا تتمہ:

اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر اللہ کی طرف سے آئے جو (خود رسول ہونے کے ساتھ ساتھ) اس کتاب کی بھی تصدیق کر رہے ہیں جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی۔ کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر ہے تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراۃ پر عمل تھا، جسے وہ بھی اللہ کی کتاب مانتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود) ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اللہ کی اس کتاب ہی کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو اس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا اصلاً علم ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۚ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۚ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

ع ۱۲

ترجمہ: اور انھوں نے ایک ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی

سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے۔ اور اس کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں، جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے، سو تو کہیں کافر مت بن جائیو۔ سو لوگ ان دونوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے۔ اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے، مگر خدا ہی کے حکم سے اور ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں ہیں۔ اور ضرور یہ بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور بیشک بری ہے وہ چیز جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں۔ کاش ان کو عقل ہوتی۔ اور اگر وہ لوگ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدائے تعالیٰ کے یہاں کا معاوضہ بہتر تھا، کاش ان کو عقل ہوتی۔

یہود کا جادو کی اتباع کرنا (سابقہ مضمون کا تتمہ)

اس مقام کی خصوصیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ترجمہ اور تفسیر سے پہلے ایک مضمون بطور مقدمہ کے پیش کر دیا جائے تا کہ تفسیر کو سمجھنے میں سہولت ہو اور ذہن کے الجھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

مقدمہ: ایک زمانہ میں جس کی تعیین کی مجھے پوری تحقیق نہیں ہے، دنیا میں بالخصوص بابل میں جادو کا بہت زیادہ چرچا ہو گیا تھا اور اس کے عجیب عجیب آثار کو دیکھ کر جہلا کو اس کی حقیقت اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت میں اشتباہ اور خلط ملط ہونے لگا، حتیٰ کہ وہ بعض جادوگروں کو مقدس اور قابل اعتماد سمجھنے لگے۔ اور بعض اس کو نیک عمل سمجھ کر سیکھ سیکھ کے اس پر عمل کرنے لگے، جیسا کہ بالکل اسی طرح کے معاملے آج کل مسمریزم کے سلسلہ میں ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلطی اور اشتباہ کو دور کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت اور ماروت نام کے اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر، اس کی قسموں اور شعبدوں کی حقیقت سے مطلع کر دیں تا کہ اشتباہ دور ہو جائے۔ اور لوگ سحر پر عمل اور ساحروں کی اتباع کرنے سے اجتناب کر سکیں اور جس طرح انبیاء کی نبوت کو معجزات اور دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے اسی طرح ان کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے تا کہ آن ﷺ کے ارشادات کی اطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام حضرات انبیاء علیہم السلام سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اول تو انہیں جادوگروں سے ممتاز کرنا مقصود تھا، اس حیثیت سے کہ گویا وہ ایک فریق تھے، چنانچہ دونوں فریقوں کے علاوہ حکم کسی تیسرے کا ہونا مناسب تھا۔ دوسرے اس کام کی تکمیل ان اقوال و افعالِ سحر کی نقل و حکایت کے بغیر عادۃً نہیں ہو سکتی اور اگر چہ یہ بات عقل اور نقل کے لحاظ سے مسلم ہے کہ کفر کا نقل کرنا کفر نہیں ہوتا پھر بھی چونکہ یہ حضرات مظہر ہدایت تھے اس لئے ان سے اس کام کا لینا مناسب نہیں تھا، لہٰذا فرشتے تجویز کئے گئے، کیونکہ تکوین کے کارخانہ میں جو کہ خیر اور شر سب پر مشتمل ہے ان سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں

جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے تو عام مصلحتوں کے نتائج کی وجہ سے خیر ہوں، لیکن خود اپنے آپ میں خاص مفسدہ اور بگاڑ کے لازم آنے کی وجہ سے شر ہوں، جیسے کسی ظالم کو نشو ونما دینا یا کسی موذی جانور کی تربیت کرنا کہ تکوین کے لحاظ سے محمود اور اچھا ہے، لیکن تشریعاً مذموم و برا۔ برخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان سے خاص طور سے تشریعیات کا کام لیا جاتا ہے، جو خصوصاً اور عموماً خیر ہی خیر ہیں۔

اور باوجودیکہ یہ نقل اور حکایت مذکورہ بالا غرض کی وجہ سے ایک تشریعی کام تھا، لیکن اس امر کے قریب ہونے کے احتمال کی وجہ سے کہ اس میں جادو کے عمل کا سبب نہ ہو جائے جیسا کہ واقع میں ہوا۔ ان حضرات کو بالواسطہ سبب بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔ البتہ کلیات شرعیہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی۔ چنانچہ قواعد کلیہ آیت کی تفسیر کے بعد سحر کی حلت وحرمت کے بیان میں احقر بھی نقل کرے گا۔ فتنہ کے احتمال کی وجہ سے جزئیات کی تفصیل ان کے ذریعہ بیان نہیں کی گئی۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے انبیاء علیہم السلام نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے اور اس کی حقیقت بھی بتا دی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتائے کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحب معاملہ سے یوں چال بازی کر کے فلاں بات کہے اور اسی طرح چونکہ اس سے تو لوگ دوسری ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں یا مثلاً جادو کی قسموں ہی میں شامل فرض کر لیجئے کہ قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ بتایا گیا کہ دست غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں روپیہ مل جائے تو ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ فلاں عمل اس طرح پڑھنے سے روپے ملنے لگتے ہیں۔ آگے اللہ تعالیٰ حکمت اور قدرت والے ہیں۔ محض سمجھانے کے لئے گمان کے طور پر اتنا لکھ دیا گیا۔

حاصل یہ کہ انہوں نے بابل میں آ کر اپنا کام شروع کر دیا کہ جادو کی اصل اور فرع ظاہر کر کے لوگوں کو اس برے عمل سے بچنے اور جادوگروں سے نفرت اور دوری رکھنے کی تاکید اور تنبیہ کی۔ جیسے کوئی عالم دیکھتا ہے کہ جاہل عوام اکثر نادانی اور ناسمجھی سے کفر کے کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریر یا تحریر کے ذریعہ ان کلمات کو جمع کر کے جو اس وقت عام طور پر استعمال ہوتے ہیں عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات برے اور غلط ہیں، ان سے احتیاط رکھنی چاہئے، اس لئے ان سے بچے رہنا۔

اب مختلف قسم کے لوگوں کی وقتاً فوقتاً ان کے پاس آمد و رفت شروع ہوئی جو درخواست کرنے لگے کہ ان اصولوں اور فروعات کے بارے میں ہمیں بھی بتا دیجئے، تاکہ ہم ناواقفیت کے سبب کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس وقت انھوں نے احتیاط کے طور پر اور اصلاح کی غرض سے اپنے اوپر اس امر کو لازم کر لیا کہ ان اصولوں اور فروع کو بتانے سے پہلے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہماری اس اطلاع کے ذریعہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ

دیکھیں اس بارے میں معلوم ہونے کے بعد کون اپنے دین کی اصلاح اور حفاظت کرتا ہے کہ شر اور برائی سے آگاہ ہو کر اس سے بچتا ہے اور کون اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر کے بارے میں معلوم ہونے پر خود ہی اس شر کو اختیار کر لیتا ہے اور اس پر عمل کرنے لگتا ہے، جس کا انجام کفر ہے۔ چاہے اعتقاد کے لحاظ سے یا عمل کے لحاظ سے، اس لئے دیکھو ہم تمہیں نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اس کا علم اچھی اور نیک نیت سے حاصل کرنا۔ اور پھر اس پر قائم بھی رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر تحقیق اور دریافت کر لو کہ میں بچنے کی غرض سے معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کی برائی میں خود ہی مبتلا ہو کر ایمان برباد کر لو۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ اور کیا خیر خواہی کر سکتے تھے۔

غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد و پیمان کر لیتا، وہ اس کے سامنے جادو کے سارے اصول اور فروع بیان کر دیتے کہ کام ہی ان کا یہ تھا۔ اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ اور اختیار سے فاجر یا کافر بنتا ہے تو وہ جانے۔

چنانچہ بعض لوگ اس عہد پر قائم نہ رہے اور اس سحر کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیا، جو فسق تو یقیناً ہے، جبکہ اس کے استعمال کے بعض طریقے کفر بھی ہیں، اس طرح وہ فاجر اور کافر بن گئے۔

اس اصلاحی ارشاد اور پھر مخاطب کی طرف سے اس کی خلاف ورزی کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بہت بڑے عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھے قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے تاکہ خود بھی شبہات اور غلط فہمیوں سے محفوظ رہوں اور مخالفوں کو بھی جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ مجھے دھوکہ دے کر پڑھ لے اور پھر خود ہی باطل قوتوں کی مدد کے لئے اسے استعمال کرنے لگے۔ اور وہ اس احتمال کی وجہ سے اس شخص کو نصیحت کرے کہ ایسا ہرگز مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے تب اس کو پڑھا دیا جائے، لیکن پھر وہ شخص قصداً اسی اندیشہ کے مطابق اس کا غلط استعمال کرنے لگے۔ ظاہر ہے اس کے غلط استعمال سے اس معلم پر کسی برائی کا الزام نہیں آسکتا۔ اسی طرح سحر سے متعلق اس اطلاع سے ان فرشتوں پر کسی شبہ یا وسوسہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اس خدمت کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم۔

اب اللہ کی مدد سے اس آیت کی تفسیر پیش کی جاتی ہے۔

اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انھوں نے (اللہ کی کتاب کا تو اتباع نہ کیا) اور ایسی چیز کا (یعنی سحر کا) اتباع کیا جس کا چرچا حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت (کے دور) میں شیاطین (یعنی خبیث جن) اور بعض وہ بیوقوف لوگ کیا کرتے تھے (جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں جادو کا گمان رکھتے ہیں۔ جب کہ یہ بالکل ہی لغو بات ہے۔ کیونکہ سحر تو اعتقاد یا عمل کے لحاظ سے کفر ہے۔ اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے (نعوذ باللہ کبھی بھی) کفر نہیں کیا، مگر (ہاں) شیاطین یعنی خبیث جن بیشک کفر (یعنی سحر کی باتیں اور کام) کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی

تھے دوسرے) آدمیوں کو بھی جادو سکھایا کرتے تھے (اس طرح وہی سحر آج تک ایک دوسرے کو ہوتا ہوا چلا آرہا ہے اس کا اتباع یہ یہودی کرتے ہیں) اور (اسی طرح یہ لوگ) اس (سحر) کا بھی (اتباع کرتے ہیں) جو کہ بابل میں ان دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کے واسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کے نام ہاروت اور ماروت تھے۔ اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہیں بتاتے تھے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی (مخلوق کے لئے) ایک (خداوندی) امتحان و آزمائش ہے (کہ ہم سے جادو کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہے) اس لئے کہیں تم (اس بارے میں معلومات حاصل کر کے) کافر مت بن جانا (کہ اس میں پھنس جاؤ) پھر بھی (بعض) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا جادو سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں جدائی و علاحدگی پیدا کر دیتے تھے۔ اور (اس سے کسی کو وہم اور خوف میں بتلا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (جادوگر) لوگ اس (جادو) کے ذریعہ کسی کو (ذرا سا) بھی ضرر نہیں پہونچا سکتے۔ مگر اللہ ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا جادو سیکھ کر بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) انہیں ہی (گناہ کی وجہ سے) ضرر پہونچانے والی ہیں۔ اور (کسی قابل ذکر درجہ میں) انہیں نفع پہونچانے والی نہیں ہیں (تو سحر کے اتباع سے یہودی بھی بڑے نقصان میں ہوں گے) اور (یہ بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں ہے بلکہ) لازمی طور پر یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص (اللہ کی کتاب کے بدلہ) اس (جادو) کو اختیار کرے، ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بیشک وہ چیز (یعنی سحر اور کفر) بری ہے جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں۔ کاش انہیں (اتنی) عقل ہوتی اور اگر وہ لوگ (اس کفر اور بدعملی کے بجائے ایمان اور تقوی (اختیار) کرتے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کا معاوضہ (اس کفر اور بدعملی سے ہزار درجہ) بہتر تھا۔ کاش انہیں (اتنی) عقل ہوتی۔

فائدہ (۱): یہ بے وقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سحر، جادو کی نسبت کیا کرتے تھے یہود ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیان میں ان کی براءت بھی ظاہر فرما دی۔

فائدہ (۲): ان آیتوں سے یہودیوں کی قباحت بیان کرنا مقصود ہے، کیونکہ ان میں جادو کا بھی چرچا تھا۔

قصۂ زہرہ کی تحقیق:

ان آیتوں کے سلسلہ میں ایک لمبا چوڑا قصہ زہرہ کا مشہور ہے جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے۔ جن علماء و مفسرین نے اس کو قواعد شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے، انھوں نے اس کو رد کر دیا ہے اور جنھوں نے کسی تاویل کی وجہ سے قواعد شرعیہ کے خلاف نہیں سمجھا انھوں نے اسے رد نہیں کیا۔ احقر کو اس وقت اس کے صحیح اور غلط ہونے سے قصداً کوئی بحث نہیں ہے، البتہ میں یہ بات ضرور کہتا ہوں کہ ان آیتوں کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں ہے، جیسا کہ قارئین نے مقدمہ کے

مضمون سمیت تفسیر کو پڑھ کر دیکھ لیا ہوگا۔

جادو کے احکام کی تفصیل:

سحر یا جادو کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس میں کفریہ کلمات ہوں جیسے شیاطین یا ستاروں وغیرہ سے استعانت، تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو ضرر پہونچایا جائے یا نفع پہونچایا جائے۔ اور اگر مباح کلمات ہوں تو اگر کسی کو شرعی حکم کے خلاف کسی قسم کا ضرر پہونچایا جائے یا کسی اور ناجائز مقصد کے تحت استعمال کیا جائے تو فسق اور معصیت (گناہ کبیرہ) ہے اور اگر ضرر نہ پہونچایا جائے اور نہ ہی کسی دوسرے ناجائز مقصد کے تحت استعمال کیا جائے تو اس کو عرف عام میں سحر یا جادو نہیں کہا جاتا، بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈا کہتے ہیں جو مباح ہے۔ البتہ لغت میں اس کو بھی لفظ سحر میں شامل کیا جاتا ہے، کیونکہ لغت میں ہر عجیب تصرف کو سحر کہا جاتا ہے۔ اور اگر کلمات ایسے ہوں جو سمجھ میں نہ آتے ہوں تو ان میں کفر کا احتمال ہونے کی وجہ سے ان سے بچنا واجب ہے اور تمام تعویذ گنڈوں اور نقش وغیرہ کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے کہ ایسے الفاظ نہ ہوں جو سمجھ میں نہ آئیں۔ خلاف شرع نہ ہوں اور ناجائز مقاصد کے لئے استعمال نہ ہوں تو ان شرطوں کے ساتھ جائز ہیں، ورنہ ہر ناجائز پر ناجائز اور کفر عملی کا اطلاق صحیح ہے۔

فائدہ (۱): بعض لوگوں نے ان آیات کی بنیاد پر یہ سمجھ لیا ہے کہ سحر میں میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے یا اس طرح کے اور انہی کے قریب قریب سے زیادہ اثرات نہیں ہوتے ہیں، لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ کسی خاص امر کے ذکر سے غیر مذکور امور کی نفی لازم نہیں آتی۔ کسی خاص امر کے ذکر کے موقع ومحل کے اختلاف کے مطابق بہت سے اسباب اور ترجیحات ہوتے ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ خاص یہ سحر ایسا ہی ہو اور اس طرح کے دعوے کرنے والوں کے پاس اس بارے میں کوئی عقلی دلیل بھی نہیں ہے۔

فائدہ (۲): چونکہ یہودی سب باتوں کو جاننے کے باوجود علم کے خلاف عمل کرتے تھے اور حق وصداقت کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتے تھے، اس لئے پہلے ان کے جاننے کی خبر دی پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کر دی کہ کاش انہیں علم اور عقل ہوتی، کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبر نہ ہو، وہ جہل ہی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تم راعنا مت کہا کرو اور انظرنا کہہ دیا کرو، اور سن لو اور کافروں کو سزا دردناک ہوگی۔

تیسواں معاملہ:

(بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آ کر آپ کو لفظ "راعنا" سے

خطاب کرتے جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں برے ہیں اور وہ اسی معنی کو ذہن میں رکھ کر یہ لفظ کہتے تھے، جبکہ عربی زبان میں اس لفظ کے معنی بہت اچھے ہیں کہ ہماری مصلحت کی رعایت فرمایئے، اس لئے عربی جاننے والے اس شرارت کو نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اور اس اچھے معنی کے لحاظ سے بعض مسلمان بھی حضور کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، جس کی وجہ سے ان شریروں کو مزید موقع ملا۔ حق تعالیٰ نے اس شرارت کا راستہ بند کرنے کے لئے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ) اے ایمان والو! تم لفظ ''راعنا'' مت کہا کرو۔ اور (اگر اس کا ظاہری مطلب عرض کرنے کی ضرورت پڑا کرے تو لفظ) ''انظرنا'' کہہ دیا کرو (کہ اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمایئے) اور (اس حکم کو اچھی طرح) سن لو (اور یاد رکھو) اور (ان) کافروں کو (تو) دردناک سزا ہوگی ہی (جو لوگ پیغمبر ﷺ کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)

مسئلہ: اس حکم سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کسی مباح فعل سے کسی کو گناہ کرنے کی گنجائش ملے تو وہ فعل خود اس کے حق میں مباح نہیں رہتا، جیسے عالم کے کسی فعل سے سند لے کر جاہل خلافِ شرع کام کرنے لگے تو اگر وہ فعل ضروری نہ ہو تو خود اس عالم کے لئے بھی منع ہو جائے گا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝

ترجمہ: ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ ان اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری نصیب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرما لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔

اکتیسواں معاملہ:

(بعض یہودی بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دل سے تمہارے خیر خواہ ہیں اور ہزار جان سے چاہتے ہیں کہ تمہیں دینی احکام ہمارے دینی احکام سے بہتر عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں۔ مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ اس خیر خواہی کے دعوی کو جھوٹا قرار دیتے ہیں کہ) کافر لوگ (خواہ) ان اہل کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکوں میں سے، اس امر کو ذرا بھی پسند نہیں کرتے کہ تمہیں تمہارے رب کی طرف سے کسی طرح کی بہتری نصیب ہو اور (ان کے اس حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے، مخصوص فرما لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔

تفسیر: یہودیوں کے دو دعوے تھے: ایک یہودیت کا اسلام سے بہتر ہونا، دوم: ان کا مسلمانوں کا خیر خواہ ہونا، لیکن

جہاں تک پہلے دعوی کا سوال ہے، اول تو اس کو ثابت نہیں کر سکے، ایسی صورت میں محض خالی دعوی سے کیا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی فضول اور لغو بات۔ کیونکہ ناسخ کے آنے سے منسوخ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ افضل اور غیر افضل پر موقوف نہیں۔ لہٰذا اس کا جواب انتہائی ظاہر ہونے کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف دوسرے دعوئی خیر خواہی میں کلام کیا گیا ہے اور یہاں مشرکوں کا ذکر مضمون کی تقویت کے لئے کیا گیا کہ جس طرح وہ یعنی مشرک تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں، اسی طرح ان کو یعنی یہودیوں کو سمجھو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۚ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

ترجمہ: ہم کسی آیت کا حکم جو موقوف کر دیتے ہیں یا اس آیت کو فراموش کرا دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں، کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شئ پر قدرت رکھتے ہیں۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص ان ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں۔

بتیسواں معاملہ:

(یہودیوں نے قبلہ کا حکم بدل جانے پر جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، طعنہ دیا تھا۔ اور مشرک بھی بعض احکام کے منسوخ ہو جانے پر زبان درازی کرتے تھے۔ حق تعالیٰ اس طعنہ اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم اگر کسی آیت کا حکم موقوف کر دیتے ہیں (گو آیت قرآن میں یا ذہنوں میں محفوظ و باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کرا دیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض یا طعنہ کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے۔ چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت کے مثل لے آتے ہیں (اے معترض!) کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شئے پر قدرت رکھتے ہیں (تو ایسے قادر کو مصالح کی رعایت رکھنا کیا مشکل کام ہے؟ اور) کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت خاص ان ہی کی ہے (جب ان کی اس قدرت و سلطنت میں کوئی شریک اور حصہ دار نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دوسرا حکم دیدینے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے۔ غرض دوسرے حکم کی تجویز سے بھی کوئی منع کرنے والا نہیں ہے اور اس حکم کے جاری کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے) اور (یہ بھی سمجھ لو کہ) حق تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہے۔ اور جب وہ ولی (یار) ہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے۔ اور جب مددگار ہیں تو ان احکام پر عمل کے وقت تمہارے مخالفوں کی مزاحمت کے ضرر سے بھی محفوظ رکھیں گے۔ البتہ اگر اس ضرر سے بڑھ کر کوئی آخرت کا نفع ملنے والا ہو تو ظاہری طور پر مخالف کا مسلط ہو جانا دوسری بات ہے۔

منسوخ کی قسمیں:

دوسرے حکم کا مصلحت میں بہتر یا اس جیسا ہونا کبھی ثواب کے اعتبار سے ہوتا ہے، کبھی آسانی کے اعتبار سے۔ اور کبھی دوسرا حکم یہی تجویز ہوتا ہے کہ بالکل ہی معاف کر دیا، یہ بھی ایک حکم ہے۔ اگر کوئی قرآنی حکم حدیث کے ذریعہ منسوخ ہو تو وہ حدیث بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ غرض اس میں منسوخ ہونے کی سب قسمیں آ گئیں۔

ناسخ کے لئے ضروری امور:

دوسرے حکم کے لئے عقل کے لحاظ سے یہ امور ضروری ہیں، اس کا مصلحت کے مطابق ہونا، حاکم کا قادر ہونا، دوسرے کسی کا مزاحم کا نہ ہونا، حاکم کا محکوموں کے لئے خیر خواہ ہونا، اگر کوئی ان سے مزاحمت کرے تو ان کی مدد کرنا۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے تمام شرطوں کو جمع کر دیا۔ واللہ اعلم

نسخ بر بنائے مصلحت ہوتا ہے:

قانون کا بدلنا کبھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ پہلے سے بانیٔ قانون سے کوئی غلطی ہو گئی تھی، ایسی تبدیلی اور نسخ احکام الٰہی میں محال ہے، اور کبھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ محکوم کی حالت کے بدلنے کی وجہ سے مصلحت بدل گئی ہے، جیسے مریض کی حالت بدلنے کی وجہ سے نسخہ بدل دیا جاتا ہے، ایسا نسخ عام طور سے ہوتا ہے اور یہ جائز ہے اور اس کے سلسلہ میں کوئی عقلی یا نقلی اشکال نہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

ترجمہ: ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے درخواستیں کرو جیسا کہ اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی درخواستیں کی جا چکی ہیں۔ اور جو شخص بجائے ایمان لانے کے کفر کرے، بلاشک وہ شخص راہِ راست سے دور جا پڑا۔

تینتیسواں معاملہ:

(بعض یہودیوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں بطور عناد عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر توریت ایک ہی بار میں نازل ہوئی، اسی طرح آپ بھی قرآن مجید مجموعی طور پر ایک ہی دفعہ میں لائیے۔ اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ) ہاں (کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے (وقت) کے رسول سے ایسی (بیجا) درخواستیں کرو، جیسا کہ اس سے پہلے (تمہارے بزرگوں کی طرف سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کی جا چکی ہیں (مثلاً اللہ تعالیٰ کو علانیہ دیکھنے کی درخواست جس کا پہلے ذکر

آچکا ہے اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہو۔ یہ محض کفر کی باتیں ہیں اور) جو شخص ایمان لانے کے بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بے شک وہ شخص راہِ راست سے دور جا پڑا۔

تفسیر: یہ درخواست بیجا اس لئے تھی کہ ہر فعل میں حق تعالیٰ کی حکمتیں مختلف ہوتی ہیں، پھر بندے کو ان میں طریقہ کی تعیین کا کیا حق ہے کہ ایسے ہو ایسے نہ ہو، بلکہ اس کا فرض تو یہ ہے کہ:

زباں تازہ کردن باقرار تو ❁ نہ پنگیختن علت از کار تو

[آپ کے حکم کو ماننے کے ساتھ زبان کو تازہ رکھنا (ضروری ہے) آپ کے حکم کی وجہ ڈھونڈھنا درست نہیں]

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ: ان اہلِ کتاب میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں محض حسد کی وجہ سے جو کہ خود ان کے دلوں ہی سے ہے، حق واضح ہوئے پیچھے، خیر معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ اپنا حکم بھیجیں اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اور نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور زکوٰۃ دیئے جاؤ۔ اور جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے حق تعالیٰ کے پاس اس کو پالو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کو دیکھ رہے ہیں۔

چونتیسواں معاملہ:

بعض یہودی رات دن مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے انداز میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ اور ناکامی کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو چوکنا کیا کہ ان اہل کتاب (یعنی یہودیوں) میں سے بہت سے لوگ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر کر ڈالیں (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں ہے، جیسا کہ وہ ظاہر کرتے ہیں، بلکہ) محض اس حسد کی وجہ سے ہے، جو کہ (تمہاری جانب سے کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے (اور یہ بھی نہیں کہ ان کے سامنے حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہونے کے بعد (یہ حالت ہے۔ اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا موقع تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو) معاف کرو اور درگذر کرو۔ جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق)

اپنا حکم (نیا قانون بھیجیں) اس طرح اشارہ کے طور پر بتا دیا کہ ان کی شرارتوں کے علاوہ امن عامہ کے انتظام کے قانون یعنی قتال اور جزیہ کے ذریعہ ہم جلد ہی کرنے والے ہیں، اس حکم پر مسلمانوں کو اپنی کمزوری اور ان کی قوت وطاقت کی وجہ سے اس قانون کے جاری کئے جانے کے متعلق تعجب کا موقع تھا، اس لئے ارشاد ہوا کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو، خواہ عجیب ہو) قادر ہیں۔ اور (فی الحال صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ (اور جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ (اور جب وہ قانون آجائے گا ان اعمال کے ساتھ اس کو بھی اضافہ کر لینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آئے، صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی رہے گی، نہیں بلکہ) جو بھی نیک کام اپنی بھلائی کے واسطے کرتے رہوگے، حق تعالیٰ کے پاس (پہونچ کر) اس کو (پورا پورا مع صلہ کے) پاؤگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کو دیکھ رہے ہیں (ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا)

فائدہ: اس وقت کی حالت کا تقاضہ یہی تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور جہاد سے متعلق آیتیں نازل فرمائیں۔ تب یہودیوں کے ساتھ اسی قانون سے کام لیا گیا اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ان کے فساد و بگاڑ کے مطابق قتل یا ملک بدری یا محصول مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۞ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۞

ترجمہ: اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں۔ یہ دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ آپ کہئے کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو، ضرور دوسرے لوگ جاویں گے جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

۳۵واں معاملہ: نصاریٰ کو شریک کرتے ہوئے:

(اس مضمون میں یہود کے ساتھ نصاریٰ بھی شریک ہیں، اس لئے انہیں بھی ذکر میں شامل کر لیا گیا اور یہودی اور نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں کوئی اور ہرگز نہیں جانے پائے گا سوائے ان لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ یہودیوں کا قول ہے) یا ان لوگوں کے جو عیسائی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے) حق تعالیٰ دونوں کا رد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ (سو وہ تو دلیل کیا لائیں گے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ اب ہم اس کے خلاف پہلے یہ دعویٰ کرتے

ہیں کہ) دوسرے لوگ ضرور جائیں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا قانون جو آسمانی ملت والوں کے اتفاق سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف کرلے (یعنی فرماں برداری اختیار کرے عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ دل سے فرماں برداری اختیار کی ہو کسی مصلحت کی وجہ سے محض ظاہر داری نہ ہو) تو ایسے شخص کو اس (کی فرماں برداری) کا عوض اس کے پروردگار کے پاس پہونچ کر ملتا رہے گا۔ اور ایسے لوگوں پر (قیامت میں) نہ کوئی اندیشہ (والا واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ ہی ایسے لوگ (اس دن) رنجیدہ و مغموم ہونے والے ہیں (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سنا کر بے فکر کر دیں گے)

تفسیر: استدلال کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ قانون مسلم ہے تو صرف یہ دیکھ لو کہ یہ مضمون کس پر صادق آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی سابق حکم کے منسوخ ہو جانے کے بعد اس پر چلنے والا کسی بھی طرح فرماں بردار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح یہودی اور نصرانی فرماں بردار نہیں ہوئے، بلکہ دوسرے حکم پر عمل کرنا ہی فرماں برداری قرار دی جائے گی۔ اور یہ شان مسلمانوں کی ہے کہ انھوں نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و شریعت کو قبول کر لیا۔ اس طرح یہی جنت میں داخل ہونے والے ثابت ہوئے اور مخلص کی قید سے منافق ان لوگوں میں سے نکل گئے کہ وہ قانون شرعی کی رو سے کفار ہی میں شامل ہیں اور جہنم کے مستحق ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

ترجمہ: اور یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں، حالانکہ یہ سب کتابیں پڑھتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ جو کہ بے علم ہیں ان کا سا قول کہنے لگے سو اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان فیصلہ کر دیں گے قیامت کے روز، ان تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔

چھتیسواں معاملہ: نصاریٰ اور مشرکوں کو شریک کرتے ہوئے:

(ایک بار کچھ یہودی اور کچھ نصاریٰ جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے، یہودی اپنے عقیدہ کے مطابق نصاریٰ کے دین کو بالکل اصل ہی سے باطل قرار دیتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول اور انجیل کے اللہ کی کتاب ہونے کا انکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ بھی تعصب میں آکر یہود کے دین کو سرے سے باطل کہنے لگے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول اور توریت کے اللہ کی کتاب ہونے کا انکار کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تعصب سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل کر کے رد فرماتے ہیں:) اور یہودی کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے ہی غلط

ہے) اور (اسی طرح) نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کا مذہب کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے ہی غلط ہے) حالانکہ یہ سب (دونوں فریقوں کے لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور دونوں کی کتابوں میں دونوں رسولوں کی اور دونوں کی تصدیق موجود ہے جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہے، اگرچہ یہ الگ بات ہے کہ ان کے منسوخ ہو جانے کی وجہ سے اب ان پر عمل نہ ہوتا ہو۔ اور اہل کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کو دیکھ کر مشرکوں کو بھی جوش آ گیا اور اس طرح وہ لوگ بھی جو کہ (آسمانی دین اور کتاب سے متعلق بالکل ہی) بے علم ہیں، ان (ہی اہل کتاب) کی سی بات کہنے لگے (کہ ان یہود و نصاریٰ کا دین بے بنیاد ہے، ہم ہی حق پر ہیں) تو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے۔ ان تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔

عملی فیصلہ یہ کہ اہل حق کو جنت میں اور اہل باطل کو دوزخ میں بھیج دیں گے اور یہ قید اس لئے لگائی کہ قول اور دلیل کے مطابق تو فیصلہ حق اور باطل کے درمیان نقلی اور عقلی دلائل سے دنیا میں بھی ہو چکا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران ہونے میں کوشش کرے۔ ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا۔ ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

سینتیسواں معاملہ: نصاریٰ اور مشرکوں کو شریک کرتے ہوئے:

(قبلہ بدلنے کے حکم کے وقت یہود تو طرح طرح کے اعتراضات کر کے کم سمجھ لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے کہ اگر وہ شبہات عام طور سے دلوں پر اثر کرتے تو ان کا لازمی نتیجہ رسالت کا انکار اور ترکِ صلوٰۃ ہوتا اور ترکِ صلوٰۃ سے مسجد کی ویرانی ظاہر ہے تو گویا یہ یہودی اس طرح ترکِ صلوٰۃ اور مساجد، خاص طور سے مسجدِ نبوی کو ویران کرنے کی کوشش میں تھے۔ اور روم کے بعض سلاطین جو نصاریٰ کے اسلاف تھے اور نصاریٰ ان کے افعال سے انکار نہیں کرتے تھے، چاہے وہ نصرانی نہ ہوں، کسی وقت شام کے یہودیوں پر چڑھ آئے تھے، اس سے جو قتل و قتال ہوا اس میں بعض جہلا کے ہاتھوں سے مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی۔ اور بدامنی کی وجہ سے اس میں نماز وغیرہ کا بھی اہتمام نہ ہوا۔ اس طرح نصاریٰ کے اسلاف ترکِ صلوٰۃ اور مسجد کی ویرانی کے بانی ہوئے اور نصاریٰ کے انکار نہ کرنے کی وجہ سے انہیں اس کا الزام دیا گیا۔ اس بادشاہ کا نام طیطس تھا۔ اس کا تفصیلی قصہ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر کے شروع میں آئے گا۔ اور نصاریٰ کو

یہ قصہ اس لئے ناگوار نہیں تھا کہ اس میں یہود کی تذلیل ہوئی تھی اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے۔ اور جب جناب رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ سے قبل عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں داخل ہوکر مسجد الحرام میں طواف اور نماز ادا فرمانی چاہی تو مکہ کے مشرکوں نے آپ کو وہاں نہیں جانے دیا یہاں تک کہ اس سال آپ حدیبیہ کے مقام سے ہی واپس تشریف لائے اور پھر اگلے سال صلح اور معاہدہ کی وجہ سے عمرہ ادا فرمایا۔ اس طرح مکہ کے مشرک مسجدِ حرام کی ویرانی میں کوشش کرنے والے ہوئے۔ حق تعالیٰ عمومی انداز میں اس کی قباحت ظاہر فرماتے ہیں) اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں (جن میں مکہ مکرمہ کی مسجدِ حرام، مدینہ کی مسجدِ نبوی اور بیت المقدس کی مسجدِ اقصیٰ اور دوسری تمام مسجدیں شامل ہیں) ان میں (اللہ) کا ذکر (اور عبادت) کرنے سے روکے اور ان (مساجد) کو ویرانی (اور معطل) کرنے کی کوشش کرے۔ ان لوگوں کو کبھی بے خوف (اور بے باک) ہوکر ان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہئے تھا (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت و حرمت اور ادب و احترام سے جاتے۔ جب بے خوف اور بے باک ہوکر اندر جانے تک کا حق نہیں تو اس کی ہتک حرمت کا حق کہاں اور کب حاصل ہوسکتا ہے؟ اسی کو ظلم قرار دیا) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور آخرت میں بھی سزائے عظیم ملے گی۔

یہ رسوائی دنیا میں تو یہ ہوئی کہ یہ سب قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گذار ہوئیں اور آخرت میں کافر ہونے کی وجہ سے عذاب سے دوچار ہونا ظاہر ہے۔ اور مساجد کی ویرانی کی کوشش کی وجہ سے وہ عذاب اور بھی زیادہ شدید ہوجائے گا۔ اور اوپر کی آیت میں جو ان تینوں قوموں کے اپنے اپنے حق پر ہونے کے دعووں کا ذکر ہے۔ اس قصہ سے ایک طرح سے اس دعوی کا بھی رد ہوگیا کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحب حق ہونے کا دعوی کرنا شرم کی بات ہے۔ اور جن نصاری نے ایسا کیا تھا، وہ اگرچہ گزر چکے تھے، لیکن ان کی نسلوں کے لوگ ان کے اس فعل سے نفرت اور ناگواری ظاہر نہیں کرتے تھے، جو ایک طرح سے رضامندی اور حمایت و شرکت کی دلیل ہے۔ اس لئے ملامت کرنا بالکل بجا اور برمحل ہے، جیسا کہ یہود کے معاملات کے ضمن میں کئی بار یہ مضمون گذر چکا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

ترجمہ: اور اللہ ہی کی مملوک ہیں مشرق بھی اور مغرب بھی تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو ادھر اللہ تعالیٰ کا رخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ محیط ہیں، کامل العلم ہیں۔

اڑتیسواں معاملہ:

(یہود نے قبلہ کی تبدیلی کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنا رخ اس جہت سے دوسری جہت میں کیوں کرلیا۔ حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں:) اور اللہ ہی کی ملکیت ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا

مکان نہیں، جب وہ مالک ہیں تو جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کر دیں، کیونکہ تعیین قبلہ کی حکمت، مثلاً عبادت کرنے والوں کا اتفاق، ہیئت اور اجتماع خاطر ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا حکم کر دیں وہ متعین ہو جائے گا۔ البتہ اگر معبود کی ذات (نعوذ باللہ) کسی خاص جہت کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کے تحت اس جہت میں قبلۂ عبادت بننے کا منحصر ہونا زیبا تھا، لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہے، جب بات یہ ہے) تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ تعالیٰ (کی پاک ذات) کا رخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہتوں اور اشیاء کو) احاطہ کرنے والے ہیں (جس طرح کا احاطہ ان کی شان کے لائق ہے۔ لیکن احاطہ کرنے والے اور غیر محدود ہونے کے باوجود عبادت کے لئے جہت کو اس لئے متعین فرمایا کہ وہ کامل العلم ہیں (کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں اس تعیین میں مصلحتیں شامل ہیں، اس لئے اس کا حکم دیدیا۔

نماز میں استقبال کعبہ کی حکمت:

احقر نے قبلہ کی تعیین کی جو ایک خاص حکمت مثال کے طور پر بیان کی ہے۔ اس سے اسلام کے ان مخالفین کا اعتراض دور ہو گیا جو کہتے ہیں کہ مسلمان کعبہ کی پوجا کرتے ہیں۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ پرستش اور عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ البتہ چونکہ پرستش کے وقت دل کی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے اور عبادت کرنے والوں کی ہیئت اجتماعیہ کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہے اور یہ دونوں امر تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہیں، لہٰذا اس یکسوئی اور ہیئت اجتماعیہ کے حصول کے لئے جہت کی تعیین ضروری ہوئی۔ اس طرح اب اس میں شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعوی کرے کہ ہمارا بھی بتوں کے سامنے سر رکھنے سے یہی مقصود ہوتا ہے تو اول تو اس برأت کے دعوی سے اہل اسلام پر مذکورہ اعتراض کا کوئی تعلق نہیں۔ ہر حال میں مسلمانوں پر کیا جانے والا اعتراض باطل ہو جاتا ہے جو اس مقام پر مقصود اصلی ہے، جبکہ عام مسلمانوں اور عام کفار کی حالت کی تحقیق سے پرستش نہ کرنے کی نیت کے اس دعوی میں مسلمانوں کا راست گو سچا اور دوسروں کا دروغ گو جھوٹا ہونا ہر وقت ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس دعوی کو سچ بھی مان لیں تو بھی اس تعیین اور تقیید کے لئے کسی ایسی شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے جو غیر منسوخ ہو اور یہ سوائے اہل اسلام کے دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔

اور احقر نے ترجمہ وتفسیر کے ضمن میں حکمت کے بیان میں جو لفظ ''مثلاً'' کا اضافہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام خداوندی کی حکمتیں انحصار اور احاطہ کے ساتھ کسی کے ادراک میں نہیں آسکتیں، چنانچہ اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دوسروں کی نفی نہیں ہو سکتی۔

فائدہ: اور یہ جو فرمایا ہے کہ ادھر ہی اللہ تعالیٰ کا رخ ہے اور اسی طرح یہ فرمانا کہ وہ محیط (احاطہ کرنے والے) ہیں اور اسی طرح کے دوسرے جو بھی مضامین ہیں ان سب میں زیادہ کھود کرید نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح حق تعالیٰ کی ذات کا پورا ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں، اسی طرح ان کی صفات کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس لئے اجمالی طور پر ان سب پر ایمان لے آئیں۔ اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں، آگے اپنے کام میں لگنا چاہئے:

عنقا شکار کس نشود دام باز چین ❁ کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

[عنقا پرندے کو کوئی شکار نہیں کرسکتا، شکاری اپنا جال سمیٹ لے÷ کیونکہ یہاں ہمیشہ ہوا پر جال کا قبضہ ہے (جال جیسا چاہے گی ہوا اس کو اڑائے گی)]

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ! بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سب اُن کے محکوم ہیں۔ موجد ہیں آسمانوں اور زمین کے اور جب کسی کام کا پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کو فرما دیتے ہیں کہ ہوجا، بس وہ ہوجاتا ہے۔

انتالیسواں معاملہ: نصاریٰ اور مشرکوں کو شریک کرتے ہوئے:

(بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ اور عرب کے مشرک ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، جیسا کہ مختلف آیتوں میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے۔ حق تعالیٰ ان اقوال کے قبیح اور باطل ہونے کو بیان فرماتے ہیں) اور یہ لوگ (مختلف عنوانات سے) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ! (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ یہ امر دو حال سے خالی نہیں یا تو اولاد غیر جنس ہوگی یا ہم جنس ہوگی۔ اگر غیر جنس ہو تو یہ تو اپنے آپ میں ایک عیب ہے اور حق تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہیں، عقلاً بھی جیسا کہ تسلیم شدہ ہے اور نقلاً بھی جیسا کہ آیت میں مذکورہ فقرہ سبحانہ اس پر دلالت کر رہا ہے اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں۔ کیونکہ جو صفاتِ کمال ذات واجب کے لوازم سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور غیر اللہ میں ناپید ہیں۔ اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس لئے غیر اللہ ذات واجب نہ ہوگا، اور وجوب خود عین حقیقت یا لازم حقیقت ہے۔ چنانچہ کوئی غیر اللہ، اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہیں ہوا تو ہم جنس ہونا باطل ہوگیا۔ اب صفاتِ کمال کے حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے کی دلیلوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اول یہ کہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب خاص اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے (اور دوسرے یہ کہ ملکیت ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم بھی ہیں (اس

معنی میں کہ ان کی قدرت کے تصرفات جیسے: مارنا، جلانا، بیمار کرنا وغیرہ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ خواہ کوئی احکام شرعی کو ٹال دے۔ اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) آسمانوں اور زمین کو ایجاد کرنے والے بھی ہیں۔ اور (چوتھے یہ کہ ایجاد کی قدرت بھی ایسی عظیم اور عجیب ہے کہ) جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کو (اتنا) فرمادیتے ہیں کہ "ہوجا" اور بس وہ (اسی طرح) ہوجاتا ہے۔ (ان کو آلات واسباب اور کاریگروں اور مددگاروں کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ چاروں امر حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں پائے جاتے۔ اور یہ امر اولاد کا دعوی کرنے والوں کے نزدیک بھی مسلم تھا۔ اس طرح دلیل سے اختصاص کا مقدمہ بھی ثابت ہوکر حجت تمام ہوگئی[1]

فائدہ (۱): اللہ تعالیٰ کا خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر فرمانا اور اسی طرح اسباب اور مادوں اور قوتوں سے کام لینا، یہ سب حکمت کے لئے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو ان کی مدد کی کوئی ضرورت وحاجت نہیں۔

فائدہ (۲): علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پہلی شریعتوں میں اللہ تعالیٰ کو تخلیق کے لئے سبب اول ہونے کی وجہ سے "باپ" کہا کرتے تھے۔ جاہلوں نے اس کلام کو ولادت کے معنی میں سمجھ لیا۔ اس لئے کفر قرار پایا۔ اب غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ 'باپ' کا استعمال ناجائز قرار دیدیا گیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: اور جاہل یوں کہتے ہیں کہ ہم سے کیوں نہیں کلام فرماتے اللہ تعالیٰ یا ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل آجاوے۔

---

(۱) حضرت مفسر علام قدس سرۂ نے اس کے بعد ایک فائدہ لکھا ہے، اس میں کلمۂ ﴿ كُنْ ﴾ میں دو احتمال بیان کئے ہیں: ایک یہ کہ یہ جلدی بنادینے سے مجاز (استعارہ) ہے، دوسرا یہ کہ یہی سنتِ الٰہی ہو کہ جب وہ کوئی چیز وجود میں لانا چاہیں تو اس کو 'ہوجا' کہتے ہوں۔

پھر دو شبہات کے جواب دیئے ہیں، ایک یہ کہ جب شیئ موجود نہیں تو 'ہوجا' کس کو کہا؟ اس کا جواب تو آسان ہے کہ شیئ اگرچہ خارج میں موجود نہیں، مگر علم باری میں موجود ہے، اس سے کہا: ہوجا، پس وہ خارج میں موجود ہوگئی۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ لفظ ﴿ كُنْ ﴾ بھی تو حادث (نئی پیدا ہونے والی چیز) ہے، پس اس کے لئے ایک اور کن کی ضرورت ہوگی، اس طرح سلسلہ بڑھتا رہے گا، اور تسلسل لازم آئے گا۔

اس کا جواب دقیق ہے، اس لئے آخر میں قارئین سے التماس کی ہے کہ وہ صرف ترجمہ وتفسیر ملاحظہ فرمائیں، اس فلسفیانہ بحث میں نہ پڑیں، اس لئے میں نے پورا فائدہ حذف کیا ہے، اہل علم اصل بیان القرآن میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں ۱۲ سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری۔

اسی طرح وہ لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے ہوگذرے ہیں، ان ہی کا سا قول، ان سب کے قلوب باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ہم نے تو بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کردی ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین چاہتے ہیں۔

چالیسواں معاملہ: نصاریٰ اور مشرکوں کو شریک کرتے ہوئے:

اور (رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں بعض) جاہل لوگ (یہودی اور نصرانی عیسائی) اور مشرک یوں (کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (خود) ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے؟ (خواہ فرشتوں کے واسطہ کے بغیر جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں یا فرشتوں کے واسطہ سے، جیسے پیغمبروں سے وحی کے طور پر کلام فرماتے ہیں کہ اس کلام میں یا تو خود ہمیں احکام بتادیں کہ جس سے دوسرے رسول کی ہمیں ضرورت ہی نہ رہے۔ یا کم سے کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد ﷺ ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہوکر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا (اگر خود ہم سے کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل (رسالت کے ثبوت کی) آجائے (حق تعالیٰ اولاً ان کی اس بات کو جاہلانہ رسم وریت قرار دیتے ہیں کہ) اسی طرح انہی جیسی بات وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں، جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں (اس ارشاد سے یہ ظاہر ہوا کہ ان لوگوں کی یہ بات کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دی جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے دل (کج فہمی میں) آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب بات بھی ایک ہی جیسی کہتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ تیسرے نمبر پر ان کی بات کا جواب دیتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے قول کا پہلا جز محض حماقت تھا کہ خود کو اس لیاقت پر ملائکہ اور انبیاء کے ہم پلہ بنانا چاہتے تھے جو بالکل باطل معاملہ ہے، اس لئے: جواب جاہلاں باشد خموشی (احمق کی بات کا جواب خاموشی ہے) اس کے جواب کو نظر انداز کرکے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ تم تو ایک دلیل لئے پھرتے ہو) ہم نے تو (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کردی ہیں۔ مگر وہ ان لوگوں کے لئے (نفع بخش ہوسکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ اعتراض کرنے والوں کا مقصد محض ضد اور بحث ہی ہے۔ اس لئے حق بات طلب کرنے اور سمجھنے کی غرض سے تحقیق منظور ہی نہیں تو ایسے لوگوں کی تسلی اور تشفی کا کون ذمہ دار بنے)

فائدہ: یہود اور نصاریٰ کو اہل کتاب اور اہل علم ہونے کے باوجود جاہل اس لئے کہہ دیا گیا کہ انھوں نے یہ بات جاہلوں جیسی کہی تھی کہ بڑی تعداد میں قطعی اور قوی دلیلوں کے بیان کے باوجود ابھی تک انکار ہی کئے جاتے ہیں۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ۝

ترجمہ: ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہئے اور ڈراتے رہئے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کی تسلی:

چونکہ اس موقع پر یہ امکان تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کی اس جہالت اور عناد کی وجہ سے تنگی ہوجاتی اور ان کے ایمان لانے کی کوئی صورت نظر نہ آنے سے غم ہوتا۔ اس لئے حق تعالیٰ اگلی آیت میں آپ کی تسلی فرماتے ہیں۔ (اے رسول!) ہم نے آپ کو سچا دین دے کر (مخلوق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوشخبری سناتے رہیے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے) ڈراتے رہیے اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا) اور یہ کیوں دوزخ میں گئے؟ آپ اپنا کام کرتے رہیے، آپ کو کسی کے ماننے نہ ماننے کی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

> وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

ترجمہ: اور کبھی خوش نہ ہونگے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہوجاویں۔ آپ کہہ دیجئے کہ حقیقت میں تو ہدایت کا وہی راستہ ہے جس کو خدا نے بتلایا ہے۔ اور اگر آپ اتباع کرنے لگیں ان کے غلط خیالات کا علم آچکنے کے بعد تو آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے گا نہ مددگار۔

خاص مخالفوں کے ایمان لانے سے مکمل مایوسی:

یہاں تک یہودیوں کی چالیس برائیاں (قبیح معاملات) بیان کی گئیں، جن میں سے بعض میں نصاریٰ بھی شریک ہیں، اب یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں سے ایمان کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اس طرح یہ مضمون گذشتہ باتوں کا نتیجہ بھی ہے، جس سے ان بیان کی ہوئی برائیوں کی اور تاکید ہوگئی کہ جو شخص ایسا کج طبع ہو اس کی کجی کم جاتی ہے۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے فکر و غم کا ازالہ بھی ہے کہ آپ ان سے عام طور پر ایمان لانے کی امید مت رکھیے اور دل سے پریشانی و کلفت دور کردیجئے۔ اس طرح تسلی کے اس مضمون کی بھی تاکید ہوگئی اور ان مضامین کی تاکیدوں کے علاوہ خود مستقل ان کی ایک برائی (قبیح معاملہ) کا اور بھی بیان ہے کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے کی کیا توفیق ہوتی، وہ تو کج فکری اور بدعملی میں یہاں تک بلند پروازی کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ خود آپ کو بھی اپنی راہ پر چلانے کی فکر میں ہیں۔ اور قالاً یا حالاً ان کی زبان یا عمل سے بھی ان کی یہ کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ تو اس تقریر پر ان کا یہ اکتالیسواں قبیح معاملہ ہوگا۔ اور جناب رسول اللہ ﷺ جو ابتدا میں بعض مباح امور میں اہل کتاب کے ساتھ لطف و مہربانی اور تالیف قلب کی غرض سے

موافقت فرما لیتے تھے، اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ آپ اس قصہ کو جانے دیجئے، گواس سے آپ کی جوغرض ہے کہ کچھ نرم ہوکر اسلام کو قبول کرلیں اور ایمان لے آئیں وہ نیت بخیر ہے۔

بہرحال یہ مضمون آئندہ چند فوائد پر مشتمل ہے اور قدر مشترک ان خاص لوگوں کے اسلام قبول کرنے سے مایوس کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''اور یہ یہودی اور یہ نصاری آپ سے کبھی بھی خوش نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہوجائیں (اور یہ محال ہے اس لئے ان کا راضی ہونا محال ہے اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے ظاہر ہوتو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جسے اللہ نے بتایا ہے (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ پس راہِ ہدایت وہی ہے) اور (یہ امر کہ آپ نعوذ باللہ ان کے مذہب کے پیرو ہوجائیں، محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک محال لازم آتا ہے۔ کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرنے لگیں (جنہیں وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں مگر کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہوجانے کی وجہ سے اب وہ محض چند خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے اور پھر اتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی وحی سے) آجانے کے بعد (تو ایسی حالت میں تو) آپ کو اللہ سے بچانے والا نہ کوئی ولی و یار ملے گا نہ مددگار (بلکہ توبہ توبہ پنجۂ قہر میں گرفتار ہوجانا لازم آئے گا اور یہ لازم محال ہے۔ کیونکہ آپ سے حق تعالٰی کی ہمیشہ رضا قطعی دلائل سے ثابت ہے۔ چنانچہ غضب محال ہے۔ اور چونکہ مذکورہ بالا اتباع سے یہ لازم آیا تھا، اس لئے مذکورہ اتباع بھی محال ہے، اور بغیر اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن تو ایسے امر کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے اس سے دل کو خالی کرلینا چاہئے۔

> اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۠ (۱۲۱) ع ۱۴

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت کرتے رہے جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے۔ ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جو شخص نہ مانے گا خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے۔

اہل کتاب کے انصاف پسندوں کا ذکر:

اب یہاں تک اہل کتاب کے ان لوگوں کا ذکر تھا جو عناد رکھتے تھے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم حسب عادت ان اہل کتاب کے بارے میں بیان کرتا ہے جو انصاف پسند تھے۔ اور جنھوں نے حق واضح ہوجانے کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی اور آپ کا اتباع اختیار کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ وانجیل) دی، بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کررہے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے (کہ علمی قوت کو مضامین کو سمجھنے میں صرف کیا اور ارادہ کی قوت کو حق کے اتباع کو پختہ نیت میں استعمال کیا) ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اس (سچے دین اور وحی

کے علم) پر ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص نہ مانے گا (وہ کسی اور کا نقصان نہیں کرے گا) ایسے لوگ خود ہی خسارہ میں رہیں گے کہ ایمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ان سے محروم رہیں گے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

ترجمہ: اے اولادِ یعقوب علیہ السلام میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر انعام کیا، اور اس کو کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر فوقیت دی۔ اور تم ڈرو ایسے دن سے جس میں کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ ادا کرنے پاوے گا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جاوے گا۔ اور نہ کسی کو کوئی سفارش مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی بچا سکے گا۔

بطور تلخیص تمہید کا اعادہ:

اس مقام پر بنی اسرائیل سے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا، وہ ختم ہو گئے۔ اب ان مضامین کے آغاز کی جو تمہید تھی جس کے اجمال کے یہ سارے مضامین تفصیل تھے، ان کے ختم پر اس کو مکرر لاتے ہیں، جس میں اس کا مضمون خاص یعنی ترغیب کے لئے عام وخاص انعامات کا یاد دلانا اور ترہیب (ڈرانے) کے لئے قیامت کو سامنے پیش نظر کر دینا: بوجہ تکرار کے خوب ذہن نشیں ہو جائے کیونکہ مقصودِ اعظم کلیات ہوتے ہیں، جن کے اختصار کی وجہ سے ان کا ذہن میں حاضر کرنا آسان ہوتا ہے۔ اور جامعیت اور مطابقت کی وجہ سے ان کے ذریعہ ان کے جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے اور محاوروں میں یہ بلیغ طرز اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے کہ مفصل اور طویل بات کرنے سے پہلے ایک مختصر عنوان سے اس کو بیان کر دیا جائے، جس کی قدر مشترک تمام تفصیلات کو سمجھنے میں مددگار ہو اور آخر میں مذکورہ تفصیل کے خلاصہ اور نتیجہ کے طور پر اس مجمل عنوان کا پھر اعادہ کر دیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ تکبر بڑی نقصان دہ خصلت ہے۔ دیکھو اس میں ایک نقصان یہ ہے، دوسرا یہ ہے، تیسرا یہ ہے، اس طرح دس بیس مضرتوں کو بیان کرنے کے بعد پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ تکبر بڑی نقصان دہ خصلت ہے، اسی انداز سے آیت ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ کو دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو، جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا اور اس (فضل وکرم) کو بھی کہ میں نے تمہیں بہت سارے لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی۔ اور تم ایسے دن سے (قیامت کے دن سے) ڈرو جس میں کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور واجب حق) ادا کر پائے گا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (حق واجب کی جگہ) قبول کیا جائے گا، اور نہ کسی کو کوئی سفارش (ایمان نہ ہونے کی صورت میں) فائدہ دے گی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (زور وقوت سے) بچا سکے گا۔

نوٹ: اس سے متعلق ضروری امور اوپر اس آیت کی تفسیر میں گذر چکے ہیں، ضرورت ہو تو وہاں ملاحظہ فرمالئے جائیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں اور وہ ان کو پورے طور سے بجالائے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔ انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کو۔ ارشاد ہوا کہ میرا عہد خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام معمار کعبہ کی فضیلت:

اب تک بنی اسرائیل کے قبیح اعمال اور بدعنوانیوں کا بیان تھا، جن میں ایک بدعنوانی یہ بھی تھی کہ بعض احکام کے منسوخ ہونے خصوصاً قبلہ بدلنے کے حکم پر انھوں نے اعتراض کیا تھا۔ جس کا جواب مندرجہ بالا بعض آیتوں میں بتیسویں اور اڑتیسویں معاملہ کی تقریر کے ضمن میں کافی بیان بھی ہوا ہے، چونکہ خاص اس حکم میں ان لوگوں کا شور شرابہ زیادہ تھا اور ضعیف الاعتقاد لوگوں پر اس مخالفت کا اثر ہو جانا بھی کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں تھا، اور چونکہ نماز خود اسلام کا رکن اعظم ہے اور اس بحث کا اس سے تعلق تھا، اس لئے ان اسباب کا تقاضہ تھا کہ خاص اس معاملہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اور طویل کلام کیا جائے۔ وہ مفصل کلام یہاں سے شروع ہو کر چار رکوعوں تک چلا گیا ہے، جس کی ترتیب بھی نہایت عمدہ واقع ہوئی ہے کہ اول معمارِ کعبہ کی فضیلت اور ان کا امام ہونا بیان کیا۔ پھر کعبہ کی فضیلت اور اس کی تعمیر کا قصہ بیان فرمایا۔ اور اس کے ضمن میں بہت سے مضامین جو اس سے مناسبت رکھتے ہیں اور اس کی تائید میں ہیں: لائے گئے۔ پھر حاکمانہ اختیار سے اس کعبہ کو قبلہ بنانا، پھر اس میں جو حکیمانہ مصلحتوں کی رعایت رکھی گئی ہے ان کا ذکر فرمایا اور درمیان درمیان میں موقع و محل کی مناسبت سے دوسرے مضامین بیان فرمائے۔ جن میں امام القبلتین ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق و خصوصیت اور آپ کا تمام مخلوقات کے لئے نعمت عظمیٰ ہونا بھی بتادیا، تاکہ ہر ذوق پر ہر پہلو سے مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

اور جس وقت (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کے پروردگار نے (اپنے احکام میں سے) چند باتوں میں امتحان لیا۔ اور انھوں نے ان کو پوری طرح انجام دیا۔ (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تمہیں (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔ انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجئے) ارشاد ہوا کہ (آپ کی یہ درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہد (نبوت: قانون کی) خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا (ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہے۔ البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)

امتحان کے دومقصد:

امتحان دومقصد سے ہوتا ہے، کبھی تو اس واسطے کہ امتحان لینے والا خود اس شخص کی حالت ولیاقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ سواس طرح کا امتحان لینا تو حق تعالیٰ کی ذات کے لئے محال ہے، کیونکہ انہیں سب کچھ پہلے ہی معلوم ہے، اور کبھی امتحان لینے والا خودتو جانتا ہے، لیکن دوسرے دیکھنے والوں کے سامنے اس حالت کو پیش کرنا منظور ہوتا ہے۔ تاکہ مثلاً امتحان دینے والے کی عظمت ثابت ہوجائے اور دوسروں کو محرومی یا ترجیح کی شکایت کا موقع نہ رہے یا اگر امتحان کسی مجرم کا ہے تو وہ خود بھی اپنے دل میں انصاف کرلے اور دوسرے بھی ظلم وزیادتی کا شبہ نہ کرسکیں، تو ایسا امتحان لینا حق تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں۔ چنانچہ جہاں بھی کہیں حق تعالیٰ کے بندوں کا امتحان لینے کا ذکر ہے وہاں یہی دوسری قسم کا امتحان مراد ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی دوسری قسم مراد ہے۔

اور جن باتوں میں حضرت ابراہیم کا امتحان لیا گیا، وہ کتابوں میں مختلف طرح سے لکھی ہیں۔ بہرحال وہ کچھ احکام تھے جن کے سلسلہ میں امتحان لیا گیا۔ اور یہ امتحان اگر ایسے وقت تھا کہ ابھی آپ کو مخلوق کو احکام پہنچانے کا حکم نہیں ہوا تھا تو لوگوں کا مقتدا بنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کو احکام پہونچانے کا کام دیا جائے گا جو نبوت کا مقصود ہے۔ اس لئے اس وقت اس قول کے مطابق وحی تو نازل ہوگئی تھی، لیکن اس وحی کی تبلیغ کا حکم نہیں ہوا تھا۔ اور اگر یہ امتحان ایسے وقت تھا کہ وحی کی تبلیغ کا کام بھی کرنے لگے تھے تو لوگوں کا امام بنانے کے معنی ہوں گے کہ اب جتنی امت ہے اس سے زیادہ ترقی دوں گا مثلاً آپ کے زمانہ ہی میں دوسرے لوگ بھی آپ پر بکثرت ایمان لائیں گے یا یہ کہ آپ کی شریعت آپ کے بعد بھی مدتوں تک برقرار رہے گی، جو کہ اجر وثواب کے بڑھنے کا سبب ہے، کیونکہ نیک راہ پر چلنے کے ثواب میں اس راہ کا بتانے والا بھی شریک ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں بھی روایت ہے تو یہ امر بھی اس نبوت کے آثار سے ہے۔

بہرحال ہر صورت میں اس کا حاصل نبوت کی تکمیل ہے۔ اور اس میں یہ قید لگانا کہ جس کو نبوت ملے گی وہ ظالم نہ ہونا چاہئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے معصوم اور گناہوں سے محفوظ ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ ہر گناہ احکام کی خلاف ورزی ہوتا ہے اور ظلم کی یہی حقیقت ہے اور یہاں دونوں کے جمع نہ ہونے کا صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ جو حضرات نبوت سے مشرف ہوچکے ہیں، یقیناً وہ گنہگار نہیں تھے، نہ نبوت سے پہلے اور نہ ہی نبوت کے بعد اور جن قصوں میں ایسے امور مذکور ہیں وہ واقع میں گناہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہر قصہ کے موقع پر اس کی تفسیر دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ جن میں ایک قصہ حضرت آدم علیہ السلام کا گذر بھی چکا ہے، وہاں دیکھ کر اس کی تصدیق کی جائے۔ اور لفظ عصیان یا ظلم وغیرہ جو کہیں وارد ہوا ہے اس کے معنی مجازی مراد ہیں، کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ جب حقیقی معنی کسی دلیل سے محال ثابت ہوں تو مجاز پر محمول کرنا واجب ہے۔ اور محال کی دلیل جس سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت (معصوم

ہونا) ثابت ہے، ابھی بیان ہو چکی۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ، وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: اور جس وقت ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور امن مقرر رکھا۔ اور مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو۔ اور ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف حکم بھیجا کہ میرے گھر کو خوب پاک رکھا کرو، بیرونی اور مقامی لوگوں کے واسطے، اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

کعبہ کی فضیلت:

کعبہ کی تعمیر کرنے والے کی فضیلت کے بعد آگے خود عمارت کی فضیلت بیان فرماتے ہیں۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے عبادت گاہ اور مقام امن (ہمیشہ سے) مقرر کیا۔ اور (آخر میں امت محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو۔ اور ہم نے (کعبہ کی تعمیر کے وقت) حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو، بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

کعبۃ اللہ کو دو وجہوں سے مقام امن فرمایا: ایک تو یہ کہ اس میں حج وعمرہ ونماز وطواف کرنے سے دوزخ کے عذاب سے امن ملتا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے بعد حدود کعبہ میں جسے حرم کہتے ہیں جا گھسے تو وہاں اس کو سزائے موت نہیں دیں گے۔ البتہ اس کی رسد وغیرہ بند کر دیں گے، یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پھر پکڑ لیں گے۔ اور قاتل کے علاوہ دوسرے مجرموں کا حکم مختلف ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، دوسرے اماموں کے دوسرے اقوال ہیں کہ وہ اس صورت میں اس امن کا وقوع نہیں بتلاتے بلکہ قانون بتلاتے ہیں۔

اور مقام ابراہیم ایک خاص پتھر کا نام ہے، جس پر کھڑے ہو کر آپ نے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ وہ کعبہ کے پاس ایک محفوظ جگہ رکھا ہے۔ وہاں نفلیں پڑھنا ثواب ہے۔ اور جب طواف کرے تو اس وقت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دو رکعت پڑھنا واجب ہے۔ آگے حدود کعبہ یعنی حرم اور اس کے باشندوں کے لئے دعاء ابراہیمی کا ذکر ہے کہ وہ بھی اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔

اور آیت میں جو مقام ابراہیم کو چھوٹا ہونے کے باوجود مصلّٰی فرمایا ہے تو اس کا چھوٹا ہونا اس کے مصلّٰی ہونے سے مانع نہیں، کیونکہ اس پر صرف قدم رکھنے سے بھی مصلّٰی ہونا صادق آجاتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اب اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی

تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل مقصود اسی کو محل صلوٰۃ بنانا ہے، باقی اس کے قرب وجوار کی جگہ بھی اس کے تابع ہونے کی وجہ سے اس کے حکم میں ہے، جیسا کہ مسجدِ حرام یا مسجدِ نبوی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ اس کے تابع ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ: اور جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس کو ایک شہر بنا دیجئے امن والا۔ اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں سے عنایت کیجئے، ان کو جو ان میں سے اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور اس شخص کو بھی جو کافر ہے، سو ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا، پھر اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچا دوں گا۔ اور ایسے پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے۔

حرم اور اہلِ حرم کے واسطے دعائے ابراہیمی:

(اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس (مقام) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (وامان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے (بھی) عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) ان کو (کہتا ہوں) جو ان میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں (باقی دیگر کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دوں گا، مؤمن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کہ کافر ہے (البتہ آخرت کی نجات چونکہ اہلِ ایمان کے ساتھ خاص ہے) اس لئے ایسے شخص کو (جو کہ کافر ہے) تھوڑے روز (یعنی دنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا (لیکن) پھر (مرنے کے بعد) اسے کھینچ کر دوزخ کے عذاب میں پہنچا دوں گا، اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے (اللہ بچائے)

شہر ہونے کی دعا اس لئے کی تھی کہ اس وقت یہ مقام بالکل جنگل تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے شہر کر دیا اور اس مقام پر امن اور آبادی کے متعلق دعا قبول ہونے کا ذکر صراحت سے نہیں فرمایا، کیونکہ قانونِ امن کا منظور ہونا اس سے اوپر کی آیت میں آچکا ہے۔

اور جب یہ فرمایا کہ یہاں کے رہنے والوں میں جو کافر ہوں گے ان کو بھی ثمرات ملیں گے، اس سے خود معلوم ہو گیا کہ یہ جگہ لوگوں کے رہنے کی ہوگی جو شہر آباد ہونے کا حاصل ہے۔ اور پھلوں کے ملنے کی یہ صورت کر دی کہ دور دور سے ہر قسم کی

چیز اس شہر میں آتی ہے اور خاص نزدیک میں دو منزل پر طائف ہے۔ اس سرزمین کو خوب سرسبز وشاداب بنایا ہے، وہاں سے سب طرح کی چیزیں میوے، ترکاری بکثرت ہر روز پہنچتی رہتی ہیں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کافروں کے لئے رزق کی دعا نہیں مانگی تو غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ پہلی دعا کے جواب میں حق تعالیٰ نے ظالموں کو ایک نعمت کی اہلیت سے خارج فرما دیا تھا، اس لئے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس دعا میں انہیں شامل نہیں کیا کہ کبھی مرضی کے خلاف ہو۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: اور جب کہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانۂ کعبہ کی اور اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرمائیے۔ بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں۔

کعبہ کی تعمیر کا قصہ اور تعمیر کرنے والے کا اخلاص اور دعا:

ربط: آگے کعبہ کی تعمیر، اور اس تعمیر میں بانی کا اخلاص، اور اس کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کے بانئ کعبہ کے ساتھ اختصاص کا تذکرہ ہے۔

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی دیواریں اور (ان کے ساتھ) اسماعیل (علیہ السلام) بھی (اور یہ کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے۔ بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں (ہماری دعا کو سنتے ہیں، ہماری نیتوں کو جانتے ہیں)

فائدہ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شرکت دو طرح ہو سکتی ہے یا تو پتھر و مسالا دیتے ہوں گے یا کسی وقت تعمیر (چنائی) بھی کرتے ہوں گے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو اور ہم کو ہمارے حج کے احکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔ اے ہمارے پروردگار! اور اس جماعت کے اندر ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی

مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کرے اور ان کو پاک کردے۔ بلا شبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام۔

مذکورہ بالا دعا کا تتمہ:

اے ہمارے پروردگار! اور (ہم دونوں یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ) ہمیں اپنا اور زیادہ مطیع وفرماں بردار بنالیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع وفرماں بردار ہو۔ اور ہمیں ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتادیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے۔ حقیقت میں آپ ہی توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور (یہ بھی دعا ہے کہ) اس جماعت میں (جس کے پیدا کرنے کی دعا ہم اپنی اولاد میں سے کررہے ہیں) ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں۔ اور انہیں (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور اسے اچھی طرح سمجھنے کی تعلیم دیا کریں۔ اور انہیں (اس تلاوت اور تعلیم کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کردیں۔ بلا شبہ آپ ہی غالب قدرت والے (کہ سب درخواستیں پوری کرسکتے ہیں) کامل انتظام والے ہیں (کہ جو کام کرتے ہیں اس میں کوئی بھول چوک نہیں ہوتی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے مصداق:

جس جماعت کا اس آیت میں ذکر ہے، وہ صرف بنی اسماعیل (حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کے لوگ) ہیں، جن میں جناب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ یہاں جس پیغمبر کے لئے دعا ہے اس سے بھی صرف آپ مراد ہوئے۔ کیونکہ یہ دعا دونوں حضرات نے کی ہے تو اس سے وہی جماعت مراد ہوسکتی ہے جو دونوں کی اولاد میں ہو۔ اور پیغمبر کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ وہ اس جماعت میں سے ہوں، اس لئے وہ جماعت بنی اسماعیل ہوئی اور پیغمبر آپ ہوئے، جو کہ بنی اسماعیل میں سے ہیں۔ اسی لئے حدیث صحیح میں ارشاد نبوی ہے کہ میں اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کا ظہور ہوں۔

اور ہر چند مسلم (مطیع وفرماں بردار) کی صفت اور لقب تمام امت محمدیہ ﷺ کے لئے حاصل ہے، جیسا کہ مشاہد ہے اور سورۃ الحج کے آخر میں ارشادِ الٰہی ﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ کی توجیہ بھی یہی ہے۔ لیکن اولاد کی تخصیص اس لئے ہے کہ دوسرے لوگوں میں یہ اسلام اس اولاد ہی کی بدولت شائع ہوگا۔ اس طرح اس صفت میں یہ اصل ہوئے، چنانچہ واقع میں بھی یہی ہوا کہ بنی اسماعیل کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی۔ ان کی جسمانی کوشش سے بھی اور انتظامی تدبیر سے بھی۔ اور یہی حکمت قریش کے ساتھ خلافت کے خاص ہونے میں ہے۔ جو کہ بنی اسماعیل ہیں۔

حکمت کے معنی:

اور اچھی طرح سمجھنے کا سلیقہ یہ ہے کہ بات میں سے بات نکال لیں۔ اصل سے فرع کا حکم سمجھ لیں۔ ایک نظیر کو دوسری

نظیر پر صحیح اصول کی رعایت کرتے ہوئے قیاس کرلیں، جسے اصطلاح میں اجتہاد اور تفقہ کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت محمد ﷺ کے پیروکاروں میں بہت سارے اکابر اس صفت سے ممتاز ہوئے۔ اور ان کی برکتوں سے آج عام مسلمان دین سے نفع اٹھا رہے ہیں۔

اور اسی طرح جو پیغمبر میں تخصیص کی گئی کہ ان ہی میں سے ہوں، اس میں بھی یہ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ دوسرے خاندان کی بہ نسبت، ایسے پیغمبر کی دیانت وامانت اور صدق کو اور دوسری خوبیوں اور قابل فخر باتوں کو زیادہ بہتر طور سے سمجھیں گے جو ان ہی کے خاندان سے ہوں۔ اور ایسے لوگوں کی تصدیق واتباع کو دوسرے لوگوں کے اطمینان، خیالات کی یکسوئی اور شبہات وخلجان کو دور کرنے میں زیادہ اثر اور دخل ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ عام اہل عرب قریش کے ایمان کے منتظر تھے۔ جیسے ہی انھوں نے اطاعت اختیار کی، گروہ کے گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ جس کی طرف سورۂ اذا جاء میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں، جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو، انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی۔

ملتِ ابراہیمی کی تحقیق اور اس کا محمد ﷺ کی اتباع میں منحصر ہونا:

مندرجہ بالا آیتوں سے ضمناً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہبی طریقہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام یعنی اطاعت حق ہے۔ جیسا کہ ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ﴾ میں واضح نص کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ اس مناسبت سے اگلی آیت میں ان لوگوں کی بدعملی وغلط کاری بیان فرماتے ہیں، جو حضرت ابراہیم کی اتباع کے دعوے کے باوجود ان کے اس مذہبی طریقہ کو چھوڑے بیٹھے ہیں اور جناب رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ کی پیروی اختیار نہیں کرتے۔

اور اس سے اس طریقہ کا چھوڑنا اس طرح لازم آیا کہ اس طریقہ کا حاصل یہ ہے کہ احکام الٰہی کی اطاعت کی جائے۔ جس زمانہ کے لئے جو بھی حکم ہو، تو دلائل نقلی یعنی گذشتہ کتابوں کی شہادت اور سابق انبیاء علیہم السلام کی وصیتوں اور عقلی دلائل وبرہان جب سب حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے ثبوت پر متفق ہیں تو اب حکم کی اطاعت وفرماں برداری یہی ہے کہ آپ کا اتباع اختیار کیا جائے۔ جب دلائل قائم ہوجانے اور حق کے واضح ہوجانے کے بعد بھی اتباع اختیار نہیں کیا تو اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس طریقہ کو ترک کیا۔

چنانچہ اگلی آیت کے نزول کا سبب بھی ایک ایسا ہی قصہ ہے، جیسا کہ لباب النقول میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے جو کہ یہودی سے مسلمان ہوئے تھے، توریت اور دوسرے یہودی علوم کے بہت بڑے عالم تھے، اپنے دو بھتیجوں سے جن کے نام سلمہ اور مہاجر تھے۔ یہ فرمایا کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں فرمایا ہے کہ میں بنی اسماعیل میں ایک نبی مبعوث کرنے والا ہوں۔ جن کا نام احمد ہوگا، اور جو شخص آپ پر ایمان لائے گا، وہ راہِ ہدایت پر ہوگا اور جو ایمان نہیں لائے گا وہ معلون ہوگا۔ یہ سن کر سلمہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن مہاجر نے انکار کر دیا، اس بارے میں یہ اگلی آیت نازل ہوئی۔ اس اعتبار سے یہاں تک بھی یہودیوں کے قبیح اعمال کا ذکر جاری ہے۔

جب ملت ابراہیمی دین اسلام میں منحصر ہے تو اس کو ترک کرنے والے بدکار ہیں:

اور ملتِ ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کو ترک کرنے والے کو احمق کیوں نہ کہا جائے، جس کی یہ شان ہو کہ اس کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام کو رسالت کے منصب کے لئے) دنیا میں منتخب کیا اور (اس کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے اہلیت والے اور لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سبھی کچھ ہے اور رسالت کے منصب کے لئے یہ انتخاب اس وقت ہوا تھا) جبکہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے رب العالمین کی اطاعت اختیار کی۔ (چنانچہ اس اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے انہیں نبوت کا شرف عطا کر دیا۔ خواہ اسی وقت ہو یا کچھ زمانہ کے بعد)

اطاعت سے قبل انبیاء میں عصیان کے اشکال کا جواب:

اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اس وقت اطاعت اختیار کی تو نعوذ باللہ اس سے پہلے مخالف اور عاصی تھے؟ جواب یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر مخالفت کا تو کسی وقت بھی احتمال نہیں۔ البتہ ایک ایسا زمانہ گذرنے کا ان پر بھی امکان ہے کہ جس میں وہ خالی الذھن رہے ہوں۔ مثلاً جب تک ہوش نہ سنبھالا ہو۔ یا دلائل کی طرف التفات نہ فرمایا ہو اور ذہن کے خالی ہونے کو مخالفت وعصیان کہنا سراسر باطل ہے کہ مخالفت حقیقت کے واضح ہونے کے بعد اس پر عمل نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر جب ذہن میں حق کا درود ہوتا ہے تو وہ خلو زائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ حضرات فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس درود اور قبول کو اطاعت فرمایا گیا ہے۔ اس طرح اطاعت کے وقت سے پہلے زیادہ سے زیادہ ذہن کا خالی ہونا لازم آیا۔ اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔ معاذ اللہ عصیان اور خلاف لازم نہیں آیا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۚ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞

ترجمہ: اور اسی کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور یعقوب علیہ السلام بھی۔ میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

یعقوب علیہ السلام نے بھی اسلام پر رہنے کی وصیت کی ہے:

ربط: جس ملت کا فضل وشرف اوپر مذکور ہوا ہے اسی کے فضل وشرف کی تاکید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی اولاد کو اسی ملت کی وصیت فرمانا اس آیت میں مذکور ہے، جس میں یہود کی تفضیح بھی ہے کہ تم مثل ابراہیم علیہ السلام کے یعقوب علیہ السلام کے بھی خلاف کر رہے ہو۔

اور اسی (ملت موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم دے گئے ہیں ابراہیم (علیہ السلام) اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب (علیہ السلام) بھی (اپنے بیٹوں کو جس کا مضمون یہ تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی دین (حق کی اطاعت واسلام) کو منتخب فرمایا ہے، اس لئے تم (مرتے دم تک اس کو مت چھوڑنا، اور) اسلام کے سوا کسی اور حالت پر جان مت دینا۔

> اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا تم خود موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا، جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم لوگ میرے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم واسماعیل واسحاق پرستش کرتے آئے ہیں۔ یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم اسی کی اطاعت پر رہیں گے۔

مذکورہ بالا وصیت کی تاکید:

ربط: اوپر ثابت کیا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹوں کو اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی۔ چونکہ یہود بلکہ نصاریٰ بھی ان دونوں حضرات کو اور ان کی وصیت کے مطابق ان کی اولاد کو بھی یہودی یا نصرانی بتاتے تھے، جیسا کہ چند آیات کے بعد آرہا ہے۔ ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ﴾ (کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی یا نصاریٰ تھے؟) اور یہ دعویٰ وصیت کی خبر دینے کے سلسلہ میں مذکور مضمون کے خلاف تھا، اس لئے حق تعالیٰ اس آیت میں ایک خاص انداز سے اس کی نفی فرماتے ہیں۔ اور اس ذکر میں صرف یعقوب علیہ السلام کی

تخصیص اس وجہ سے ہے کہ بنی اسرائیل ان کی خاص اولاد ہیں۔ فرماتے ہیں: ”کیا (تم لوگ مذکورہ بالا دعوی کسی معتبر صحیح سند کی روایت سے کرتے ہو یا) تم خود اس وقت موجود تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے (معاہدہ کی تجدید کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے) کے بعد کس چیز کی پرستش کروگے؟ انھوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذاتِ پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات) ابراہیم واسماعیل واسحاق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں۔ یعنی وہی معبود جو واحد، لاشریک ہے، اور ہم (احکام میں) اس کی اطاعت پر قائم رہیں گے۔

تفسیر: کسی منقول امر کے دعوی کی صحت دو ہی طریقوں سے ہوسکتی ہے: یا تو صحیح نقل و روایت یا اپنا مشاہدہ۔ یہاں دونوں ہی مفقود ہیں تو دعوی بغیر دلیل کے ہوا، بلکہ عقل کے لحاظ سے بھی اور نقل کے لحاظ سے بھی دلیل کے خلاف ہے۔

عقلی دلیل کے خلاف تو اس واسطے سے ہے کہ یہودیت اور نصرانیت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بعد شروع ہوئیں۔ اور یہ مذکورہ بالا حضرات ان دونوں صاحبوں سے بہت زمانہ پہلے ہیں۔ جیسا کہ آیت ﴿ یٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡٓ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ ﴾ (اے اہل کتاب! ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے، حالانکہ توریت اور انجیل ان کے بعد نازل کی گئیں؟ کیا پھر سمجھتے نہیں ہو؟ آلِ عمران ۶۵) میں یہی مضمون ہے۔

اور دلیل نقلی کے خلاف اس لئے کہ خبر صادق یعنی قرآن کے خلاف ہے اور جو بات خبر صادق کے خلاف ہو وہ جھوٹی ہے۔ چنانچہ آیت ﴿قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ‌ؕ﴾ (آپ پوچھئے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟) میں جو ابھی آرہی ہے یہی مضمون ہے۔

اسلام کے خاص معنی یا یہودیت ونصرانیت کے عام معنی کے شبہ کا جواب:

اگر کوئی یہ شبہ ظاہر کرے کہ اسی طرح اسلام رسول اللہ ﷺ کے وقت سے شروع ہوا ہے اور آپ ان حضرات سے بہت بعد میں ہیں، پھر اسلام ان حضرات کی ملت کیسے ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب اوپر ظاہر ہوچکا ہے، جہاں اسلام کے معنی: حق کی اطاعت بیان کئے گئے ہیں، جس سے تمام انبیاء علیہم السلام کا ملت اسلام پر ہونا ثابت ہے۔ بخلاف یہودیت یا نصرانیت کے کہ وہ خاص طور سے توریت یا انجیل کے مذہب کے نام ہیں، اور اگر کوئی اس کو لغت کے اعتبار سے عام کہنے لگے جس سے وہ اسلام کا مرادف ہوجائے تو ہم بحث نہیں کرتے، لیکن یہ معنی عام اتباع محمدی سے ہٹ کر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس دعوی سے اتباع محمدی کو ترک کرنے میں یہود ونصاری کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی حضرت محمد ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو اتباع محمدی کے دعوی میں کوئی ضرر ہوگا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ، وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔

نجات میں مقبولین کے ساتھ انتساب کا کافی نہ ہونا:

ربط: اوپر ان سب ممدوح انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا اور یہود ونصاری کا اتباع محمدی کو ترک کرنے کی وجہ سے اس ملت سے اعراض کرنا ثابت ہو چکا تو اس سے ان کا اللہ کے نزدیک غیر مقبول ہونا بھی لازم آگیا۔ مگر ان لوگوں کو پیغمبروں کی اولاد میں ہونے یا مذہب کے طور پر ان کی طرف منسوب ہونے کا زعم اور اس پر فخر تھا اور وہ اس انتساب کو طریقہ کی مخالفت کے باوجود قول یا حال کے لحاظ سے اپنی آخرت کی تجارت میں کافی سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آیت ﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (اور یہود ونصاری دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ المائدۃ ۱۸) بھی دلالت کرتی ہے۔ اس لئے اس خیال کا غلط ہونا اور محض انتساب کا ناکافی ہونا، اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: "یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر چکی۔ ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا۔ اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کے سلسلہ میں پوچھ گچھ بھی تو نہیں ہوگی (اور خالی ذکر بھی تو نہ ہوگا۔ رہا اس سے تمہیں نفع پہونچنا یہ تو بہت دور کی بات ہے)

دنیا یا آخرت میں نسب کے مفید ہونے کی تحقیق:

مقبولین کے ساتھ انتساب کا نفع بخش نہ ہونا اس شخص کے لئے ہے جو قطعی عقائد میں بھی ان مقبول بزرگوں کا مخالف ہو۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر ان حضرات سے محبت بھی رکھتا ہو اور یہود ونصاری ایسے ہی تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت ہی کے مخالف تھے، جس کے عقائد قطعی ہیں اور سب انبیاء اس کی تصدیق کرنے والے رہے ہیں۔

اور جو شخص ایسے عقائد میں موافق اور اتباع کرنے والا ہو گو کسی جزوی معاملہ میں عاصی (گنہگار) بھی ہو ایسے شخص کو اس انتساب کا کسی نہ کسی درجہ میں نفع بخش ہونا خواہ شفاعت سے یا محبت سے یا معیت کی بنا پر محض مشیت سے صحیح نصوص سے ثابت ہے۔ اور اسی انتساب کو نسب سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ انتساب مؤمنوں کے لئے نفع بخش ہوگا، کفار کو نہیں۔ اور نسب بھی بایں معنی نفع بخش ہے نہ کہ معنی عرفی کے اعتبار سے شرافت میں۔ خوب سمجھ لو۔ اس طرح سب نصوص ودلائل ایک دوسرے کے مطابق وموافق ہو گئے۔ مثلاً: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ (اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد

نے بھی ان کا ساتھ دیا، ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیں گے الطور ۲۱) اور آیت: ﴿ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ ﴾ (تو اس دن ان میں آپسی رشتے ناطے نہ رہیں گے، المومنون ۱۰۱) اور آیت: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ الحجرات ۱۳) اور حدیث شفاعت اور حدیث المرء مَعَ من أحب (آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہوگا) اور حدیث: یا فاطمة انقذی نفسک من النار لا أغنی عنک من الله شیئًا (اے فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ میں تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکوں گا) رہا دنیا میں نسبتوں کا فرق تو یہ اپنے آثار کے اعتبار سے بلاشبہ بہت سی مصلحتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ لیکن اپنے نسب پر تفاخر اور دوسرے کی تحقیر حرام ہے۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تم بھی راہ پر پڑ جاؤ گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے۔

یہودیت یا نصرانیت کی طرف بلانے والوں کو جواب:

اوپر ملتِ اسلامیہ کے حق ہونے اور یہودیت و نصرانیت کے نبوتِ محمدی کے دور میں نجات کا ذریعہ نہ ہونے کا ذکر ہوا ہے۔ اس آیت میں یہودیت و نصرانیت کی طرف بلانے والوں کے قول کا جواب دیا گیا ہے۔ اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہودیوں نے کہا تھا) یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہِ (حق) پر پڑ جاؤ گے۔ (اے محمد ﷺ) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہیں ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے جس میں تحریف ہو جانے کے علاوہ وہ منسوخ بھی ہو چکی ہے، اس لئے اب اس میں کجی آ چکی ہے) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہیں تھے۔

تفسیر: اس آخر کے جملہ سے یا تو یہ مقصود ہے کہ منسوخ ہونے کے علاوہ یہودیت اور نصرانیت میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔ جیسا کہ آیت ﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ (اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ التوبہ ۳۰) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خالص توحید پر تھے۔ اس لئے بھی یہودیت و نصرانیت یا عیسائیت اختیار کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ اس صورت میں یہ جملہ خود ایک مستقل دعویٰ کی دلیل ہو جائے گا۔ یا پھر عرب کے مشرکوں پر

رد کرنا مقصود ہے جو کہ ملت ابراہیمی کے بعض اعمال مثلاً ختنہ اور حج وغیرہ کی وجہ سے خود کو ملتِ ابراہیمی کا متبع سمجھتے تھے تو یہود و نصاریٰ کے ساتھ ان کے خیالات کو بھی رد فرمادیا۔ جب کہ تم میں اور حضرت ابراہیم میں شرک اور توحید کا فرق ہے تو صرف بعض فروعی اعمال کے اختیار کر لینے سے اتباع کا دعویٰ کب صحیح ہو سکتا ہے؟

ملت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کے امر سے اشکال کا ازالہ:

یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تو مستقل نبی اور صاحبِ شریعتِ مستقل ہیں۔ پھر آپ کے ملتِ ابراہیمی پر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور اس سے بڑھ کر بعض آیتوں میں جو آپ کو حضرت ابراہیم کی اتباع کا حکم ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ملت ابراہیم کی تفسیر اوپر آچکی ہے کہ اہل حق کی اطاعت ہے جو کہ تمام انبیاء علیہم السلام میں ملتِ مشترک ہے اور اطاعتِ حق کی خصوصیات ہر شریعت جدیدہ کے زمانہ میں بدلتی رہی ہیں، حتی کہ اب شریعت محمدیہ میں آکر منحصر ہوگئیں۔ اس طرح ملت ابراہیم شریعت محمدیہ کا ایک لقب ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے اور تم شریعت محمدیہ کی اتباع کرو، اس امر کا مرادف اور ہم معنی ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم شریعت محمدیہ پر رہیں گے اور تم شریعت محمدیہ کی اتباع کرو۔ چنانچہ ایک آیت میں اس توجیہ سے سب انبیاء کی اتباع کا حکم فرمایا: ﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ (انہی کے راستہ کی اتباع کرو۔ انعام ۹۰) اس طرح کوئی اشکال نہیں رہا۔

رہا یہ امر کہ جب ملت ابراہیم یعنی اسلام، انبیاء کے درمیان ملتِ مشترکہ ہے تو اس کو ملت موسیٰ اور ملت عیسیٰ کا لقب بھی دے سکتے ہیں۔ پھر ملت ابراہیم کے لقب کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہود اور نصاریٰ اور مشرک سب مانتے تھے، اس لئے دوسری کسی بھی تعبیر میں بعض کو وحشت ہوتی۔ دوسرے یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت سے فروعی اعمال میں بھی یکساں طریقہ ہے۔ بخلاف دوسری شریعتوں کے کہ ان سے اصولوں اور عقائد میں تو اتحاد اور فروع میں اکثر فرق ہے۔ خوب سمجھ لو۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۞

ترجمہ: کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے، اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔

ملتِ ابراہیم کا خلاصہ:

اس آیت میں ملت ابراہیمی کا خلاصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ماننے بغیر چارہ نہیں: (مسلمانو! یہود و نصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس (رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں ان) کی طرف (وحی کے واسطہ سے) بھیجا گیا اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا۔ ان کے پروردگار کی طرف سے (تو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں۔ اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (انھوں نے ہمیں یہ دین بتایا اور ہم نے اختیار کرلیا۔ پس یہ اس ملت کا حاصل ہے، جس پر ہم قائم ہیں جس میں اصلاً کسی کو انکار و نافرمانی کی گنجائش نہیں)

تفسیر: حکم میں صحیفے اور کتابیں اور خالی وحی سب داخل ہیں کہ ان حضرات میں سے بعض تو صاحب کتاب ہیں، جیسے جناب رسول اللہ ﷺ و حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کچھ صحیفے ملے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔: ﴿ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴾ (الاعلیٰ ۱۹)

حاصل مضمون یہ ہوا کہ دیکھو ہمارا دین کیسا انصاف اور حق کا دین ہے کہ سارے انبیاء کو مانتے ہیں۔ سب کی کتابوں کو سچا جانتے ہیں۔ سب کے معجزوں کو برحق تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ اکثر احکام کے منسوخ ہوجانے کی وجہ سے دوسری مستقل شریعت محمدیہ پر عمل کرتے ہیں، لیکن انکار اور تکذیب کسی کی نہیں کرتے، برخلاف یہودیت اور نصرانیت کے کہ منسوخ ہونے کے علاوہ اب اس میں کسی کی تصدیق ہے اور کسی کی تکذیب۔ اور اخیر جملہ میں پھر اس ملت کے لقب (اسلام) کی طرف اشارہ کردیا ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ (ہم اسی کے مطیع و فرماں بردار ہیں) تو ایسے حق و انصاف کا دین تو ہمارے مخاطبوں کو بھی قبول کرلینا چاہئے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

ترجمہ: سو اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہ پر لگ جاویں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ تو برسرِ مخالفت ہیں ہی تو آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ

تعالیٰ۔اور اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔

گذشتہ مضمون کی شاخ:

یہاں تک دین حق کا ملت ابراہیمی میں منحصر ہونا ثابت ہو چکا۔اب اس انحصار سے نکلنے والی ایک بات بیان فرماتے ہیں،اور اس کے ساتھ فریق مخالف کے حق کو قبول نہ کرنے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرمائی جارہی ہے (جب اوپر دین حق کا اسلامی طریقہ میں منحصر ہونا ثابت ہو چکا) تو اگر وہ (یہود ونصاری) بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہ (حق) پر لگ جائیں گے۔اور اگر وہ (اس سے) روگردانی کریں تو (تم ان کی روگردانی سے کچھ تعجب نہ کرو۔کیونکہ) وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) مخالفت پر کمر بستہ ہیں ہی (اور اگر ان کی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے ان سے جلد ہی اللہ تعالیٰ نمٹ لیں گے۔اور اللہ تعالیٰ (تمہاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں اور تمہارے اور ان کے برتاؤ کو) جانتے ہیں (تمہیں فکر وغم کی کوئی ضرورت نہیں،چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں قرب وجوار کے یہود ونصاری اور دوسرے کفار سب کو مغلوب کر دیا جیسا کہ متواتر تاریخ سے ثابت ہے)

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝

ترجمہ: ہم اس حالت پر رہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ سے خوب تر ہو؟ اور ہم اسی کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

اسلام کے شرف کا اظہار:

اس دین کا لقب جو اوپر ملتِ ابراہیم آیا ہے،اس میں اضافت ونسبت ایک نبی کی طرف ہے (اس میں ایک شرف ہے) آگے اس کا شرف مزید ظاہر کرنے کے لئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی جاتی ہے۔نیز اس میں توحید کا بھی زیادہ اہتمام ہے کہ دین کی اصلاً اضافت جس کی طرف کی جائے وہ حق تعالیٰ ہی ہیں کہ نبی کی طرف نسبت تبلیغ کے واسطہ وتعلق سے ہے (اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے، اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ ہم دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہمیں) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ وریشہ میں پیوست کر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے زیادہ بہتر ہو؟ (جب دوسرا کوئی ایسا نہیں تو ہم نے کسی دوسرے کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ۚ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ ۚ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ۚ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ کیا تم لوگ ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں، حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا رب ہے اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا۔ اور ہم نے صرف حق تعالیٰ کے لئے اپنے کو خالص کر رکھا ہے۔ یا کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہود و نصاریٰ تھے، اے محمد ﷺ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ؟ اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفاء کرے، جو اس کے پاس منجانب اللہ پہنچی ہو؟ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بے خبر نہیں۔

اہل کتاب کو کیا جواب دیا جائے؟

سابقہ آیتوں میں یہود و نصاریٰ پر پوری طرح حجت قائم ہوچکی۔ پھر بھی وہ لوگ وہی دعویٰ بلا دلیل کئے جاتے تھے کہ مسلمان باطل پر ہیں، آخرت میں ان کی نجات نہیں ہوگی۔ اور ہم حق پر ہیں، کیونکہ جس طریق پر ہم ہیں سارے انبیاء اسی طریق پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باتوں کی پوری طرح تحقیق فرمادی ہے۔ اب پھر دوسرے انداز سے جواب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرمادیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) حق تعالیٰ کے معاملہ میں حجت کئے جاتے ہو (کہ وہ ہمیں قیامت کے دن نہیں بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب (اور مالک) ہے (تو رب ہونے میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں، جیسا کہ تمہارے بعض دعوؤں سے خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ﴾ اور ہمیں ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تمہیں تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہیں بھی تسلیم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (تمہارے موجودہ طریقہ کے برخلاف کہ منسوخ ہونے کے علاوہ خود شرک سے بھی مخلوط ہے۔ جیسا کہ ان کے اقوال ﴿عُزَیْرُ ۨ ابْنُ اللّٰہِ﴾ اور ﴿الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ﴾ سے ظاہر ہے۔ اور اس میں ہمیں اللہ نے ترجیح دی ہے، پھر ہمیں نجات نہ ہونے کے کیا معنیٰ) یا (اب بھی اپنے آپ کو حق پر ہونے کے ثبوت کے نام پر یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو انبیاء گذرے ہیں، یہ سب حضرات) یہودی یا نصاریٰ تھے (اور اس سے طریقہ کی مطابقت کے واسطہ سے اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں اے محمد ﷺ ایک اتنی مختصر سی بات) کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ؟ (اور ظاہر ہے کہ اللہ ہی زیادہ واقف ہیں اور وہ ان

انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا ثابت کر چکے ہیں، جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے اور جانتے وہ بھی ہیں مگر چھپاتے ہیں تو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اس شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی جانب سے پہونچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے بے خبر نہیں ہیں (تو جب یہ حضرات یہود و نصاری نہیں تھے تو تم دین کے طریقہ میں ان کے موافق کب ہوئے، پھر تمہارا حق پر ہونا بھی ثابت نہیں ہوا)

فائدہ: ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴾: اخلاص کی خبر سے کمال کا دعوی مقصود نہیں، بلکہ مذہبی مناظرہ میں اپنے دین کے طریقہ کا اظہار مقصود ہے جو کہ ضروری امر ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔

آخرت میں نجات کے لئے مقبول حضرات کی طرف انتساب کافی نہیں (مکرر مضمون)

مندرجہ بالا آیات میں ﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ﴾ سے ﴿ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ تک جس طرح ان حضرات انبیاء علیہم السلام کا ملت ابراہیم پر ہونا اور یہود و نصاری کا اس ملت سے اعراض کرنا اور اس وجہ سے ان کا اللہ کے نزدیک غیر مقبول ہونا بیان ہوا تھا اور اس کے بعد ان لوگوں کے اس فخر وزعم کا کہ ان مقبول حضرات سے انتساب آخرت میں نجات کے لئے کافی ہے: اس کا جواب دینے کے لئے آیت ﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ ﴾ ارشاد فرمائی گئی تھی۔ وہی مضمون غرض مختلف ہونے کی وجہ سے کہ پہلے انہیں ابتدائی جواب دینا مقصود تھا اور یہاں آخری جواب: اس مقام پر بھی وارد ہوا ہے، کیونکہ مذکورہ فخر وزعم کا پھر موقع تھا، اس لئے تاکید کی غرض سے اور ان کے اس زعم میں غلط کاری کی تجدید کے لئے وہی آیت ﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ ﴾ مکرر ارشاد فرماتے ہیں۔ یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر گئی۔ ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا۔ اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ گچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب صرف ذکر بھی نہ ہوگا تو اس سے تمہیں کچھ نفع کا پہونچنا تو بہت دور کی بات ہے۔

حوالہ: اس مضمون سے متعلق فائدہ پہلے مقام پر بیان کیا جا چکا۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ: اب تو بیوقوف لوگ ضرور کہیں ہی گے کہ ان کو ان کے قبلہ سے جس کی طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس

بات نے بدل دیا۔ آپ فرما دیجئے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک ہیں۔ جس کو خدا چاہیں سیدھا طریق بتادیتے ہیں۔

تحویل قبلہ پر شبہ کا حاکمانہ جواب:

احقر نے آیت ﴿ وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ ﴾ کے ربط میں بیان کیا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کے اعتراض کا جواب چند اجزاء پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض اجزا تو یہاں تک مع اپنے متعلقہ مضامین کے بیان ہوتے ہوئے آئے اور بعض اجزا باقی ہیں۔ ان میں سے ایک جز حاکمانہ جواب ہے جو اس آیت میں پیش کیا ہے۔ اور اس جواب کی تمہید میں ان کے جاہلانہ اعتراض کی بھی تصریح فرمائی گئی ہے، جب کعبہ کے نماز کا قبلہ مقرر ہونے پر یہود کا قبلہ ترک ہوگیا تو ناگواری کی وجہ سے، اب تو (یہ) بے وقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمتِ) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے۔ کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا؟ آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) سب اللہ ہی کی ملک ہیں (اللہ تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے، جس سمت کو چاہیں مقرر فرمائیں۔ کسی کو علت دریافت کرنے کا اختیار و منصب نہیں ہے اور شرعی احکام کے باب میں سیدھا راستہ ہی اعتقاد ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ خواہ مخواہ علتیں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں (البتہ) جس کو اللہ ہی (اپنے فضل سے) چاہتے ہیں (یہ) سیدھا راستہ بتادیتے ہیں۔

احکام کی حکمتوں کا کھوج لگانا کیسا ہے؟

جس امر کو اس مقام پر صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کہا گیا ہے، حقیقت میں سلامتی اور امن اسی راستہ میں ہے۔ اس معاملہ میں اکثر نوخیز طبیعتوں نے اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیا ہے اور احکام کی علتوں کی کھوج میں لگ گئے ہیں، جن میں بعض کی غرض تو نعوذ باللہ شرعی احکام کی توہین یا تکذیب اور اس پر اعتراض کرنا ہوتا ہے اور بعض کو اسی بہانہ سے عمل سے اپنی جان بچانا مقصود ہوتا ہے، اور بعض کی غرض اگرچہ فاسد نہیں ہوتی لیکن قوتِ فہم: بلند اور دقیق وکافی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا نتیجہ اکثر بد دینی اور بد اعتقادی نکلتا ہے۔ اس مقام پر وہ شعر پھر دہراتا ہوں:

زباں تازہ کردن باقرار تو ❁ نینگیختن علت از کار تو

تیرے اقرار سے زبان ترو تازہ رکھنا ہے　　تیرے کام کی علت ڈھونڈھنا نہیں ہے

اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ تم لوگوں کے مقابلہ

میں گواہ ہو اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ گواہ ہوں۔

امتِ محمدیہ کی مدح:

احکام شرعی کے باب میں جس امر کو اوپر صراطِ مستقیم فرمایا گیا ہے چونکہ امتِ محمدیہ نے اس کو بغیر کسی چون وچرا کے اختیار کرلیا۔ اس لئے اس آیت میں بطور جملہ معترضہ کے اس جماعت کی مدح وستائش اور فضیلت بیان کرتے ہیں اور پھر اصل مطلب کی طرف رجوع فرمائیں گے۔ (اے محمد ﷺ کی اتباع کرنے والو!) اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی ہی جماعت بنادیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دنیا میں شرف وامتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور دوسرا فریق ان کی مخالف قومیں ہوں گی۔ ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور شرف بالائے شرف یہ کہ) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ ﷺ گواہ ہوں (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت کے معتبر ہونے کی تصدیق ہو۔ پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو۔ اور مخالف لوگ مجرم قرار پاکر سزایاب ہوں۔ اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے۔

فائدہ: حدیثوں میں اس کی یہی تفسیر آئی ہے کہ گذشتہ امتوں کے کفار، حق تعالیٰ سے کہہ دیں گے کہ ہمیں آپ کے احکام کی اطلاع ہی نہیں ہوئی، جبکہ انبیاء علیہم السلام دعویٰ کریں گے کہ ہم نے اطلاع دیدی تھی، جب انبیاء سے گواہ طلب کئے جائیں گے تو وہ حضرات امت محمدیہ کے لوگوں کو اپنا گواہ بتائیں گے۔ اور جب اس امت کو بلا کر پوچھا جائے گا تو یہ انبیاء کے حق میں گواہی دیں گے۔ ان سے سوال کیا جائے گا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس واقعہ کے ثبوت کے قطعی دلائل پہونچے۔ اس لئے ہمیں واقفیت ہے، پھر مدعا علیہ کی جرح کا خاتمہ کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو بلا کر ان گواہوں کے معتبر ہونے سے متعلق سوال ہوگا۔ آپ ان کے معتبر اور قابل شہادت ہونے کی تصدیق فرمائیں گے، اس پر احکم الحاکمین کے اجلاس سے فیصلہ کردیا جائے گا۔

اس روایت پر جو تفسیر کی بنیاد ہے بظاہر چند شبہات ہوسکتے ہیں:

اول: یہ کہ امت محمدیہ انبیاء سے زیادہ معتبر نہیں ہیں، پھر ان کی سچائی کو ان کی شہادت سے ثابت کرنے کے کیا معنی ہیں؟

جواب: یہ ہے کہ زیادہ معتبر تو وہی حضرات ہیں لیکن چونکہ وہ اس مقدمہ میں فریق ہوں گے، لہٰذا دوسرے گواہ درکار ہوں گے، گو وہ ان سے ادنیٰ ہوں، البتہ معتبر ہوں۔ چنانچہ دنیا کی عدالتوں میں بھی رات دن یہی عمل دیکھا جاتا ہے کہ اگر تحصیلدار جو خود بھی صاحب اجلاس ہوتا ہے کسی گستاخ اور مخالف چپراسی کا کسی مقدمہ میں فریق بن جائے تو حاکم اعلیٰ کے اجلاس میں تحصیلدار سے گواہ طلب کئے جائیں گے، گو وہ تحصیلدار سے ادنیٰ درجہ کے ہوں۔

دوسرا: شبہ یہ ہے کہ وہ لوگ امتِ محمدیہ کی شہادت پر بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم نعوذ باللہ انبیاء کو سچا نہیں سمجھتے تو ان لوگوں کو کیوں سمجھیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر بھی دنیوی عدالتوں کے معاملہ سے سمجھ میں آسکتا ہے، گواہوں پر ایسی اجمالی جرح کرنے کا مدعا علیہ کو اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً مقدمہ میں وہ چپراسی حاکم اعلیٰ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب میں تحصیلدار صاحب کو سچا نہیں مانتا تو ان کے اس گواہ کو کیوں سچا مانوں گا۔ بالخصوص اگر وہ گواہ بھی سرکاری آدمی ہو، جیسا کہ اس روز امتِ محمدیہ کے لوگ اسی حیثیت سے گواہی میں پیش کئے جائیں گے۔

تیسرا: شبہ یہ ہے کہ جب امت محمدیہ نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو اول تو یہ شہادت کیسے دیں گے؟ پھر وہ لوگ اس پر اچھی خاصی جرح کر سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کا مقصد یقین کے لئے مفید صحیح طریقہ سے یقین کا حاصل ہو جانا ہے، جو محسوسات بغیر وحی کے ثابت ہیں، ان میں یہ طریقہ مشاہدہ میں منحصر ہے، اس لئے وہاں شہادت کا مدار مشاہدہ ہے اور زیر بحث معاملہ میں اگرچہ واقعہ محسوسات سے تعلق رکھتا ہے، لیکن وحی کے ذریعہ ثابت ہونے کی وجہ سے وحی کے ذریعہ اس کا یقین حاصل ہے، جو شہادت کا اصل مدار ہے، لہٰذا یہ گواہی برمحل ہے، جس میں جرح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مردہ کو دیکھ کر جس کے بدن پر زخم وغیرہ کوئی ظاہری علامت نہ ہو اپنی فنی مہارت کی بنیاد پر کہہ دے کہ یہ شخص بیماری سے نہیں بلکہ کسی سخت چوٹ کی وجہ سے مرا ہے۔ اور اس بنا پر قاتل کی تحقیقات کا سرکاری حکم ہو جائے تو باوجود یکہ اس موقع پر ڈاکٹر کی گواہی واقعہ کے معائنہ کی بنا پر نہیں ہے، لیکن چونکہ صحیح قواعد کے ذریعہ سخت چوٹ تشخیص کی گئی، اس لئے اس کا اعتبار کیا گیا۔

اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کا فائدہ معلوم ہو ہی چکا ہے، اس میں کسی سوال کی گنجائش نہیں رہی۔ اور ''ہر پہلو سے معتدل'' کی جو بات کہی گئی اس کا مصداق مثلاً خاص طور سے تحویلِ قبلہ کے اس حکم میں یہ ہے کہ وہ نہ تو ایسے عام ذہن کے حامل ہیں کہ اگر احکام کی علت بتائی جائے تب بھی نہ سمجھیں اور نہ ہی ایسے فلسفی ہیں کہ اگر حکمت نہ بتائی جائے تو اس کو طے کئے بغیر حکم ہی کو نہ مانیں۔ چنانچہ یہاں حکمت نہیں بتائی تو بھی ویسے ہی مان لیا۔ آگے چل کر بعض حکمتیں بتا دیں تو ان کو جان لیا، اور جو شخص ایسی معتدل طبیعت کا مالک ہوگا وہ ضرور اچھا ہوگا۔ اس لئے دنیا و آخرت میں صاحب عزت و شرف ہوگا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ کون رسول اللہ ﷺ کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے۔ اور یہ قبلہ کا بدلنا ہوا بڑا ثقیل مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دیں۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت ہی شفیق مہربان ہیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع:

(اور اصل میں تو ہم نے شریعتِ محمدیہ کے لئے کعبہ ہی کو قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور قبلہ کی جس سمت (یعنی بیت المقدس) پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں، وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھی کہ ہمیں (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جائے کہ (اس کے مقرر ہونے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے؟ اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصل قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا) اور یہ قبلہ کا بدلنا (انحراف کرنے والوں پر) بڑا گراں ہوا (ہاں) سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے (سیدھے راستہ کی) ہدایت فرمائی ہے۔ (جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام الٰہی کو بغیر کسی چوں و چرا کے قبول کر لینا) انہیں کچھ بھی گراں نہیں ہوا (جیسا پہلے اس کو حکم الٰہی سمجھتے تھے، اب اس کو سمجھنے لگے) اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا تو اس سے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ پھر تو جتنی نمازیں اس طرف رخ کر کے پڑھی ہیں، ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا۔ کیونکہ وہ اصلی قبلہ کی طرف نہیں تھیں، تو ایسا وسوسہ دل میں نہ لانا۔ کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان (کے متعلق اعمال، مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا۔ اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)

فائدہ: مفسرین نے لکھا ہے کہ بیت المقدس کا قبلہ بننا بعض اہل عرب پر گراں گذرا تھا کہ وہ کعبہ کو مانتے تھے اور اس کا منسوخ ہونا یہود کے لئے گراں ہوا، کہ وہ کعبہ کو نہ مانتے تھے، حتیٰ کہ بعض ضعیف العقیدہ لوگ اسلام سے بھی پھر گئے تھے۔

لنعلم کی عجیب تفسیر:

اور یہ جو کہا گیا کہ "ظاہری طور پر" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو سب امور حقیقت میں پہلے سے معلوم ہیں اور اہل حق مجمل طور پر اس کا یقین بھی رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ بندوں کو ظہور یا وقوع سے پہلے خود اس واقعہ کا علم نہیں ہوتا اس لئے تعیین اور تفصیل کے ساتھ خاص طور پر یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ اللہ کے علم کے خاصہ میں تھا اور ظہور اور وقوع کے بعد یہ حکم بھی کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ظاہری طور پر علم ہونے سے یہی مراد ہے (یعنی یہ جاننا بندوں کے تفصیلی علم کے اعتبار سے ہے)

اور اس کی ایک تقریر یہ بھی ہو سکتی ہے جو تفسیر مظہری میں ہے کہ شیخ ابو منصور رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم پہلے سے اس طرح جانتے تھے کہ وہ وجود میں آئے گی، اس کو ہم عملاً موجود دیکھ لیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کا وجود عمل میں لانا چاہتے ہیں ان کا ازل میں اس طرح تو علم ہے کہ اس کو فلاں وقت میں وجود میں لاؤں گا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس کو ازل میں ایسی چیزوں کا اس طرح علم تھا کہ وہ فی الحال موجود ہے، کیونکہ جب وہ واقع میں موجود نہیں تو اس کو خلاف واقع موجود فی الحال کیسے جان سکتا ہے، اور یہ تبدیلی معلوم میں ہوئی ہے، علم میں نہیں۔ اب اس میں کوئی اشکال نہیں رہا (اس صورت میں جاننا اللہ کے اعتبار سے ہے، مگر حدوث معلوم میں ہے، اللہ کے علم میں نہیں)

> قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: ہم آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، اس لئے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لئے آپ کی مرضی ہے، پھر اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے۔ اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہروں کو اسی کی طرف کیا کرو۔ اور یہ اہل کتاب بھی یقیناً جانتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے ان کے پروردگار کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی ان کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

ربط: حاکمانہ جواب دینے کے بعد اب حکیمانہ جواب شروع ہوتا ہے، جس میں کئی حکمتوں کی طرف اشارہ ہے:

تحویل قبلہ کی پہلی حکمت:

(آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں اور وحی کی امید میں بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے۔ تو) ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پوری کرنا منظور ہے) اس لئے ہم (وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جس کے لئے آپ کی مرضی ہے (لو) پھر (حکم ہی دیئے دیتے ہیں کہ اب سے آپ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے۔ اور (یہ حکم کوئی مخصوص نہیں ہے، بلکہ عام قانون ہے کہ) تم سب لوگ (پیغمبر بھی اور امتی بھی جہاں کہیں بھی موجود ہوں خواہ مدینہ میں یا کسی اور جگہ حتیٰ کہ خود بیت المقدس کے اندر بھی ہر جگہ نماز کی حالت میں) اپنے چہروں کو اس (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو۔ اور (اس قبلہ کے مقرر ہونے کے متعلق) یہ اہل کتاب بھی (بالعموم اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقیناً جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے۔ اور (ان کے پروردگار کی طرف سے ہے (مگر عناد اور دشمنی کی وجہ سے مانتے نہیں ہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی ان کارروائیوں سے کچھ

بے خبر نہیں ہیں۔

اس آیت سے بیت المقدس کا بطور قبلہ منسوخ کرنا اور کعبہ کو مقرر کرنا منظور ہے، اور باوجودیکہ یہ حکم اس آیت میں موجود ہے پھر بھی اس کے جز اول میں وعدہ فرمایا گیا تاکہ وعدہ کے بارے میں سن کر اول وعدہ کی خواہش ہو اور بعد میں انتظار کے ساتھ ساتھ وعدہ کے پورا ہونے سے، دوسری خوشی ہو تو دوگنی مسرت ہو جائے اور یہ مسرت انگیز طرز اس مقام کے زیادہ مناسب ہے کہ اس میں ایک حکم کے ساتھ ساتھ آپ کی رضا بھی بیان کی گئی ہے۔ اس حکمت کا حاصل یہ ہوا کہ ہمیں آپ کی خوشی منظور تھی اور آپ کی خوشی کعبہ کے قبلہ مقرر ہونے میں دیکھی، اس لئے ہم نے اسی کو قبلہ مقرر کر دیا۔

رہا یہ امر کہ آپ کی خوشی اس میں کیوں تھی؟ تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی نبوت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپ کے قبلہ کی یہ جہت ہوگی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے نورانی قلب میں اس کے مطابق خواہش پیدا فرما دی۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

ترجمہ: اور اگر آپ اہل کتاب کے سامنے تمام دلیلیں پیش کر دیں جب بھی یہ آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، اور ان کا کوئی فریق بھی دوسرے کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا۔ اور اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں آپ کے پاس علم آئے پیچھے تو یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔

ربط: اوپر فرمایا ہے کہ وہ اہل کتاب اس قبلہ کا حق اور اللہ کی جانب سے ہونا دل میں جانتے ہیں۔ آگے ان کا عناد اور دشمنی کی بنیاد پر نہ ماننا بیان فرمایا جاتا ہے۔

قبلہ کے حکم کے بارے میں اہل کتاب کا عناد:

اور (ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے باوجود ان کی ضد کی یہ حالت ہے کہ) اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کر کے) پیش کر دیں، تب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی امید اس لئے نہیں رکھنی چاہئے کہ آپ کا قبلہ کبھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے (اس لئے کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور (جیسا کہ ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے، ان میں آپس میں بھی موافقت نہیں ہے، کیونکہ (ان کا کوئی فریق بھی دوسرے کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا) مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت قبلہ بنا رکھا تھا) اور (خدانخواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ کو جو منسوخ ہو چکا اور غیر

شرعی ہے، لے ہی نہیں سکتے کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (اگر چہ وہ اصل میں حکم آسمانی رہے ہوں، لیکن اب منسوخ ہو جانے کی وجہ سے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہے، اس لئے اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کرلیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آنے کے بعد تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں (جو کہ نافرمان ہیں اور آپ کے معصوم ہونے کی وجہ سے، آپ کا ظالم ہونا محال ہے۔ اس لئے یہ امر کہ آپ ان کے خیالات کو کہ جن میں ان کا قبلہ بھی شامل ہے، قبول کرلیں محال ہے)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۞

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ لوگ رسول اللہ کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجود یکہ خوب جانتے ہیں، اخفاء کرتے ہیں۔ یہ امر واقعی منجانب اللہ ہے، سو ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

ربط: اوپر اہل کتاب کے مسلمانوں کے قبلہ کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر تھا۔ آگے انہی اہل کتاب کے صاحب قبلہ کو یعنی جناب رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں اہل کتاب کا عناد:

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توریت وانجیل) دی ہے۔ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو (ان کتابوں میں درج بشارتوں کی وجہ سے بحیثیت رسول) ایسا (بغیر شک وشبہ کے) پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی کسی باپ کو شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچاننے کے بعد بھی یہ سب لوگ مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور ان میں سے بعض لوگ (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجود یکہ خوب جانتے ہیں (پھر بھی) چھپاتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی اللہ کی جانب سے (ثابت ہو چکا) ہے، سو (ایسے واقعی امر میں جو اللہ کی طرف سے ثابت ہے ہر ایک فرد سے کہا جا سکتا ہے کہ) ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

تفسیر: رسول اللہ ﷺ کے پہچاننے کو جو بیٹوں کے پہچاننے سے تشبیہ دی ہے، اس میں ایک بنا پر اہل علم کو اور ایک بنا پر غیر اہل علم کو شبہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات بعض وجوہ سے بیٹے کے بیٹا ہونے میں شبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن سلام جو پہلے بڑے علماء یہود میں سے تھے اور پھر حضور ﷺ کے صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا، ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بیوی میں تو خیانت کا بھی احتمال ہے، جس سے بیٹا ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے، مگر آپ کی نبوت میں تو اتنا بھی شبہ نہیں۔ اس طرح امر یقینی کی یہ تشبیہ اشتباہ کے احتمال کے امر

کے ساتھ ہوئی، جس سے مشبہ کا یقینی ہونا کمزور درست ہوگیا۔

احقر نے اس شبہ کو دور کرنے کی غرض سے بین القوسین (بریکٹ میں) اس قید "ان کی صورت سے" کا اضافہ کردیا جس سے جواب اچھی طرح واضح ہوگیا کہ تشبیہ میں بیٹے کا بیٹا ہونا ملحوظ نہیں، بلکہ بیٹے کی صورت ملحوظ ہے، تو چونکہ بیٹا گود میں پرورش پاتا ہے، ہر وقت آدمی کو دیکھتا ہے، اس لئے عادت کے طور پر اس کی صورت میں کسی باپ کو شبہ نہیں ہوتا، کہ یہ فلاں لڑکا ہے یا فلاں۔ چنانچہ تفسیر کے دوران اس کی توضیح بھی کردی گئی۔

اور اس نکتہ کی وجہ سے بیٹیوں کو پہچاننے سے تشبیہ نہیں دی گئی، کیونکہ عام طور سے بیٹا زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ باپ اس کو اپنے ساتھ زیادہ رکھتا ہے، اور اس نکتہ کی وجہ سے یہ نہیں فرمایا کہ جیسے اپنی ذات کو جانتے ہیں، کیونکہ کبھی کبھی انسان پر ایسا زمانہ بھی گذرتا ہے جس میں اسے اپنی معرفت حاصل نہیں ہوتی، جیسا کہ بالکل بے ہوشی کی عمر۔ بخلاف اپنے بیٹے کے کہ وہاں اس کی نوبت نہیں آتی۔ یہ سب باتیں تفسیر روح المعانی میں ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ: اور ہر شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا رہا ہے، سو تم نیک کاموں میں لگا پو کرو، تم خواہ کہیں ہوگے، اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کردیں گے، بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جاویں تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف رکھا کیجئے۔ اور یہ بالکل حق ہے من جانب اللہ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے اصلاً بے خبر نہیں۔

تحویل قبلہ میں دوسری حکمت:

اور (تحویل قبلہ میں دوسری حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطہ ایک الگ قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے) اس لئے اس کا بھی ایک خاص قبلہ ہوگیا۔ جب حکمت سب پر ظاہر ہوچکی، تو (اے مسلمانو!) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر دین کے نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی سعی و کوشش کرو کیونکہ ایک دن اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں بھی ہوگے، لیکن اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کردیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور برے اعمال پر سزا ہوگی اور) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر (امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور (اس حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر یعنی کعبہ میں رہتے ہوئے کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے، اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں)

آپ باہر جائیں تو (بھی نماز میں) اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی کعبہ) کی طرف رکھا کیجئے (غرض یہ کہ سفر و حضر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور (قبلہ کا) یہ (حکم عام) بالکل حق (اور صحیح) ہے اور اللہ کی جانب سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے اصلاً بے خبر نہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

ترجمہ: اور آپ جس جگہ سے بھی باہر جاویں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف رکھیے۔ اور تم لوگ جہاں کہیں ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف رکھا کرو تا کہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں گفتگو نہ رہے، مگر ان میں جو بے انصاف ہیں تو ایسے لوگوں سے اندیشہ نہ کرو اور مجھ سے ڈرتے رہو اور تا کہ تم پر جو میرا انعام ہے اس کی تکمیل کر دوں اور تا کہ تم راہ پر رہو۔

تحویلِ قبلہ کی تیسری حکمت:

اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جائیں (اور حضر میں تو اس وجہ سے کہ قانون تجویز کئے جانے کے وقت آپ مقیم ہی تھے بدرجۂ اولیٰ نماز میں) اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف رکھئے اور (اس طرح دوسرے تمام مسلمان بھی سن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (بھی) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اسی (مسجدِ حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے) تا کہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) بحث (کی گنجائش) نہ رہے (کہ اگر محمد ﷺ وہی نبی ہوتے جن کے آخری زمانہ میں ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے تو ان کی علامتوں میں تو یہ امر بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، جبکہ یہ تو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہم نے اس حکمت کے تحت بھی تحویلِ قبلہ کیا ہے۔ ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) ناانصافی کرنے والے ہیں (وہ اب بھی کٹ حجتی کرتے رہیں گے کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے برخلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دینِ حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا) تو ایسے لوگوں سے (اصلاً) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ہی ڈرتے رہو (کہ میرے احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے کہ یہ خلاف ورزی یقیناً تمہارے لئے مضر ہے) اور (ہم نے ہی ان سب مذکورہ احکام پر عمل کی بھی توفیق دی) تا کہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (و اکرام متوجہ) ہے (تمہیں آخرت میں بہشت میں داخل کر کے) اس کی تکمیل کر دوں اور تا کہ تم (دنیا میں) راہ (حق) پر (جو کہ اسلام ہے، قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر انعام کی وہ تکمیل مرتب ہوتی ہے)

تحویل قبلہ کے حکم میں تکرار کی وجہ:

چونکہ قبلہ کا معاملہ نہایت مہتم بالشان تھا، اور اس میں مخالفین کا شور وشرابہ بھی زیادہ تھا اور اس کے بعض خاص جزئیات کے احکام کی تعیین میں تردد بھی ہوسکتا تھا، اس لئے کئی کئی پہلوؤں سے بیان کیا اور حکمتیں بھی متعدد ارشاد فرمائیں اور حضر وسفر کے لئے عام عنوان ﴿ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ ﴾ بھی لائے اور حضر کی تخصیص کے حکم کا اشارۃً الگ کیا اور اس کے ساتھ ہی سفر کے حکم کی الگ تصریح کی تا کہ حضر میں کعبہ کی طرف توجہ کے حکم سے جنوب کی جہت کے مقصود ہونے کا وہم نہ ہو جائے کہ مدینہ سے جس طرف کعبہ واقع ہے، اور سفر کا موقع زیادہ شبہ کا تھا کہ شاید راستہ کا حکم جدا و مختلف ہو اور منزل کا حکم جدا ہو۔ اس لئے اس کو مکرر لائے، اور عربی زبان میں کلمہ ''من'' ابتدا کے لئے ہے، جس کی دلالت سے واضح ہو گیا کہ شروع سفر سے یہی حکم ہے۔ اس طرح راستہ اور منزل سب کا حکم معلوم ہو گیا۔ پھر خاص خطاب الگ کیا اور عام خطاب الگ۔ حضر کے متعلق بھی اس خاص وعام کو لائے اور سفر کے متعلق بھی لائے اور آیت ﴿ قَدْ نَرٰى ﴾ میں ایک بار اس کے حق ہونے کی تصریح فرمائی، پھر رکوع کے ختم پر دوبارہ تصریح کی۔ پھر آیت ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ ﴾ میں پہلے موقع پر تیسری بار بھی تصریح فرمائی اور اس حکم کو قبول کرنے والوں کے ہدایت یافتہ ہونے کی تصریح سے اس مضمون کو شروع بھی فرمایا ﴿ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اور اس پر ختم بھی فرمایا ﴿ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ اور ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ اور ﴿ لَا تَخْشَوْهُمْ ﴾ میں بحث ومباحثہ اور نزاع ومجادلہ سے یکسو اور بے فکر ہونے کی طرف اشارہ کر کے اس حکم کے انتہائی واضح ہونے پر بھی دلالت فرما دی۔ جیسا کہ تفسیر کی تقریر سے معلوم ہوا اور اس کے ضمن میں یہ تعلیم بھی ہو گئی کہ جب معترض کا عناد قرائن سے معلوم ہو جائے تو پھر اس کے جواب دئے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی طالب حق کو اس اعتراض سے شبہ ہو جائے تو اس کی اصلاح ضرور کر دی جائے۔

> كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ: جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک رسول کو بھیجا تم ہی میں سے، ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی۔

ربط: یہاں تک قبلہ کی بحث چلی آ رہی ہے۔ اب اس کو ایسے مضمون پر ختم فرمانا چاہتے ہیں جس کا اس بحث کی تمہید کے آغاز میں بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے ضمن میں ذکر آیا تھا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے رسول اللہ ﷺ کا ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونا۔ اس طرح آغاز اور انجام کے متحد ہونے میں اس امر کی طرف

اشارہ ہوگیا کہ ان نبی ﷺ کی شریعت میں کعبہ کا قبلہ مقرر ہونا تعجب کا مقام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہے، اور یہ نبی ابن ابراہیم ہیں اور اس تعمیر کے قبول کئے جانے اور اس ابن کے رسول بنانے کے لئے انھوں نے دعا کی تھی اور ہم نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ اور کعبہ کو اس نبی کی شریعت میں قیامت تک کے لئے قبلہ مقرر کردیا جو کہ تعمیر کے قبول ہونے کے عظیم آثار میں سے ہے۔ اور اس اشارہ سے آغاز وانجام کا یہ اتحاد نہایت ہی مستحسن ہوگیا۔

محمد ﷺ کے مبعوث کئے جانے کی خبر:

(ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا جو کعبہ کی تعمیر کی قبولیت سے متعلق تھی، اس طرح قبول فرمائی) جس طرح (ان کی دوسری دعا قبول کی جو حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے متعلق تھی کہ) ہم نے تم لوگوں میں ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیتیں (واحکام) پڑھ پڑھ کر تمہیں سناتے ہیں اور (خیالات ورسوم جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تمہیں کتاب اور سمجھ داری کی باتیں بتاتے رہتے ہیں اور تمہیں ایسی (مفید) باتوں کی تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تمہیں خبر بھی نہ تھی (اور نہ ہی گذشتہ کتابیں یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اسی شان والے رسول کے مبعوث کئے جانے کی دعا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، چنانچہ اس کا ظہور ہوگیا۔

نوٹ: اس آیت کے اکثر الفاظ پہلی آیت (نمبر ۱۲۹) میں ہیں۔ وہاں تفسیر دیکھ لینی چاہئے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ: ان نعمتوں پر مجھ کو یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا اور میری شکر گذاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

ربط: چونکہ مذکورہ بالا آیتوں میں حق تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر تھا یعنی کعبہ کا قبلہ بنانا، اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خاص تعلق کا ہونا، ملت اسلامیہ میں ابراہیم علیہ السلام اور تمام دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ موافقت کا ہونا، تحویل قبلہ کے وقت طریقِ اطاعت پر ثابت قدم رہنا۔ اور ایسے رسول کی امت اور تابع ہونا: اس لئے اس آیت میں انعام فرمانے والے کے ذکر کا اور ان کی نعمت کے شکر کا حکم فرما کر مذکورہ آیات کی زیادہ احسن طریقہ سے تکمیل و تتمیم فرماتے ہیں۔

ذکر و شکر کا حکم:

ان مذکورہ نعمتوں کی بنیاد پر مجھے (انعام عطا کرنے والے (منعم) کی حیثیت سے) یاد کرو۔ میں تمہیں عنایت (کے ساتھ) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گذاری کرو اور (نعمتوں کے انکار یا اطاعت ترک کر کے) میری ناشکری مت کرو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

ربط: تحویلِ قبلہ پر مخالفین کی طرف سے جو اعتراض تھا، اس کے دو اثر تھے: ایک مذہبِ اسلام پر کہ اعتراض سے مقصود مذہب کی حقانیت کے بارے میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس اثر کو دور کرنا مقصود تھا۔ دوسرا اثر اہلِ اسلام پر کہ اعتراض کے ذریعہ بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بیجا اصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے۔ اس آیت میں رنج وغم کو ہلکا کرنے کا طریقہ بتا کر جو کہ صبر اور صلوٰۃ ہے، اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

صبر وصلوٰۃ کی تعلیم:

اے ایمان والو! (طبیعتوں سے غم ہلکا کرنے کے لئے) صبر اور نماز کے ذریعہ سہارا لیا کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ بدرجۂ اولیٰ رہتے ہیں، کیونکہ نماز سب سے بڑی اور افضل عبادت ہے، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے، اس میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ بشارت ہوگی)

غم کو ہلکا کرنے میں صبر وصلوٰۃ کا اثر:

اور صبر کا حزن وملال کی تخفیف میں دخل اور اثر ہونا تو ظاہر اور مشاہد ہے، رہا یہ سوال کہ نماز کو اس میں کیا دخل ہے؟ تو اول تو جس طرح بعض دوائیں اپنے خاصہ سے اثر کرتی ہیں اور تجربہ سے اس خاصیت کا حکم لگایا جاتا ہے، اسی طرح اگر بعض اعمال بھی خاصہ کے ساتھ اثر کرتے ہوں تو اس میں تعجب کیا ہے؟ چنانچہ جو نماز حضورِ قلب کے ساتھ جس کے بغیر نماز پرانی دوا کی طرح ہے، اس میں جس کا جی چاہے اس خاصیت کا تجربہ کر کے دیکھ لے کہ مشاہدہ کے بعد سوال ہی کی گنجائش نہیں رہے گی اور اگر کیفیت کے ذریعہ اثر کرنے والی دواؤں کی طرح نماز میں اس اثر کی علت ہی کا پتہ لگانے کا شوق ہو تو اس کی توجیہ بھی سمجھ میں آسکتی ہے، کہ حزن وملال کو ہلکا کرنے کا مدار قلب کو دوسری شے کی طرف متوجہ کر دینے پر ہے۔ اس سے دل بہت زیادہ بہل جاتا ہے۔ چنانچہ جب نماز میں حضورِ قلب کے ساتھ مشغول ہوں گے تو اس سے عبادت اور معبود کی طرف یکسوئی اور توجہ ہوگی۔ اور اس عمل کی تکرار سے وہ غم انگیز واقعہ دل ودماغ سے غائب ہو جائے گا اور اس کا اثر کمزور ہونا شروع ہو جائے گا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں، ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ مردے ہیں، بلکہ وہ لوگ

زندہ ہیں، لیکن تم حواس سے ادراک نہیں کر سکتے۔

ربط: اوپر ایک خاص ناگوار خاطر واقعہ (تحویل قبلہ) کے سلسلہ میں صبر کی تعلیم اور صبر کرنے والوں کی فضیلت بیان فرمائی تھی۔ اب اس آیت میں اور اگلی آیتوں میں بعض اور خلافِ طبع واقعات کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جن میں کفار کے ساتھ قتل وقتال کے مضمون کو پہلے بیان فرماتے ہیں۔ اول اس کے اعظم یعنی بہت بڑا ہونے کی وجہ سے کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجۂ اولیٰ صبر کرلے گا۔ دوسرے خاص طور پر موقع کے مناسب ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا۔

اللہ کے راستہ میں مارے جانے کی فضیلت:

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کیے جاتے ہیں (ان کی ایسی فضیلت ہے کہ) ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں۔ لیکن تم (ان) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔

ایسے مقتول کو شہید کہتے ہیں۔ اور اس کی نسبت اگرچہ یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے۔ لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں جیسی موت سمجھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اگرچہ برزخ والی زندگی ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اس سے جزا وسزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس زندگی میں دوسرے مردوں سے ایک طرح کا امتیاز حاصل ہے اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ زندگی آثار کے لحاظ سے دوسروں سے زیادہ قوی ہے، جس طرح پیروں کی انگلیوں کے اگلے پوروں میں پاؤں کی ایڑی کی بہ نسبت طبی اور حسی لحاظ سے قوی حس پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر معمولی مردوں کے برخلاف اس کے ظاہری جسم تک بھی پہونچتا ہے کہ اس کا جسم گوشت و پوست کا مجموعہ ہونے کے باوجود مٹی سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور زندہ جسم کی طرح صحیح سالم رہتا ہے۔ جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں۔ چنانچہ اس امتیاز کی وجہ سے شہید کو احیاء (زندہ) کہا گیا ہے اور انہیں دوسرے اموات (مرے ہوئے لوگوں کے برابر) اموات کہنے سے منع کیا گیا ہے اور یہی زندگی ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہدا سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ ظاہری موت کے بعد جسم کی سلامتی کے ساتھ ایک اثر اس حیات کا اس عالم کے احکام میں بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ افراد کی بیویوں کی طرح ان کی بیویوں سے کسی کو بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور ان کا مال میراث میں تقسیم نہیں ہوتا۔ اس طرح اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء اور پھر معمولی مردے۔

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء اور صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں۔ سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی شہادت کے معنی میں داخل سمجھیں گے۔ اسی طرح وہ بھی شہید ہوئے، یا یوں کہا جائے کہ شہداء کی

تخصیص عام مردوں کے اعتبار سے اضافی ہے۔ان خواص کے اعتبار سے حقیقی نہیں۔اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو ایسا پایا ہو کہ وہ خاک میں مل کر خراب ہوگئی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر قتل کے شہادت ہونے کا مدار ہے کہ صرف قتل ہی شہادت نہیں ہے۔اور اگر بالفرض ایسے شہید کا جسم مٹی کا کھایا ہوا پایا جائے جس کا اللہ کی راہ میں قتل ہونا اور اس کا شہادت کی شرطوں کے لئے جامع ہونا قطعی تواتر وغیرہ کی دلیل سے ثابت ہو (جس کا صاحب روح المعانی کو شبہ ہوگیا ہے) تو اس کی وجہ کے بارے میں کہا جائے گا کہ حدیث میں زمین پر شہید کے جسم کی حرمت وارد ہے، غیر ارض سے غیر متاثر ہونا وارد نہیں ہے۔ چنانچہ دوسرے مرکب اجسام مثلاً اسلحہ، دواؤں، غذاؤں اخلاط اور بسیط اجسام مثلاً پانی، آگ اور ہوا کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے جسموں میں ثابت ہے اور شہیدوں کی موت کے بعد کی زندگی انبیاء کی موت سے قبل کی زندگی سے زیادہ قوی نہیں ہے۔اور زمین کے بعض اجزا میں بعض غیر زمینی اجزا بھی شامل ہوجاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مخالف عناصر شامل ہوجاتے ہیں۔تو اگر ان غیر زمینی اجزا سے ان کے جسم متاثر ہوجائیں تو اس سے ان احادیث میں اشکال لازم نہیں آتا جن میں زمین پر جسموں کی حرمت وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ شہیدوں کے جسموں کے امتیاز کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ دوسرے مردوں سے زیادہ مدت تک ان کے جسم خاک کی وجہ سے متاثر نہ ہوں۔اگر بعد میں کسی وقت ہوجائیں اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کا محفوظ رہنا جسموں کی خرق عادت ہے اور خرقِ عادت کی دونوں صورتیں ہیں یعنی ایک ہمیشہ کا محفوظ ہونا اور دوسرے طویل مدت تک محفوظ رہنا، اور چونکہ برزخ کے احوال کا حواس سے ادراک نہیں ہوتا، اس لئے ﴿ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ فرمایا گیا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے، اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے۔اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں۔ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی ہوگی۔اور یہی لوگ ہیں جن کی رسائی ہوگئی۔

ربط: صبر کے مواقع میں سے بڑے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد آگے اس سے چھوٹے واقعات کا بیان فرماتے ہیں۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمارے دربار میں صبر کی اعلیٰ قسم کی طرح اس سے ادنیٰ قسم کی بھی قدر ہے۔

صبر کی فضیلت اور اس کے بعض مواقع:

اور (دیکھو) ہم (رضاوتسلیم کی صفت میں جو ایمان کا تقاضہ ہے) تمہارا امتحان وآزمائش کریں گے۔ کسی قدر خوف سے (جو کہ مخالفوں کے ہجوم یا حوادث وسختیوں کے نزول سے پیش آئے) اور (کسی قدر فقرو) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا، یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہوگئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر جائیں اور ثابت قدم رہیں تو) آپ ایسے صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے سمجھ کریوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (حقیقت میں مع مال واولاد) اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے مملوک یا ملکیت کے تنگ ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے) اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (اس لئے یہاں کے نقصان کا بدلہ وہاں جا کر مل جائے گا۔ اور انہیں بشارت کا جو مضمون سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (الگ الگ) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر مشترکہ طور پر) عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقت حال تک) رسائی ہوگی (کہ حق تعالیٰ کو مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)

تفسیر: اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا جو امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت آیت ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ﴾ کی تفسیر میں بیان کی جا چکی ہے اور واقعات کے پیش آنے سے پہلے خبر دینے میں یہ فائدہ ہے کہ صبر آسان ہو جاتا ہے۔ ورنہ اچانک کوئی صدمہ پیش آجانے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔

اور یہ خطاب ساری امت سے ہے، اس لئے سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا محنت ومشقت کا گھر ہے، یہاں کے حوادث کو عجیب اور کوئی بڑی بات نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی۔

اور چونکہ یہ لوگ صبر کے محل میں سب مشترک ہیں، اس لئے اس کا صلہ مشترکہ تو عام رحمت ہے جس کا تعلق نفس صبر سے ہے اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ بھی خاص عنایتوں کی بنیاد پر جدا جدا ہوگا جو ان خصوصیات سے متعلق ہے، جیسے دنیا میں انعام وخوشی کے مواقع پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے لیکن روپئے اور جوڑے وغیرہ ہر ایک کو حیثیت اور خدمت کے لحاظ سے دیئے جاتے ہیں۔

اور جو مضمون صبر کرنے والوں کی طرف سے نقل فرمایا ہے حقیقت میں اس کی تعلیم مقصود ہے اور یہ مضمون ثواب کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اگر دل سے سمجھا جائے تو دل کی تسکین کے لئے بھی نہایت قوی الاثر ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ۝

ترجمہ: تحقیقاً صفا اور مروہ منجملہ یادگارِ خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں ان دونوں کے درمیان آمدورفت کرنے میں۔ اور جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ قدر دانی کرتے ہیں، خوب جانتے ہیں۔

ربط: مذکورہ بالا آیتوں میں ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى ﴾ سے دور تک خانہ کعبہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے، جن کے شروع میں خانہ کعبہ کے عبادت گاہ ہونے کا بیان تھا، اور اس سے آگے دعائے ابراہیمی کی حکایت تھی کہ انھوں نے اس کے متعلق مناسک کی تعلیم کی درخواست کی تھی اور مناسک میں حج اور عمرہ بھی داخل ہیں۔ چنانچہ بیت اللہ کے عبادت گاہ ہونے کا تعلق جیسے اس کے نماز کا قبلہ بننے سے ہے، اسی طرح اس کے حج اور عمرہ کا مقصد ہونے سے بھی ہے۔ پس جب مندرجہ بالا آیتوں کے آخر میں جو ابھی گذری ہیں۔ اس کے قبلہ ہونے کی بحث کا ذکر ہوا اور اسی سلسلہ میں صبر کرنے والوں کے فضائل بیان کر دیئے گئے تو اب اس آیت میں اس کے حج اور عمرہ کا مقصد بننے سے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ صفا اور مروہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج اور عمرہ میں طواف کے بعد ان کے درمیان بھی دوڑتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ سعی زمانۂ جاہلیت میں بھی ہوتی تھی اس لئے بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ شاید اس کو جاہلیت کے افعال میں شمار کیا جائے، اور گناہ کا سبب قرار دیا جائے، جبکہ بعض لوگ اس کو دورِ جاہلیت میں بھی گناہ سمجھتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ اسلام میں بھی گناہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ رفع کرنا مقصود ہے۔ اس لئے گذشتہ مضمون کعبہ کے نماز کا قبلہ ہونے پر کفار کے اعتراض کو دور کرنے کے لئے تھا اور اب یہ مضمون کعبہ کے حج و عمرہ کا مقصد ہونے سے متعلق ایک امر یعنی صفا و مروہ کی سعی پر مؤمنوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا ہے۔ دونوں مضمونوں میں یہی ربط ہے۔

صفا و مروہ کی سعی پر شبہ کا ازالہ:

(صفا و مروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) بلاشبہ صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان سعی کرنا) اللہ تعالیٰ (کے دین) کی یادگاروں میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر بھی ان دونوں کے درمیان (معروف قاعدہ کے مطابق) آمدورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) گناہ نہیں (ہوتا جیسا کہ تمہیں شبہ ہو گیا) اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے، کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں (اور اس خیر کے کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں (پس اس ضابطہ کی رو سے سعی کرنے والے کو اس کے خلوص کے حساب سے ثواب عنایت ہوگا)

فائدہ: حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اور یہ سعی امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب اور امام مالک وامام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے کہ اس کے ترک کرنے سے ایک بکری ذبح کرنی پڑتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِۙ اُولٰٓىٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىٕكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَۙ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ۝

ترجمہ: جولوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے، جو کہ واضح ہیں، اور ہادی ہیں، اس حالت کے بعد کہ ہم ان کو کتاب میں عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر جولوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کردیں اور ظاہر کردیں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہوجاتا ہوں اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا۔ البتہ جولوگ اسلام نہ لاویں اور اسی حالت غیر اسلام پر مرجاویں، ایسے لوگوں پر لعنت اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی بھی سب کی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی میں رہیں گے، ان سے عذاب ہلکا نہ ہونے پاوے گا اور نہ ان کو مہلت دی جاوے گی۔

ربط: اوپر قبلہ کی بحث کے ضمن میں صاحبِ قبلہ کی نبوت سے متعلق اہل کتاب کے حق کو چھپانے کا مضمون بیان کیا گیا تھا۔ اس آیت میں ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ ﴾ سے ﴿ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ ﴾ تک، آگے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں اور اس پر اصرار کرنے والوں پر وعید اور توبہ کرنے والوں کے لئے معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

حق کو چھپانے اور اس پر اصرار کرنے پر وعید اور توبہ کرنے والے کے لئے معافی کا وعدہ:

اور جولوگ ان مضامین کو چھپاتے ہیں، جو ہم نے نازل کئے ہیں جو کہ (اپنے آپ میں) واضح ہیں اور دوسروں کے لئے ہادی ہیں (اور چھپانا بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الٰہی توریت وانجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے انہیں دور کردیتے ہیں) اور (دوسرے بہت سارے لعنت کرنے والے بھی (جنہیں اس فعل سے نفرت ہے) ان پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعا کرتے ہیں۔ ہاں!) مگر جولوگ (ان چھپانے والوں میں سے اپنی اس حرکت سے) توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے سامنے اپنے پچھلے کئے ہوئے برے کاموں سے معذرت) کرلیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہوگئی تھی

آئندہ کے لئے اس کی) اصلاح کردیں اور (اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان چھپائے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کردیں (تاکہ سب کو اطلاع ہوجائے اور ان کے اوپر گمراہ کرنے کا بار نہ رہے۔ اور شریعت کے نزدیک معتبر اظہار یہ ہے کہ اسلام قبول کرلیں، کیونکہ اسلام قبول نہ کرنے سے نبوت محمدیہ سے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر یہ نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب کو جاننے والے لوگ کیوں نہ اعتقاد لاتے؟ خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہوجائیں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوجاتا ہوں (اور ان کی خطائیں معاف کردیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام قبول نہ کریں اور اسی غیر اسلامی حالت میں مرجائیں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (جس کا اوپر ذکر ہوا) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی بھی سب کی (اس طرح برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے۔ اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی اللہ کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا۔ اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہے۔ اور ہیشگی کی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت) ان (پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پائے گا۔ اور نہ (داخل ہونے سے پہلے) انہیں (کسی میعاد تک) مہلت دی جائے گی (کیونکہ معیاد اس وقت دی جاتی ہے جبکہ مقدمہ میں کچھ گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے کی صورت میں پہلی ہی پیشی میں سزا کا حکم ہوجاتا ہے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ؏

ترجمہ: اور جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ رحمٰن ہے رحیم ہے۔

ربط: مندرجہ بالا آیت میں امر حق کو چھپانے کے بارے میں جس وعید کا ذکر ہوا ہے، وہ الفاظ کے لحاظ سے ہر امر حق کے بارے میں عام ہے۔ لیکن جملہ ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ کے قرینہ سے، اس کی تفسیر مذکور کے اعتبار سے، موقع و مقام کی خصوصیت کے تقاضہ کے مطابق، رسالتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مسئلہ زیادہ پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے آیت بالا میں رسالت کا مسئلہ ثابت ہوا اور توحید کا عقیدہ اور رسالت کا عقیدہ دونوں شریعت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں، اس لئے اس آیت میں توحید کے مسئلہ کو بیان فرمایا جاتا ہے۔

توحید کا بیان:

اور جو (ذات) تم سب کا معبود بننے کا مستحق ہے، وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (وہی) رحمٰن ہے، رحیم ہے (کہ ان صفات میں کوئی دوسرا کامل نہیں ہے اور صفات کے کمال کے بغیر معبودیت کا

استحقاق باطل ہے، اس لئے معبود حقیقی کے سوا کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ہوسکتا)

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا، اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید رہتا ہے دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

ربط: مشرکین عرب نے آیت ﴿اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ سنی جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہے تو تعجب سے کہنے لگے کہ بھلا کہیں سارے جہان کا ایک معبود ہوسکتا ہے؟ اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو اس پر کوئی دلیل پیش کرنی چاہئے۔ ان کے جواب میں حق تعالیٰ توحید کی دلیل بیان فرماتے ہیں:

توحید کی دلیل:

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ آدمیوں کے فائدہ کی چیزیں اور مال (واسباب) لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا۔ پھر اس (پانی) سے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد اس کو تروتازہ کیا (یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیئے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور توالد وتناسل یعنی بچوں کا پیدا ہونا اور نسلوں کا چلنا اسی نباتاتی غذا کی بدولت ہے) اور ہواؤں (کی سمتوں اور کیفیتوں) کے بدلنے میں (کہ کبھی پُروا ہے کبھی پچھوا، اور کبھی گرم ہے کبھی سرد) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) ان لوگوں کے استدلال کے لئے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

تفسیر: یہ مختصر عقلی استدلال اس طرح ہے کہ مذکورہ بالا تمام اشیا ممکن الوجود ہیں، بعض تو بالکل واضح اور بدیہی طور پر مشاہدہ سے عدم سے وجود ہوتا ہے یا احوال کے تغیر وتبدل کے سبب سے، اور بعض اجزا کی ترکیب کی دلیل سے یا بعض کے

بعض کی طرف محتاج ہونے کے سبب سے۔ اور ممکن: وجود اور عدم کے متساوی ہونے کی وجہ سے کسی مرجح (ترجیح دینے والے) کا محتاج ہوتا ہے۔ اور وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس کے سلسلہ میں پھر یہی بحث ہوگی تو محالِ مسلسل کو ختم کرنے کے لئے کسی واجب الوجود تک رکنا واجب ہے۔ یہ تو صانع کے وجود کی دلیل ہے۔

آگے رہا اس کے واحد ہونے کا معاملہ تو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ متعدد یعنی دو یا دو سے زیادہ فرض کئے جائیں تو ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہوگا، یا دونوں کا قادر ہونا ضروری و لازم ہوگا۔ پہلا معاملہ محال ہے، کیونکہ عاجز ہونا وجوبِ وجود کے منافی ہے۔ اب رہا دوسرے کا معاملہ تو اگر ان میں سے ایک نے کسی امر کا مثلاً زید کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کرسکتا ہے، یا نہیں کرسکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو وجود کے وجوب کے منافی ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کرسکتا ہے تو اس پر مقصد کا پورا ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادرِ مطلق کے ارادہ کے مقصد کے خلاف ہونا لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مقاصد کا اجتماع لازم آئے گا، کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر ایک مقصد پورا ہوا۔ دوسرے واجب کے ارادہ پر دوسرا مقصد پہلے والے مقصد کی ضد پوری ہوئی، تو دو ضدوں کا جمع ہونا لازم آیا، اور وہ محال ہے۔ اور جو امر محال کو مستلزم ہوتا ہے وہ خود محال ہوتا ہے۔ اس طرح کئی واجبوں کا ہونا محال ہے۔ اس لئے وحدت ماننا ضروری ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ خوب سمجھ لو۔

فائدہ (۱): اسلام کے اصول یعنی توحید و رسالت عقلی مسائل ہیں جیسا کہ آیت کے فقرہ ﴿ يَعْقِلُوْنَ ﴾ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور فروع کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔ البتہ کسی عقلی قطعی دلیل کے خلاف نہ ہونا ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل جو نوخیز طبیعتیں اٹھ رہی ہیں، وہ ان دونوں کو آپس میں خلط ملط کر کے عجیب چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ جس کا انجام آخر کار بد دینی نکلتا ہے۔ خوب سمجھ لو۔

فائدہ (۲): آسمانوں کا وجود ثابت ہے اور نفی کی دلیل کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ طلوع و غروب کے نظام میں آسمان کو دخل نہ ہو، لیکن اس سے وجود کی نفی لازم نہیں آتی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

ترجمہ: اور ایک آدمی وہ ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک قرار دیتے ہیں ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ضروری ہے۔ اور جو مؤمن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم جب کسی مصیبت کو دیکھتے تو سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہوگا۔

ربط: مندرجہ بالا آیتوں میں توحید کو ثابت کیا گیا تھا۔ آگے مشرکوں کی غلطی اور اس سے متعلق وعید بیان فرماتے ہیں:

مشرکوں کی مذمت:

اور ایک وہ لوگ (بھی) ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اوروں کو بھی (خدائی میں) شریک قرار دیتے ہیں (اور انہیں اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنی) ضروری ہے (یہ حالت تو مشرکوں کی ہے) اور جو لوگ مؤمن ہیں انہیں (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے (کیونکہ) اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہوجائے کہ میرے معبود سے مجھے کوئی نقصان پہونچے گا تو فوراً محبت منقطع ہوجائے گی، اور مؤمن اس کے باوجود کہ نفع ونقصان پہونچانے والا صرف حق تعالیٰ ہی کو مانتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی محبت اور رضا باقی رہتی ہے۔ اور اکثر مشرک لوگ شدید مصیبت کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے تھے اور جو ایسا ایمان رکھتے تھے جیسا ایمان رکھنے کا حق ہے، وہ مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے اور محاوروں میں ایسے قضایا حالت غالبہ کے اعتبار سے بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرک) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس کے واقع ہونے کے بارے میں غور کرکے یہ) سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے (اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں۔ چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا، اور نہ ہی ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا، اور (اس مصیبت کی شدت کے بارے میں غور کرکے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ (آخرت میں جو کہ دار الجزاء ہے) اللہ تعالیٰ کا عذاب (اور بھی) سخت ہوگا (تو اس طرح غور کرنے سے ان کے تراشے ہوئے معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت وعظمت کا انکشاف ہونے پر توحید اور ایمان اختیار کرلیتے)

فائدہ: غور کرنے کے واسطے مصیبت کے وقت کا جو خاص طور سے ذکر کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایسے ہی وقت میں غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوجاتے تھے۔ اس لئے اس وقت کو یاد دلا کر متنبہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اس وقت کسی قدر راہِ راست کا رخ کرلیتے ہو اگر کسی قدر صحیح نظر سے کام لو تو اس وقت لازمی طور پر توحید کا حق ہونا منکشف ہوجائے اور توحید پر ثابت قدم ہوجاؤ۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝

ع ۴

ترجمہ: جبکہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے، ان لوگوں سے صاف الگ ہوجاویں گے جو ان کے کہنے پر چلے تھے، اور سب عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے اس وقت سب قطع ہوجاویں گے۔ اور یہ تابع لوگ یوں کہنے لگیں گے: کسی طرح ہم کو ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے صاف الگ ہوجاویں جیسا یہ ہم سے صاف الگ ہو بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ یوں ہی ان کی بداعمالیوں کو خالی ارمان کرکے ان کو دکھلا دیں گے۔ اور ان کو دوزخ سے

نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔

ربط: اوپر آخرت کے عذاب کو سخت فرمایا ہے، اب اس سختی کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔

آخرت کے عذاب کی شدت:

(عذاب کی وہ سختی اس وقت معلوم ہوگی) جبکہ (ان مشرکوں میں سے) وہ ذی اثر لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے۔ ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہوجائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور (خاص و عام) عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور ان میں آپس میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع تھا۔ دوسرا متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہوجائیں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور مقدمہ کی تنقیح کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی انکار کردیتے ہیں) اور (جب) یہ تابع لوگ (ان متبوعوں کی یعنی جن کی وہ اتباع کرتے تھے یہ طوطا چشمی اور بے وفائی دیکھیں گے تو بڑے جھنجھلائیں گے۔ اس وقت اور تو کچھ نہ ہوسکے گا مگر جھلا کر) یوں کہنے لگیں گے کہ کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ایک بار جانے کا موقع مل جائے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لے لیں کہ اگر یہ پھر ہمیں اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہوجائیں، جیسے یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہہ دیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر آنکھیں دکھائی تھیں، اب ہم سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس وقت ان تجویزوں اور سوچ بچار سے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا، یوں) اللہ تعالیٰ ان کی بداعمالیوں کو یوں ہی خالی ارمان (کے پیرایہ میں) کرکے ان کو دکھادیں گے اور ان (اتباع کرنے والوں اور متبوعین جن کی اتباع کی گئی سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار یعنی جہنم میں ہمیشہ کا داخلہ ہے)

تفسیر: اس عذاب میں کئی طرح کی شدت ثابت ہوئی۔ اول تو دوزخ کا عذاب حسی طور پر خود شدید ہے، دوسرے ان متبوعین کے ٹکا سا جواب دینے سے، اور اس وقت تابعین کو غیظ و غضب کے سوا اور انتقام کی تمنا سے کچھ نہ بن پڑنے کی وجہ سے اور مشترکہ طور پر سب پر حسرت واقع ہونے سے جو کہ روحانی عذاب ہے، اس حسی عذاب میں معنوی شدت اور بڑھ گئی۔

يَآيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال پاک چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم

مت چلو، فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ وہ تم کو ان ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ بری اور گندی ہیں اور یہ کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ کہ جس کی تم سند بھی نہیں رکھتے۔

ربط: اوپر اہل شرک کے عقیدہ کے باطل ہونے کو بیان کیا گیا تھا۔ آگے اہل شرک کے بعض اعمال کے باطل ہونے کو بیان کیا گیا ہے، جیسے سانڈ (گائے بیل) کی تعظیم وغیرہ۔

بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور کی تعظیم کا باطل ہونا:

(بعض مشرک بتوں کے نام پر جانور چھوڑتے تھے اور ان سے کسی بھی طرح فائدہ اٹھانے کو ان کی تعظیم کے اعتقاد کی وجہ سے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الٰہی اور رضاء حق کا ذریعہ اور ان بتوں کی شفاعت کے واسطہ سے اللہ کے تقرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہوں ان میں سے شرعی طور پر حلال پاک چیزوں (کے سلسلہ میں اجازت ہے کہ ان) کو کھاؤ (برتو) اور (اس نامزد کرنے سے ان کو تعظیم کے طور پر حرام قرار دینے کو اللہ کا حکم اور اس کی رضا وقرب کا ذریعہ ہونے کا عقیدہ رکھ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو کہ حقیقت میں وہ (شیطان) تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات اور جہالت کی باتوں کے ذریعہ تمہیں ہمیشہ کے گھاٹے میں گرفتار کر رکھا ہے۔ اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تو تمہیں اپنی باتوں کی تعلیم دے گا جو کہ (شرعاً) بری اور گندی ہیں اور یہ (بھی سکھائے گا) کہ اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے)

تفسیر: سانڈ وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں یا کوئی اور جانور بکرا، مرغا وغیرہ کسی بزرگ یا غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا جاتا ہے اس کا حرام ہونا آگے چار آیتوں کے بعد ﴿مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں آتا ہے۔ زیر بحث آیت ﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ﴾ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہو گیا ہے، بلکہ اس آیت میں ایک خاص طریقے سے حرام کرنے کی نہی وممانعت کرنا مقصود ہے، یعنی تم جو ایسا فعل کرتے ہو جس سے ان جانوروں وغیرہ کی حرمت ہو جائے یا ان جانوروں کو حرام قرار دے کر غیر اللہ کی تعظیم کرتے ہو اور اس عمل کو برکت اور تقرب کا ذریعہ سمجھتے ہو، اور اس سے فائدہ اٹھانے کو بے ادبی کا سبب سمجھتے ہو، پھر اس تحریم (حرام قرار دینے) کو ہمیشہ کے لئے ایسا عمل سمجھتے ہو کہ اس کی تحریم کبھی دور نہیں ہو سکتی کہ ان سے فائدہ اٹھانا ہمیشہ کے لئے ممنوع منہی عنہ قرار دے لیتے ہو۔ تو ایسے فعل کا یعنی سانڈ وغیرہ کے بتوں کے نام پر چھوڑنے کا یا کسی غیر اللہ کے لئے نامزد کرنے کا ارتکاب نہ کرو، بلکہ اسے اس کے حال پر رکھ کر کھاؤ پیو۔ اور نہ ایسے عمل کو مشروع (شریعت کی رو سے جائز) سمجھو۔ اور اگر ایسی حرکت جہالت و ناسمجھی سے ہو جائے تو ایمان وتوبہ اور نیت کی اصلاح کر کے اس کے حرام قرار دینے کے خیال کو دور کر دو۔ اور ظاہر ہے کہ

کرامت کے لئے حرام قرار دینے میں اور نجاست کی وجہ سے تحریم ثابت کرنے میں کچھ تعارض نہیں۔احقر نے جو تفسیر بیان کی ہے اس میں بھی اس کو صاف کر دیا ہے اور ہم نے جو حلال اور گندی چیزوں میں ''شرعی طور'' کی قید لگا دی ہے اس سے کسی کو قیاس آرائی کی گنجائش نہیں رہی۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ۞

ترجمہ: اور جب کوئی ان لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم بھیجا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں؟

ربط: گذشتہ آیت میں مشرکوں کے طریقہ کے باطل ہونے کا بیان تھا۔ اب اس طریقہ کے باطل ہونے کی دلیل کا بیان ہے۔

مشرکوں کی دلیل کا باطل ہونا:

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے، اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ ان لوگوں کو اس طریقہ کے اختیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا۔ حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں کہ) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے) خواہ ان کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔

تفسیر: مطلب یہ ہے کہ وہ باپ دادا ہی (اللہ کے حکم کو پکڑنے والے) نہ تھے اور تمسک (اللہ کے حکم کو پکڑنے) کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک کتاب کے الفاظ سے صریح طور پر، جسے ہدایت سے تعبیر فرمایا اور دوسرے قیاس کے واسطہ سے کتاب کے حکم کی علت سے، جسے عقل سے تعبیر فرمایا۔ تو دونوں ہی صورتوں سے خالی تھے، تو ایسے شخص کی تقلید کی کیا گنجائش ہے اور پھر تقلید بھی کسی ایسے محل میں نہیں جس سے سکوت اختیار کیا گیا ہو، بلکہ مورد دلیل میں، اور دلیل کے خلاف۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر بزرگ کے بارے میں صحیح و معتبر دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا قول دلیل شرعی کے ساتھ مستند ہوتا ہے، خواہ وہ دلیل شرعی نص ہو یا قیاس، تو وہ شخص شرعی طور پر اس وقت تک اتباع اور تقلید کے قابل ہوتا ہے جب تک کہ اس کے قول کا کسی صحیح صریح دلیل سے معارض ہونا ثابت نہ ہو جائے، اس لئے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی مذمت کی غرض سے اس آیت کا پڑھ دینا بالکل بے محل ہے، بلکہ اس سے تو دین کے مجتہدین کی تقلید کی تائید اور تقویت ہوتی ہے، جیسا کہ ابھی (اوپر) بیان کر چکا ہوں۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ؁

ترجمہ: اور ان کافروں کی کیفیت اس کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا۔ یہ کفار بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو سمجھتے کچھ نہیں۔

ربط: اوپر ان مشرکوں کی بدفہمی کا بیان تھا جو حق کو قبول نہ کرنے کا سبب تھا، آگے اس کج فہمی کے باب میں ان کی ایک مثال کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مشرکوں کی کج فہمی کی مثال:

اور ان کافروں کی کیفیت (سوءِ فہم میں) ایسی ہے جیسے ایک شخص ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو سوائے بلانے اور پکارنے کے (مضمون کی) کوئی بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت سنتے ہیں، لیکن کام کی بات سے بالکل) بہرے ہیں (گویا سنا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان پر آئی ہی نہیں) اندھے ہیں (کہ نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس میں خلل پڑ گیا تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ؁

ترجمہ: اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔

ربط: اوپر حلال و پاکیزہ چیزوں کے معاملہ میں مشرکوں کی غلطی ظاہر فرمانے سے مقصود ان کی اصلاح تھی۔ اب اہل ایمان کو اس غلطی میں ان کفار کی موافقت کرنے کی ممانعت ہے، اور اس ضمن میں اسی معاملہ میں اہل ایمان پر اپنا انعام ظاہر فرمانا، اور اس انعام پر انہیں ادائے شکر کا حکم فرمانا مقصود ہے۔

مؤمنوں پر نعمت کا اظہار اور شکر گذاری کا حکم:

اے ایمان والو (ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ) جو (شرعی طور پر) پاک چیزیں ہم نے تمہیں مرحمت فرمائی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور (اس اجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکر گذاری کرو۔ (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے، خدمت وطاعت بجالا کر بھی، اور دل سے ان نعمتوں کو اللہ کی جانب سے سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مسلم اور ظاہر ہے تو شکر کا وجوب بھی ثابت ہے)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر بھی جو شخص بیتاب ہو جاوے، بشرطیکہ نہ تو طلب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم۔

ربط: اوپر اس امر کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو۔ اب یہ ذکر ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرک اس معاملہ میں بھی مبتلا تھے، چنانچہ مردار اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور وغیرہ کو کھایا کرتے تھے۔ اور ان حرام چیزوں کے بیان کرنے سے مذکورہ مضمون کی بھی تائید مقصود ہے کہ دیکھو حرام یہ چیزیں ہیں، اپنی طرف سے حلال چیزوں کو حرام مت کرو۔

کھانے کی حرام چیزیں:

اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا گذرا یعنی) مردار (جانور) کو (جس کا ذبح کرنا واجب ہو، اس کے باوجود وہ شرعی طور پر ذبح کئے بغیر مر جائے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزا کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (تقرب کی نیت سے) غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک کی وجہ سے بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) لذت طلب کرنے والا ہو اور نہ (ضرورت وحاجت کی مقدار سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں میں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز سے گناہ اٹھا دیا)

اس مقام سے متعلق چند مسائل فقہیہ ہیں:

مسئلہ (۱): جس جانور کا ذبح کرنا شرعی طور پر ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کئے ہلاک ہو جائے وہ حرام ہوتا ہے، اور جس جانور کا ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، وہ دو طرح کے ہیں: ایک ٹڈی اور مچھلی، اور دوسرے وحشی جانور جیسے ہرن وغیرہ، جب کہ اس کے ذبح پر قدرت نہ ہو تو اگر اسے دور ہی سے تیر یا کسی دوسرے ہتھیار سے بسم اللہ کہہ کر زخمی کیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے۔ البتہ بندوق کا شکار بغیر ذبح کئے ہوئے حلال نہیں۔ کیونکہ گولی میں دھار نہیں ہوتی۔

مسئلہ (۲): جو خون بہتا نہ ہو اس سے دو چیزیں مراد ہیں: جگر (کلیجی) اور طحال (تلی) یہ دونوں حلال ہیں۔

مسئلہ (۳): خنزیر کے تمام اجزا یعنی گوشت، چربی، کھال اور اعصاب (پٹھے) سب حرام ہیں، اور نجس بھی۔

مسئلہ (۴): جس جانور کو کسی بھی غیر اللہ کے لئے اس نیت سے نامزد کر دیا ہو کہ وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ہمارا کوئی کام کر دیں گے جیسا کہ اکثر عام جاہلوں کی عادت ہے کہ اس نیت سے بکرا، مرغا وغیرہ مقرر کر دیتے ہیں، وہ حرام ہو جاتا ہے، اگر چہ ذبح کے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہو۔ البتہ اگر اس طرح نامزد کرنے کے بعد اس سے توبہ کر لے تو پھر وہ حلال ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: اس مسئلہ میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے، اس غلط فہمی کی دو وجہیں ہیں: اول یہ کہ گذشتہ آیت ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ کا شانِ نزول یہ لکھا ہے کہ جو لوگ سانڈ وغیرہ کو حرام قرار دیتے ہیں ان کی رد میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سانڈ وغیرہ حلال ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تحریم اور مدعی کی اس تحریم میں چند فرق ہیں:

اول: یہ کہ وہاں تحریم کے معنی ہیں ایسا فعل کرنا جس سے حرمت پیدا ہو جائے، جیسے خود سانڈ وغیرہ چھوڑنا۔ اور یہاں تحریم کے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی ایسا فعل کرے تو حرمت کا حکم ہو جائے گا۔

دوسرے: ان کی تحریم اس جانور کی تعظیم اور ادب کے اعتقاد سے تھی اور یہ تحریم اس جانور کے خبث اور نجاست کی وجہ سے ہے۔

تیسرے: وہ تحریم اُن کے عقیدہ میں دائمی یعنی ہمیشہ کے لئے تھی کہ کسی طرح دور نہیں ہو سکتی تھی اور یہ تحریم غیر ابدی ہے کہ اگر توبہ کر لو تو دور ہو جائے اور یہ دور کر دینا واجب ہے۔ اس طرح اس تحریم کی نفی، یا نہی یا انکار سے اس تحریم کی نفی لازم نہیں آتی۔

غلط فہمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اُهِلَّ کی تفسیر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر ذبح کرنا: کی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہی جانور مراد ہے، جس کو اللہ کے نام کے بجائے کسی غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس تفسیر سے حصر (حرام کا اسی معاملہ میں محدود ہونا) لازم نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ اس حرام کی ایک تفسیر یہ بھی ہے۔ چونکہ دور جاہلیت میں اس کا زیادہ رواج تھا، اس لئے یہ تفسیر کر دی گئی۔ زیر گفتگو معاملہ میں یہ مذکورہ تفسیر دوسرے معاملہ میں ساکت رہے گی، اس لئے اس میں کچھ ضرر نہیں، بلکہ حرمت کے دوسرے دلائل موجود ہیں، جن میں ایک تو یہی آیت ہے، کیونکہ اھل یا اھلال لغت کے اعتبار سے مطلق نامزد کر دینے میں عام ہے، خواہ کسی کے بھی نام سے ذبح ہو۔ پھر دوسری آیت اس سے بھی زیادہ صریح اور واضح ہے۔ سورۂ مائدہ میں ﴿ مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ کے بعد ﴿ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ الگ سے فرمایا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جس ذبح سے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا تقرب اور تعظیم مقصود ہو وہ حرام ہو جاتا ہے۔ تیسرے صحیح مسلم میں حدیث مرفوع ہے: لعن الله من ذبح لغير

اللہ: (جس نے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے ذبح کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے) اور ظاہر ہے کہ ایسے متنازع فیہ ذبح پر اللہ کے سوا کے لئے ذبح کرنا صادق آتا ہے۔ چنانچہ فقہی کتابوں میں یہاں تک وضاحت ہے کہ اگر کسی حاکم کے آنے پر کسی جانور کو بھینٹ کے طور پر ذبح کیا جائے، گو اس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر بھی وہ ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہو کر حرام ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ درمختار وغیرہ میں ہے۔ اور نووی نے بھی مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں امیر کے آنے پر اس طرح ذبح کئے ہوئے جانور کی حرمت اسی بنا پر شیخ ابراہیم مروزی شافعی سے نقل کی ہے۔ بعض لوگوں کو تفسیر احمدی کی عبارت سے یہ شبہ ہو گیا ہے۔ اس کا جواب اس کے منہیہ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ایصالِ ثواب کی نیت کی تاویل کی بنا پر حلّت کا حکم فرمایا ہے، بغیر تاویل کے حلال قرار نہیں دیتے۔ جیسا کہ اس قسم کی تاویل سے متعلق نووی نے ابراہیم مروزی کے قول کے بعد رافعی کا قول نقل کیا ہے، تو جہاں یہ تاویل یقینی طور پر منفی ہو، اُسے کیسے حلال کہا جائے گا اور عوام کا یہ فعل یقینی طور پر قابلِ تاویل نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس جانور کے بدلہ میں اس سے بھی دوگنی قیمت کی چیز انہیں دے کر کہا جائے کہ اس جانور کے بجائے اس چیز سے ایصالِ ثواب کر دو تو وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے اور اس تبدیلی میں ان بزرگوں کی ناراضی کا اندیشہ ظاہر کریں گے۔ جس سے نیت کا فساد یقینی طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور یہی حرمت کا مدار ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝

ع ۲۱

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب کا اخفاء کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں، ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے۔ اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت چھوڑ کر عذاب، سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔ یہ سزائیں اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا۔ اور جو لوگ کتاب میں بے راہی کریں وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور کے خلاف میں ہوں گے۔

ربط: اوپر محرَّماتِ حِسّیہ (نظر آنے والی چیزوں کی حرمت) کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں معنوی طور پر حرام کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے، جو یہودی علماء کی عادت تھی کہ غلط احکام بیان کر کے عوام سے رشوت لیتے اور کھاتے تھے۔ اور اس میں

امت محمدیہ کے علماء کے لئے بھی تعلیم ہے کہ ہم نے جو کچھ احکام بیان کئے ہیں، کسی بھی نفسانی غرض اور نفع کی خاطر ان کے بیان اور تبلیغ میں کوتاہی مت کرنا۔

دین فروشی کو حرام قرار دینا:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کو چھپاتے ہیں اور اس (خیانت) کے بدلہ میں (دنیا کی) تھوڑی سی چیز وصول کرتے ہیں، ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (ہی ان کے گناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے اور انہیں دردناک سزا ہوگی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کی (اور آخرت میں) مغفرت کو چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے ان کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہ روی (اختیار) کریں وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (دراز) کی خلاف ورزی میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی سخت سزاؤں کے مستحق ہوں گے)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر۔ اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہو۔ اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں: یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

ربط: سورت کے شروع سے یہاں تک جو کہ نصف سورہ بقرہ ہے، گفتگو کا رخ زیادہ تر منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب سے پہلے قرآن کی حقانیت ثابت کی، اس ضمن میں اس کے ماننے اور نہ ماننے والے فرقوں کا ذکر کیا، پھر توحید اور

رسالت کو ثابت کیا، پھر بنی اسرائیل پر عام اور خاص نعمتوں کا ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ ﴾ تک بیان فرمایا۔ وہاں سے قبلہ کی بحث چلی اور اس کو بیان کر کے صفا ومروہ کی بحث پر ختم کیا۔ پھر توحید کو ثابت کرنے کے بعد شرک کے اصول اور فروع کو باطل کیا۔ اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہے۔ البتہ ضمناً غیر مسلموں کو کوئی خطاب ہو جانا دوسری بات ہے۔

اب اس آیت میں اور آئندہ آیتوں میں جو کہ سورہ بقرہ کا نصف ہے زیادہ مقصود مسلمانوں کو بعض اصول وفروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلموں کوئی خطاب ہو جائے۔ اور یہ مضمون سورت کے ختم تک چلا گیا ہے۔ جسے ایک مجمل عنوان ''بِرّ'' سے شروع کیا گیا ہے جو کہ ظاہری وباطنی تمام طاعتوں کے لئے عام ہے۔ اور اس پہلی آیت میں جامع الفاظ مثلاً کتاب پر ایمان، مال دینے، عہد کے پورا کرنے، تکلیف و پریشانی کے وقت صبر کی کلی طور پر تعلیم کی گئی ہے جن میں کتاب کے تمام احکام، انفاق کے انواع، نکاح ومعاملات کے عہد اور جہاد وغیرہ شامل ہیں۔ آگے اس ''بِرّ'' کی تفصیل چلی ہے، جس میں وقت اور مقام کے تقاضہ کے مطابق بہت سے احکام مثلاً قصاص ووصیت وصیام (روزہ) وجہاد وحج وانفاق وحیض وایلاء ویمین (قسم) وطلاق ونکاح وعدت ومہر اور جہاد، انفاق فی سبیل اللہ کی تکرار اور بیع وشرا (خرید وفروخت) کے بعض معاملات حسب ضرورت بیان فرما کر بشارت اور رحمت ومغفرت کے وعدے پر ختم فرمادیا۔ سبحان اللہ! کیا عمدہ وبلیغ ترتیب ہے۔ چونکہ ان مضامین کا حاصل اجمالاً وتفصیلاً ''بر'' (اللہ کی رضا کے لئے کیا ہوا ہر فعل) کا بیان ہے، اس لئے اگر اس مجموعہ کا عنوان ''ابواب البر'' رکھا جائے تو نہایت زیبا ہے۔ الموفق (اللہ ہی توفیق دینے والا) ہے۔

نیکی کی بنیادی باتیں:

سارا کمال اس میں نہیں (آگیا) ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف (کرلو) بلکہ (اصل) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر یقین رکھے اور (اس طرح) قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب آسمانی) کتابوں پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ حالت میں چھوڑ کر مر گیا ہو) اور دوسرے (غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (ان) مسافروں کو (جن کے پاس سفر کی ضرورت کے لئے خرچ کا سامان یا روپیہ پیسہ نہ رہا ہو) اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص، نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو۔ اور جو اشخاص (کہ ان اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی جائز امر کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہوں کہ وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے

ہوں (ایک تو) تنگ دستی میں اور دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے کفار کے ساتھ) قتال (کے معرکہ) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں بس) یہ لوگ سچے ہیں (جو کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں (غرض دین کے اصلی مقاصد اور کمالات یہ ہیں۔ اور نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا ان ہی مذکورہ کمالات میں سے ایک خاص کمال یعنی نماز کے قائم کرنے کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں بھی حسن آگیا۔ ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)

فائدہ (۱): خاص سمتوں کے قصہ کا یہاں اس لئے ذکر ہوا کہ تحویلِ قبلہ کے وقت یہود و نصاریٰ کی تمام تر بحث اسی مسئلہ میں رہ گئی تھی۔ اس لئے متنبہ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر دوسرے کام ہیں ان کا اہتمام کرو۔

فائدہ (۲): شریعت میں تمام احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں: (۱) عقائد (۲) اعمال (۳) اخلاق۔ اور تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں اقسام کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ آیت جوامع کلم (جامع کلمات) میں سے ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى، اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى، فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ، ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ، فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولین کے بارہ میں۔ آزاد آدمی آزاد آدمی کے عوض میں، اور غلام غلام کے عوض میں، اور عورت عورت کے عوض میں، ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جاوے تو معقول طور پر مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دینا ہے، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے، اور ترحم ہے، پھر جو شخص اس کے بعد تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا۔ اور فہیم لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ پرہیز رکھو گے۔

ربط: بر (اللہ کی رضا کے لئے کئے جانے والے افعال) کے اصولوں کے بعد اب پیش آنے والے واقعات کی ضرورت کے مطابق بر کے کچھ فروع یعنی جزئی احکام کا بیان ہے۔

نیکی کے بعض جزئی احکام:

پہلا حکم: قصاص کی فرضیت

اے ایمان والو! تم پر قصاص (کا قانون) فرض کیا جاتا ہے (قتل عمد کے) مقتولوں کے بارے میں (یعنی ہر آزاد

آدمی (قتل کیا جائے ہر دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے) غلام کے عوض میں (اور اسی طرح) عورت (ہر دوسری) عورت کے عوض میں (خواہ یہ قاتل اعلیٰ درجہ کے اور مقتول ادنی درجہ کے ہوں، تب بھی سب کو برابر سمجھ کر قصاص لیا جائے گا، یعنی قاتل کو سزا کے طور پر قتل کیا جائے گا) ہاں جس (قاتل کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے (مگر پوری معافی نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو بری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خون بہا کے طور پر ایک معین مقدار میں قاتل کے ذمہ مال واجب ہو جائے گا تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی مقتول کے وارث کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (ہے کہ اسے زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہونچا دینا (ہے کہ مقدار میں کمی نہ کرے اور خواہ مخواہ ٹال مٹول بھی نہ کرے) یہ (دیت اور معافی کا قانون) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف اور (شاہانہ) رحم وکرم کا معاملہ ہے (ورنہ قتل کی سزا کے سوا کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہونے کے) بعد تعدی وزیادتی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا شبہ کی بنیاد پر قتل کا دعوی کردے یا معاف کر کے پھر قتل کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہوگا۔ اور (اے سمجھ دار لوگو!) قصاص (کے اس قانون) میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے اجرا کے خوف سے قتل کے ارتکاب سے ڈریں گے تو کئی جانیں بچیں گی) ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے امن کے قانون کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

اس مقام سے متعلق چند مسائل ہیں:

مسئلہ (۱): قتلِ عمد یہ ہے کہ کسی کو جان بوجھ کر قصداً کسی آہنی ہتھیار سے یا کسی ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے: قتل کیا جائے۔ قصاص یعنی قتل کی سزا اسی قتل کے جرم میں خاص ہے۔

مسئلہ (۲): ایسے قتل میں جس طرح آزاد آدمی آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جاتا ہے، اسی طرح غلام کے عوض میں بھی اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت کو قتل کیا جاتا ہے اسی طرح مرد بھی عورت کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے۔

مسئلہ (۳): اگر قتل عمد میں قاتل کو پوری معافی دے دی جائے۔ مثلاً مقتول کے وارث اس کے صرف دو بیٹے تھے اور دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو۔ مثلاً مذکورہ بالا دونوں بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا اور دوسرے نے معاف نہیں کیا تو قاتل قصاص کی سزا سے تو بری ہو گیا، لیکن معاف نہ کرنے والے بیٹے کو نصف دیت یعنی خون بہا دلایا جائے گا۔ اور خون بہا شریعت اسلامی میں یہ ہے کہ سو اونٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم (اس زمانہ میں ایک دینار دس درہم کا ہوتا تھا) اور ان اونٹوں کی عمروں وغیرہ کا فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

مسئلہ (۴): جس طرح ناتمام (ناقص یا ادھوری) معافی سے مال واجب ہوتا ہے، اسی طرح اگر آپس میں مال کی کسی

مقدار پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ اونٹوں یا اشرفیوں یا روپیوں پر صلح ہو تو ان اشیا کی جس مقدار کا اوپر ذکر آیا، اس سے زیادہ پر معاملہ نہ ہو، البتہ اگر کسی اور جنس پر صلح ہو جائے، مثلاً کوئی غلہ، یا کپڑا یا گھوڑے تو جس قدر قیمت کی بھی ہوں صلح جائز ہے، پھر خواہ یہی مقررہ چیزیں لے لے اور چاہے تو ان مقررہ چیزوں کے عوض میں آپس میں رضامندی سے اشرفیاں یا روپئے خواہ یہ اشرفیاں یا روپئے مندرجہ بالا مقدار سے زیادہ ہوں، لے لے) سب جائز ہے۔

مسئلہ (۵): قتل عمد میں دیت یا صلح سے جو مال واجب ہو، وہ صرف قاتل کے مال میں واجب ہوتا ہے۔

مسئلہ (۶): مقتول کے جتنے شرعی وارث ہوں گے ان میں وراثت کے حصوں کے مطابق ہی قصاص میں حصے ہوں گے اور اسی طرح مال دیت سب میں مشترک ہوں گے۔ یہ سب مسائل ہدایہ میں ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

ع ۲۱ / ۵

ترجمہ: تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول طور پر کچھ کچھ بتلا جاوے، جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری ہے، پھر جو شخص سن لینے کے بعد اس کو تبدیل کرے گا تو اس کا گناہ ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اس کو تبدیل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں۔ ہاں جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی بے عنوانی کی یا کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو، پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو معاف فرمانے والے ہیں اور رحم کرنے والے ہیں۔

دوسرا حکم وصیت:

(اسلام کے شروع میں جب تک میراث کے حصے شریعت کی طرف سے مقرر نہیں ہوئے تھے، یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک تہائی تک مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو جتنا جتنا مناسب سمجھے بتا جائے۔ اتنا تو ان لوگوں کا حق ہوتا تھا جو کچھ باقی رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا۔ اس آیت میں اس حکم کا ذکر ہے یعنی) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے، اگر اس نے کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ وصیت کر جائے، جنہیں اللہ کا خوف ہے، ان

کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا) ہے۔ پھر (جو شخص (بھی) سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم وفیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا اور اس کے مطابق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جائے گا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (عدالت کے حاکم یا ثالث کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے، جانتے ہیں (تو تبدیلی کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی تبدیلی کی اجازت ہے، وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارہ میں غلطی سے) کسی بدعنوانی کی یا (قصداً وصیت کے قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی سے) کسی جرم کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس مردے کے پس ماندگان یعنی ترکہ کے مستحقوں اور وصیت کے مال کے مستحقوں میں نزاع کا احتمال یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرادے (اگرچہ وہ مصالحت وصیت کے اس مضمون کے خلاف ہو جو ظاہراً وصیت کی تبدیلی ہے) تو اس (شخص) پر کوئی گناہ (کا بار) نہیں ہے اور واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور (گناہ گاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور یہ شخص تو اس اصلاح میں فرماں بردار ہے تو اس پر کیوں رحمت نہ ہوگی؟)

فائدہ: اس حکم کے تین جز تھے: ایک اولاد کے علاوہ دوسرے ورثاء کے ترکہ میں حصے اور حقوق معین نہ ہونا۔ دوسرے ایسے اقارب کے لئے وصیت کا واجب ہونا۔ تیسرے تہائی مال سے زیادہ وصیت کی اجازت نہ ہونا۔ چنانچہ پہلا جز تو آیت میراث سے منسوخ ہے، دوسرا جز حدیث سے جس کی تائید اجماع سے ہوئی ہے، منسوخ ہے۔ اور وجوب کے ساتھ جواز بھی منسوخ ہو گیا۔ یعنی شرعی وارث کے لئے مالی وصیت باطل ہے۔ تیسرا جز اب بھی باقی ہے، ایک تہائی سے زیادہ میں بالغ وارثوں کی رضامندی کے بغیر وصیت باطل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے۔ اور جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا ہے، اور جو شخص خوشی سے خیر کرے تو یہ اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے اگر تم خبر رکھتے ہو۔

تیسرا حکم: روزوں کی فرضیت

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلی (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی عادت پڑے گی اور اسی عادت کی پختگی تقوی کی بنیاد ہے، اس لئے) تھوڑے دنوں کے روزے رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے رمضان کا مہینہ مراد ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا تکلیف دہ ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور رمضان کے مہینہ کے دنوں کے بجائے) دوسرے دنوں کی (اتنی ہی) گنتی (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر بھی روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) ان کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور (گو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہے، لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

تفسیر: پہلی امتوں میں سے نصاری پر روزہ فرض ہونے کا بیان ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ نصاری پر ماہِ رمضان کا روزہ فرض ہوا تھا۔ ان کا کوئی بادشاہ بیمار ہوا تو اس کی قوم نے نذر مانی کہ اگر بادشاہ کو شفا ہو جائے تو ہم مزید دس روزوں کا اضافہ کردیں گے۔ پھر کوئی اور بادشاہ بیمار ہوا تو اس کی صحت پر سات روزوں کا مزید اضافہ ہوا، پھر تیسرا بادشاہ بیمار ہوا تو اس نے تجویز کیا کہ پچاس میں تین ہی کی کسر رہ گئی ہے، لاؤ تین اور بڑھالیں اور ربیع کے ایام میں سب رکھ لیا کریں (روح المعانی بروایت ابن حنظلہ والنحاس وطبرانی بروایت معقل بن حنظلہ مرفوعاً) اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ میں روزہ کی ایک حکمت کا بیان ہے۔ جس کی وضاحت ترجمہ کے ذیل میں کردی گئی ہے۔

روزہ کی حکمت کا تقوی میں محدود نہ ہونا:

لیکن روزہ کی حکمت کا تقوی میں ہی انحصار نہیں ہوگیا، اللہ جانے اور کیا کیا ہزاروں حکمتیں ہوں گی۔ اس لئے کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ جب روزہ کا مقصود معلوم ہوگیا تو اگر یہ مقصود دوسرے طریقہ سے حاصل کرلیں تو روزہ کی یا رمضان کی قید کی کیا ضرورت ہے؟

گنجائش نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے روزے میں کچھ خاص حکمتیں اور ثمرات ایسے ہوں کہ وہ شرعی طور پر مقرر ان خاص قیود کے بغیر حاصل نہ ہوسکیں۔ خوب سمجھ لو۔

اور اس مقام پر چند فقہی مسائل ہیں:

مسئلہ (۱): جس بیماری میں روزہ رکھنا نہایت دشوار ہو یا مرض کے لئے مضر ہو، اس میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

مسئلہ (۲): حنفیوں کے نزدیک شرعی سفر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قیام کی جگہ سے تین منزل کی نیت سے سفر کرلے تو راستہ میں وہ مسافر ہوگیا۔ اب اگر منزل مقصود پر پہونچ کر پندرہ دن یا زیادہ قیام کا ارادہ کرلیا تو مسافر نہ رہا۔ اور اگر پندرہ روز سے کم کے قیام کا ارادہ کیا تو پھر بھی مسافر ہے۔ غرض جو شخص شرعی طور پر مسافر ہو اس کے لئے جائز ہے کہ روزہ رکھنے کی قوت وطاقت کے باوجود روزہ نہ رکھے۔ البتہ ایسی حالت میں بھی افضل یہی ہے کہ روزہ رکھے۔

مسئلہ (۳): یہ مریض اور مسافر جن کا ذکر کیا گیا اس دن کے روزے کی نیت نہیں کر چکے تھے تو روزہ نہ رکھنا درست ہے، اور اگر نیت کر چکے ہوں تو بغیر شدید تکلیف کے روزہ توڑنا جائز نہیں۔

مسئلہ (۴): یہ مریض اور مسافر جتنے دن روزہ نہ رکھیں ان دنوں کی گنتی یاد رکھیں اور جب مرض یا سفر ختم ہو جائے تو رمضان گذر جانے کے بعد اتنے دنوں کا روزہ قضا کی نیت سے رکھیں۔ اور قضا کے یہ روزے چاہے بیک وقت رکھیں خواہ ایک ایک دو دو کر کے جیسے چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ اور سفر یا مرض کے ختم ہونے کے بعد اگر کچھ رمضان بھی باقی ہے تو بقیہ رمضان کے روزے ادا کر کے اس کے گذر جانے کے بعد یہ قضا روزے رکھ سکتے ہیں۔

مسئلہ (۵): شروع اسلام میں جب لوگوں کو دھیرے دھیرے روزہ کی عادت ڈالنا منظور تھا، یہ حکم ہوگیا تھا کہ استطاعت کے باوجود روزہ رکھنے کی بجائے اس کا فدیہ دے سکتے ہیں۔ اب یہ حکم منسوخ ہے۔ البتہ جو شخص بہت بوڑھا یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی امید نہ رہی ہو تو ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم اب بھی باقی ہے کہ ہر روزہ کے بدلہ یا تو ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلا دیں یا فی روزہ ایک مسکین کو اسّی سیر کے من والے حساب سے پونے دو سیر گیہوں (ایک کلو ۶۶۲ گرام) گیہوں دیدیا کریں۔

تنبیہ: یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگر ایک روزے کے بدلہ میں اتنے گیہوں دو مسکینوں کو دیں گے تو فدیہ درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک تاریخ میں ایک مسکین کو دو دن کا فدیہ دیں گے تب بھی درست نہ ہوگا، اگر فدیہ دینے کے بعد اس شخص میں طاقت وقوت آگئی یا وہ مرض جاتا رہا تو ان روزوں کو پھر قضا کرنا ہوگا۔ البتہ اس فدیہ کا ثواب الگ ملے گا۔ مگر یہ فدیہ روزوں کے بدلہ نہ رہے گا۔ اور اگر کسی کو فدیہ دینے کی بھی وسعت نہ ہو بجائے فدیہ کے وہ صرف استغفار کرے اور نیت رکھے کہ جب ممکن ہوگا ادا کردوں گا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، يُرِيْدُ

اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡوَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: ماہِ رمضان ہے، جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت اور واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کرلیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کیا کرو، اس پر کہ تم کو طریقہ بتلا دیا اور تاکہ تم شکر ادا کیا کرو۔

ربط: اوپر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے دنوں کے روزے رکھ لیا کرو۔ اب ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے۔

روزوں کے لئے دنوں کی تعیین:

وہ تھوڑے دن جن میں روزے رکھنے کا حکم ہوا ہے رمضان کا مہینہ ہے، جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس میں یعنی اس کے ایک خاص حصہ میں شب قدر ہے) قرآن مجید (لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا پر) بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت (کا ذریعہ) ہے اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتانے میں اس کا ایک ایک جز) واضح الدلالۃ ہے (اور ان دونوں صفتوں میں) من جملہ ان (آسمانی) کتابوں کے جن میں (یہ دونوں ہی صفتیں ہیں۔ یعنی وہ) ہدایت (کا ذریعہ بھی) ہیں اور (واضح الدلالۃ ہونے کی وجہ سے حق اور باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں۔ تو جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور فدیہ کی وہ اجازت جس کا اوپر ذکر ہوا منسوخ اور موقوف ہوگئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اوپر قانون تھا البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس کے لئے روزہ رکھنا مشکل یا تکلیف دہ ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے رمضان کے دنوں کے) دوسرے دنوں کا (اتنا ہی) شمار کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے۔ اللہ تعالیٰ کو (احکام میں) تمہارے ساتھ آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مقرر کئے جن کو تم آسانی سے بجا لا سکو۔ چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کردیا) اور (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) تمہارے لئے دشواری (پیدا کرنا) منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کردیتے) اور یہ احکام جن کا ذکر کیا گیا، ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے۔ چنانچہ اولاً روزہ اس کے اپنے وقت پر ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر کی وجہ سے رہ جائے تو دوسرے دنوں میں قضا کرنے کا حکم اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ (ادا یا قضا کے دنوں کی) گنتی پوری کرلیا کرو (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے دیا) تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثنا) بیان کیا کرو۔ اس پر کہ تمہیں (ایک

ایسا) طریقہ بتادیا (جس کی بدولت تم رمضان کے مہینہ کے روزوں کی برکتوں اور ثمرات سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا کا حکم واجب کے طور پر نہ ہوتا تو بہت کم لوگ اس کا اہتمام کرتے) اور (عذر کی صورت میں خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (آسانی کی اس نعمت پر اللہ کا) شکر ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہوتی)

تفسیر: قرآن مجید میں دوسری آیتوں میں آیا ہے کہ ہم نے قرآن مجید شب قدر میں نازل فرمایا اور یہاں رمضان شریف میں نازل کرنا فرمایا ہے۔ ان دونوں باتوں میں مطابقت یہ ہے کہ وہ شب قدر جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا، رمضان کی تھی، اس لئے ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہاں یہ وسوسہ بھی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن مجید تو کئی سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور ﷺ پر نازل ہوا ہے، پھر رمضان یا شب قدر میں نازل فرمانے کے کیا معنی ہیں؟

اس وسوسہ کے جواب کی طرف احقر نے ترجمہ کے درمیان اشارہ کردیا ہے، یعنی لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر ایک ہی بار میں رمضان کی شب قدر میں نازل ہو چکا تھا، پھر آسمانِ دنیا سے دنیا میں بتدریج کئی سال میں نازل ہوا۔ اس طرح اس میں بھی تعارض نہیں رہا۔ چنانچہ روح المعانی میں حضرت ابن عباس اور ابن جبیر اور حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول نقل کیا ہے: انه نزل فيه جملة إلى السماء الدنيا ثم نزل منجما في ثلث وعشرين (وہ ایک ہی بار میں رمضان کی شب قدر میں دنیاوی آسمان پر نازل کیا گیا، پھر تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال میں نازل کیا گیا) اور اس حدیث کے بھی یہی معنی ہیں جو امام احمد اور طبرانی نے واثلہ بن الاسقع کی روایت سے جناب رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہے کہ صحفِ ابراہیم اس رمضان کی پہلی رات میں، تورات چھٹی شب میں اور انجیل تیرہویں رات میں اور قرآن مجید چوبیسویں شب میں نازل کئے گئے (روح المعانی) واللہ اعلم

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

ترجمہ: اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں، منظور کر لیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی، جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں، امید ہے کہ وہ لوگ رشد حاصل کر سکیں گے۔

ربط: اوپر صوم کے احکام میں جن مصلحتوں کی رعایت فرمائی گئی ہے، اسی طرح آئندہ بھی بعض احکام میں مصالح اور سہولت کی رعایت کی جائے گی۔ ان سب سے حق تعالیٰ کا بندے کے حال پر توجہ اور عنایت فرمانا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے

موقع ومحل کی مناسبت سے قرب اور قبولیت کا ذکر فرماتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا قرب اور قبولیت:

اور (اے محمد ﷺ) جب آپ سے میرے بندے میرے (قرب اور بعد کے) متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے ان سے فرمادیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور نامناسب درخواست کو مستثنیٰ کر کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) درخواست کرنے والے کی عرضی، جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے تو (جس طرح میں ان کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (ان پر عمل کرتے ہوئے) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی نامناسب حکم نہیں اس لئے اس میں استثنا ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (میری ہستی پر بھی، میرے حاکم ہونے پر بھی، میرے حکیم ہونے پر بھی، اور رعایتوں و مصلحتوں پر بھی۔ اس طرح (امید ہے کہ وہ لوگ رشد (وفلاح) حاصل کریں گے۔

فائدہ: یہ جو فرمایا کہ جب دریافت کریں تو اس بارے میں ایک شخص نے دریافت کیا تھا۔

حق تعالیٰ کے قرب کا مطلب نہیں سمجھا جاسکتا:

اور یہ جو فرمایا کہ میں قریب ہوں تو جیسے حق تعالیٰ کی ذات کی حقیقت کا بے چوں وچگوں ہونے کی وجہ سے ادراک نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ان کی صفات کی حقیقت بھی معلوم نہیں ہوسکتی، لہٰذا ایسی بحثوں میں زیادہ کھوج جائز نہیں۔ مختصر طور پر اتنا سمجھ لیں کہ جیسی ان کی ذات ہے ان کی شان کے مناسب ان کا قرب بھی ہے۔

مناسب اور نامناسب درخواستیں:

اور احقر نے "جو نامناسب درخواست کو مستثنیٰ کرنے" کی قید ظاہر کی ہے اس کے ذریعہ دعا کی قبولیت سے متعلق وہ مشہور وسوسہ دور ہو گیا کہ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ دعا اس شخص کے حال کے مناسب نہیں ہوتی اور یہ ضروری نہیں کہ جو چیز واقع میں نامناسب ہو، اس کے نامناسب ہونے کی اطلاع خود اس شخص کو بھی ہو جایا کرے۔

اور کسی ملحد کو یہ شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ جیسے وہ ہماری صرف بعض حاجتیں قبول کرتے ہیں، ہم بھی ان کے صرف بعض احکام مان لیں۔ یہ گنجائش نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تو بعض درخواستیں نامناسب ہوتی ہیں، جبکہ ان کے تمام احکام مناسب ہی ہیں، چنانچہ احقر نے ترجمہ کے ضمن میں اس کو ظاہر کر دیا ہے۔

> أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ

ترجمہ: تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا، کیونکہ وہ تمہارے اوڑھنے بچھونے ہیں اور تم ان کے اوڑھنے بچھونے ہو، خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے۔ خیر اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو اب ان سے ملو ملاؤ اور جو تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے اس کا سامان کرو، اور کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح کا متمیز ہو جائے سیاہ خط سے، پھر رات تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

چوتھا حکم: روزہ توڑنے والی چیزوں سے روزہ کی راتوں میں فائدہ اٹھانے کا جواز:

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی رات میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور اس سے پہلے جو ممانعت تھی وہ موقوف کر دی گئی) کیونکہ (قرب و اتصال کی وجہ سے) وہ تمہارے لئے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے لئے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (حکم الٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے آپ کو مبتلا کر رہے تھے (مگر (خیر) جب تم معذرت سے پیش آئے (تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، تو (جب) اجازت ہوگئی تو اب ان سے ملو ملاؤ اور (اجازت کا قانون) جو تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے (بے تکلف) اس کا سامان کرو۔ اور (جس طرح روزہ کی رات میں بیویوں سے ہم بستری کی اجازت ہے، اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تمہیں صبح (صادق) کا سفید خط (کہ وہ نور ہے جبکہ وہ بالکل شروع میں طلوع ہوتی ہے) سیاہ خط سے (کہ وہ اس حد فاصل سے تاریکی کی عبارت ہے جو کہ صبح کے نور کے خط سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے) متمیز ہو جائے (یعنی صبح صادق طلوع ہو جائے) پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

تفسیر: شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ رات کو ایک بار نیند آ جانے سے آنکھ کھلنے کے بعد کھانا، پینا، بیوی کے پاس جانا حرام ہو جاتا تھا۔ بعض صحابہ سے غلبہ میں اس میں کوتاہی ہوگئی، تو انھوں نے نادم ہو کر حضور ﷺ کو اطلاع کی۔ ان کی ندامت اور توبہ پر حق تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور اس حکم کو منسوخ کر دیا۔

اور احقر نے خط تاریکی اور خط نور کے ملنے کو جو محسوس ہونے سے تعبیر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ واقع میں وہ دو خط نہیں، بلکہ ایک ہی خط ہے جو نور کی سطح اور ظلمت و تاریکی کی سطح دونوں کا منتہا اور دونوں کے درمیان میں مشترک اور جدا کرنے والا ہے، جیسا کہ اہل ریاضی جانتے ہیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ

ترجمہ: اور ان بیبیوں سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو، جس زمانہ میں تم اعتکاف والے ہو مسجدوں میں۔

پانچواں حکم: اعتکاف کا مسئلہ:

اور ان بیویوں (کے بدن) سے اپنا بدن (شہوت کے ساتھ) ملنے بھی مت دو، جس زمانہ میں کہ تم اعتکاف کر رہے ہو (جو کہ) مسجدوں میں ہوا کرتا ہے۔

مسئلہ (۱): اعتکاف کی حالت میں بیوی کے ساتھ صحبت اور اسی طرح بوس وکنار سب حرام ہے، پھر اگر بوس وکنار میں انزال بھی ہو گیا تو وہ اعتکاف جاتا رہے گا۔ اور اس کی جگہ دوسرا قضا کرنا ہوگا۔ البتہ اگر بلا شہوت ایک نے دوسرے کو ہاتھ لگایا یا بدن دبا دیا تو درست ہے، کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ (۲): اعتکاف صرف ایسی مسجد میں جائز ہے جس میں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز کا اہتمام ہو۔

مسئلہ (۳): جو اعتکاف رمضان میں نہ ہو، اس میں بھی روزہ شرط ہے (مگر نفل اعتکاف میں روزہ شرط نہیں)

مسئلہ (۴): اعتکاف والے کو مسجد سے کسی وقت باہر نکلنا درست نہیں، البتہ جو کام بہت ہی لاچاری کے ہیں، جیسے پیشاب، پاخانہ یا کوئی کھانا لانے والا نہ ہو تو گھر سے کھانا لے آنا یا جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے جانا، صرف ایسی ضرورت کے لئے باہر جانا درست ہے، لیکن گھر میں یا راستہ میں ٹھہرنا درست نہیں۔

مسئلہ (۵): اگر عورت اعتکاف کرنا چاہے تو جو جگہ اس کی نماز پڑھنے کے لئے مقرر ہے اس کے لئے اسی جگہ اعتکاف بھی درست ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ: یہ تو خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے ملنے کے نزدیک بھی مت ہونا، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام لوگوں کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس امید پر کہ وہ لوگ پرہیز رکھیں۔

مذکورہ بالا احکام کی تاکید:

یہ (سب مذکورہ بالا احکام) اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں۔ اس امید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ کے کھا جاؤ اور تم کو علم بھی ہو۔

چھٹا حکم: مال حرام کی ممانعت:

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے پاس اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ گناہ (یعنی ظلم) کے طور پر کھا جاؤ، اور تمہیں علم بھی ہو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ

ترجمہ: آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناختِ اوقات ہیں، لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔

ساتواں حکم: حج وغیرہ میں قمری حساب کا اعتبار:

آپ سے (بعض لوگ ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے، اس) کی تحقیقات کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ (اس کا فائدہ یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے لازمی طور پر یا سہولت کے طور پر) اوقات کی شناخت کا آلہ ہیں۔ لوگوں کے (اختیاری معاملات مثلاً عدت اور حقوق کے مطالبہ کے) لئے غیر اختیاری عبادات مثلاً) حج (وزکوۃ وروزہ وغیرہ) کے لئے۔

تفسیر: مطلب یہ ہے کہ سورج تو اپنی شکل کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا ہے، اگرچہ طلوع وغروب کے مقامات کے اعتبار سے ہر روز اس میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، لیکن وہ امر بہت ہلکا ہے کہ ایک مدت تک اس کا فرق ظاہر نہیں ہوتا، اور گہن ہمیشہ رہنے والا اور معین نہیں، برخلاف چاند کے کہ اس کی شکلیں جلد جلد بدلتی رہتی ہیں پھر ہر مہینہ میں ایک ہی ضابطہ پر ہوتے رہتے ہیں اور وہ اختلاف اتنا واضح ہے کہ ہر چھوٹا بڑا اس کو محسوس کرتا ہے۔ اس لئے عام طور پر مختلف طبقات اور درجات کے لوگوں کو جس طرح قمری حساب سے اوقات وتاریخوں کا سمجھنا اور یاد رکھنا آسان ہے، شمسی حساب سے یہ ممکن نہیں، اس لئے شریعتِ اسلامی نے اصلاً احکام وعبادات کا مدار قمری حساب پر رکھا ہے کہ ان امور میں سب کا اجتماع واتفاق سہولت کے ساتھ ممکن ہے۔

پھر بعض احکام میں تو اس حساب کو لازم کر دیا ہے کہ ان میں دوسرے حساب پر مدار رکھنا جائز ہی نہیں۔ جیسے حج وروزہ، رمضان وعیدین وزکوٰۃ وعدت طلاق وغیرہ۔ اور بعض میں گو اختیار دیا ہے جیسے کوئی چیز خریدی اور طے ہوا کہ اس وقت سے ایک شمسی سال یا مہینہ گذرنے پر یا فلاں شمسی تاریخ کو قیمت ادا کر دیں گے۔ اس میں شریعت نے مجبور نہیں کیا کہ قمری سال یا تاریخ پر ہی مطالبہ کا حق ہو جائے۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ابتدا سے ہی قمری حساب پر مدار رکھا جائے تو عام طور پر سہولت اس میں ہے۔ احقر نے جو لازمی طور پر یا سہولت کے طور پر کی نشاندہی کر دی ہے، وہ اسی مفصل مضمون کا اجمال ہے۔ اور اختیاری وغیر اختیاری جو ترجمہ میں واقع ہوا ہے، اس سے مراد شرعی طور پر ان کے وقت کا معین یا غیر معین ہونا ہے، ورنہ فعل کے اعتبار سے سب اختیاری ہیں۔ ورنہ شرعاً ان کا حکم ہی نہ ہوتا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

شمسی حساب کے استعمال کا حکم:

اور جاننا چاہئے کہ اپنی روزمرہ کی خط وکتابت اور حساب کتاب میں اگرچہ شمسی حساب کا استعمال کرنا شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ لیکن غور کرنے سے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ اور سلف صالحین کی وضع کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ خلاف اولیٰ ضرور ہے۔ اور چونکہ احکام شرعیہ کا مدار قمری حساب پر ہے، اس لئے اس کا محفوظ اور نظم وضبط میں رکھنا یقیناً فرضِ کفایہ ہے اور اس کے محفوظ رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں اس کو استعمال کیا جائے اور ظاہر ہے کہ فرض کفایہ عبادت ہے اور عبادت کی حفاظت کا آلہ یقیناً ایک درجہ میں عبادت ہے۔ اس لحاظ سے قمری حساب کا استعمال اس درجہ میں شرعی طور پر مطلوب قرار پایا۔ اس لئے مسلمان سے بعید ہے کہ ایک طرف ایک امر شرعی طور پر مطلوب ہو اور دوسری طرف دوسرا امر کسی درجہ میں اس شرعی امر سے ٹکراتا ہو، پھر بھی کوئی مطلوب کو چھوڑ کر بلاضرورت اس ٹکرانے والے کو اختیار کرے۔ خصوصاً اس طور پر کہ اس مطلوب سے کوئی خاص تعلق اور دلچسپی ہی نہ رہے اور غیر مطلوب کو ترجیح دینے لگے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

آٹھواں حکم: احرام کی حالت میں گھر میں داخل ہونے کے طریقہ کی اصلاح:

اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں اگر حج کے احرام کی حالت میں کسی ضرورت سے گھر میں جانا چاہتے تو بعض لوگ

گھر کے دروازہ سے جانا ممنوع سمجھتے تھے۔اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے اور اس عمل کو بڑی فضیلت قرار دیتے تھے،حق تعالیٰ حج کے ذکر کے بعد ان کے اس خیال وعمل کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: ’’اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت (پچھواڑے) کی طرف سے آیا کرو۔البتہ فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دوازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے،اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں۔سوا گر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ،اور (اصل امر تو یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے) امید ہے کہ تم (دونوں جہاں میں) کامیاب ہو۔

غیر لازم کو لازم کر لینا بدعت ہے:

اس سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوئی کہ جو شے شرعاً مباح ہو،اس کے طاعت وعبادت ہونے کا عقیدہ کر لینا، اسی طرح اس کے معصیت اور محل ملامت ہونے کا عقیدہ کر لینا شریعتِ اسلامی میں دونوں مذموم ہیں۔اور بدعت میں داخل ہیں۔چنانچہ گھروں میں دروازہ سے آنا مباح تھا۔ان لوگوں نے اسے معصیت سمجھا تھا اور دروازہ کو چھوڑ کر کسی اور طرف سے آنا بھی آپ میں مباح ہے،اس کو ان لوگوں نے عبادت اور فضیلت سمجھا تھا۔اس پر حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور ان کے اس اعتقاد کو باطل اور تقوی کے خلاف قرار دیا اور تقوی کو واجب فرمایا۔جس سے ظاہر ہے کہ جس چیز سے واجب کا ترک اور خلاف لازم آئے گا وہ گناہ ہوگا۔پس ان کے یہ دونوں عقیدے گناہ ہوئے۔اس قاعدہ سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔جو کہ عوام بلکہ خواص میں بھی شائع اور عام ورائج ہیں۔اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾

ترجمہ: اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو،واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔اور ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ اور ان کو نکال باہر کرو جہاں سے انھوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا،اور شرارت قتل سے بھی سخت تر ہے،اور ان کے ساتھ مسجدِ حرام کے قریب میں قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ

وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو تم ان کو مارو ایسے کافروں کی ایسی ہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ باز آجاویں تو اللہ تعالیٰ بخش دیں گے اور مہربانی فرمادیں گے۔ اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جاوے۔ اور اگر وہ لوگ باز آجاویں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔ حرمت والا مہینہ ہے بعوض حرمت والے مہینہ کے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

نواں حکم: کفار سے قتال کے بارے میں:

ذی قعدہ ۶ھ میں حضور ﷺ عمرہ کی ادائیگی کے قصد سے مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے، اس وقت تک مکہ معظمہ پر مشرکوں کا قبضہ، اقتدار اور حکومت تھی، ان لوگوں نے حضور ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ کے اندر نہ جانے دیا، اور عمرہ ادا نہ کیا جاسکا، آخر میں طویل گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ آپ آئندہ سال تشریف لا کر عمرہ ادا فرمائیں۔

چنانچہ ذی قعدہ ۷ھ میں آپ پھر اسی قصد سے روانہ ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرک معاہدہ پر عمل نہ کریں اور مقابلہ ومقاتلہ پر آمادہ ہو جائیں، ایسی حالت میں سکوت مصلحت نہ ہوگا، اور اگر مقاتلہ کیا جائے تو ذی قعدہ میں ہوگا، جبکہ اس وقت ذی الحجہ اور محرم اور رجب میں قتل وقتال ممنوع تھا، اور اسی وجہ سے یہ چار مہینے اشہر حرم کہلاتے تھے۔ اس طرح مسلمان اس تردد میں مبتلا اور پریشان تھے، اس وقت حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ گو معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ باہمی معاہدہ کی وجہ سے تمہیں اپنی جانب سے قتال کی ابتدا کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس وقت تم کسی قسم کے اندیشہ میں مبتلا مت ہو (اور (بے تکلف) تم (بھی) اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ لڑو جو (عہد شکنی کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں۔ اور (از خود معاہدہ کی) حد سے تجاوز نہ کرو (کہ عہد شکنی کرکے لڑنے لگو) واقعی اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور (جس حالت میں وہ خود نقض عہد کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو، جہاں ان کو پاؤ۔ اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو، جہاں سے انھوں نے تمہیں (تنگ کرکے اور اذیتیں پہونچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے اور (تمہارے اس قتل واخراج کے بعد بھی عقلاً الزام انہی پر رہے گا، کیونکہ ان سے جو عہد شکنی واقع ہوگی وہ بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی شرارت (ضرر ونقصان میں) قتل (واخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل واخراج کی نوبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچتی ہے، اس لئے یہ شرارت اصل اور قتل واخراج اس کی فرع ہے) اور (معاہدہ کے علاوہ ان کے ساتھ قتال میں ابتدا کرنے سے ایک اور امر بھی مانع

ہے۔اور وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ مکرمہ اور اس کا قرب وجوار ایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے۔اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے گرد (ونواح میں کہ حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو، جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تمہیں اجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو۔ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔پھر اگر (قتال شروع ہونے کے بعد بھی) وہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں (اور اسلام قبول کرلیں) تو (ان کا اسلام بے قدر و قیمت نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گذشتہ کفر کو) معاف کردیں گے اور (مغفرت کے علاوہ طرح طرح کی نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرمائیں گے۔اور (اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگر چہ دوسرے کفار سے جزیہ دینے کے وعدہ پر قتال سے رک جانے کا حکم ہے، لیکن یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، لہٰذا ان کے لئے قانون جزیہ نہیں ہے، بلکہ ان کے لئے اسلام ہے یا قتل۔اس لئے) ان کے ساتھ اس وقت تک لڑو کہ (ان میں) عقیدہ کا فساد (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجائے (اور کسی کے دین ومذہب کا خالص اللہ کے لئے ہوجانا قبولِ اسلام پر موقوف ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (جس کا ذکر ابھی ہوا ہے) تو (آخرت میں مغفرت ورحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے تمہیں یہ قانون بتایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی سوائے نافرمانی کرنے والوں کے کسی پر نہیں ہوا کرتی (جو ناانصافی کی غرض سے اللہ کے احسانات کو فراموش کرکے کفر وشرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو ناانصافی کرنے والے نہیں رہے۔لہٰذا ان پر قتل کی سزا کی سختی نہیں رہی۔اور اے مسلمانو! تمہیں جو ان کے نقضِ عہد کے اندیشہ کے تحت یہ تردد ہے کہ شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں لڑنا پڑے گا تو اس سے بھی بے فکر رہو۔کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تمہیں کفار کے ساتھ قتال سے) عوض میں (اس کے مانع ہوسکتا) ہے (کہ) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (وجہ یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں۔تو (جو تم سے ان کی رعایت کرے، اس کے ساتھ تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرے) زیادتی کرے تو تم بھی ان پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور (ان سب مذکورہ احکام کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں قانونی حد سے تجاوز نہ ہونے پائے) اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت ورحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ان آیتوں سے متعلق چند فقہی مسائل ہیں۔

(۱) قتال میں ابتدا:

کفار کے ساتھ قتال میں ابتدا کرنا اس صورت میں درست ہے جب جواز کے شرائط پائے جائیں اور اوپر جو ابتداء یا

قتال سے ممانعت فرمائی ہے وہ صرف معاہدہ کی وجہ سے ہے کہ معاہدہ کی صورت میں ابتدا نا جائز ہے۔ البتہ اگر معاہدہ کا باقی رکھنا اپنی مصلحت کے مطابق نہ ہو تو انہیں صاف طور پر یہ اطلاع کر دی جائے کہ ہم وہ معاہدہ باقی نہیں رکھتے، ختم کرتے ہیں پھر قتال جائز ہے۔ اسی طرح اگر وہ لوگ خود معاہدہ توڑ دیں تب بھی قتال جائز ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے باب میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں، انھوں نے آخر میں جب نقض عہد کر دیا تو ان سے یہاں تک قتل وقتال ہوا کہ مکہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا۔

(۲) جزیرۂ عرب کو کفار کا وطن بنانا اور حرم کے اندر قتال کرنا:

جزیرۂ عرب کے اندر جس میں حرم بھی شامل ہے، کفار کو وطن بنانے کی اجازت نہیں اور اگر وہ زبردستی رہنے کی کوشش کریں تو غیر حرم میں قتال کر کے بھی دفع کر دینا جائز ہے، البتہ حدودِ حرم کے اندر اولاً قتال نہیں کریں گے، بلکہ انہیں دوسرے طریقوں سے تنگ کریں گے کہ وہ خود حدودِ حرم کو چھوڑ کر باہر آجائیں۔ اور اگر کسی طرح نہ نکلیں اور وہ دفع کرنے پر قتال کے لئے آمادہ ہو جائیں تو پھر قتال جائز ہو جائے گا۔ اسی طرح اس شخص کا بھی یہی حکم ہے جو کسی جرم قتل وغیرہ کا ارتکاب کر کے حرم کے اندر جا گھسے۔ اس کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کے بعد قصاص وغیرہ لیں گے۔ اور یہاں جو نقض عہد نہ کرنے کی صورت میں ان سے تعرض نہ کرنے کا حکم ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کفار کے لئے جزیرۂ عرب میں آباد ہونے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، بعد میں یہ حکم مقرر ہو گیا۔

(۳) اشہر حرم میں قتال کرنا:

جمہور ائمہ دین کا اجماع ہے کہ اب اشہر حرم میں قتل وقتال جائز ہے، اور جن آیتوں سے ممانعت معلوم ہوتی ہے وہ منسوخ ہیں، تاہم افضل اب بھی یہی ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی ابتدا نہ کریں۔

(۴) عرب کے کفار سے جزیہ قبول نہ کرنا:

اگر ملک عرب میں کفار اسلام قبول نہ کریں تو ان کے لئے صرف قتل کا قانون ہے کہ اگر وہ جزیہ دینا چاہیں تو یہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ سب مسائل درمختار و ردالمحتار وغیرہ فقہ حنفی کی کتابوں سے منقول ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: اور تم لوگ خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور کام اچھی طرح کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

دسواں حکم: جہاد میں خرچ کرنا:

اور تم لوگ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو۔ اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے بد دلی اور کنجوسی کرنے لگو جس کا نتیجہ تمہارا کمزور اور مخالف کا قوی ہونا ہے جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہے۔ دل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کے ساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ اچھی طرح کام کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا "اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو" اس قید کا حاصل یہ ہے کہ خود اپنے اختیار سے کوئی کام حکم کے خلاف نہ کرو، اور جو بلا قصد و اختیار ہو جائے وہ معاف ہے (روح المعانی)

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ع ۸

ترجمہ: اور حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو، پھر اگر روک دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو، اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے، البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو فدیہ دیدے روزہ سے یا خیرات دیدینے سے یا ذبح کر دینے سے، پھر جب تم امن کی حالت میں ہو تو جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا ہو تو جو کچھ قربانی میسر ہو، پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آ جاوے، یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب میں نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سزائے سخت دیتے ہیں۔

گیارہواں حکم: حج اور عمرہ کے احکام:

اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (خوش کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ سب افعال و شرائط بھی بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دشمن کے ذریعہ یا کسی مرض کے سبب سے حج

وعمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرو اور حج وعمرہ کی جو وضع اختیار کر رکھی تھی اس کو موقوف کردو۔ واضح ہو کہ اسے احرام کھولنا کہتے ہیں۔ جس کا طریقہ شریعت میں سر منڈانا ہے اور بال کٹا دینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ روک ٹوک کے ساتھ فوراً ہی تمہارے لئے احرام کھولنا درست ہو جائے بلکہ) اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کرنے کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہونچ جائے (اور وہ موقع حرم ہے کہ قربانی کا جانور اگر وہاں خود نہ جاسکے تو کسی کے ہاتھ بھیجا جائے اور (ذبح کیا جائے) البتہ اگر تم میں سے کسی کو (کچھ) بیماری ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑ جائے) تو اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (خواہ تین) روزے سے یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقۂ فطر کی برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات سے یا (کم سے کم درجہ ایک بکری) ذبح کر کے۔

پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ یہ کہ پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا یا پیش آ کر جاتا رہا) تو (اس صورت میں حج وعمرہ کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ خاص) جس شخص نے عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھایا ہو (یعنی حج کے دنوں میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس کے لئے ضروری ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر صرف حج یا صرف عمرہ سے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج وعمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ قربانی کے بجائے) تین دن کے روزے ہیں (ایام حج) میں (کہ ان ایام کا آخر ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے) اور سات (دن کے) ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکو خواہ وہاں سے لوٹنا ہو یا وہاں ہی رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی جو حج وعمرہ کے ملانے کا ذکر ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کے لئے درست نہیں، بلکہ خاص اس شخص کے لئے درست) ہے جس کے اہل (وعیال) مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (وجوار) میں نہ رہتے ہوں (یعنی اس کا وطن حرم سے قریب نہ ہو) اور (ان سب احکام کی بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف ورزی نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (جسارت بیجا اور مخالفت کرنے والوں کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

مسئلہ (۱): جو شخص صاحب استطاعت ہو، اس پر تو حج شروع ہی سے فرض ہے اور جس شخص کو حج کی استطاعت نہ ہو پھر بھی وہ شروع کردے یعنی احرام باندھ لے، تو اس پر حج کا پورا کرنا فرض ہو جاتا ہے اور عمرہ فرض و واجب نہیں، بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ البتہ شروع کرنے سے اس کا بھی پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس لئے احقر نے آیت کی تفسیر میں "جب حج یا عمرہ کرنا ہو" لکھا ہے تا کہ فرض و واجب نہ ہونے کی صورت بھی اس میں شامل ہو جائے اور حج وعمرہ واحرام کے طریقے

فقہ کی کتابیں دیکھنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ (۲): اگر کسی عذر کی وجہ سے حج و عمرہ پورا نہ کر سکے خواہ راستہ میں بدامنی ہوگئی یا بیماری نے مجبور کر دیا تو ایسے شخص کو چاہئے کہ کسی معتبر شخص سے کہہ دے کہ فلاں تاریخ کو حد حرم کے اندر میری طرف سے ایک جانور کہ کم سے کم بکری ہے اور قران و تمتع میں جن کا ذکر عن قریب آرہا ہے دو بکری ذبح کر دینا، اور جب وہ تاریخ آجائے گو وہ قربانی کے ایام سے پہلے کی تاریخ ہو اور گمان غالب ہو کہ اب جانور ذبح ہو گیا ہوگا تو سر منڈا دے یا بال کٹا دے۔ اس سے احرام کھل جائے گا۔ اور جو جو امور احرام باندھنے کی وجہ سے ممنوع ہو گئے تھے، سب درست ہو جائیں گے، مگر اس حج یا عمرہ کو قضا کرنا پڑے گا۔

مسئلہ (۳): عورت کو سر منڈانا حرام ہے، وہ احرام کھولنے کے لئے صرف ایک ایک انگل کے برابر بال کاٹ ڈالے۔

مسئلہ (۴): اگر حج و عمرہ پورا کرنے کی کوئی مجبوری لاحق نہیں ہوئی، یا جو ہوئی تھی وہ بعد میں نہیں رہی، لیکن کسی اور عذر کی وجہ سے سر منڈانے کی ضرورت پڑ گئی تو اسے تین باتوں کا اختیار ہے۔ خواہ سر منڈا کر تین روزے رکھ لے خواہ چھ مسکینوں کو ہر ہر مسکین کو صدقہ فطر کے برابر دیدے یعنی گیہوں ایک صاع یا اسّی تولہ کے سیر کے حساب سے پونے دو سیر (کلوگرام کے حساب سے ایک کلو چھ سو چھیاسٹھ گرام) یا جس برتن میں اتنے گیہوں آجائیں اس کو دو بار بھر کر جَو دیدے یا ایک بکری ذبح کر کے مسکینوں کو تقسیم کر دے۔ اور گو اس حکم کا ذکر اس جگہ مُحصَر کے بیان کے ساتھ ہوا ہے، مگر عموم لفظ سے عام ہے، البتہ ذبح کے لئے حد حرم معین ہے، لیکن روزہ اور صدقہ کے لئے معین نہیں۔ اور ایک مسکین کو ایک ہی حصہ دینا چاہئے۔ اگر دو حصے دیئے تو ایک ہی مانا جائے گا۔

مسئلہ (۵): حج تین طرح کا ہوتا ہے: (۱) افراد: کہ ایام حج میں صرف حج کیا جائے اور تمتع و قران جن میں ایام حج میں عمرہ اور حج دونوں کئے جائیں۔ تمتع اور قران میں ایام قربانی میں حدودِ حرم کے اندر ایک جانور ذبح کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور جس کو قربانی کی استطاعت نہ ہو تو اس کے لئے اس کے عوض میں دس روزے رکھنے ضروری ہیں۔ ان میں سے تین روزے تو دسویں ذی الحجہ سے پہلے ختم کر دے اور سات اس وقت رکھ لے جب حج کر چکے، خواہ وطن آکر یا وہاں ہی۔ اور اگر دس ذی الحجہ سے پہلے تین روزے نہ رکھ سکا تو اب قربانی ہی کرنی پڑے گی۔

مسئلہ (۶): حج افراد ہر شخص کے لئے جائز ہے، لیکن تمتع اور قران صرف ان لوگوں کے لئے جائز ہے جو میقات کے حدود سے باہر رہتے ہوں اور جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہیں ان کے لئے تمتع و قران کی اجازت نہیں ہے۔ میقات یہ ہے کہ جب اپنے ملکوں سے چل کر مکہ کو جاتے ہیں تو ہر طرف کے لوگوں کے لئے کچھ معین میقات ہیں جن کی نسبت شرعی حکم ہے کہ ان مقامات پر سے مکہ کا ارادہ حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کر کیا جائے۔ انہی مقامات کا نام میقات ہے۔ زیر گفتگو آیت میں ان حدود سے باہر کے لوگوں کو اس عنوان سے تعبیر فرمایا گیا ہے ''اس کے اہل (وعیال) مسجد حرام کے قرب (وجوار) میں نہ رہتے ہوں'' اس قرب وجوار سے مراد یہی میقات ہیں اور یہ سب مسائل فقہ حنفی کے مطابق ہیں۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ: حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے تو پھر نہ کوئی فحش بات ہے اور نہ کوئی بے حکمی ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے، اور خرچ ضرور لے لیا کرو، کیونکہ سب سے بڑی بات خرچ لینے میں (سوال سے) بچا رہنا ہے۔ اور اے ذی عقل لوگو مجھ سے ڈرتے رہو۔

حج کے احکام کا تتمہ: حج کا وقت اور زادِ راہ کی تاکید:

حج (کے افعال کا زمانہ) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال دوسرا ذی قعدہ، تیسرا ذی الحجہ کی دس تاریخیں) تو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کرے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی نافرمانی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا جھگڑا (وتکرار) زیبا ہے (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک کاموں ہی میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے، اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچے رہنا ہے۔ اور اے عقل والو! (ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)

مسئلہ (۱): افعالِ حج: احرام سے شروع ہوتے ہیں، چنانچہ شوال کے مہینہ سے احرام باندھ لینا بلا کراہت درست ہے اور اس سے پہلے مکروہ ہے۔ اسی لئے شوال سے حج کے مہینے شروع سمجھے گئے۔ اور افعالِ حج میں جو کام فرض ہیں ان میں آخری فعل طوافِ زیارت ہے۔ جو ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو ہوتا ہے، اس لئے اس تاریخ کو ختم قرار دیا گیا۔ البتہ کچھ واجب افعال پھر بھی رہ جاتے ہیں جو بعد کی تاریخوں میں ادا ہوتے ہیں۔

مسئلہ (۲): فحش باتیں دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو پہلے ہی سے حرام ہیں وہ حج کی حالت میں اور زیادہ حرام ہوں گی۔ دوسرے وہ کہ پہلے سے حلال تھیں، جیسے اپنی بیوی سے بے حیائی اور بے حجابی کی باتیں کرنا۔ حج کے دنوں میں یہ بھی درست نہیں۔ اسی طرح نافرمانی دو طرح کی ہے: ایک وہ جو پہلے سے ہی حرام ہیں، جیسے تمام گناہ، یہ حج کی حالت میں اور زیادہ حرام ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ امور جو خاص حج کی وجہ سے منع ہو گئے، جیسے خوشبو لگانا، بال کٹانا وغیرہ، حج کے دنوں میں یہ امور ناجائز ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ساتھیوں سے لڑنا، جھگڑنا یوں بھی برا ہے مگر حج میں اور بھی زیادہ برا ہے۔

مسئلہ (۳): بغیر خرچ لئے ہوئے حج کو جانا ایسے شخص کے لئے درست نہیں جس کے نفس میں توکل کی قوت نہ ہو، اور غالب گمان ہو کہ شکایت اور بے صبری میں مبتلا ہو جائے گا اور سوال کر کے لوگوں کو پریشان کرے گا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: تم کو اس میں بھی ذرا گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس کے تم محض ہی ناواقف تھے۔ پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے اور مہربانی فرماویں گے۔

حج میں تجارت کرنا اور عرفات و مزدلفہ میں قیام کرنا:

(اور اگر حج میں کچھ تجارتی سامان ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو) تمہیں اس میں بھی ذرا گناہ نہیں (کہ حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے۔ پھر جب تم لوگ عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کر کے) اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو بلکہ) تم سب کے لئے (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اس جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں جا کر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں۔ اور (حج کے احکام میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے اور مہربانی فرماویں گے۔

حج کے واسطے مکہ سے عرفات کو جا کر نویں ذی الحجہ کو وہاں ٹھہرتے ہیں۔ راستہ میں منیٰ اور مزدلفہ پڑتے ہیں، پھر اس راستے سے لوٹتے ہیں اور دسویں رات کو مزدلفہ ملتا ہے، اس میں صبح تک ٹھہرتے ہیں اور یہاں مغرب و عشاء دونوں نمازیں عشا کے وقت جمع کر کے پڑھی جاتی ہیں، اور یہ جمع کرنا واجب ہے۔ آیت میں جو حکم اللہ کو یاد کرنے کا فرمایا ہے، اس میں یہ نمازیں بھی داخل ہیں۔ اس طرح یہ ذکر تو واجب ہے باقی ذکر جو کچھ کرے مستحب ہے۔

اور یہ جو کہا گیا کہ جس طرح بتا رکھا ہے اسی طرح یاد کرو، اس سے فائدہ یہ ہے کہ مثلاً اس جمع کرنے ہی میں کوئی شخص قیاس کو دخل دینے لگتا، اس سے روک دیا، مشعر حرام اسی مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے، اس کے پاس سے مراد سارا مزدلفہ ہے، سوائے ایک خاص میدان کے جسے وادی مُحَسِّر کہتے ہیں۔ اور جس جگہ بھی ٹھہر جائیں درست ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں چونکہ قریش خود کو حرم کا مجاور سمجھتے تھے اور مزدلفہ حرم میں ہے جبکہ عرفات حرم سے باہر ہے، اس لئے یہ لوگ عرفات میں نہ جاتے تھے۔ مزدلفہ ہی میں ٹھہر کر وہاں سے لوٹ آتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان احکام کا عام ہونا بتا دیا۔

اور تجارت کی اجازت کی تصریح اس لئے فرمائی کہ اسلام سے پہلے ان ایام میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اسلام کے بعد یہ شبہ ہوا کہ شاید گناہ ہو، اس لئے گناہ نہ ہونا بتا دیا تو مباح تو یقیناً ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اخلاص کے خلاف تو نہیں تو اس میں اس کا حکم دوسرے مباحات کی طرح ہے کہ دارو مدار نیت پر ہے۔ اگر حج سے اصل مقصود تجارت ہے یا حج اور تجارت دونوں مساوی درجہ میں ہیں تو بیشک اخلاص کے خلاف ہے اور حج کا ثواب کم ہو جائے گا اور اگر اصل مقصود حج ہے، اسی طور پر کہ اگر تجارت کا سامان نہ رہے تب بھی حج کو ضرور جائے اور تجارت محض تابع ہے تو اخلاص کے خلاف نہیں، بلکہ اگر اس کے ساتھ یہ نیت ہو کہ تجارت کے نفع سے حج میں اعانت ہوگی تو تجارت میں مزید ثواب ملے گا۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۞ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۞

ترجمہ: پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، جس طرح تم اپنے آباء کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے بڑھ کر ہو، سو بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دے دیجئے اور ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا۔ اور بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے۔ ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا بدولت ان کے اس عمل کے۔ اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک۔ پھر جو شخص دو دن میں تعجیل کرے، اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے، اس پر بھی کچھ گناہ نہیں، اس شخص کے واسطے جو ڈرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

منیٰ کا وقوف اور حاجیوں کی قسمیں:

(دور جاہلیت میں بعض لوگوں کی تو عادت یہ تھی کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر و فضائل بیان کیا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ اس بے ہودہ شغل کے بجائے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا ذکر (شکر و عظمت کے ساتھ) کیا کرو، جس طرح تم اپنے آباء (واجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے (بدرجہا) بڑھ کر ہو (نا چاہئے۔ اور بعض لوگوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ

تعالیٰ ہی کا کرتے تھے، لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا ان کا تمام تر ذکر صرف دنیا کے لئے دعا مانگنا ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر اس کے بجائے خیر دارین طلب کرنے کی ترغیب فرماتے ہیں) بعض لوگ (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں (جو کچھ دینا ہو) دنیا ہی میں دے دیجئے (اور بس، تو انہیں جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (آخرت کے انکار کی وجہ سے) کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور بعض لوگ (جو کہ مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے۔ اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیے (تو یہ لوگ پہلے والے لوگوں کی طرح بے بہرہ اور محروم نہیں ہوں گے، بلکہ (ایسے لوگوں کو ان کے اس عمل (یعنی دارین میں طلبِ خیر) کی بدولت دونوں جہاں میں) بڑا حصہ ملے گا اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو) اور (منیٰ میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا یعنی رمی جمار ہے اور وہ کئی دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں تاریخیں ہیں یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (دسویں تاریخ کے بعد کنکریاں مار کر) دو دن میں جلدی کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) دو دن میں (مکہ کے لئے واپسی میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آئے بلکہ تیرہویں ذی الحجہ کو آئے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (اللہ سے) ڈرے۔ (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ یا ثواب سے کوئی غرض ہی نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

طالبانِ دنیا کی مدح کے شبہ کا جواب:

اس آیت سے ہمارے زمانہ کے دنیا کے طلب گاروں کو شبہ ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالبانِ دنیا کی مدح وستائش کی ہے، جبکہ وہ آخرت کے بھی طالب ہوں اور یہ بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ آیت میں آتِنا کا مفعول بہ حسنۃ ہے اور الدنیا مفعول فیہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا طلب کا مقام (ظرف) ہے خود مطلوب نہیں، مطلوب تو حسنۃ ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ لوگ اس امر کے طالب ہیں کہ ہمیں دنیا میں رہتے ہوئے حسنۃ یعنی وہ حالت جو آپ کے نزدیک مستحسن اور پسندیدہ ہو عنایت کی جائے اور اصل پسندیدہ اعمال حسنہ ہیں۔ اس طرح بالذات وہ مطلوب ہوئے اور دنیا کے جس قدر حصہ کا ان اعمالِ حسنہ میں دخل ہے خواہ مال ہو یا صحت، وہ البتہ اس حسنہ کے تابع ہو کر بالعرض اور بالغیر مطلوب ہو جائے گا۔ یہ امر اس وقت کی تعلیم وطرز عمل کے برخلاف ہے، جس میں دنیا کو مطلوب بالذات اور آخرت کو محض برائے نام قرار دے رکھا ہو۔ حاشا وکلا اس کا آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں زیادہ سے زیادہ اگر دنیا کی طلب میں حلال وحرام کی حدود کو نہ توڑا

جائے تو اباحت کا حکم کردیا جائے گا۔لیکن شرعی طور پر مباح ہونے سے شرعی طور پر مطلوب ہونا لازم نہیں آتا۔خوب سمجھ لو۔
مسئلہ: منیٰ میں تین پتھر (جمرات) ہیں۔مزدلفہ سے دس تاریخ کو منیٰ میں آکر ان میں سے بڑے پتھر کو جسے جمرہ عقبہ کہا جاتا ہے: سات کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔اور اس دن کنکری مارنے کا وقت طلوع صبح صادق سے شروع ہو جاتا ہے۔پھر گیارہویں اور بارہویں تاریخوں میں تین جمرات کو سات سات کنکریاں ماریں اور ان دنوں میں کنکری مارنے کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔پھر اگر چاہیں تو مکہ چلے آئیں۔جائز ہے اور اگر وہاں تیرہویں تاریخ کی صبح ہوگئی تو اس دن پھر تینوں پتھروں کو کنکریاں مارنا ضروری ہے۔البتہ پہلے دن کی طرح تیرہویں تاریخ کو بھی طلوع صبح صادق کے بعد اس کا وقت ہو جاتا ہے۔آیت میں تعجیل اور تاخیر اس کو فرمایا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

ترجمہ: اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر، حالانکہ وہ مخالفت میں شدید ہے۔اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کردے اور کھیت اور مواشی کو تلف کردے۔اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ خدا کا تو خوف کر، تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کردیتی ہے، سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے۔اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔

ربط: اوپر کی آیت میں دعا مانگنے والوں کی دو قسمیں قرار دی تھیں: ایک کافر جو آخرت کے منکر ہیں، اس لئے صرف دنیا مانگتے ہیں۔دوسرے مؤمن جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے وہ دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتے ہیں، اب اسی طرح کی تقسیم نفاق اور اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض لوگ منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلص۔

منافق کا بیان:

(ایک شخص اخنس بن شُریق بڑا فصیح و بلیغ تھا۔وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آکر قسمیں کھا کھا کر اسلام قبول کرنے کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتا تھا اور آپ کی مجلس سے اٹھنے کے بعد فساد و شرارت اور مخلوق کی ایذا رسانی میں لگ جاتا۔حق تعالیٰ اس منافق کے بارے میں فرماتے ہیں) اور کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیاوی غرض سے ہوتی ہے (کہ اسلام کا اظہار کرکے مسلمانوں کی طرح قربت و خصوصیت کے ساتھ رہوں گا۔اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ (اپنا اعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر بتاتا ہے، اپنے مافی الضمیر (کے سچے ہونے)

پر حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے اور (جس طرح آپ کا مخالف ہے، اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو بھی ایذا پہونچاتا ہے۔ چنانچہ) جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) فساد کردے اور کھیت اور مویشیوں کو تلف کردے (چنانچہ ایک مسلمان کا اسی طرح نقصان کردیا تھا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے اور (اس مخالفت اور ایذا رسانی کے ساتھ مغروراس درجہ ہے کہ) جب کوئی اس سے کہتا ہے کہ اللہ کا تو خوف کر (تو اس سے نخوت و گھمنڈ کرتا ہے اور وہ) نخوت اس کو اس گناہ پر (دوگنا) آمادہ کردیتی ہے، تو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ: اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

مخلص کا بیان:

اور کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

ع ۲۵ ۹

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔ واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں پہنچ چکی ہیں لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔ یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے۔ اور یہ سارے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے۔

بدعت کیا ہے؟

ربط: اوپر مخلص کی مدح وستائش تھی۔ بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا، مگر وہ اطاعت گہری نظر سے دیکھنے پر شریعت اور سنت کی حد سے تجاوز کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کو

بدعت کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہود میں سے تھے اور چونکہ یہودیوں کے مذہب میں ہفتہ کا دن معظم تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ اس لئے ان حضرات کو اسلام قبول کرنے کے بعد یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کے دن کی تعظیم واجب تھی، اور شریعتِ محمدی میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعتِ موسوی میں اونٹ کا گوشت: کھانا حرام تھا اور شریعتِ محمدی میں اس کا کھانا فرض نہیں۔ اس لئے اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھنے کے باوجود صرف عملاً ترک کردیں تو شریعت موسوی کی بھی رعایت ہوجائے اور شریعتِ محمدیہ کی بھی خلاف ورزی نہ ہو اور اس طرح اللہ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے خیال کی اصلاح اس آیت میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو، اس کی رعایت دین کی حیثیت سے نہ کی جائے اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے اور ظاہری گناہ کی بہ نسبت اس کے سخت ہونے کے سبب اس میں عذاب کا زیادہ گمان ہے۔

بدعتی کی اصلاح:

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ (یہ نہیں کہ کچھ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑکر) شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو۔ واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسا سبق پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف ہو) اگر تم اس کے بعد کہ تمہیں واضح دلیلیں پہونچ چکی ہیں (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے۔ اگرچہ فوری طور پر سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا، کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے کبھی سزا میں دیر بھی کردیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ دلائل حق کے واضح ہونے کے بعد کج روی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبان میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آئیں۔ اور سارا قصہ ہی ختم ہوجائے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزاء وسزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا۔ تو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام خرابی کے سوا کیا ہوسکتا ہے)

صفاتِ متشابہات کی کھوج میں نہ پڑے:

روح المعانی میں بسند ابن مردویہ بروایت ابن مسعود رسول اللہ ﷺ کی حدیث نقل کی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اولین وآخرین کو جمع فرمائیں گے اور سب حساب کتاب کے منتظر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں

عرش سے تجلی فرمائیں گے۔ اور ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ان سائبانوں کے اردگرد ملائکہ ہوں گے۔ چنانچہ آیت میں اس قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ قیامت کے منتظر ہیں پھر اس وقت کیا ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے جہاں کہیں بھی آنا وغیرہ مذکور ہے، اس کی حقیقت کی تفتیش کے پیچھے پڑنا جائز نہیں۔ کیونکہ جس طرح ان کی ذات کی حقیقت کا کسی کو ادراک نہیں ہوا، اسی طرح ان کی صفات وافعال کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً کیفیت کی تعیین کے بغیر ایمان لے آنا چاہئے، اس سے زیادہ کی فکر میں پڑنا اپنی طاقت واستطاعت سے زیادہ زور لگانا ہے۔ خوب کہا ہے:

عنقا شکارِ کس نشود دام باز چیں ❁ کانجا ہمیشہ باد بدستِ است دام را

(عنقا کسی کے جال میں آکر شکار نہیں ہوتا، شکاری جال سمیٹ لے ÷ اس جگہ ہمیشہ جال ہوا کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے)

بدعت پر سخت سخت وعیدیں آئی ہیں:

آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمانے سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدعت پر کس درجہ ملامت مذمت اور رد وانکار فرمایا گیا ہے اور حدیثوں میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں سخت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ اور اگر واقع میں غور کیا جائے تو بدعت ایسی ہی مذموم چیز ہے، کیونکہ بدعت کی حقیقت کا خلاصہ غیر شریعت کو شریعت بنانا ہے اور شریعت کا اللہ کی طرف سے ہونا ضروری اور لازم ہے تو بدعتی شخص ایسے امر کو جو اللہ کی جانب سے نہیں ہے، اپنے عقیدہ میں اللہ کی طرف سے ہونا بتاتا ہے جس کا حاصل اور مرجع اللہ تعالیٰ پر افترا او بہتان اور ایک طرح سے نبوت کا دعویٰ ہے، تو اس کے عظیم اور ثقیل ہونے میں کیا شبہ ہے، یہ تو ایک برائی وشناعت ہے اور اس کی حقیقت اور آثار کے اعتبار سے ایک بڑی شناعت اس میں یہ ہے کہ اس سے توبہ کم ہی نصیب ہوتی ہے، کیونکہ جب وہ اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے تو توبہ کیا کرے گا۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس جہل ہی سے نجات بخش دیں کہ اس کی نظر میں وہ استحسان (بدعت کو اچھا سمجھنا) استہجان (برا سمجھنے کے ساتھ) بدل جائے تو دوسری بات ہے اور پھر توبہ سہل ہے۔ افسوس کہ جہلائے صوفیا بدعت کی اس بلا میں بکثرت مبتلا ہیں، ان میں سے بہت سے عابد، زاہد، تارکِ دنیا بھی ہیں، مگر سنت کی برکتوں سے محروم ہیں۔

سَلْ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھئے ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں؟ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے اس کے پاس پہنچنے کے بعد تو یقیناً حق تعالیٰ سخت سزا دیتے ہیں۔

حق کی مخالفت کی سزا:

آپ (ذرا) بنی اسرائیل (کے علماء) سے پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان (کے بزرگوں) کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گمراہی پر کمر باندھی۔ پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں۔ مثلاً توریت ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر اس کا انکار کیا۔ آخر ان کے اوپر پہاڑ گرانے کی انہیں دھمکی دی گئی۔ اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سنا تو چاہئے تھا کہ سر آنکھوں پر رکھتے، مگر شبہات نکالے۔ آخر بجلی سے ہلاک ہوئے۔ اور مثلاً دریا کو پھاڑ کر فرعون سے نجات دی گئی تو چاہئے تھا کہ اس کا احسان مانتے، مگر گئو سالہ پرستی شروع کر دی۔ چنانچہ قتل کی سزا دی گئی۔ اور مثلاً من وسلویٰ نازل ہوا تو شکر ادا کرنا چاہئے تھا، لیکن نافرمانی کی، چنانچہ وہ سڑنے لگا اور اس سے نفرت وبیزاری ظاہر کی تو وہ بند ہوگیا۔ اور کھیتی کرنے کی مصیبت سر پر پڑی۔ اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، چاہئے تھا کہ اس کو غنیمت سمجھتے، مگر انہیں قتل کرنا شروع کیا، تب اقتدار وسلطنت سے محرومی کی سزا دی گئی اور اسی طرح بہت سے معاملات کا اسی سورہ بقرہ کے شروع میں ذکر ہو چکا ہے) اور (ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی ایسی بڑی نعمت (یعنی واضح دلائل) پہونچنے کے بعد اس کو بدلتا ہے (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور الٹا گمراہ ہوتا ہے) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

فائدہ: یہ سزا کبھی دنیا میں بھی ہو جاتی ہے، کبھی آخرت میں ہوگی۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ترجمہ: دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ جو کفر وشرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ میں ہونگے قیامت کے روز۔ اور روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ دیدیتے ہیں۔

ربط: اوپر حق کی مخالفت کا بیان تھا۔ اب فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ اکثر دنیا کی محبت ہوتی ہے، جس کے آثار میں سے ایک اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ جب دیکھتا ہے کہ دین داری دنیا کے معاملات میں خلل ڈال رہی ہے تو دین کو بھی ترک کر بیٹھتا ہے اور دوسرے طالبان دین پر ہنستا ہے۔ چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل مثل جہلائے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ استہزاء کی شکل میں پیش آیا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

دنیا کی محبت کے آثار:

دنیوی معاش کفار کو بجی سجائی زینت معلوم ہوتی ہے اور (اس وجہ سے وہ) ان مسلمانوں سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں۔ قیامت کے روز ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض فراغ معاش پر مغرور نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ) روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں (چنانچہ اس کا دارومدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جو دنیا کی دولت کے لحاظ سے بڑا ہو، وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو اور بڑی عزت وہی ہے۔ اس لئے اس کی بنیاد پر خود کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھنا بےوقوفی ہے)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ: سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی سناتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں، اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ میں فیصلہ فرمادیویں۔ اور اس کتاب میں اختلاف اور کسی نے نہیں کیا مگر صرف ان لوگوں نے کیا جن کو وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضحہ پہنچ چکے تھے، باہمی ضد اضدی کی وجہ سے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ امرِ حق جس میں اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہٖ تعالیٰ بتلادیا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو راہِ راست بتلادیتے ہیں۔

ربط: اوپر دین حق سے اختلاف کرنے کی علت دنیا کی محبت کو بتایا ہے۔ اب اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم دین حق پر واضح دلائل قائم کرتے ہیں اور طالبانِ دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس کی خلاف ورزی کرتے رہے۔

دنیا کی محبت کے اثر کی تائید:

(ایک زمانہ میں) سب لوگ ایک ہی راستہ پر تھے (کیونکہ دنیا میں پہلی بار حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بیوی کے تشریف لائے، اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے۔ ایک مدت اسی حالت میں گذر گئی، پھر طبیعتوں کے اختلاف سے خواہشات اور اغراض ومقاصد میں اختلافات پیدا ہونے شروع

ہوئے۔حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد اعمال وعقائد میں اختلاف کی نوبت آ گئی) پھر (اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق کو تسلیم وقبول کرنے والوں کو) خوش خبری سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے مذہبی اختلافی امور میں فیصلہ فرمادیں (کیونکہ رسول اور کتابیں واقعی امر کا اظہار کردیتے تھے اور (امر واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہونا معلوم ہوجاتا ہے اور یہی فیصلہ ہے۔اور ان پیغمبروں کے ساتھ اللہ کی کتابوں کے آنے سے ان لوگوں کو چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے اور اس کی بنیاد پر اپنے تمام اختلافات کو ختم کردیتے۔مگر بعض لوگوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا اور خود اس میں اختلاف کرنا شروع کردیا) اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، بلکہ صرف ان لوگوں نے کیا جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم اور اہل فہم ودانش نے کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام ان کے ساتھ مل جایا کرتے ہیں۔ اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا) اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلائل پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہوچکے تھے اور اختلاف کس وجہ سے کیا؟ صرف) آپسی ضد کی وجہ سے (اور ضد کی اصل وجہ دنیا کی محبت ہوتی ہے۔خواہ مال کی محبت ہو یا جاہ ومرتبہ کی) اس طرح حق کی مخالفت کی علت (بنیاد) وہی دنیا کی محبت قرار پائی۔اور گذشتہ آیت میں یہی مضمون تھا، پھر کفار کے اس اختلاف نے اہل ایمان کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ) اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (اختلاف کرنے والے) اختلاف کیا کرتے تھے، اپنے فضل سے (رسولوں اور کتابوں پر (ایمان لانے کی بدولت بار بار) بتادیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو راہ راست بتادیتے ہیں۔

> اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

ترجمہ: دوسری بات سنو: کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہوگے، حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ان پر ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب ہوگی؟ یاد رکھو بے شک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے۔

ربط: اوپر کی آیت میں یہ ذکر تھا کہ کفار ہمیشہ ہی سے انبیاء اور مؤمنوں کے ساتھ اختلاف اور ان کی مخالفت کرتے

رہے ہیں، جس میں ایک حدتک مسلمانوں کواس طرح تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو کفار کی طرف سے مذاق اڑانے کی وجہ سے اذیت ہوتی تھی کہ یہ اختلاف ومخالفت تمہارے ساتھ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ آگے ان مخالف کفار کے ذریعہ انبیاء اور مؤمنوں کو طرح طرح کی ایذاؤں اور سختیوں کے پہونچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہونچتی ہیں ان پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ آخرت کی کامل راحت، مشقتیں برداشت کرنے ہی سے ملتی ہے۔

مسلمانوں کو سختیاں برداشت کرنے کی ترغیب:

دوسری بات سنو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بغیر مشقت کے) داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ (ابھی کوئی مشقت تو اٹھائی ہی نہیں) حالانکہ تمہیں ابھی ان لوگوں جیسا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ ان پر (مخالفوں کی وجہ سے) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی (اور مصیبتوں سے) انہیں یہاں تک ہلا دیا کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جوان کے ساتھ اہل ایمان تھے (بے قرار ہوکر) بول اٹھے کہ (اللہ تعالیٰ) کی امداد (جس کا وعدہ کیا گیا ہے) کب ہوگی؟ (جس پر انہیں یہ جواب دے کر تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

فائدہ: انبیاء اور مؤمنوں کا اس طرح کہنا نعوذ باللہ شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ مخالفین کے مقابلہ میں امداد اور غلبہ کا وقت ان حضرات کو نہیں بتایا گیا تھا، وقت کے ابہام کی وجہ سے انہیں جلدی ہونے کا انتظار رہتا تھا، جب انتظار سے تھک جاتے تو اس طرح عرض معروض کرنے لگتے جس کا حاصل الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنا ہے۔

کاملین کی دعا اور رضا کے اجتماع کی توجیہ:

اور الحاح: رضا و تسلیم کے خلاف نہیں ہے، بلکہ جب الحاح کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہونا ثابت ہے تو الحاح رضاءِ حق سے عین رضا ہے، البتہ رضا کے خلاف وہ دعا ہے جس کے قبول نہ ہونے سے دعا کرنے والا ناراض ہو۔ تو معاذ اللہ انبیاء اور مؤمنوں میں اس کا نہ ثبوت ہے نہ احتمال۔

اور یہ جو فرمایا ہے کہ کیا جنت میں بغیر مشقت کے چلے جاؤ گے؟ تو مشقت کے مختلف درجات ہیں، جس کا ادنی درجہ نفس اور شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین کے مخالفوں کی مخالفت کر کے عقائد کا درست کرنا ہے جو ہر مؤمن کو حاصل ہے۔ آگے اوسط اور اونی درجات ہیں۔ اس طرح جنت میں داخلہ کے مختلف مراتب ہیں۔ تو جس درجہ کی مشقت ہوگی اس درجہ کا جنت میں داخلہ ہوگا۔ اب آیت میں یہ اشکال لازم نہیں آتا کہ بعض گناہ گار محض فضل کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ ان پر کوئی مشقت بھی نہیں ہوگی، جواب کی تقریر یہ ہے کہ ان کو بھی ادنی درجہ کی مشقت تو ضرور ہوئی ہے، البتہ چونکہ صحابہ کرام اعلی درجات کے طالب تھے، چنانچہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لہٰذا ان درجات کے لئے بڑی

مشقتیں جھیلنے کو شرط قرار دیا گیا۔فقط۔آگے پھر احکام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں، آپ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو، سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔اور جونسا نیک کام کرو گے سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔

بارہواں حکم: انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف:

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کریں؟ (اور کس موقع پر صرف کیا کریں؟) آپ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تمہیں خرچ کرنا ہو تو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے۔البتہ موقع ہم بتادیتے ہیں کہ (ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے (یتیم) بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔اور جو بھی نیک کام کرو گے (خواہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)

مسئلہ: ماں باپ کو زکوٰۃ اور دوسرے وہ صدقات دینا درست نہیں جو واجب ہیں، اس آیت میں نفل خیرات کا بیان ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو گراں ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

تیرہواں حکم: جہاد کی فرضیت:

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں (طبعاً) گراں (معلوم ہوتا) ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خرابی (کا باعث) ہو اور (ہر شے کی حقیقت کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم پورا پورا نہیں جانتے (اس لئے اپنی رغبت وکراہت پر کبھی عمل نہ کرو، جو کچھ حکم ہو جائے اسی کو اجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر عمل پیرا رہو)

فائدہ: جہاد فرض ہے جب کہ اس کے شرائط پائے جائیں جو فقہ کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور فرض دو طرح کا ہوتا ہے: فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کہ جب دین کے دشمن مسلمانوں پر چڑھائی کر آئیں تب تو فرضِ عین ہے، ورنہ فرضِ کفایہ۔ اور طبعاً کی قید اس لئے ظاہر کردی گئی کہ مسلمان کو شرعی احکام میں عقلاً کبھی کراہت نہیں ہوتی۔ اس آیت سے ہمارے نوخیز مسلمان فلسفیوں کو سبق لینا چاہئے کہ ہر حکم کی مصلحت واقعیت کے باوجود ہمارے علمی احاطہ سے خارج ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ

ترجمہ: لوگ آپ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر قتال کرنا جرم عظیم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک ٹوک کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجدِ حرام کے ساتھ، اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے، ان کو اس سے خارج کر دینا جرم اعظم ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پردازی کرنا قتل سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔

چودھواں حکم: محترم مہینوں میں قتال کی تحقیق:

(حضور ﷺ کے چند صحابہ کا اتفاق سے سفر میں کفار سے مقابلہ ہوگیا، جس میں ایک کافر ان کے ہاتھوں سے مارا گیا اور جس روز یہ واقعہ ہوا وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہ اس کو جمادی الاخری کی تیس تاریخ سمجھے تھے، جبکہ رجب اشہر حرام میں شامل ہے۔ کفار نے اس واقعہ کی بنیاد پر طعنہ زنی کی کہ مسلمانوں نے شہرِ حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا۔ مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور ﷺ سے دریافت کیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ خود قریش کے بعض کفار نے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بطور اعتراض سوال کیا۔ اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے) لوگ آپ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے سے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور سے (یعنی قصداً وعملاً) قتال کرنا جرم عظیم ہے (مگر مسلمانوں سے اس طرح قتال کا صدور نہیں ہوا بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہوگیا، یہ تو تحقیقی جواب ہے) اور (الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا کسی طرح منہ ہی نہیں۔ کیونکہ اگرچہ شہرِ حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں (یعنی) اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو روکنا (یعنی ان کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تکلیفیں پہنچانا کہ لوگ ڈر کے مارے مسلمان نہ ہوں) اور اللہ کے ساتھ اور مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ (جو کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر ہے) کفر کرنا (کہ وہاں بہت سارے بت رکھ دیئے تھے اور بجائے اللہ کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ ﷺ

اور دوسرے مؤمن) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا (جس سے ہجرت یعنی ترک وطن کی نوبت آ گئی تو یہ حرکتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرم اعظم ہیں (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پردازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا (قباحت میں) بدرجہا بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا، کہ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جان کرایسا کرے تو وہ خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو نقصان پہونچتا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے)

جواب کا خلاصہ: یہ ہوا کہ اول تو مسلمانوں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور بالفرض اگر کیا بھی ہے تو معترضین اس سے بڑے بڑے گناہ یعنی کفر اور دین حق سے مزاحمت میں مبتلا ہیں، پھر انہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کی کہاں گنجائش ہے؟

فائدہ: تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر میں اس آیت کے ذیل میں اور تفسیر بیضاوی میں سورۂ براءۃ کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں قتال کی حرمت کے منسوخ ہونے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ؕ

ترجمہ: اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ رکھیں گے اس غرض سے کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔

ربط: اوپر دین حق میں ان کی مزاحمت کا بیان تھا۔ اسی مضمون کی اب تاکید فرماتے ہیں۔

دین میں مزاحمت کے مضمون کی تاکید:

اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ (وجدل کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے۔ اس غرض سے کہ اگر (خدانخواستہ) قابو پالیں تو تمہیں تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۲۱۷﴾

ترجمہ: اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جاوے پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مر جاوے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

ربط: اب مسلمانوں کو احتیاط کے طور پر متنبہ فرماتے ہیں کہ یہ کفار جو دین حق کی مزاحمت کی سعی کر رہے ہیں۔ اگر اس سعی کا کوئی اتباع کر بیٹھے یعنی دین حق سے پھر جائے تو اس کا کیا انجام ہے؟

ارتداد کا انجام:

اور تم میں سے جو اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں اور یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

فائدہ: دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کی بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے جس کی وراثت کا مسلمان کی حیثیت سے یہ شخص وارث بنتا ہے اس کی وراثت سے اس شخص کو حصہ نہیں ملتا۔ حالتِ اسلام میں جو کچھ نماز روزہ اور دوسرے نیک کام کئے تھے، سب کالعدم ہوجاتے ہیں، اس کے مرنے کے بعد جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی۔ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہوتا۔ اور آخرت میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادتوں کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اور ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

مسئلہ (۱): اگر یہ شخص پھر مسلمان ہوجائے تو آخرت میں دوزخ کے عذاب سے نجات مل جانا اور دنیا میں آئندہ کے لئے اسلام کے احکام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تھا تو استطاعت کی شرط کے ساتھ دوبارہ اس پر حج فرض ہونے نہ ہونے، اور آخرت میں پچھلے نماز و روزہ وغیرہ کے ثواب کے ملنے نہ ملنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ استطاعت کی شرط پر دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں اور گذشتہ نماز و روزہ وغیرہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ (۲): جو شخص ابتدا ہی سے کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے، اس کا ثواب معلق رہتا ہے۔ اگر کبھی اسلام لے آیا تو سب پر ثواب ملتا ہے اور اگر کفر پر مرگیا تو سب بیکار جاتا ہے۔ حدیث أسلمت علیٰ ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ (۳): اس طرح مرتد کی حالت کافرِ اصلی سے بھی زیادہ بری ہے، اسی لئے کافر اصلی سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے اور مرتد اگر اسلام نہ لائے تو اگر مرد ہو تو قتل کردیا جاتا ہے اور اگر عورت ہے تو دائمی قید کی سزا دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوتی ہے۔ سرکار کی اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

> اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾

ترجمہ: حقیقۃً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے اور رحمت کریں گے۔

ربط: اشہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو مذکورہ بالا جواب سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہوگیا تھا۔ مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا۔ اب اس سلسلہ میں تسلی کی گئی ہے۔

نیت کے اخلاص پر ثواب کا وعدہ:

حقیقت میں جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں (اور تم لوگوں میں یہ صفات اس طرح موجود ہیں کہ کبھی دور ہو ہی نہیں ہوسکتیں چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے۔ رہی یہ بات کہ خاص اس واقعہ سے متعلق جہاد میں شبہ ہوسکتا ہے، تو چونکہ تمہاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہٰذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے۔ پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں ناامید ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کردیں گے اور (ایمان و ہجرت و جہاد سے تم پر) رحمت کریں گے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

ترجمہ: لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں اور گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

پندرہواں حکم: شراب اور جوئے سے متعلق:

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (چیزوں کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی (پیدا ہوجاتی) ہیں اور لوگوں کو (کچھ) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں ترک کئے جانے کے قابل ہیں)

تفسیر: پہلے یہ دونوں چیزیں حلال تھیں۔ چنانچہ شراب اور جوئے سے متعلق سب سے پہلی آیت یہی نازل کی گئی۔ اور اس آیت کے مضمون کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خود ان دونوں چیزوں کا استعمال گناہ ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ ان کے استعمال سے اکثر دوسری گناہ کی باتیں ہوجاتی ہیں، کیونکہ شراب سے عقل جاتی رہتی ہے، جبکہ وہی معاصی کے ارتکاب سے روکتی ہے اور جوئے سے مال کی حرص بڑھتی ہے اور اس حرص کی وجہ سے چوری وغیرہ کی عادت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ان میں منافع: لذت کا حاصل ہونا اور مال کا حاصل ہونا ہے۔ اس طرح اس آیت سے ان دونوں چیزوں کے بذاتِ خود حرام ہونے کی نفی کرنا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ محض بعض ان عوارض کی وجہ سے جو کہ غیر لازم ہیں، ان دونوں کو ترک کردینے کا مشورہ دینا مطلوب تھا کہ ان دونوں سے تمہیں جتنا نقصان ہوجاتا ہے اتنا نفع نہیں ہوتا۔ کیونکہ نفع تو وقتی اور باقی نہ رہنے والا اور

اپنی حد سے نہ بڑھنے والا ہے، جبکہ نقصان بشکل انجام دیرپا، طویل المدت اور اپنی حد سے بڑھنے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس آیت کو سن کر بعض حضرات نے فوراً دونوں کو ترک کردیا کہ اگرچہ حرام نہیں کہا، پھر بھی برائیوں اور مفاسد کا ذریعہ ہونا تو ثابت ہوا۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ جب حرام نہیں ہے تو ہم ان مفاسد کا کچھ انتظام کر کے منافع حاصل کرنے کے لئے ان کو استعمال کیا کریں گے۔ اگر اس مضمون میں حرمت کا اشارہ ہوتا تو اہل زبان بڑی تعداد میں اتنی بڑی غلطی میں نہ پڑتے۔ پھر اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے شراب پی کر نماز پڑھی اور غلط پڑھی تو نماز کے اوقات میں شراب پینا بالکل ممنوع ہوگیا۔ پھر کچھ دن کے بعد مطلقاً حرام کردی گئی اور یہی آخری حکم ہے جس نے پہلے احکام کو منسوخ کردیا۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

ترجمہ: اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کیا کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں سوچ لیا کرو۔

سولہواں حکم: کتنا خرچ کریں؟

اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کیا کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ ہونے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخرت کی تکلیف میں نہ پڑ جائے) اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں۔ تاکہ تم (کو ان احکام کا علم حاصل ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کے کرنے سے پہلے) دنیا اور آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے مطابق عمل کیا کرو)

تفسیر: مثلاً خرچ کرنے ہی کے باب میں جس کا دنیا و آخرت دونوں سے تعلق ہے، دنیا سے ضروریات کے حصول کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اور آخرت کے ثواب کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے پہلے سوچ لیا کرو کہ یہ خرچ کرنا حکم الٰہی کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر اس کے مطابق ہو تو خرچ کیا جائے ورنہ نہ کیا جائے۔

اور اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی معصیت میں خرچ کرتا ہے تو مطلقاً ناجائز اور اگر اطاعت میں خرچ کرتا ہے تو اگر وہ طاعت وجوب اور فرضیت کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، مثلاً زکوٰۃ وغیرہ تو خرچ کرنا فرض اور واجب ہے اور اگر نفل کی حد تک ہے، جیسے معمولی خیر خیرات تو اگر اس میں کسی صاحبِ حق عیال وغیرہ کا حق ضائع ہوتا ہو تو خرچ کرنا ناجائز، اور اگر کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا، لیکن خود پریشان ہو کر صبر نہ کر سکے گا تو بھی ناجائز ورنہ جائز۔ اور اگر وہ موقع نہ طاعت کا ہے نہ

معصیت کا بلکہ مباح ہے جیسے پھل و میوہ وغیرہ کھانے میں اور تفریح وغیرہ میں تو اگر نیت طاعت کے کاموں کے لئے تقویت حاصل کرنے کی ہے تو ثواب ہے اور نیت معصیت کے کاموں کے لئے تقویت حاصل کرنے کی ہے تو گناہ ہے اور اگر محض دل ہی خوش کرنا ہے تو مباح ہے۔

اس آیت میں نفل صدقات کے حکم کا ذکر ہے، اس کی جو شرطیں ہیں، احقر نے ترجمہ کے ضمن میں بھی ان کی طرف مختصراً اشارہ کردیا ہے اور اس تقریر میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ: اور اس سے پہلے بارہویں حکم میں جو اس قسم کا سوال آچکا ہے اور جواب میں مصارف کے بیان کے ساتھ ضمناً اس کا حکم بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جتنی ہمت ہو صرف کرو، اس میں یہ بات پوچھنے کے قابل تھی کہ اگر جوش میں آکر سب دے ڈالنے کی ہمت ہو تو اس ہمت کا اعتبار ہے یا نہیں؟ یہاں اس سے متعلق تحقیق مقصود ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۰

ترجمہ: اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے، اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

سترہواں حکم: یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانا:

(چونکہ ابتداء اسلام میں ہندوستان کی طرح عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہیں کی جاتی تھی اس لئے یہ وعید سنائی گئی تھی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسے دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا۔ اس حکم کو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا بھی الگ تیار کراتے اور الگ ہی رکھواتے۔ اور اگر اتفاق سے بچہ کم کھاتا اور کھانا بچ جاتا تو وہ سڑتا اور پھینکنا پڑتا۔ اس طرح بالکل علاحدہ رکھنے میں خود ان لوگوں کو تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کے مال کا بھی نقصان ہوتا۔ تو حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے) اور لوگ آپ سے یتیم بچوں (کے خرچ علاحدہ یا اپنے خرچ کے ساتھ شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ (ہمارا اصل مقصود ان کے مال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت و بھلائی ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علاحدہ خرچ رکھنے سے جو کہ خلاف مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کے

ساتھ خرچ شامل رکھو تو (کوئی اندیشہ کی بات نہیں، کیونکہ) وہ (بچے تمہارے دینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (اس لئے مخالفت اس قسم کی نہیں ہونی چاہئے جس میں ان کی مصلحت ضائع ہوجائے۔ مثلاً برائے نام اپنا تھوڑا سا ملا دیا باقی سب ان ہی کا کھایا تو جو ایسا کرے گا، اللہ تعالیٰ سے اس کی بدنیتی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور جو ملانے میں ان کی مصلحت کی رعایت رکھے تو اگر بالفرض بلا علم اور بلا قصد کچھ کمی بیشی بھی ہوجائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی نیک نیتی معلوم ہے، اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس بارے میں سخت قانون مقرر کر کے) تمہیں مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، جو حکم چاہیں دے سکتے ہیں مگر آسان قانون مقرر فرمایا۔ کیونکہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہوسکے)

فائدہ (۱): جو چیز سڑنے گلنے خراب ہونے والی ہو، اس میں اپنے ساتھ یتیم کا خرچ اندازے سے شامل رکھنا درست ہے اور دوسری چیزوں کا حساب الگ لکھنا واجب ہے۔

فائدہ (۲): چونکہ اس وقت مسلمانوں کے پاس اکثر مسلمان ہی یتیم بچے تھے۔ اس لئے اخوانکم فرمایا ورنہ اگر دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والا بچہ بھی اپنی تربیت میں ہو تو اس کا بھی بعینہٖ یہی حکم ہے اور اس کی دلیل دوسری آیات واحادیث ہیں جن میں یتیم کا عام لفظ آیا ہے۔ مثلاً ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ اور ملانے کے لئے مصلحت کی رعایت کی شرط کے ساتھ احسن ہونا ظاہر ہے، بلکہ اس کے ساتھ مذہبی رعایت اتنی اور زیادہ ہے کہ اس بچہ پر بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کے لئے زور نہیں دیا جاتا۔ مذہبی آزادی دی جاتی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷

ترجمہ: اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجاویں۔ اور مسلمان عورت لونڈی بہتر ہے کافر عورت سے، گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو۔ اور عورتوں کو کافر مردوں سے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجاویں۔ اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے، گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو۔ یہ لوگ دوزخ کی تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے، اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں۔

اٹھارہواں حکم: کفار کے ساتھ میل جول رکھنا:

اور کافر عورتوں کے ساتھ نکاح مت کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان عورت (چاہے) باندی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد معزز خاتون ہی کیوں نہ ہو) اگر چہ وہ (کافر عورت مال یا جمال کی وجہ سے) تمہیں اچھی ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اس طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو، جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد مال و مرتبہ کی وجہ سے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان مرد ہی اس سے اچھا ہے۔ اور ان کافروں کے برا ہونے کی وجہ یہ ہے اور یہی ان سے نکاح کرنے کی ممانعت کا اصلی سبب ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ وہ کفر کی تحریک دیتے ہیں اور اس کا انجام دوزخ ہے) اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک دیتے ہیں (اور اس حکم کا اس طرح ظہور ہوا کہ کفار کے باب میں یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس واسطے اپنے احکام بتادیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور جنت و مغفرت کے مستحق ہو جائیں)

تفسیر: اس آیت میں دو حکم ہیں: ایک یہ کہ کافر مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح نہ کیا جائے، چنانچہ یہ حکم تو اب بھی باقی ہے حتی کہ مرد کے کافر اور عورت کے مسلمان ہونے کی صورت میں پہلا جائز نکاح بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ مثلاً کوئی مسلمان مرد نعوذ باللہ کافر ہو جائے اور اس کے نکاح میں پہلے سے کوئی مسلمان عورت تھی تو نکاح فوراً ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ عدت پوری کر کے دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ اور اسی طرح مثلاً کوئی کافر عورت اللہ کے حکم سے ہدایت پا کر مسلمان ہو جائے اور وہ پہلے سے کسی کافر مرد کے نکاح میں تھی اور وہ مرد اسلام قبول نہ کرے تو اس وقت وہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔

البتہ اس میں اتنی تفصیل ہے کہ اگر وہ ملک دار الاسلام ہے تو مرد سے واضح طور پر پوچھیں گے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو نکاح نہ ٹوٹے گا اور اگر انکار کر دے تو اب ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر وہ جگہ دار الحرب ہے تو خاوند سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ عورت کے اسلام لانے کے بعد جب تین حیض گذر جائیں یا اگر اس کو حیض نہ آتا ہو تو جب تین مہینے گذر جائیں اور اگر حاملہ ہو تو جب بچہ پیدا ہو جائے، اس شوہر کے نکاح سے باہر ہو جائے گی اور ہر صورت میں نکاح ٹوٹنے کے بعد پھر عدت واجب ہوگی (درمختار و ردالمحتار)

بہرحال جس وقت سے نکاح ٹوٹا ہے اس وقت سے عدت طلاق کی پوری کر کے دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور

یہ جو اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ ایسی عورت کے مسلمان ہوتے ہی فوراً کسی سے نکاح کر دیتے ہیں اور عدت واجبہ کو پورا نہیں کرتے یہ بالکل ناجائز ہے۔ اور اس صورت میں یہ دوسرا نکاح صحیح نہیں ہوتا۔

غرض یہ کہ ایک حکم تو آیت کا اس طرح باقی ہے۔ دوسرا حکم یہ کہ مسلمان مرد کا کافر عورت سے نکاح نہ کیا جائے۔ اس حکم میں دو جزء ہیں: ایک یہ کہ وہ کافر عورت کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی نہ ہو اور کوئی مذہب کفر کا رکھتی ہو تو اس جزء میں بھی اس آیت کا حکم باقی ہے۔ چنانچہ ہندو یا آتش پرست عورت سے، مسلمان مرد کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ دوسرا جزیہ کہ وہ کافر عورت کتابیہ یعنی یہودی یا عیسائی ہو اس خاص جز میں اس آیت کا حکم باقی نہیں، بلکہ ایک آیت سورۂ مائدہ میں اس مضمون کی ہے کہ کتابی عورتوں سے نکاح درست ہے۔ اُس آیت سے اِس آیت کا یہ خاص جز منسوخ ہوگیا۔ چنانچہ یہودی یا نصرانی (عیسائی) عورت سے نکاح درست ہے، بشرطیکہ وہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا عیسائی نہ بنی ہو۔

مسئلہ (۱): اگرچہ کتابی عورت سے نکاح درست ہے، لیکن اچھا نہیں۔ حدیث میں دین دار عورت کے حاصل کرنے کا حکم ہے تو بددین عورت کا حاصل کرنا اس درجہ میں ناپسند ہوگا۔

مسئلہ (۲): جو لوگ اپنی وضع قطع وطرز زندگی سے اہل کتاب سمجھے جاتے ہیں، لیکن تحقیق کرنے سے ان کے عقائد کتابی ثابت نہ ہوں تو ان کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست نہیں۔ جیسے آج کل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے بعض کے عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے ہیں کہ نہ خدا کے قائل، نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقد، نہ انجیل کے متعلق آسمانی کتاب ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں تو ایسے لوگ عیسائی نہیں ہیں۔ اور ایسے لوگوں میں کی جو عورت ہو اس سے نکاح درست نہیں۔ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بغیر تحقیق کے ولایت (یورپ وامریکہ) سے میمیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ (۳): اسی طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے، لیکن اس کے عقائد کفر تک پہونچے ہوئے ہوں تو اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہونے کے بعد ایسے عقائد ہوجائیں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جیسے آج کل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں۔ لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیغام دیتے وقت یا آنے پر اس کو قبول کرتے وقت اولاً عقائد کی تحقیق کر لیا کریں۔ جب اس سے اطمینان ہوجائے تب زبان دیں۔ اور عورتوں کو چاہئے کہ اگر نکاح کے بعد شوہر کے ایسے عقائد ثابت ہوں تو ان سے کنارہ کرلیں۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو ان کو ہم بستر نہ ہونے دیں۔ اور سرپرستوں کے لئے بھی اس سلسلہ میں عورتوں کی مدد کرنا واجب ہے۔

کتابیہ کے نکاح کے جواز پر اشکال وجواب:

اس موقعہ پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جس طرح کافروں کا مسلمانوں کو کفر کی طرف بلانا کفار سے نکاح کی ممانعت کی

علت ہوسکتا ہے جس کا لحاظ رکھنا اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا کافروں کو اسلام کی طرف بلانا کفار سے نکاح کی اجازت کی علت ہوسکتا ہے تو اس کا اعتبار کیوں نہیں کیا گیا؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ چونکہ شارع تعالیٰ علیم وحکیم اور قادر ومختار ہے۔ ایک علت کا اعتبار ولحاظ کر کے ترجیح دینا، اسی طرح تمام علتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کرنا اور مجموعہ کا جو تقاضہ ہو اس پر حکم کی بنیاد رکھنا یہ سب ان کے خصوصی کمالات ہیں۔ اس بارے میں کسی کو سوال اور قیل وقال کا حق نہیں پہنچتا۔

اور دوسرے عقلی طور پر جلب منفعت (فائدہ اٹھانے) سے دفع مضرت (نقصان سے بچنا) اہم اور مقدم ہے، جہاں دونوں احتمال پائے جاتے ہوں، وہاں دوسرے کی اصلاح کی بہ نسبت اپنی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔

تیسرے ایمان کا تقاضہ عقل کا ہے اور کفر کا تقاضہ نفس کا ہے، اور جب عقل کمزور ہو جاتی ہے تو اس پر نفس غالب آجاتا ہے۔ اور ابتدائے اسلام میں اکثر قوت عقلیہ ضعیف تھیں، اس لئے کفار کی اصلاح کی بہ نسبت مؤمنوں کے درمیان فساد پیدا ہو جانے کا احتمال زیادہ تھا اس لئے اکثر کی حالت کے اعتبار سے ممانعت کی گئی اور اجازت نہیں دی گئی۔

کتابیہ بھی تو کفر کی تحریک کرسکتی ہے پھر اس سے نکاح کیوں جائز ہے؟

دوسرا سوال: اس آیت کا جو جز منسوخ ہو چکا ہے اس کی ممانعت کی علت تو بظاہر اب بھی باقی ہے، یعنی کفر کی تحریک کرنا پھر علت کے باقی رہتے ہوئے حکم کے ختم ہونے کی کیا صورت ہے؟

جواب: علت کا باقی رہنا قابل تسلیم نہیں، کیونکہ علت صرف تحریک نہیں، بلکہ اس تحریک سے متاثر ہونے کا احتمال اور اس اثر کے قبول کرنے کی علت ضعف ہے۔ جب اسلام کے قواعد اصول وفروع اچھی طرح ذہن نشین ہو گئے تو اکثر کی قوت عقلیہ قوی ہو گئی اور اب احتمال نہ رہا کہ اس پر نفس غالب آکر کفر کی طرف مائل کرسکے۔ لہٰذا وہ جز منسوخ ہو گیا۔

مسلمان مرد وزن کی قوتِ عقلیہ قوی ہے پس مشرک مرد وزن سے نکاح جائز ہونا چاہیئے؟

تیسرا سوال: پھر چاہیئے تھا کہ مشرک عورت سے نکاح جائز ہوتا، اس طرح مسلمان عورت کا کافر مرد سے نکاح جائز ہوتا۔

جواب: ایک علت یہ بھی ہے کہ یہاں نکاح کی جگہ میں شر ہے اور شر میں دو مرتبے ہیں: شریعت نے اہل کتاب کے شر کو غیر کتابی کے خبث اور شر کے مقابلہ میں خفیف سمجھا ہے۔ اس لئے غیر کتابی عورت کو مسلمان کے نکاح کے شرف کا محل ہی قرار نہیں دیا۔ یہ تو وجہ ہے غیر کتابی عورت سے نکاح درست نہ ہونے کی، ضعف جیسا داخلی ہوتا ہے جس کو عقلی کہا گیا ہے، اسی طرح خارجی بھی ہوتا ہے اور بیوی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے مرد کے تابع ہے، اس لئے یہ ضعف بھی اثر قبول کرنے کی علت ہوسکتا ہے، اس لئے مسلم عورت کا نکاح کافر مرد کے ساتھ جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اور مسلم مرد کے نکاح میں کافر عورت (کتابیہ) کے ساتھ یہ کمزوری مفقود ہے، لہٰذا وہ جائز قرار دیا۔ اور چونکہ اکثر کی حالت کا یہ تقاضہ تھا اور قانون

میں ہمیشہ ایسی ہی حالت کا اعتبار ہوتا ہے، لہٰذا اصلی قانون تو یہ مقرر ہوا، لیکن اگر کہیں مسلمان کو کتابی عورت سے نکاح کرنے میں غالب گمان بگڑ جانے کا ہو تو وہاں دوسری وجہ کے درجہ میں اس کو بھی شدت کے ساتھ ممنوع قرار دیا جائے گا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ وہ گندی چیز ہے تو حیض میں تم عورتوں سے علاحدہ رہا کرو، ان سے قربت مت کیا کرو، جب تک وہ پاک نہ ہو جاویں۔ پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جاویں تو ان کے پاس آ جاؤ، جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں صاف پاک رہنے والوں سے۔ تمہاری بیویاں تمہارے کھیت ہیں سو اپنے کھیت میں جس طرف سے ہو کر چاہو آؤ اور آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ کرتے رہو۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ بیشک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو۔ اور ایسے ایمانداروں کو خوش خبری سنا دیجئے۔

انیسواں حکم: حیض کی حالت میں جماع کی حرمت اور پاکی میں اجازت کی شرطیں:

اور لوگ آپ سے حیض (کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے) کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندی چیز ہے، تو تم حیض (کی حالت) میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علاحدہ رہا کرو اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کیا کرو۔ جب تک کہ وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جائیں (کہ ناپاکی کا شک وشبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے کی راہ سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی کی وجہ سے حیض کی حالت میں صحبت کر بیٹھا، پھر متنبہ ہو کر توبہ کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حیض کی حالت میں صحبت کرنے اور دوسری منع کی ہوئی باتوں سے بچتے ہیں۔ اور پاکی کی حالت میں صحبت کی اجازت دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کی جگہ میں صحبت ہو، اس لئے ہے کہ) تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیت (کے درجہ میں) ہیں (جس میں نطفہ بیج کے درجہ میں اور بچہ پیداوار کے درجہ میں ہے) سو اپنے کھیت میں جس طرف سے ہو کر چاہو آؤ (اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے، اسی طرح بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت

ہے، خواہ کروٹ سے ہو یا پیچھے یا آگے، بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو یا جس حیثیت سے بھی ہو، مگر آنا ہر حال میں کھیت کے اندر ہو کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو) اور (ان لذتوں میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ) آئندہ کے واسطہ (بھی) اپنے لئے کچھ (اعمال صالح) کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو۔ اور یہ یقین رکھو کہ بیشک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور (اے محمد! ﷺ ایسے ایمانداروں کو (جو نیک کام کریں اللہ سے ڈریں، اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سنا دیجئے (کہ انھیں آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)

مسئلہ (۱): حیض کی حالت میں عورت کے بدن کو ناف سے گھٹنے تک دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست نہیں۔

مسئلہ (۲): اگر حیض پورے دس دن گذرنے پر موقوف ہو تو فوراً صحبت درست ہے، اور اگر دس دن سے پہلے حیض موقوف ہو جائے، البتہ عادت کے مطابق موقوف ہو تو صحبت اس وقت درست ہوتی ہے جب عورت یا تو غسل کر لے یا ایک نماز کا وقت گذر جائے اور اگر دس دن سے پہلے موقوف ہوا اور ابھی عادت کے دن نہیں گذرے، مثلاً سات دن حیض آیا کرتا تھا اور اس بار چھ دن میں ہی موقوف ہو گیا تو عادت کے پورے دن گذرے بغیر صحبت درست نہیں۔

مسئلہ (۳): اگر شہوت کے غلبہ کی وجہ سے حیض کی حالت میں صحبت ہو گئی تو خوب توبہ کرنا واجب ہے، اور اگر کچھ صدقہ خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

مسئلہ (۴): پیچھے کے موقع میں اپنی بیوی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب (پردہ) مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقوی کے اور (اصلاح فیما بین الخلق) کے کام کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں۔

بیسواں حکم: نیکی نہ کرنے کی قسم کھانے کی ممانعت:

اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقوی کے اور مخلوق کے درمیان اصلاح کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہیں کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان کو سنبھال کر بات کرو اور دل میں برے خیالات مت لاؤ)

فائدہ: جس بات سے آدمی قسم کھالیتا ہے، اس سے رک جاتا ہے تو جب اس نے ایسے معاملات میں اللہ کی قسم کھائی تو گویا قسم کھا کر اللہ کے نام کو ان کاموں کا حجاب بنا دیا۔ حالانکہ اللہ کے نام سے تو نیک کام زیادہ کرنے چاہئیں۔ اس نے الٹا

برتاؤ کیا، اس لئے ایسی بات پر قسم کھانا اور زیادہ برا ہوا، جبکہ نیک کام کا ترک کرنا ویسے بھی برا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم پر دارو گیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں سے بیہودہ قسم پر، لیکن دارو گیر فرماویں گے اس پر جس میں تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں حلیم ہیں۔

اکیسواں حکم: جھوٹی قسم کا گناہ:

اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں سے (ایسی) بے ہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا ہو) تم پر (آخرت میں) گرفت نہیں فرمائیں گے۔ لیکن اس (جھوٹی قسم) پر گرفت فرمائیں گے جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بے ہودہ قسم پر گرفت نہیں فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے پر بھی آخرت تک مہلت دی)

تفسیر: بے ہودہ (لغو) قسم کے دو معنی ہیں: ایک تو یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی یا نکلی تو ارادہ سے مگر اس کو اپنے گمان میں سچ سمجھتا ہے۔ جیسے زید واقع میں آیا تھا، لیکن اس کو خبر نہ تھی اور قسم کھا بیٹھا کہ وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بلا ارادہ منہ سے قسم نکل گئی۔ اس میں گناہ نہیں ہوتا اور اس کو اسی واسطے لغو کہتے ہیں کہ آخرت کے مواخذہ یعنی آخرت میں پکڑ وسزا کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں (ساقط الاعتبار ہے) اور اس کے مقابلہ میں جس قسم پر مواخذہ ہونے کے بارے میں فرمایا ہے، وہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو۔ اس کو غموس کہتے ہیں۔ اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں کفارہ لازم نہیں آتا، اور لغو بمعنی مذکور میں بدرجۂ اولیٰ کفارہ نہیں۔ اس آیت میں ان ہی دونوں کا بیان ہے۔

لغو کے دوسرے معنی یہ ہیں: جس پر کفارہ نہ ہو۔ اور اس کو لغو اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دنیوی مواخذہ یعنی کفارہ کے بارے میں ساقط الاعتبار ہے اور لغو میں اس معنی میں غموس بھی شامل ہے، کیونکہ اس میں کفارہ نہیں، گو گناہ ہو۔

اور اس کے مقابلہ میں وہ قسم ہے جس میں کفارہ لازم آتا ہے، اس کو منعقدہ کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں گا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔ ان دونوں قسموں کا یعنی دوسرے معنی والی لغو اور منعقدہ کا سورۂ مائدہ میں کفارہ کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ غرض یہ کہ غموس ہمیشہ زمانۂ ماضی کے معاملہ میں ہوتی ہے اور پہلے معنی میں لغو کبھی ماضی کے معاملہ میں اور کبھی آئندہ کے معاملہ میں اور منعقدہ ہمیشہ مستقبل کے معاملہ میں ہوتی ہے۔ اور لغو دوسرے معنی میں کوئی الگ سے قسم نہیں ہے، اس کی ایک قسم پہلے

معنی میں ہے اور دوسری قسم غموس ہے اور ان دونوں کا مفہوم اور حکم معلوم ہو چکا۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: جولوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے، سواگر یہ رجوع کرلیں تب تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، رحمت فرمادیں گے۔ اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے تو اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔

بائیسواں حکم: ایلاء شرعی کی صورتیں اور ان کے احکام:

جولوگ (کسی مدت کی قید کے بغیر یا چار ماہ یا زیادہ مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں (کے پاس جانے) سے، ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے۔ تو اگر (ان چار مہینوں کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کرلیں تب تو (نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کے توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف فرمادیں گے (اور چونکہ اب بیوی کے حقوق ادا کرنے لگا، اس لئے اس پر) رحمت فرمائیں گے اور اگر بالکل چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گذرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائے گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی اس قسم کو) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادہ کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق مناسب حکم ارشاد فرمایا)

تفسیر: اگر کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا۔ اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت متعین نہ کرے کہ کب تک صحبت نہیں کرے گا۔ دوسرے یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگادے۔ تیسرے یہ کہ چار ماہ سے زیادہ مدت کی قید لگادے اور چوتھے یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے۔ ان میں سے پہلی، دوسری اور تیسری صورت کو شریعت میں ایلاء (شرعی) کہتے ہیں۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا جائے تو قسم کا کفارہ دے۔ اس صورت میں نکاح باقی رہے گا۔ اور اگر چار ماہ گذر گئے اور قسم نہ توڑی تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، اب بغیر نکاح کے رجوع کرنا درست نہ ہوگا۔ البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کرلیں تو درست ہے اور حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا اور قسم پوری کرلی تب بھی نکاح باقی ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ

ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں تین حیض تک اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو اس کو پوشیدہ کریں، اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں اور ان عورتوں کے شوہر ان کے پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر، بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حکیم ہیں۔

تیئیسواں اور چوبیسواں حکم: مطلقہ کی عدت اور رجعت کی مدت:

اور طلاق دی ہوئی عورتیں (جن میں اتنی باتیں ہوں کہ خاوند نے ان سے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، انہیں حیض آتا ہو۔ آزاد ہوں یعنی شرعی قانون کے مطابق باندی نہ ہوں) اپنے آپ کو تین حیض (ختم ہونے) تک (نکاح سے) روکے رکھیں (اس روکنے کو عدت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دانی) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو چھپا کر رکھیں (کیونکہ اس کے چھپانے سے عدت کا حساب غلط ہو جائے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتی ہیں (کیونکہ اس یقین کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت کے دن نافرمانی پر سزا نہ ہو جائے) اور ان عورتوں کے شوہر (جبکہ ان کو طلاق رجعی دی گئی ہو جس کا بیان آگے آئے گا، بغیر نکاح کی تجدید کے) عدت کے اندر پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں۔ (اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لاحاصل ہے اگرچہ رجعت تو ہو ہی جائے گی) اور (اصلاح کا یہ حکم اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (واجب ہونے میں) انہی حقوق کی طرح ہیں جو (مردوں کے) ان عورتوں پر ہیں (کہ ان کو شرعی) قاعدہ کے مطابق (ادا کیا جائے) اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں (جو احکام چاہیں مقرر کرنے کا حق رکھتے ہیں اور حکیم (بھی) ہیں (کہ نہایت مصلحت کے ساتھ احکام مقرر فرماتے ہیں)

فائدہ: ان مذکورہ مطلقات (طلاق پائی ہوئی عورتوں) میں جو چند باتوں کی قید لگائی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جن میں یہ باتیں نہ ہوں گی ان کا حکم دوسرا ہے۔ جو درج ذیل مسائل سے واضح ہے۔

مسئلہ (۱): جس مطلقہ کو حیض نہ آتا ہو۔ اس کی تین صورتیں ہیں: یا تو وہ نابالغ ہے، اس لئے حیض نہیں آیا، یا بہت

بوڑھی ہے، اس لئے حیض آنا موقوف ہوگیا تو ان دونوں کی عدت تین مہینے ہیں اور یا اس کو حمل ہے اس کی عدت یہ ہے کہ بچہ پیدا ہو جائے۔ اور جو جوان غیر حاملہ ہو مگر احتباس وغیرہ کسی مرض کی وجہ سے اس کو حیض نہ آتا ہو اس کے حکم کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

مسئلہ (۲): جو مطلقہ شرعی قاعدہ کی رو سے باندی ہو اس کو اگر حیض آتا ہو تو اس کی عدت دو حیض ہے اور اگر بالغ نہ ہونے یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت ڈیڑھ مہینہ ہے۔

مسئلہ (۳): عدت کے اندر دوسرے شوہر سے نکاح درست نہیں۔

مسئلہ (۴): مطلقہ پر واجب ہے کہ اپنے حائضہ یا حاملہ وغیرہ ہونے کی حالت ظاہر کر دے، تاکہ اس کے مطابق عدت کا حساب لگایا جائے۔

مسئلہ (۵): طلاق کی کئی قسمیں ہیں، ان میں ایک رجعی ہے، یعنی خاوند ایک بار یا دو بار واضح لفظ سے طلاق دے۔ اس کا بیان اگلی آیت میں آئے گا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر اس عورت سے صحبت یا خلوتِ صحیحہ کر چکا تھا تو عدت گذرنے سے پہلے اس عورت سے رجعت کر لے۔ یعنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے تجھ سے رجعت کی یا اس سے ہم بستری یا بوس و کنار کر لے۔ اس رجعت سے پہلا ہی نکاح قائم رہتا ہے۔

مسئلہ (۶): مرد پر عورت کے خاص حقوق یہ ہیں: اپنی وسعت کے مطابق اس کو کھانا کپڑا رہنے کا مکان دے۔ مہر دے، اس کو تنگ نہ کرے۔ اور عورت پر مرد کے خاص حق یہ ہیں: اس کی اطاعت کرے، اس کی خدمت کرے، اس شرعی قاعدہ سے یہی تفصیل مراد ہے۔ صرف ان امور میں تو مرد و عورت دونوں برابر ہیں کہ ایک دوسرے پر ان کے حقوق واجب ہیں۔ احقر نے جو "واجب ہونے میں" کا فقرہ لکھا ہے اس کا مطلب یہی ہے۔ لیکن حقوق کی نوعیت میں اور ان کے چھوٹے بڑے ہونے میں فرق ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا تفصیل سے دونوں امر ظاہر ہیں۔ احقر نے اسی کو نوعیت کا تفاضل کہا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

ترجمہ: وہ طلاق دو مرتبہ ہے، پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ۔

پچیسواں حکم: طلاقِ رجعی کی تعداد:

وہ طلاق (جس میں رجوع کرنا درست ہے) دو مرتبہ (کی) ہے۔ پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اختیار ہیں) خواہ (رجعت کر کے عورت کا) قاعدہ کے مطابق رکھ لینا، خواہ (تیسری بار طلاق آئندہ طہر میں دے کر یا عدت کے اندر رجعت نہ کر کے اس کا) خوش اسلوبی کے ساتھ چھوڑ دینا۔

تفسیر: اس طلاق کو رجعی کہتے ہیں جو دو مرتبہ سے زیادہ نہ ہو۔ اور اس میں یہ بھی قید ہے کہ صاف لفظوں سے ہو اور

قاعدہ سے مراد یہ ہے کہ اس کا طریقہ بھی شریعت کے مطابق ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت کے مسائل کے ضمن میں بیان کیا گیا۔ اور اس میں نیت بھی شرع کے مطابق ہو، یعنی رجعت سے ارادہ ہو کہ اس کے حقوق ادا کریں گے۔ یہ مقصود نہ ہو کہ بیوی کو رکھ کر تنگ کریں گے۔ اور خوش اسلوبی سے بھی مراد یہ ہے کہ اس کا طریقہ شریعت کے مطابق ہو جیسا کہ ترجمہ کے درمیان میں بیان ہوا، یعنی یا تو اور طلاق نہ دے، حتیٰ کہ عدت گذر جائے، تب وہ خود ہی نکاح سے نکل جائے گی۔ یا تیسری طلاق اس طرح دے کہ دو طلاقوں کے بعد جب حیض آ کر پاک ہو جائے، جس کو طہر کہتے ہیں، اس وقت تیسری طلاق دیدے۔ بلکہ ان دو طلاقوں کا بھی اسی طرح ہونا مسنون ہے کہ پہلے طہر میں ایک طلاق دے، پھر اگر دوسری طلاق دینی چاہے تو دوسرے طہر کا انتظار کرے اور اگر ایک ہی طلاق دینے کے بعد پھر دوسری اور تیسری طلاق نہ دے تو سب سے احسن ہے اور خوش اسلوبی سے چھوڑنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ نیت بھی شرع کے مطابق ہو۔ یعنی جھگڑے کو ختم کرنا مقصود ہو، اس کی دل شکنی یا ذلیل کرنا مقصود نہ ہو۔ اس لئے نرمی اور دل جوئی کی رعایت لازمی ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ کچھ بھی لو اس میں سے جو تم نے ان کو دیا تھا، مگر یہ کہ میاں بی بی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کر سکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے، یہ خدائی ضابطے ہیں سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے باہر نکل جاوے سو ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔

چھبیسواں حکم: خلع کا بیان:

اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیویوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (گو وہ لیا ہوا) اس (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (ہی) ان کو (مہر میں) دیا تھا۔ (مگر ایک صورت میں البتہ حلال ہے وہ) یہ کہ (کوئی میاں بیوی ایسے ہوں کہ) دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کر سکیں گے۔ تو اگر تم لوگوں (یعنی میاں بیوی) کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں خداوندی ضابطوں کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ (سب احکام) خدائی ضابطے ہیں، سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے باہر نکل جائے تو ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔

تفسیر: عورت سے مال مقرر کر کے چھوڑنے کی دو صورتیں ہیں: ایک خلع، دوسرے مال کے بدلہ طلاق۔ خلع یہ ہے

کہ عورت کہے کہ تو اتنے مال کے بدلہ مجھ سے خلع کر لے اور مرد کہے کہ مجھے منظور ہے۔ مرد کے یہ کہتے ہی خواہ وہ لفظ طلاق نہ کہے طلاق بائن واقع ہو جائے گی، جس کو ایلا کے مسائل میں قطعی طلاق کا نام دیا گیا ہے۔ اور عورت نے جتنا مال دینے کی بات کہی تھی اسی قدر اس کے ذمہ واجب ہو جائے گا۔ اور مال کے بدلہ طلاق یہ ہے کہ مرد عورت سے کہے کہ تجھے اتنے مال کے بدلے طلاق ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر عورت منظور نہ کرے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر منظور کر لے تو منظور کرتے ہی طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اور جتنے مال کے لئے کہا تھا اتنا مال عورت کے ذمہ واجب ہو جائے گا۔

مسئلہ (۱): اگر میاں بیوی کے درمیان موافقت نہ ہونے میں قصور عورت کا ہے اور خود وہی خلع کی درخواست کرتی ہے تو وہ گنہگار ہوگی اور مرد مال لینے میں گنہگار نہیں ہوگا۔ البتہ مہر سے زیادہ لینا اس کے لئے مکروہ ہوگا۔

مسئلہ (۲): اور اگر موافقت نہ ہونے میں قصور مرد کا ہے تو خلع کا مال لینے سے مرد مطلقاً گنہگار ہوگا، جیسا کہ احقر نے ﴿ مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ﴾ کے ضمن میں اشارہ کر دیا ہے کہ مہر لینا بھی مکروہ ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ اتنا مال لینے لگے کہ اس نے دیا بھی نہیں۔ اور عورت مال دینے سے گنہگار نہیں ہوگی۔

مسئلہ (۳): اور اگر صورت یہ ہو کہ مرد تو عورت کا قصور سمجھتا ہے اور عورت مرد کا قصور سمجھتی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی رائے میں خود کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم سمجھتا ہے تو مرد کو لینے میں گناہ نہیں ہوگا، البتہ پھر بھی مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہوگا جیسا کہ احقر نے ترجمہ کے درمیان میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ اور نہ عورت کو خلع کی درخواست میں گناہ ہوگا اور اس آیت میں دونوں کے احتمال کے معنی احقر کے نزدیک یہی ہیں، کیونکہ یہ احتمال مظلوم ہی کو ہوا کرتا ہے، اس لئے کہ دوسرے کے ظلم کا دفع کرنا اس کے اختیار سے خارج ہوتا ہے۔ اور اس میں احتمال ہوتا ہے کہ شاید یہ ظلم سے باز نہ آئے۔ اور انتقام لینے میں مجھ سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ بخلاف ظالم کے کہ اس کو اس احتمال کی نوبت نہیں آتی۔ اس لئے کہ ظلم کا ترک کر دینا اس کے لئے ہر وقت اختیاری ہے، پھر حقوق زوجیت کے ضائع ہونے کے اندیشہ کے کچھ معنی نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں فرمایا کہ دونوں پر گناہ نہ ہوگا۔ برخلاف پہلے دو مسئلوں کے کہ ان میں ایک ایک کو گناہ ہوتا ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ "البتہ ایک صورت میں حلال ہے" وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایسا احتمال ہو، اس سے مقصود مرد کے ظالم ہونے کی صورت میں حلال ہونے کی نفی ہے، نہ کہ عورت کے ظالم ہونے کی صورت میں کہ اس صورت میں بدرجۂ اولیٰ حلال ہے۔ اس طرح حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں، خوب سمجھ لو۔

مسئلہ (۴): اور مال کے لینے میں گناہ کا ہونا نہ ہونا اس میں مال کے بدلے طلاق دینے کا حکم یکساں ہے۔

مسئلہ (۵): مال کے لینے یا دینے میں گنہگار مرد ہو یا عورت خلع بہر حال صحیح اور نافذ ہو جائے گا، اگرچہ گناہ کے ساتھ ہی سہی۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞

ترجمہ: پھر اگر کوئی طلاق دیدے عورت کو تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی، اس کے بعد، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ نکاح کرے، پھر اگر یہ اس کو طلاق دیدے تو ان دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں غالب گمان رکھتے ہوں کہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خداوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں۔

ستائیسواں حکم: تیسری طلاق کے بعد حلالہ ضروری ہے:

پھر اگر کوئی (دو طلاقوں کے بعد عورت کو تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر اس کے بعد وہ (عورت) اس تیسری طلاق دینے والے) کے لئے حلال نہ رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ (عدت کے بعد) اس (خاوند) کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ نکاح کرے (اور اس سے ہم بستری بھی ہو) پھر اگر یہ (دوسرا خاوند) اس (عورت) کو طلاق دیدے (اور عدت بھی گذر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ (دوبارہ نکاح کر کے) بدستور پھر مل جائیں۔ بشرطیکہ دونوں غالب گمان رکھتے ہوں کہ (آئندہ) خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے (ورنہ پھر دوبارہ جھگڑے اور حق تلفی کے گناہ میں مبتلا ہونے کا کیا فائدہ) اور یہ خداوندی ضابطے ہیں۔ حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں: ایسے لوگوں کے (کام کے) لئے جو دانشمند ہیں (کیونکہ دانشمند ہی عمل کرتے ہیں اور جو نادانی کی وجہ سے عمل نہیں کرتے ان کے لئے یہ ضابطے الٹے ثبوت جرم کے دلائل بن جاتے ہیں)

تفسیر: اس عمل کو حلالہ کہتے ہیں، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے تو پھر دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے یہی حلالہ کا طریقہ شرط ہے۔ اور دو طلاقوں کے ساتھ یہ تیسری طلاق ہوگی۔ خواہ وہ دونوں طلاق رجعی ہوں یا بائن یا ایک رجعی ایک بائن، پھر یہ تیسری بھی خواہ صریح الفاظ سے ہو یا غیر صریح سے جس کو کنایہ کہتے ہیں اور اس میں اللہ کے نزدیک نیت کی ضرورت ہے۔ پھر یہ تینوں طلاق چاہے ایک ہی بار میں ہوں یا الگ الگ وقتوں میں، اور ایک ہی کلمہ سے ہوں یا الگ الگ کلمات سے سب کا حکم یہی ہے۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ

اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جاویں تو تم ان کو قاعدہ کے موافق نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کرو گے اور جو شخص ایسا کرے گا سو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور حق تعالیٰ کے احکام کو لہو ولعب مت سمجھو اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو اور اس کتاب اور حکمت کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر اس حیثیت سے نازل فرمائی ہیں کہ تم کو ان کے ذریعہ سے نصیحت فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: اوپر آیت ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ میں قاعدہ کے مطابق رکھ لینے اور خوش اسلوبی کے ساتھ چھوڑ دینے کے بارے میں فرمایا ہے۔ اس آیت میں اس کا ذکر دوبارہ اس لئے فرماتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں لوگ اس میں بہت کوتاہی کرتے تھے۔ اس لئے تکرار سے اعتماد، تاکید اور مبالغہ حاصل ہو گیا اور ایک مقصود مستقل بھی ہے وہ یہ کہ اوپر والی آیت میں اگرچہ رکھنے اور چھوڑ دینے کا ذکر ہے، مگر وہ ذکر ضمناً ہے اور اصلی مقصود طلاقِ رجعی کا بیان کرنا ہے اور اس آیت میں اصلی مقصود "رکھ لینے" اور "چھوڑ دینے" کو معروف کے ساتھ مقید کرنا ہے۔ اس طرح مقصود مختلف ہو گیا۔

اٹھائیسواں حکم پچیسویں حکم کا تتمہ اور احکام کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی ممانعت:

اور جب تم نے عورتوں کو (رجعی) طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گذرنے کے قریب پہونچ جائیں (اور عدت ختم نہ ہوئی ہو) تو تم (پر واجب ہے کہ یا تو) ان کو قاعدہ کے مطابق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے مطابق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہونچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کرو گے اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا تو وہ (آخرت میں) اپنا ہی نقصان کرے گا (کیونکہ ظلم کی سزا بھگتے گا) اور حق تعالیٰ کے احکام کو لہو ولعب (کی طرح بے وقعت) مت سمجھو (کہ جب چاہا کر لیا اور جب چاہا نہ کیا) اور تم پر جو حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں انہیں یاد کرو اور (خصوصاً) اس کتاب اور حکمت (کی باتوں) کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر اس حیثیت سے نازل فرمائی ہیں کہ تمہیں ان کے ذریعہ سے نصیحت فرماتے ہیں (اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے تو ان نعمتوں کے یاد کرنے سے انعام عطا فرمانے والے کے احکام کی قدر و قیمت دل میں بیٹھے گی) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (جب یہ خوف اور یقین ہو گا تو احکام پر عمل ہو گا)

تفسیر: قاعدہ کے مطابق رکھنا اور قاعدہ کے مطابق چھوڑنا اس کا بیان آیت ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ کی تفسیر میں

آچکا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ اور احکام پر عمل نہ کرنے کو جولہو ولعب بنانا فرمایا ہے یہ مجاز ہے جو کہ صرف معصیت ہے گو شدید ہے۔ اور اگر کوئی شخص حقیقت میں احکام الہیہ کے ساتھ استہزاء و مسخرہ پن کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ خواہ عقیدہ بھی فاسد ہو یا عقیدہ صحیح رہے۔ کیونکہ دین کی تو تحقیر بہر حال دونوں حالتوں میں کی اور اس کے کفر ہونے کی یہی علت ہے۔

اور بعض مفسرین نے ﴿ وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ﴾ کی تفسیر دوسرے طریقہ سے کی ہے وہ یہ کہ بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ طلاق دیدی اور پھر کہہ دیا کہ ہم نے یوں ہی دل لگی کے طور پر کہہ دیا تھا۔ اسی طرح غلام کو آزاد کر دیا پھر کہہ دیا کہ ویسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی یعنی یہ احکام دل لگی اور مذاق کے لئے نہیں ہیں۔ حدیث میں اس بات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ فرمادیا گیا کہ طلاق اور کچھ دوسرے امور بھی بیان فرمائے: یہ ایسے امور ہیں کہ اگر کوئی ان کو دل لگی یا مذاق میں بھی کہہ دے گا تب بھی سچ مچ واقع ہو جائیں گے، پھر یہ سمجھنا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور بدستور اس عورت سے تعلق رکھنا گناہ ہوگا، اس لئے آگے ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ وغیرہ فرمایا گیا۔

اس تفسیر کے لحاظ سے مناسب ہے کہ اس کو اٹھائیسواں حکم کہا جائے۔ اور سابق تفسیر کے لحاظ سے اٹھائیسواں حکم روک رکھنے اور چھوڑ دینے کا مستقل طور پر ہو جائے گا۔ اس واسطے احقر نے اس مضمون کا عنوان دور خوں والا لکھا ہے۔

مسئلہ: ہزل (مذاق) اس کو کہتے ہیں کہ آدمی لفظ تو بالقصد بولے، لیکن اس کے ساتھ مقصود یہ ہو کہ اس لفظ کا اثر واقع نہ ہو، تو بعض تصرفات ایسے ہیں کہ ان میں اس کا جو مقصود ہے وہ بے معنی ہوگا اور وہ تصرفات محض الفاظ کے کہہ دینے سے واقع ہو جائیں گے۔ ان تصرفات میں سے ایک طلاق بھی ہے۔ اور ایک صورت خطا (چوک) کی ہے کہ منہ سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا، لیکن بے اختیار لفظ طلاق نکل گیا۔ فتح القدیر میں لکھا ہے کہ ایسی صورت میں اللہ کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوگی۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور جب تم میں ایسے لوگ پائے جاویں کہ وہ اپنی بیبیوں کو طلاق دیدیں، پھر وہ عورتیں اپنی میعاد بھی پوری کر چکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ باہم سب رضامند ہو جاویں، قاعدہ کے موافق۔ اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو۔ اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

انتیسواں حکم: عورت کو دوسرے نکاح سے روکنے کی ممانعت:

اور جب تم میں ایسے لوگ پائے جائیں کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دیدیں، پھر وہ عورتیں اپنی میعاد (عدت) بھی پوری کر چکیں (اور عدت پوری کر کے کسی سے نکاح کرنا چاہیں۔ خواہ پہلے ہی شوہر سے یا کسی دوسری جگہ) تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے (خواہ وہ اول ہو یا ثانی) نکاح کرلیں۔ جبکہ باہم سب قاعدہ کے مطابق راضی ہو جائیں۔ اس مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہو (یعنی ماننے کی ان ہی سے امید ہے اور یوں تو نصیحت سب ہی کو ہے) اس نصیحت کو قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کو) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے (اس لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی رائے پر عمل مت کیا کرو)

تفسیر: کبھی طلاق کے بعد جب عورت کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی تو طلاق دینے والا شوہر ہی اپنی بے عزتی سمجھ کر نکاح نہیں کرنے دیتا۔ اور کبھی عورت کے دوسرے اعزا واقربا اپنی کسی دنیوی غرض سے اس کو نکاح نہیں کرنے دیتے، اور ایک جگہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اور اس کا پہلا شوہر پھر نکاح کرنے پر رضامند ہو گئے، مگر اس عورت کے بھائی نے غصہ میں آکر روکا، اس آیت میں سب صورتیں داخل ہیں۔ اور ہر صورت میں روکنے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ رضامندی قاعدہ کے مطابق ہو اس قاعدہ کی تفصیل درج ذیل مسائل سے معلوم ہوگی۔

مسئلہ (۱): جس شخص سے عورت نے نکاح کیا ہے وہ غیر کفو نہ ہو، مہر مثل سے کم مہر مقرر نہ ہو، ورنہ عورت کے ولی کو روکنے کا حق حاصل ہے اور اگر عورت نے اس طرح نکاح کرلیا تو ولی کو یہ حق حاصل ہے کہ قاضی یعنی مسلمان حاکم سے رجوع کرے اور وہ حاکم اس نکاح کو توڑ دے اور یہی ظاہر روایت ہے۔ لیکن متاخرین نے یہ فتوی دیا ہے کہ نکاح ہی صحیح نہ ہوگا۔

مسئلہ (۲): اگر بغیر شرعی گواہوں کے کوئی نکاح کرنے لگے یا نابالغ لڑکی بغیر ولی کے نکاح کرے یا کسی ایسے شخص سے نکاح کرے جس سے نکاح جائز نہیں تو یہ سب نکاح باطل ہیں۔ ہر مسلمان کو خواہ وہ شوہر اول ہو یا عورت کے عزیز واقارب ہوں یا بالکل اجنبی ہوں شرعی طور پر اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے۔

مسئلہ (۳): پہلے شوہر سے نکاح اس صورت میں درست ہے جب اس نے تین طلاق نہ دی ہوں ورنہ بغیر حلالہ اس سے نکاح درست نہیں ہوگا، اور اس میں بھی سب کو روکنے کا حق حاصل ہے۔

مسئلہ (۴): دوسرے نکاح کے لئے عدت کا گذارنا اس وقت شرط ہے جب کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہے اور اگر پہلے ہی شوہر سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو عدت کے اندر بھی درست ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو عدت گذرنے کی قید لگائی ہے وہ یا تو دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرنے کے اعتبار سے ہے اور اگر پہلے ہی خاوند کے اعتبار سے کہا جائے تو وجہ

یہ ہے کہ خاص اس قصہ میں اتفاق سے عدت گذر چکی تھی۔ اس لئے واقعہ کے طور پر بیان فرما دیا۔

اور یہ جو فرمایا کہ اس میں پاکی اور صفائی زیادہ ہے، اس کی عام وجہ تو یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کا ماننا گناہوں سے پاک ہونے اور پاک رہنے کا سبب ہے۔ اور خاص وجہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر کہ مرد اور عورت آپس میں ایک دوسرے کی طرف راغب ہوں وہاں صفائی اور پاکی اسی میں ہے کہ نکاح سے نہ روکا جائے، ورنہ خرابی اور فتنہ اور آلودگی کا اندیشہ ہے۔ البتہ اگر بے قاعدہ نکاح ہوتا ہو تو وہ نکاح ہی نہیں، اس سے روکنا نکاح سے روکنا نہیں ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق۔ کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہ پہنچانا چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ کسی باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور مثل طریق مذکور کے اس کے ذمہ ہے جو وارث ہو، پھر اگر دونوں دودھ چھڑانا چاہیں اپنی رضامندی اور مشورہ سے تو دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں۔ اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ ان کے حوالہ کر دو جو کچھ ان کو دینا کیا ہے قاعدہ کے موافق۔ اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

تیسواں حکم دودھ پلانا:

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلایا کریں (خواہ نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو) یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی دودھ پلانے کی مدت کی تکمیل کرنا چاہے (اور جو تکمیل نہ کرنا چاہے اس کے لئے دو سال سے کم میں بھی دودھ چھڑا دینا درست ہے جیسا جلدی آتا ہے) اور جس کا (شرعی نسب کے اعتبار سے) بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے مطابق (جبکہ وہ نکاح یا عدت میں ہوں اور بیوی کے نان ونفقہ کا قاعدہ اور مسئلے مشہور ہیں) کسی شخص کو (اللہ کی طرف سے کوئی) حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے مطابق (اس لئے عورتوں کو دودھ پلانا

آسان تھا، انہیں اس کا حکم دیا گیا اور مردوں کو خرچ کرنا آسان ہے، اس لئے ان کو اس کا حکم دیا گیا) کسی ماں کو تکلیف نہ پہنچانی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ کسی باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے (یعنی بچہ کے ماں باپ آپس میں کسی بات پر ضد نہ کریں۔ مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے۔ جھک مارے گی اور پلائے گی یا یہ کہ باپ مفلس ہے اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں، پھر بھی دودھ پلانے سے یہ سمجھ کر انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے جھک مار کر کسی سے پلوائے گا) اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مذکورہ طریقہ کے مطابق (بچہ کی پرورش کا انتظام) اس (محرم قرابت دار) کے ذمہ ہے جو (شرعی طور پر بچہ کے) وارث (ہونے کا حق رکھتا ہو (عنقریب اس کی تفصیل فائدہ میں آتی ہے) پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں باپ اپنی رضامندی اور مشورہ سے دو سال سے کم میں) دودھ چھڑانا چاہیں تو (بھی) دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں (مشورہ کی یہ ضرورت ہے کہ بچہ کی مصلحت میں نظر کرلیں) اور اگر تم لوگ (ماں کے ہوتے ہوئے بھی کسی ضروری مصلحت سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں، بچہ کو تکلیف، نقصان ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ ان کے حوالہ کردو (خواہ پیشگی یا بعد میں جس طرح معاہدہ ہو جائے) جو کچھ قاعدہ کے مطابق انہیں دینا طے کیا ہے (اور اگر اجرت نہ پہلے دے نہ بعد میں تو یہ بات نہ رہے گی کہ تم پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ اجرت نہ دینے کا گناہ لازم رہے گا) اور حق تعالیٰ سے (ان سب احکام کے بارے میں) ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

مسئلہ (۱): اگر ماں کو کوئی عذر نہ ہو تو دیانۃً یعنی اللہ کے نزدیک اس کے ذمہ واجب ہے کہ بچہ کو دودھ پلائے جبکہ نکاح میں ہو یا عدت میں ہو اور اجرت لینا درست نہیں ﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ ﴾ میں اسی مسئلہ کا ذکر ہے۔ اور اگر طلاق کے بعد عدت گذر چکی تو ماں پر بلا اجرت دودھ پلانا واجب نہیں، چنانچہ دونوں صورتوں میں اجرت مانگنے کا حکم آگے آتا ہے، اور ﴿ وَالْوَالِدٰتُ ﴾ اگرچہ لفظ کے اعتبار سے اس دوسری صورت کو بھی عام ہے، مگر اگلے جملہ ﴿ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ ﴾ کے سبب دودھ پلانے کا یہ وجوب کھانے اور کپڑے کے وجوب کے ساتھ مخصوص ہو گیا اور کھانے اور کپڑے کا وجوب دو حالتوں میں ہے۔ نکاح میں اور عدت میں۔ لہٰذا یہ دودھ پلانے کا وجوب بھی نکاح اور عدت کی حالت میں ہوگا (فتح القدیر)

مسئلہ (۲): اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرے تو یوں سمجھیں گے کہ غالباً یہ معذور ہوگی، اس لئے اس پر زبردستی نہیں کی جائے گی۔ ﴿ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ﴾ میں یہ مسئلہ بھی ہے۔ البتہ اگر بچہ کسی اور کا دودھ ہی نہیں پیتا نہ اوپر کا دودھ پیتا ہے تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، ﴿ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ ﴾ میں یہ مسئلہ بھی داخل ہے۔

مسئلہ (۳): ماں دودھ پلانا چاہتی ہے اور اس کے دودھ میں کوئی خرابی بھی نہیں تو باپ کو جائز نہیں کہ اسے نہ پلانے دے اور دوسری انا کا دودھ پلاوے اور یہ مسئلہ بھی ﴿ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ﴾ میں داخل ہے۔

مسئلہ (۴): ماں دودھ پلانے پر رضا مند ہے، لیکن اس کا دودھ بچہ کے لئے مضر ہوگا تو باپ کو جائز ہے کہ اسے دودھ نہ پلانے دے اور کسی انا سے دودھ پلوا دے۔ ﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا﴾ میں یہی مسئلہ ہے۔

مسئلہ (۵): ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو اگر ابھی شوہر کے نکاح میں ہے یا یہ کہ طلاق ہوگئی، لیکن عدت نہیں گذری تو ان دونوں حالتوں میں اجرت لینی جائز نہیں، بلکہ قانونی طور پر بھی مجبور کی جائے گی کہ دودھ پلائے ﴿لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾ میں یہ مسئلہ داخل ہے۔

مسئلہ (۶): اور اگر طلاق کے بعد عدت گذر گئی، پھر اجرت مانگتی ہے تو باپ کو اجرت دینی پڑے گی۔

مسئلہ (۷): اس صورت میں یعنی طلاق کے بعد عدت گذر جائے اور وہ اجرت مانگتی ہے تو اگر باپ دوسری انا سے اتنی ہی اجرت پر دودھ پلوانا چاہے تب تو ماں مقدم ہے، دوسری انا سے دودھ پلوانے کا حق نہیں۔ ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ﴾ میں یہ مسئلہ بھی داخل ہے۔ اور اگر دوسری انا اس ماں سے کم اجرت پر راضی ہے تو ماں کو یہ حق حاصل نہیں کہ خود پلائے اور زیادہ اجرت لے ﴿لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ﴾ میں یہ مسئلہ بھی ہے۔ البتہ اگر ماں درخواست کرے تو اتنا حق رکھتی ہے کہ انا کو اس کے پاس رکھا جائے تاکہ بچہ سے جدائی نہ ہو۔

مسئلہ (۸): باپ کے ہوتے ہوئے بچہ کی پرورش کا خرچ صرف باپ کے ذمہ ہے، اور جب باپ مر جائے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک ہے تب تو اس مال میں سے اس کا خرچ ہوگا، اور اگر مال کا مالک نہیں ہے تو اس کے مالدار عزیزوں میں جو اس کے محرم ہیں یعنی ان سے اس بچہ کا ایسا رشتہ ہے کہ اگر اس رشتہ دار اور بچہ میں سے ایک کو مرد اور ایک کو عورت فرض کریں تو آپس میں نکاح درست نہ ہو اور محرم ہونے کے علاوہ شرعی طور پر اس کی میراث کے مستحق بھی ہیں، یعنی اگر یہ مر جائے تو محرم رشتہ داروں میں دیکھا جائے کہ اس کا مال میراث میں کس کس کو کتنا کتنا پہونچتا ہے۔ تو ایسے محرم وارث رشتہ داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا اور ان رشتہ داروں میں ماں بھی داخل ہے، مثلاً ایک ایسے بچہ کی ماں ہے اور دادا ہے تو اس کے خرچ کا ایک تہائی ماں کے ذمہ ہے اور دو تہائی دادا کے ذمہ، کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچہ کی میراث اسی نسبت سے پاسکتے ہیں۔

مسئلہ (۹): کھانے کپڑے پر کسی کو ملازم رکھنا درست نہیں، لیکن دودھ پلانے والی کو اس طرح ملازم رکھنا درست ہے، لیکن پھر بھی کھانے کپڑے کی حیثیت اچھی طرح واضح کر کے ٹھہرا لے۔ اور حیثیت کی وضاحت نہ کرنے میں اوسط درجہ کا واجب ہوگا۔ اور نقد مقرر ہوا ہے تو اس کی مقدار اور پہلے یا بعد میں دینے کی شرط خوب صاف صاف بیان کردے، بالمعروف کا یہی مطلب ہے، یہ سبھی مسئلے ہدایہ اور درمختار میں ہیں۔ سوائے اس مسئلہ کے جو آیت ﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ﴾ سے مستنبط ہے کہ تفسیر کبیر میں ہے، مگر ہمارے قواعد بھی اس کے منکر نہیں ہیں۔

مسئلہ (۱۰): اکثر کا فتویٰ اسی پر ہے کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ: اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن، پھر جب اپنی میعاد ختم کرلیں تو تم کو کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی کریں قاعدہ کے موافق اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

اکتیسواں حکم: شوہر کی وفات کی عدت

اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) چار مہینے اور دس دن روکے رکھیں پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کرلیں تو تمہیں (بھی) ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کچھ گناہ نہیں ہوگا کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے قاعدہ کے مطابق کچھ کارروائی کریں۔ (البتہ اگر کوئی بات شرع کے قاعدہ کے خلاف کریں اور تم روکنے کی پوزیشن میں ہونے کے باوجود نہ روکو تو تم بھی گناہ میں شریک ہوگے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

تفسیر: یہ عدت اس بیوہ کی ہے جس کو حمل نہ ہو اور اگر حمل ہو تو بچہ پیدا ہونے تک اس کی عدت ہے۔ خواہ بچہ، جنازہ لے جانے سے پہلے ہی پیدا ہو جائے یا چار مہینے دس دن سے بھی زیادہ میں پیدا ہو۔ یہ مسئلہ سورۂ طلاق میں آئے گا۔

مسئلہ (۱): جس عورت کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے دوران خوشبو لگانا، بناؤ سنگار کرنا، سرمہ، تیل اور بلا ضرورت دوا لگانا، مہندی لگانا اور رنگین کپڑے پہننا درست نہیں۔ اور دوسرے نکاح کے لئے واضح الفاظ میں بات چیت کرنا بھی درست نہیں جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے۔ اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست نہیں۔ ترجمہ میں جو نکاح کے ساتھ لفظ وغیرہ کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں اور اس عورت کا بھی یہی حکم ہے جس پر طلاق بائن واقع ہو، یعنی جس میں رجعت نہیں ہو سکتی، مگر اس کو اپنے گھر سے دن کے وقت بھی بغیر سخت مجبوری کے نکلنا درست نہیں۔

مسئلہ (۲): اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ انتیس کے ہوں خواہ تیس کے، چاند کے حساب سے پورے کئے جائیں گے۔ اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہو تو یہ سب مہینے تیس تیس کے حساب سے پورے کئے جائیں گے۔ اس طرح کل ایک سو تیس دن پورے کئے جائیں گے۔ اس مسئلہ میں بہت سے لوگ لاپرواہی کرتے ہیں۔ اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گذر کر وہی وقت آئے گا تب عدت ختم ہو جائے گی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے مطابق کچھ کریں تو تمہیں بھی گناہ نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے تو

دوسرے لوگوں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ اگر قدرت ووسعت ہو تو اس کو روکیں۔ ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں۔ اور قاعدہ کے مطابق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شریعت کے مطابق صحیح اور جائز ہو اس میں حلال ہونے کی تمام شرطیں جمع ہوں۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ

ترجمہ: اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، جو ان مذکورہ عورتوں کو پیغام دینے کے بارہ میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو، اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر مذکور کرو گے، لیکن ان سے نکاح کا وعدہ مت کرو، مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو اور تم تعلق نکاح کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت مقررہ اپنی ختم کو پہنچ جاوے اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں، حلیم بھی ہیں۔

بتیسواں حکم: عدت کے دوران نکاح کا پیغام دینے کی ممانعت:

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو وفات کی عدت گذار رہی ہیں، نکاح کا) پیغام دینے کے بارہ میں کوئی بات اشارہ سے کہو (مثلاً یہ کہ مجھے ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے وغیرہ) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کر لینے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو (اس صورت میں بھی گناہ نہیں اور اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) تذکرہ کرو گے (تو خیر ذکر مذکور کرو) لیکن ان سے (صاف الفاظ میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو، مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے مطابق کہو (تو کوئی حرج نہیں۔ اور وہ بات قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشاروں میں کہو) اور تم (فوری) نکاح کے تعلق کا ارادہ بھی مت کرو۔ یہاں تک کہ مقررہ عدت ختم ہو جائے اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے دل کی بات کی اطلاع ہے۔ اس لئے اللہ سے ڈرتے رہا کرو (اور کسی ناجائز کام کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے (بھی) ہیں (تو اگر کسی ناجائز امر کا ارادہ کیا تھا، پھر توبہ کر لی تو معاف کر دیتے ہیں اور) حلیم بھی ہیں (تو اگر توبہ نہ کرنے والے کو فوراً سزا نہ دیں تو اس کی وجہ حلم سمجھو۔ دھوکا مت کھاؤ)

تفسیر: یہاں عدت کے دوران سے متعلق چار افعال کا ذکر ہے۔ دو زبان کے اور دو دل کے۔ اور ہر ایک کا جدا حکم

ہے۔اول زبان سے صراحت کے ساتھ پیغام دینا حرام ہے﴿ لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ﴾ میں اس کا ذکر ہے۔دوسرے زبان سے اشاروں میں کہنا یہ جائز ہے۔﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ﴾ اور﴿ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴾ میں اس کا ذکر ہے۔تیسرے دل سے یہ ارادہ کرنا کہ ابھی عدت کے اندر ہی نکاح کرلیں گے، یہ بھی حرام ہے، کیونکہ عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے اور حرام کا ارادہ کرنا بھی حرام ہے۔﴿ لَا تَعْزِمُوْا ﴾ میں اس کا ذکر ہے۔چوتھے دل سے یہ ارادہ کرنا کہ عدت کے بعد نکاح کریں گے یہ جائز ہے۔﴿ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ﴾ میں اس کا ذکر ہے۔

مسئلہ: جو عورت طلاق بائن کی عدت میں ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ: تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے اور ان کو فائدہ پہنچاؤ صاحبِ وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے۔اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے، خوش معاملہ لوگوں پر۔

تینتیسواں حکم: دخول سے پہلے طلاق میں مہر کا واجب ہونا نہ ہونا:

دخول سے پہلے طلاق کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا۔دوسرے یہ کہ مہر مقرر ہوا۔اولاً پہلی صورت کا حکم بیان کیا جارہا ہے۔تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر تم بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ نہ تم نے ان کو ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مقرر کیا ہے (تو اس صورت میں اپنے ذمہ مہر مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہونچاؤ۔صاحبِ وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگ دست کے ذمہ اس کی حیثیت کے مطابق ہے۔ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا، جو قاعدہ کے مطابق واجب ہے، خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی) سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب کو ہی حکم ہے۔اس سے مراد ایک جوڑا دینا ہے۔

مسئلہ (۱): اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے۔

مسئلہ (۲): اگر کسی عورت کو صحبت اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق دیدے تو مہر کچھ بھی نہیں دینا پڑتا بلکہ ایک جوڑا واجب ہوتا ہے۔جس میں تین کپڑے ہوں: ایک کرتا، ایک سربند (دوپٹا) اور ایک اتنی بڑی چادر کہ جس سے سر سے پاؤں تک پورا جسم لپیٹا جاسکے۔قال الزیلعی فی نصب الرایة: أخرجه البیهقی عن ابن عباس۔

مسئلہ (۳): ہدایہ میں اس قول کو صحیح کہا ہے کہ اس جوڑے میں مرد کی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا، عورت کی حیثیت کا نہیں، اور کرخی نے عورت کے حال کا اعتبار کیا ہے۔کیونکہ وہ آیت کو سر دست وصول کرنے پر محمول کرتے ہیں اور باقی کو

ادھار قرار دیتے ہیں۔

مسئلہ (۴): ایسی عورت کو ایسا جوڑا دینا واجب ہے اور یہ مہر کے قائم مقام ہے۔

مسئلہ (۵): یہ جوڑا پانچ درہم سے کم قیمت کا نہیں ہونا چاہئے اور ایسی عورت کے مہر مثل کے نصف سے زیادہ نہ ہو۔

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰىؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ

ترجمہ: اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف ہے، مگر یہ کہ عورتیں معاف کر دیں یا یہ کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا حکم کا تتمہ:

اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو اس سے پہلے کہ انہیں ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہے اور (نصف معاف ہے) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک) یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہیں رہا) یا (دوسری صورت) یہ کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر اس کو دیدے۔ یعنی اس نے نصف مہر بھی معاف نہیں کرایا) اور (اہل حقوق!) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو (بلکہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو اگر تم کسی کے ساتھ رعایت اور احسان کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزائے خیر دیں گے)

مسئلہ (۱): جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو اور اس کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیدی گئی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمہ واجب ہوگا۔ البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو یہ ان کے اختیار کی بات ہے۔

مسئلہ (۲): کسی کے ساتھ سلوک واحسان کرنا یا کسی کو اپنا حق معاف کر دینا اس کا اپنے آپ میں اجر کا باعث ہونا ظاہر

اور معلوم ہے، البتہ کسی خاص عارض کی وجہ سے رعایت نہ کرنے کی ترجیح ہو جائے تو یہ اور بات ہے۔ مثلاً یہ کہ رعایت کرنے والا خود مفلس ہے اور وہ رعایت کرنے کے بعد تنگ دستی پر صبر نہ کر سکے گا اور خود کسی معصیت میں مبتلا ہو جائے گا۔ پس کسی شے کا فی نفسہ (اپنے آپ میں) مستحسن ہونا اور کسی عارض کی وجہ سے غیر مستحسن ہونا، ان میں تعارض اور منافات نہیں

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: محافظت کرو سب نمازوں کی اور درمیان والی نماز کی اور کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ پھر اگر تم کو اندیشہ ہو تو تم کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے پڑھ لیا کرو، پھر جب تم کو اطمینان ہو جاوے تو تم خدا تعالیٰ کی یاد اس طریق سے کرو جو تم کو سکھلایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

چونتیسواں حکم: نماز کی حفاظت:

(اس آیت سے پہلے اور بعد میں طلاق وغیرہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانے کا مطلب یہ اشارہ کرنا ہے کہ اصلی مقصود حق کی طرف توجہ ہے اور معاشرت و معاملات کے احکام سے دوسری مصلحتوں کے علاوہ اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب انہیں احکام الٰہی سمجھ کر عمل کیا جائے گا تو توجہ لازم ہوگی۔ پھر یہ کہ ان احکام میں حقوق العباد کی ادائیگی بھی ہے اور حقوق العباد کے تلف ہونے سے بارگاہِ الٰہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لوازم میں سے اللہ اور بندہ دونوں کی طرف سے جو بے توجہی ہے، چونکہ ظاہر ہے کہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے) حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیانی والی نماز (یعنی عصر) کی خصوصاً اور (نماز میں) اللہ کے سامنے عاجز بن کر کھڑے ہوا کرو۔ پھر اگر تمہیں (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو تم کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے۔ خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ نہ ہو اور گو رکوع اور سجدوں کی ادائیگی صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس کی حفاظت کرو، اس کو ترک مت کرو) پھر جب تمہیں (بالکل) اطمینان ہو جائے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم اللہ تعالیٰ کی یاد (یعنی نماز کی ادائیگی) اس طریقہ سے کرو جو تمہیں (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

فائدہ: بعض احادیث کی روشنی میں بکثرت علماء کا قول یہ ہے کہ بیچ والی نماز عصر ہے، کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں: مغرب وعشاء۔ اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ وقت کام کے اژدحام کا ہوتا ہے۔ اور عاجزی کی تفسیر حدیث میں خاموشی کے ساتھ آئی

ہے، اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوئی، پہلے اس کی اجازت تھی۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے اس وقت صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو اور اس میں سجدہ کا اشارہ سر کو ذرا زیادہ جھکا کر کرے۔ چلنے کی حالت میں نماز نہیں ہوگی۔ البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہے تو نماز قضا کر دی جائے گی کہ دوسرے وقت پڑھ لیں گے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

ترجمہ: اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو، وہ وصیت کر جایا کریں اپنی ان بیبیوں کے واسطے ایک سال منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں ہاں اگر خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اُس قاعدہ کی بات میں جس کو وہ اپنے بارہ میں کریں اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں۔

پینتیسواں حکم: بیوہ کے لئے سکونت کی وصیت:

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویوں کو چھوڑ جاتے ہیں (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کر جایا کریں اپنی ان بیویوں کے واسطے ایک سال تک فائدہ اٹھانے کی۔ اس طرح کہ وہ گھر سے نکالی نہ جائیں، ہاں! اگر (چار مہینے دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد عدت گذار کر) خود نکل جائیں تو تمہیں کوئی گناہ نہیں اس قاعدہ کی بات میں جس کو وہ اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (ان کی نافرمانی مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں، گو تمہاری سمجھ میں نہ آسکیں)

فائدہ: جاہلیت میں شوہر کی وفات کی عدت ایک سال تھی۔ اسلام میں ایک سال کے بجائے چار مہینے دس دن مقرر ہوئے جیسا کہ اکتیسویں حکم میں بیان کیا جا چکا۔ مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور میراث میں بیوی کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہوا تھا، بلکہ دوسروں کے حق کا مدار بھی محض مردہ کی وصیت پر تھا، جیسا کہ آیت ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ ﴾ کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان ونفقہ بھی دیا جائے۔ اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور خاوند کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کرے اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اپنا حق وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا، اس لئے وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ اس گھر میں نہ رہے اور اپنا حق وارثوں کے لئے چھوڑ دے۔ بشرطیکہ عدت پوری ہو چکی ہو۔ اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور قاعدہ کی بات سے یہی مراد ہے۔ البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ

سب گناہ تھا، عورت کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی۔ پھر جب میراث کی آیت نازل ہوگئی اور گھر یا ہر سارے ترکہ میں سے عورت کو حق مل گیا تو اس آیت کا حکم منسوخ ہوگیا کہ اپنے حصہ میں رہے اور اپنے حصہ سے خرچ کرے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭحَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

ع ۳۱

ترجمہ: اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے ان پر جو پرہیز کرتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم سمجھو۔

تینتیسویں اور پینتیسویں نمبر میں مذکور متاع (بیویوں کو فائدہ پہنچانے) کے حکم کا تتمہ:

ایک متاع (بیویوں کو فائدہ پہنچانے) کا ذکر نمبر تینتیس میں آیا ہے اور ایک کا نمبر پینتیس میں۔ اب متاع کے بعض باقی اقسام بیان فرماتے ہیں: اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہونچانا (کسی درجہ میں مقرر ہے) قاعدہ کے مطابق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک وکفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا استحباب کے درجہ میں) اس طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں۔ اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)

تفسیر: نمبر تینتیس میں دو قسم کی مطلقات کا بیان تھا، جن کو دخول سے پہلے طلاق ہوئی تھی، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ آدھا مہر دیا، اب وہ طلاق والی رہ گئیں جن کو دخول کے بعد طلاق دی جائے۔ تو ان میں جس کا مہر مقرر کیا گیا، اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے اور جس کا مہر مقرر نہ کیا جائے اس کے لئے دخول کے بعد مہر مثل واجب ہے، جس کا ذکر نمبر تینتیس کے شروع میں ہوا ہے اور باقی سب اقسام میں مستحب ہے۔

اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جائے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گذرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن۔ اس طرح اس آیت کے عام الفاظ میں ساری صورتیں شامل ہیں، اور قاعدہ سے مراد یہی تفصیل ہو جائے گی اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت کیا جائے گا۔ اور لفظ حقا کو واجب کے معنی میں نہیں لیں گے، بلکہ ثابت کے معنی میں لیں گے اور یہاں علی الزام کے لئے نہیں، بلکہ تاکید کے لئے ہوگا گو درجہ استحباب ہی میں سہی۔

فائدہ: طلاق اور نکاح وغیرہ کے احکام میں جگہ جگہ اتقوا اللہ اور حدود اللہ اور سمیع علیم اور عزیز حکیم اور بصیر اور خبیر اور ھم الظالمون اور فقد ظلم نفسہ وغیرہ کا آنا جو کہ مخالفت کی حالت میں وعید پر قطعی دلیل ہیں خبر

دیتے ہیں کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں بطور مشورہ کے نہیں ہیں، جن میں نعوذ باللہ ہمیں ترمیم وتبدیلی کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۗ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں میں تھے، موت سے بچنے کے لئے، سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرمادیا کہ مرجاؤ، پھر ان کو جلا دیا بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

ربط: بِرّ (نیکی وبھلائی) کے ابواب میں یہاں تک مختلف قسم کے پینتیس احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض عبادتوں سے متعلق ہیں، گو سیاست کے ضمن میں ہیں، جیسے قصاص اور روزہ اور جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا) اور حج اور شراب اور جوئے کا حرام ہونا۔ اور نماز وغیرہ اور بعض معاشرت سے متعلق ہیں، جیسے یتیموں، نکاح، دودھ پلانے اور طلاق وغیرہ کے احکام۔ اور بعض معاملات سے متعلق ہیں۔ جیسے ربا (سود) ودَین (قرض) وشہادت ورہن (گروی رکھنا) جو کہ سورت کے ختم کے قریب آئیں گے۔ اور ان سب کا مقصود اصلی اللہ کی طرف توجہ ہے جیسا کہ چونتیسویں حکم کے ضمن میں بیان ہوا۔ اور یہ معنی عبادتوں میں زیادہ صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس لئے عبادات سے متعلق احکام زیادہ مقصود قرار پائے۔ اور پھر عبادتیں بھی دو طرح کی ہیں: ایک وہ جن کا نفع لازمی یعنی خاص اس کی ذات سے متعلق ہو اور دوسرے وہ جن کا نفع متعدی یعنی دوسروں تک پہنچنے والا ہو۔ اور دوسرا یعنی متعدی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔ اور ان مذکورہ عبادتوں میں سے اس معنی میں دو عبادتیں زیادہ کامل اور قوی ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے۔ ایک جہاد کہ اللہ کے راستہ میں نفس کو پیش کرنا ہے۔ دوسرے خیر کے معاملہ میں خرچ کرنا یعنی اللہ کے راستہ میں مال کا پیش کرنا ہے، اس لئے ان دو مضمونوں کے بیان کا اہتمام اس سورت میں اور اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی دوسرے مضامین کی بہ نسبت بہت زیادہ کیا گیا ہے، چنانچہ گذشتہ آیتوں میں بھی متعدد مواقع پر مختلف عنوانات سے تمام احکام کے بیچ بیچ میں بیان ہوا ہے کہ ہر جگہ پھیلے ہوئے معلوم ہوں۔ جیسے ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ﴾ سے ﴿حِيْنَ الْبَاْسِ﴾ تک، اور ﴿قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ میں اور ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ سے ﴿يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ﴾ تک میں صراحت کے ساتھ اور ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا﴾ میں ضمناً جہاد کا بیان ہوا ہے۔ اور ﴿اٰتَى الْمَالَ﴾ میں اور ﴿اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ﴾ میں اور دو موقعوں پر ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ میں انفاق کا بیان ہوا ہے۔ اسی اہتمام کی وجہ سے

آئندہ آیتوں میں بھی ان دونوں کا بیان پھر سے تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ چنانچہ آیت ﴿قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ میں جوذرا آگے آتی ہے، جہاد کا حکم صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اور اس کی تمہید کے لئے اس آیت ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا﴾ اور اس کی تکمیل کے لئے اس کے بعد آنے والی آیتیں ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ﴾ بھی لائی گئی ہیں، جن میں طالوت اور جالوت کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اور آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ﴾ میں جو ﴿قَاتِلُوْا﴾ کے بعد آتی ہے۔ اور چار رکوعوں کی ابتدا میں جو کہ مذکورہ بالا قصہ کے ختم کے بعد ہیں، انفاق کی تاکید اور فضیلت اور اس کے ظاہری و باطنی آداب وغیرہ مضامین کا بیان ہے۔ یہ آیات کے مضامین کے ربط کی توجیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

موت سے بھاگنے والوں کا قصہ، قتال پر ابھارنے کے لئے:

(اے مخاطب!) کیا تمہیں ان لوگوں کے قصہ کی تحقیق نہیں ہوئی جو موت سے بچنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں میں تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مرجاؤ (اور وہ سب مرگئے) پھر انھیں جلادیا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں (کے حال) پر بڑا فضل کرنے والے ہیں۔ مگر زیادہ تر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیر: یہ پہلی امتوں میں سے کسی کا قصہ ہے، وہ کسی ایسے حادثہ سے بھاگے تھے جس میں موت کا اندیشہ تھا، مشہور یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تھی اور وہ لوگ طاعون یا جہاد سے گھبرا کر بھاگے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حقیقت دکھادی کہ موت و حیات سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ چنانچہ انہیں ایک دم سے موت آگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اور مشہور یہ ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا کے بعد ان کو زندہ کردیا، تاکہ بلا سبب موت اور بلا سبب حیات دونوں کا انہیں مشاہدہ ہوجائے۔

اور فضل سے یا تو یہی مراد ہے خواہ زندہ کرنا یا ان کا عقیدہ درست کردینا اور یا اس قصہ کا امت محمدیہ کو سنادینا مراد ہے، کیونکہ ایسی بات بتادینا جس سے عقیدہ اور عمل کی اصلاح ہو بلاشبہ بڑا فضل ہے، چنانچہ یہ قصہ اسی لئے سنایا گیا ہے کہ جہاد وغیرہ سے موت کے خوف کے سبب سے پسپا نہ ہوں اور موت و حیات سب کو قبضۂ الٰہی میں سمجھیں۔

طاعون سے فرار:

جس طرح جہاد سے بھاگنا حرام ہے، اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے۔

تناسخ کے وہم کو دفع کرنا اور بعض آیات میں تعارض کو دفع کرنا:

مرکر زندہ ہونے سے تناسخ (آواگون) کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ شریعت میں جو کچھ آیا ہے اس کا مقصد اس دعویٰ کو باطل کرنا ہے کہ گذشتہ زندگی کی جزا و سزا کی غرض سے موت کے بعد دوسرا بدن دیا جائے اور یہاں دوسری زندگی جزا و سزا

کی غرض سے نہیں تھی، اور مسخ کی صورت میں درمیان میں موت کی مداخلت نہیں ہوتی، اس لئے اس پر شبہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہ دوسری زندگی ان آیات کے بھی خلاف نہیں ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے دنیا میں آنا نہیں ہوتا، کیونکہ ان آیات میں عادت کی نفی مقصود ہے۔ اور یہ حیات خرق عادت کے طور پر کبھی کبھی واقع ہوئی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

ربط: آگے اس تمہید سے جو مقصود تھا اس کی تصریح فرماتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ مقصود پہلے بھی چند جگہ آچکا ہے، لیکن ہر موقع کی غرض جدا ہے۔ چنانچہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ میں خاص حرم اور احرام میں قتال جائز ہونے کا شبہ دور کرنا مقصود تھا، اور ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ﴾ میں قتال کی فرضیت بیان کرنا مقصود تھا، اور یہاں سیاق وسباق کے قرینہ سے ابھارنا اور ہمت افزائی کرنا مقصود ہے۔ اس طرح اس میں اور دوسرے مقامات میں فرق ظاہر ہے۔

قتال پر ابھارنا:

(اس قصہ میں غور کرو) اور اللہ کی راہ میں قتال کرو اور اس بات کا یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کی باتیں سنتے ہیں اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

ترجمہ: کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا، پھر اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دیوے اور اللہ کمی کرتے ہیں اور فراخی کرتے ہیں اور تم اسی کی طرف لے جائے جاؤ گے۔

ربط: جہاد میں جان پیش کرنے کے ساتھ مال خرچ کرنے کا بیان فرماتے ہیں اور اگرچہ انفاق کا بیان اوپر بھی آچکا ہے اور آگے بھی آئے گا، لیکن ہر مقام پر بیان کا مقصود جداگانہ ہے جو معمولی غور وفکر سے معلوم ہوسکتا ہے۔

خیر و بھلائی کے کاموں میں (جہاد وغیرہ میں) خرچ کرنے کی ترغیب:

کون ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے۔ اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اخلاص کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض

کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دے اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو (اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کی اصلی بنیاد نہیں ہے) اور تم اسی کی طرف (مرنے کے بعد) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزا اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تمہیں ملے گی)

تفسیر: قرض مجازاً کہہ دیا ورنہ سب کچھ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے قرض کا عوض ضرور دیا جاتا ہے، اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضرور ملے گا۔ اور بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں ایک خرما (کھجور) خرچ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ اگر احد پہاڑ کے ٹکڑے خرما کے برابر کیے جائیں تو بیشمار ہوں گے۔ اس طرح اس حساب کو بڑھانے کی حد سات سو تک نہیں رہی۔ اور شان نزول سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب وہ سات سو والی آیت نازل ہوئی تو پیغمبر ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے میرے رب! میری امت کو اور زیادہ دیجئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ لباب النقول میں ابن حبان و ابن حاتم و ابن مردویہ کی سند سے اس کو حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ: کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا، جبکہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں، ان پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جاوے کہ تم جہاد نہ کرو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ ہم اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے۔ پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے سب پھر گئے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: اس مقام میں زیادہ مقصود قتال کی ترغیب ہے۔ اوپر کا قصہ اس کی تمہید ہے اور انفاق کا مضمون اسی کی تائید میں ہے، آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے۔

طالوت و جالوت کا واقعہ:

اے مخاطب! کیا تمہیں بنی اسرائیل کی جماعت کے قصہ کی تحقیق نہیں ہوئی؟ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے(

جس سے پہلے ان پر جالوت کافر غالب آچکا تھا اور اس نے ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں (ان پیغمبر نے) فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے تو تم (اس وقت) جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسی کونسی وجہ ہوگی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک اور محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہمیں (ان کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیا گیا ہے (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی ان کافروں نے دبالی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر کے لے گئے تھے) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو ایک تھوڑی تعداد کے سوا (باقی) سب پھر گئے (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل سے بیان آتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی نافرمانی کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں (سب کو مناسب سزا دیں گے)

فائدہ: اس زمانہ میں بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفار عمالقہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، ان کا نام شمویل مشہور ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ: اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا۔ کہنے لگے کہ ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں ان کو منتخب فرمایا ہے اور علم اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں، جاننے والے ہیں۔

باقی قصہ:

اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ کہنے لگے: ان کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ ان کی بہ نسبت ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور انہیں کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست) اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تا کہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جسامت بھی

اس معنی میں مناسب ہے کہ موافق اور مخالف کے دل میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے سوال کا حق نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دیدینا کیا مشکل ہے جس کے اعتبار سے تم کو شبہ ہے اور) جاننے والے ہیں (کہ سلطنت کی لیاقت کون رکھتا ہے)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

ع ۳۲

ترجمہ: اور ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجاوے گا جس میں تسکین کی چیز ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ وحضرت ہارون چھوڑ گئے ہیں، اس صندوق کو فرشتے لے آویں گے۔ اس میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

باقی قصہ:

بقیہ: اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر ہم ان کے اللہ کی جانب سے ہونے کی کسی ظاہری حجت کا بھی مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اطمینان ہوجائے (اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (اللہ کی جانب سے) بادشاہ مقرر ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بغیر تمہارے لائے ہوئے) آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین (اور برکت) کی چیز ہے (یعنی تورات اور تورات کا اللہ کی جانب سے ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ غرض) اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے۔ اس (طرح صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

تفسیر: اس صندوق میں تبرکات تھے۔ جب جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا تھا تو وہ یہ صندوق بھی لے گیا تھا۔ جب اللہ کو اس صندوق کا بنی اسرائیل کا پہونچانا منظور ہوا تو یہ انتظام کیا کہ وہ لوگ جہاں اس صندوق کو رکھتے وہاں ہی سخت سخت بلائیں نازل ہونے لگتیں۔ آخر ان لوگوں نے اس کو ایک گاڑی میں رکھ کر بیلوں کو ہانک دیا اور فرشتے اس کو یہاں پہنچا گئے۔ جس سے بنی اسرائیل کو بڑی خوشی ہوئی اور طالوت بادشاہ تسلیم کر لئے گئے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ

فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

ترجمہ: پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انھوں نے کہا کہ حق تعالیٰ تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر سے، جو شخص اس سے پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے سو سب نے اس سے پینا شروع کردیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے۔ سو جب طالوت اور جو مؤمنین ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، کہنے لگے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کی طاقت نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

مزید باقی قصہ:

بقیہ: پھر جب (بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا اور لوگ جالوت کے مقابلہ کے لئے جمع ہوگئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انھوں نے (اپنے ہم راہ چلنے والے پیغمبر کی وحی کے ذریعہ دریافت کرکے ساتھیوں سے) کہا کہ حق تعالیٰ (ثابت قدمی اور عدم ثابت قدمی میں) ایک نہر کے ذریعہ تمہارا امتحان کریں گے (جو راہ میں آئے گی اور تشنگی کی شدت کے وقت اس پر سے گذرو گے) تو جو شخص اس سے (افراط کے ساتھ) پانی پیئے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل حکم یہی ہے) وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی رخصت ہے۔ غرض وہ نہر راستہ میں آئی۔ پیاس کی شدت تھی) سو سب نے اس سے (بے تحاشہ) پینا شروع کردیا، مگر ان میں سے تھوڑے سے آدمیوں نے (احتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے چلو سے زیادہ نہ پیا ہوگا) سو جب طالوت اور ان کے ہمراہ ایمان لانے والے نہر سے پار اتر گئے (اور اپنے مجمع کو دیکھا کہ تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اس وقت بعض لوگ آپس میں) کہنے لگے کہ آج تو (ہمارا مجمع اتنا کم ہے کہ اس حالت سے) ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ کی طاقت معلوم نہیں ہوتی (یہ سن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں۔ کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں

(اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

امتحان میں حکمت:

اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ اور ازدحام تو بہت ہوجایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں۔ اور اس وقت لوگوں کا پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہونا باقی لوگوں کے بھی پاؤں اکھاڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایسے لوگوں کا علاحدہ کرنا منظور تھا۔ اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ثابت قدمی اور جفاکشی ہوتی ہے تو پیاس کی شدت کے وقت بغیر کوشش کے پانی ملنے پر ضبط کرنا استقلال کی، اور اندھے باؤلوں کی طرح ٹوٹ پڑنا بے استقلالی کی دلیل ہے۔ آگے خرق عادت ہے کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بے کار ہوگئے۔ جیسا کہ روح المعانی میں ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، اور اس قصہ میں جن احوال واقوال کا ذکر ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے: (۱) ناقص ایمان والے جو امتحان میں پورے نہ اترے (۲) کامل ایمان والے، جو امتحان میں پورے اترے، مگر ان کو اپنی تعداد کی کمی کی فکر ہوئی (۳) اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ: اور جب طالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آئے تو کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر استقلال نازل فرمائیے اور ہمارے قدم جمائے رکھئے اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے۔

ابھی قصہ چل رہا ہے:

اور جب (عمالقہ کے ملک میں پہنچے اور) جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آئے تو (دعا میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غیب سے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کے وقت) ہمیں ثابت قدم رکھئے اور ہمیں اس کافر قوم پر غالب کیجئے۔

فائدہ: اس دعا کی ترتیب بڑی پاکیزہ ہے کہ غلبہ کے لئے چونکہ ثابت قدمی کی ضرورت ہے اس لئے پہلے اس کی دعا کی اور ثابت قدم رہنے کا مدار دل کی مضبوطی پر ہے، اس لئے اس سے پہلے قلوب کے استقلال کی دعا کی۔

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ

عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

ترجمہ: پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی، اور داؤد نے جالوت کو قتل کرڈالا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت عطا فرمائی، اور بھی جو جو منظور ہوا ان کو تعلیم فرمایا۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتے رہا کرتے ہیں تو سرزمین فساد سے پُر ہوجاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں، جہاں والوں پر۔

واقعہ کا انجام:

پھر اللہ کے حکم سے طالوت والوں نے جالوت والوں کو شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طالوت کے لشکر میں تھے، اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جالوت کو قتل کرڈالا (اور کامیاب وفتحیاب واپس ہوئے) اور (اس کے بعد) ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (کہ یہاں نبوت سے عبارت ہے) عطا فرمائی۔ اور بھی جو کچھ منظور ہوا سکھایا (جیسے بغیر آلات وپرزوں کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا وغیرہ۔ آگے اس واقعہ کی مصلحت عامہ بیان فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو (جو کہ مفسد اور فسادی ہوں) بعض لوگوں کے ذریعہ (جو کہ اصلاح پسند ہوں۔ وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو زمین (تمام تر) فساد سے بھر جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والے ہیں (اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں)

فائدہ (۱): اور کبھی اس کا برعکس جو ہو جاتا ہے اس میں کچھ دوسری مصلحتیں ہوتی ہیں، لیکن اصلی مقصود اہل حق کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آخر میں انجام اسی پر قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث اور مشاہدہ دونوں شاہد ہیں۔

ملحوظہ: اس قصہ پر عیسائیوں نے کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے، ان کا جواب شبہات کی تقریر سمیت تفسیر حقانی میں مذکور ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ اور آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

ربط: چونکہ قرآن کے اعظم مقاصد میں نبوت محمدیہ کا اثبات بھی ہے۔ اس لئے اکثر جس جگہ کسی مضمون کے ساتھ مناسبت ہونے سے موقع ہوتا ہے، وہاں اس کو دہرایا جاتا ہے، چنانچہ اس مقام پر اس قصہ کی صحیح خبر اس طرح دینا کہ نہ آپ نے کہیں پڑھا، نہ کسی سے سنا، نہ آپ نے دیکھا، معجزہ ہونے کی وجہ سے نبوت کے دعوے کے سچا ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اس لئے اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں۔

نبوتِ محمدیہ پر استدلال:

یہ (آیتیں جن میں اس قصہ کا ذکر ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں، جو ہم تمہیں صحیح صحیح پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ) آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

> تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ع ۱ / ۲۲

ترجمہ: یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، بعضے ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوئے ہیں اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں سرفراز کیا۔ اور ہم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس سے فرمائی، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں باہم قتل وقتال نہ کرتے، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل پہنچ چکے تھے، ولیکن وہ لوگ باہم مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا اور کوئی کافر رہا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل وقتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔

ربط: گذشتہ آیت میں بالاجمال پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، اب اس آیت میں ان میں سے بعض حضرات کے احوال وکمالات کی تھوڑی تفصیل ذکر کرتے ہیں، اور اس تذکرہ کے ضمن میں ان کی امتوں کی ایک خاص حالت کا تذکرہ فرماتے ہیں، اور اس خاص حالت کے پائے جانے میں کیا حکمت ومصلحت ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بعض انبیاء اور ان کی امتوں کے احوال کی تفصیل:

یہ حضرات مرسلین (جن کا ذکر ابھی: ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) ان میں بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے (فرشتہ کے واسطہ کے بغیر) کلام کیا ہے (مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں) اور ان میں سے بعض کو بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے فرمائی (کہ ہر وقت یہود سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ اُن (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل وقتال نہ

کرتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس (امر حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضا دین حق پر متفق رہنا تھا) لیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں دینی اتفاق نہیں پیدا کیا، بلکہ) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا اور کوئی کافر رہا (پھر اس اختلاف میں قتل وقتال تک بھی نوبت پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل وقتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

تفسیر: احقر کے ذوق کے مطابق اس مضمون کا مقصد جناب رسول اللہ ﷺ کو ایک طرح کی تسلی دینا ہے یعنی جب آپ کی رسالت دلیل سے ثابت ہے، جس کو ﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ میں بیان فرمایا ہے۔ اور پھر بھی منکر لوگ نہیں مانتے، تو یہ آپ کے لئے رنج وافسوس کا موقع تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سنادی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجات اور مرتبوں کے حامل گذرے ہیں، لیکن ایمان عام کسی امت کو نصیب نہیں ہوا، کسی نے اتفاق کیا اور کسی نے اختلاف، اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں، گو ہر شخص پر ان کا انکشاف نہ ہو۔ مگر اجمالی طور پر اتنا عقیدہ ضرور ہے جس کا ثبوت بھی موجود ہے اور وہ قابل تسلیم بھی ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے، اور اس کی زیادہ تفصیل سورۃ کے شروع میں آیت ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اور آیت ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ ﴾ کے تحت تقدیر کے مسئلہ میں بیان ہو چکی ہے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام اگرچہ فرشتہ کے واسطہ کے بغیر ہوا مگر بغیر حجاب کے نہیں تھا۔ پس سورۃ شوریٰ میں جو آیت ہے: ﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ ﴾ اس سے کچھ تعارض نہیں۔ البتہ موت کے بعد بے حجاب ہونا شرعی طور پر ممکن ہے۔ پس وہ آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! خرچ کرلو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہے قبل اس کے کہ وہ دن آجاوے جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔ اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں۔

ربط: اوپر آیت ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا ﴾ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ "بر" نیکی کے ابواب میں سے دو باتوں کا بیان زیادہ اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ ان میں سے ایک اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے۔ چنانچہ اگلا رکوع اور اس کے بعد تیسرا رکوع اور پھر اس سے آگے کے سب: اسی مضمون سے شروع ہوئے ہیں۔ اور ہر جگہ جداگانہ مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں طرز کلام میں غور کرنے سے انفاق فی سبیل اللہ میں عجلت سے کام لینے اور مال اور وقت کی گنجائش کو غنیمت سمجھنے کی ترغیب دینا زیادہ مقصود معلوم ہوتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ میں عجلت سے کام لینا:

اے ایمان والو! ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز نیکی کے کاموں کا بدل نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ اس میں) نہ تو خرید وفروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر نیکی کے کاموں کو خرید لو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تمہیں اپنے اعمال خیر دیدے) اور نہ (اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے تمہیں نیک کاموں کی حاجت نہ رہے) اور کافر لوگ ہی ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کہ بدنی اور مالی طاعتوں کو ترک کرتے اور مالی وبدنی معصیت کو اختیار کرتے ہیں۔ تو تم ایسے مت بنو)

تفسیر: مطلب یہ ہے کہ جو عمل خیر دنیا میں فوت ہو جائے گا، پھر وہاں اس کا کچھ تدارک کرنا قدرت واختیار سے خارج ہو جائے گا۔ چنانچہ تدارک کے طریقوں میں سے بعض طریقے تو خود موجود ہی نہ ہوں گے۔ جیسے خرید وفروخت اور بعض عام نہیں ہوں گے جیسے دوستی اور بعض اپنے اختیار میں نہ ہوں گے۔ جیسے شفاعت کیونکہ اپنے اختیار میں ہونے کے لئے تو یہ سب امور ضروری ہیں: اول خود اس طریقہ کا وجود، پھر عموم یعنی بکثرت ہونا پھر اختیاری ہونا۔

اس طرح اس سے مطلق دوستی کی نفی لازم نہیں آتی۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۟ ﴾ (اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے اللہ سے ڈرنے والوں کے۔ سورۃ الزخرف ۶۷) سے دوستی کا وجود اور اگلی ہی آیت ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ (ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے، بغیر اس کی اجازت کے) سے شفاعت کا وجود خود سمجھ میں آرہا ہے جو نص سے ثابت ہے۔ لیکن اس دوستی اور شفاعت پر بھی کسی درجہ میں تو اعمالِ خیر کی ضرورت ہوگی کہ کم سے کم درجہ میں ایمان ہی کی ضرورت سہی۔

اور اس بیان سے مقصود قیامت کے دن نیکی کے کاموں کے ثمرات حاصل کرنے پر قادر نہ ہونے کو یاد دلانا ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مقصود انفاق کو ترک کرنے پر وعید سنانا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس انفاق سے زکوۃ مراد لی ہے۔ کہ فرض کا ترک کرنا وعید کا سبب ہوتا ہے۔ اور انھوں نے کافر کی تفسیر سخت ڈانٹ کی بنا پر زکوۃ کو ترک کرنے والے سے کی ہے۔ واللہ اعلم

> اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا

خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ: اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، زندہ ہے، سنبھالنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں۔ ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے، بدوں اس کی اجازت کے۔ وہ جانتا ہے ان کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لا سکتے، مگر جس قدر چاہے۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالیشان عظیم الشان ہیں۔

ربط: اوپر کی آیت میں جس طرح بغیر اجازت شفاعت کی نفی سے قیامت کے دن نیک کاموں پر قدرت نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی شان کی عظمت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ اس مناسبت سے اس آیت میں جس کا لقب آیت الکرسی ہے، ذات کی توحید اور صفات کے کمال کا ذکر فرماتے ہیں۔ تاکہ عظمت شان کی خوب وضاحت اور تاکید ہو جائے۔

توحید ذات وصفات:

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کو) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے) اسی کی ملکیت ہیں سب، جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں۔ ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت کے۔ وہ جانتا ہے ان (موجودات) کے تمام حاضر اور غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے علمی احاطہ میں نہیں لا سکتے۔ مگر جس قدر علم دینا چاہے۔ اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان اور زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

فائدہ: قیامت میں انبیاء اور اولیاء گنہگاروں کی شفاعت کریں گے۔ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرلیں گے جب شفاعت کریں گے، اور کرسی ایک جسم ہے، اور عرش سے چھوٹا اور آسمانوں سے بڑا۔ جیسا کہ روح المعانی میں ابن جریر اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ کی سند اور حضرت ابوذر کی روایت سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کرسی کی نسبت پوچھا تو آپ نے فرمایا: اے ابوذر! ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک حلقہ یا چھلا ایک بڑے میدان میں پڑا ہو۔ اور عرش اس کرسی سے اتنا بڑا ہے جیسے وہ میدان اس چھلے سے بڑا ہے۔ اور دار قطنی اور خطیب

کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے کرسی کے بارے میں بتا کر فرمایا کہ عرش کی حد کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور عالی شان کا حاصل صفاتِ نقص کی نفی ہے (یعنی اس کی صفات میں کوئی نقص نہیں ہے، اس کی صفات ہر قسم کے نقص سے پاک ہیں) اور عظیم الشان کا حاصل کمال صفات کا اثبات ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے، سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، جس کو کسی طرح شکستگی نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں اور خوب جاننے والے ہیں۔

ربط: اوپر آیت ﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ میں پیغمبر ﷺ کی رسالت کا اور آیت الکرسی میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی توحید کا ذکر ہوا، اور یہی دو امر دین اسلام کی اصل اور بنیاد ہیں، تو ان کے اثبات سے لازمی طور پر دین اسلام کی حقانیت بھی ثابت ہو گئی۔ اس آیت میں اسی معاملہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اسلام میں زبردستی نہ ہونے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

دین میں زبردستی نہیں:

(دین اسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کا فی نفسہ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کی خوبی قطعی دلائل سے اپنے آپ میں واضح ہے اور زبردستی اس امر میں ہوتی ہے جس کی خوبی واضح نہ ہو اور اسی وجہ سے زبردستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام میں اپنے آپ میں زبردستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام ایسی چیز ہے جس کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔ جو کسی طرح ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ تعالیٰ (ظاہری اقوال کو) خوب سننے والے ہیں اور (احوال باطنی کے) خوب جاننے والے ہیں) اسی طرح اگر کوئی صرف زبان سے اسلام لے آئے اور دل میں کفر رکھے رہے تو ہم سے چھپ نہیں سکتا۔ ہم آپ ہی اس کو سمجھ لیں گے۔ اس لئے جو اسلام قبول کرے، وہ سچے دل سے قبول کرے)

تفسیر: چونکہ اسلام کو مضبوط پکڑنے والا ہلاکت اور نقصان و خسارہ سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر

گرنے کا خطرہ نہیں، اور یوں کوئی رسّی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں باطل کا احتمال نہیں جو ہلاکت تک تو جاتا ہو۔ اور کوئی خود اسلام ہی کو چھوڑ دے تو اور بات ہے۔

اور آیت کا مقصود اسلام کی خوبی کا واضح اور دلیل سے ثابت ہونا بیان کرنا ہے۔ جس کو اس خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے زبردستی کی نفی میں فی نفسہ کی قید ظاہر کر دی ہے، تو اگر مرتد پر یا دار الحرب کے کافر پر دلیل کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے زبردستی کی جائے جیسا کہ شریعت میں حکم ہے تو یہ نفی فی نفسہ زبردستی کے خلاف نہیں، اور یہ زبردستی بھی دین کی صورت پر ہوگی نہ کہ دین کی حقیقت پر۔ کیونکہ دل کے بارے میں علم واطلاع کا کوئی یقینی طریقہ نہیں ہے۔ اور جہاد میں دین کی صورت پر بھی زبردستی کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ جزیہ کی مشروعیت صریح دلیل ہے کہ جہاد سے مقصود اسلام کا غالب رہنا ہے، خواہ مخالف کے اسلام سے ہو یا صرف رعیت بننے سے ہو۔ اور زبردستی کی اس نفی سے زبردستی کی ممانعت بھی لازم آ گئی۔ اس لئے بعض علماء نے اس کی تفسیر ممانعت سے کی ہے یعنی دین میں زبردستی مت کرو۔ خوب سمجھ لو۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے۔ ان کو تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور کی طرف لاتا ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں، وہ ان کو نور سے نکال کر یا بچا کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ربط: اوپر اسلام کے حق ہونے اور کفر کے باطل ہونے کا بیان تھا۔ اگرچہ ضمناً مؤمن کی خوبی بھی بیان کر دی تھی۔ اب اس آیت میں خود صاحب ایمان کی خوبی اور کافر کی مذمت مقصود کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔

مؤمن کی مدح اور کافر کی مذمت:

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو ایمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر (اسلام کے) نور کی طرف لاتا ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں (خواہ وہ شیطان انسان ہوں یا جنات) وہ ان کو (اسلام) کے نور سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر کو اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

فائدہ: بعض لوگ تو پہلے ہی سے مسلمان یا کافر ہوتے ہیں اور بعض ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے احقر نے دونوں جگہ دو لفظ لکھ دیئے ہیں: ”نکال کر یا بچا کر“

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرٰهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ۘ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرٰهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۝

ترجمہ: کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے بارے میں، اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی، جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے، کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے، اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے بیجا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

ربط: اوپر اہل ایمان کے نور اور اہل کفر کی ظلمات و تاریکیوں کا ذکر تھا، اب اس کی تائید میں نظیر کے طور پر تین قصے بیان فرماتے ہیں: جن میں حضرت ابراہیم اور خدا کے ایک اور بندہ کو ہدایت کا نور اور ایمان کی قوت عطا ہونے اور نمرود کے گمراہی اور کفر میں گرفتار رہنے کا ذکر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود میں مباحثہ (پہلا قصہ)

(اے مخاطب!) کیا تمہیں اس شخص (یعنی نمرود) کے قصہ کی تحقیق نہیں ہوئی، جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں بحث و مباحثہ کیا تھا (یعنی توبہ توبہ! وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سلطنت کی نعمت پر احسان ماننا اور ایمان لانا۔ اس کے برعکس اس نے انکار اور کفر شروع کر دیا، یہ مباحثہ اس وقت ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ اللہ کیسا ہے؟ جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی یہ اس کی خاص صفات ہیں، وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت کو تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں (کہ جس کو چاہوں قتل کر دوں، یہ تو مارنا ہے اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کر دوں، یہ جلانا ہے، جب) ابراہیم (علیہ السلام) نے (دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدّی عقل کا ہے کہ اس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈال دے نہ یہ کہ اس کو چھوڑ دے۔ اسی طرح مارنا یہ ہے کہ اس کی جان اپنے اختیار سے نکالے نہ یہ کہ مثلاً اس کی گردن کاٹ دے۔ اور جان اس کے اختیار کے بغیر نکل جائے۔ ورنہ یہ اختیار بھی ہونا چاہئے تھا کہ گردن الگ کر دے اور جان نہ نکلنے دے، اور قرائن سے معلوم ہوا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت کو تو سمجھے گا نہیں، اس لئے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھا) دے اس پر وہ کافر متحیر رہ گیا (اور اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ اب اس

کا تقاضہ یہ تھا کہ ہدایت کے طریقہ کو قبول کر لیتا مگر وہ اپنی اس بیجا راہ پر جما رہا۔ اس لئے ہدایت تو نہیں ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بیجا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے (بلکہ عادت یہ ہے کہ پہلے کوئی شخص حق کو قبول کرنے کا ارادہ کرے پھر وہ ہدایت کو پیدا کر دیتے ہیں اور جو اختیاری افعال کا ارادہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا نہیں فرماتے)

فائدہ(۱): اگر کہا جائے کہ ارادہ بھی تو ان ہی کے پیدا کرنے پر موقوف ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تقدیر کا راز ہے اس کی تحقیق سورۃ کے شروع میں آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ میں دیکھ لی جائے۔

فائدہ(۲): بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ نمرود کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر میرے علاوہ کوئی اور خدا موجود ہے تو سورج کو وہی مغرب سے نکال دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے دل میں یہ بات تو بہر حال موجود تھی کہ اصل قدرت والا خدا تو کوئی اور ہی ہے اور سورج کو مشرق سے نکالنا اسی کا کام ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اور اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور ایسا ہونے سے دنیا میں انقلاب عظیم آجائے گا، اس لئے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ لوگ اس خلافِ معمول امر کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو جائیں اور ان کی اتباع اختیار کر لیں۔ ذرا سی بات کہہ دینے سے ساری سلطنت بھی جاتی رہے، یہ بات تو اس لئے نہیں کہی۔ اور دوسرا کوئی جواب تھا ہی نہیں، اس لئے منہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خوب سمجھ لو۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ: یا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے جیسے ایک شخص تھا کہ ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے زندہ کریں گے، سو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سو برس تک مردہ رکھا، پھر اس کو زندہ کر اٹھایا، پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا، اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا یا ایک دن سے بھی کم، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا ہے، تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ نہیں سڑی گلی، اور اپنے گدھے کی طرف نظر کر، اور تاکہ ہم تجھ کو ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں، اور ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھائے دیتے ہیں، پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو واضح ہوگئی تو کہہ اٹھا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری

قدرت رکھتے ہیں۔

مردہ کو زندہ کرنے کی نظیر (دوسرا واقعہ)

یا تمہیں اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے کہ ایک شخص تھا کہ اس کا گذر (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے (یعنی پہلے چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر گئیں۔ مطلب یہ کہ کسی حادثہ کی وجہ سے وہ بستی بالکل ویران ہوگئی تھی اور سب آدمی مر مرا گئے تھے۔ وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرجانے کے بعد پھر کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کردیں گے، مگر اس وقت کے زندہ کرنے کا جو خیال غالب ہوا تو معاملہ عجیب ہونے کی وجہ سے دل پر ایک حیرت سی طاری ہوگئی۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح سے کر سکتے ہیں اس لئے طبیعت میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا زندہ کرنا کس صورت میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشہ دنیا ہی میں دکھادیں تا کہ ایک نظیر کے واقع ہوجانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس) کو سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ کر اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تم اس حالت میں کتنی مدت رہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا یا ایک دن سے بھی کم (یہ تھوڑی مدت سے کنایہ ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ اس حالت میں سو برس رہے ہو (اور اگر اپنے بدن کے اندر کوئی تبدیلی نظر نہ آنے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھ کہ (ذرا) سڑی گلی نہیں ہیں (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے لئے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف دیکھو (کہ گل سڑ کر کیا حالت ہوگئی ہے اور عنقریب اس کو تمہارے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تمہیں اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کی) ایک نظیر بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے دن زندہ ہونے پر استدلال کرسکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح ترتیب دیئے دیتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھائے دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈالے دیتے ہیں۔ غرض یہ سب کام یوں ہی کردیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہوگئی تو (بے اختیار جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

تفسیر: روح المعانی میں حاکم کی روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور اسحاق بن بشیر کی روایت سے حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ شخص حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ اسی لئے احقر نے ترجمہ کے دوران تصریح کردی کہ ان کو بعثت کا یقین تھا اور پھر اس حیرت کی وجہ بھی ظاہر کردی کہ مختلف ممکن کیفیات میں سے کسی

خاص کیفیت کی تعیین تھی اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ آخر میں جو کہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین رکھتا ہوں یہ ایک طبعی اضطراری حالت ہے کہ نئی بات کو دیکھ کر قدرت کے اقرار کو تازہ کیا جاتا ہے جبکہ قدرت کا عقیدہ پہلے سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے سبحان اللہ، یا لا إلہ إلا اللہ یا اللہ اکبر وغیرہ کا استعمال ہمارے محاروں میں بھی عادت ہے، حالانکہ ان مضامین کا پہلے سے بھی عقیدہ ہوتا ہے۔

اور ان کی اس حیرت کا جواب اس مجموعی کیفیت سے دینے کی وجہ احقر کے ذوق میں یہ ہے کہ حیرت کی وجہ یعنی قیامت کے دن زندہ کرنا چند اجزاء پر مشتمل ہے۔ اول خود زندہ کرنا دوسرے طویل مدت کے بعد زندہ کرنا، تیسرے خاص کیفیت سے زندہ کرنا، چوتھے اس مدت تک روح کا باقی رکھنا، پانچویں بعث کے بعد برزخ میں رہنے کی مدت معلوم نہ ہونا۔ پہلے جز پر خود ان کے زندہ کرنے اور ان کے گدھے میں جان ڈالنے سے دلالت کی گئی اور دوسرے جز کے ثبوت کے لئے ان کو سو برس تک مردہ رکھا، تیسرا جز خود گدھے کو ان کے سامنے زندہ کر کے دکھا دیا۔ چوتھے جز کا نمونہ کھانے پینے کی چیزوں کا باقی رکھنا اور خود ان کے بدن کا باقی رکھنا دکھا دیا، جو بہتر طور پر روح کی بقا کے امکان پر دلالت کرنے والے ہیں، کیونکہ بدن اور کھانے پینے کی چیزیں عناصر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے روح کی بہ نسبت تغیر و فساد کے زیادہ قابل ہیں اور پانچویں امر کی نظیر ان کا جواب میں ﴿ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ (ایک دن یا ایک دن سے بھی کم) کہنا ہے جیسا کہ بالکل یہی جواب اہل محشر دیں گے۔

رہی یہ بات کہ جب دوسروں نے نہیں دیکھا تو لوگوں کے لئے قدرت کا نمونہ کس طرح ہوگا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خارجی قطعی قرینوں سے ان کے بیان کا سچا ہونا لوگوں کو ضروری علم کے طور پر معلوم ہو جائے گا جیسا کہ خود ان کو ایسے ہی قرینوں سے اپنا طویل مدت تک مردہ رہنا معلوم ہو گیا۔ واللہ اعلم

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؀ ع

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھلا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے، ارشاد فرمایا کہ کیا تم یقین نہیں لائے، انھوں نے عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جاوے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تم چار پرندے لو، پھر ان کو اپنے لئے ہلالو پھر ہر پہاڑ پر ان میں کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان سب کو بلاؤ تمہارے پاس سب دوڑے دوڑے چلے آویں گے۔ اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کرایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے (تیسرا قصہ)

اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جب کہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو (یہ) دکھا دیجئے کہ آپ مردوں کو (مثلاً قیامت میں) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے مگر عقلاً اس کی مختلف کیفیتیں ممکن ہیں۔ان میں سے معلوم نہیں کونسی کیفیت ہوگی چونکہ اس درخواست کا قصہ سن کر احتمال تھا کہ کسی کم سمجھ کو (نعوذ باللہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر عقیدہ نہ ہونے کا گمان ہو جاتا، اس لئے حق تعالیٰ نے ان سے اس کا سوال کر کے اور ان کا جواب نقل فرما کر اس کو صاف کر دیا۔ چنانچہ (ان سے) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لائے؟ انھوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تا کہ میرے دل کو (کیفیت کی تعیین کے بارہ میں مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جائے (اور بہت سے احتمالات میں ذہن کو حرکت نہ ہو) ارشاد ہوا کہ اچھا تم چار پرندے لو، پھر ان کو (پال پوس کر) خود سے مانوس کرلو (تا کہ ان کی خوب شناخت ہو جائے) پھر (سب کو ذبح کر کے اور ان کی ہڈیوں وپَر وغیرہ سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر کے اور کئی پہاڑ اپنے اختیار سے تجویز کر کے) ہر پہاڑ پر ان میں کا ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو تمہارے پاس سب (زندہ ہو کر) دوڑے دوڑے چلے آئیں گے۔ اور اس بات کا خوب یقین رکھو کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں مگر پھر جو بعض باتیں نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ) حکمت والے (بھی) ہیں۔

تفسیر: روح المعانی میں ابن المنذر کی سند سے حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح حصے ٹکڑے کر کے ان کو پکارا، فوراً ہی ہڈی سے ہڈی، پر سے پر اور خون سے خون سب مل ملا کر اپنی ہیئت پر ہو کر ان کے پاس زندہ ہو کر آ گئے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! اس طرح قیامت کے دن ہم سارے جسموں اور سارے اجزا کو جمع کر کے ایک دم سے جان ڈال دیں گے۔ اس واقعہ کو دکھلا کر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن زندہ کرنے کی کیفیت بتادی کہ اسی طرح پہلے جسمانی اجزا مختلف مقامات سے جمع ہو کر جسم تیار ہوں گے، پھر ان میں روح پڑ جائے گی۔

اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ اگر حجاب اٹھ جائے تب بھی میرے یقین میں کوئی زیادتی نہ ہو، یعنی جتنی زیادتی ممکن ہے وہ حجاب کے اٹھے بغیر حاصل ہے، اور اس قصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یقین بڑھنا معلوم ہوتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کو پہلے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں تھا، تو اس سے حضرت علی کی افضلیت کا وسوسہ ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس قول کا ثبوت ہو تو بھی، اولاً تو یہی تسلیم نہیں کہ حضرت ابراہیم کو یقین میں زیادتی ہوگئی

تھی۔ بلکہ صرف کیفیت کے مشاہدہ سے ایک کیفیت متعین ہوگئی جس کو یقین کی زیادتی میں کوئی دخل نہیں۔

اور اگر اس زیادتی کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو جواب یہ ہے کہ نبوت کے یقین کے کمال کا رتبہ جدا ہے اور ولایت کا جدا ہے اور ولایت کا مرتبہ کمالِ یقین: نبوت کے مرتبۂ کمال یقین (سے کم تر) بلکہ اصلِ یقین سے بھی کم تر اور ضعیف ہوتا ہے پس اگر حضرت علی کو ولایت کے مقام کے مناسب یقین کے مرتبہ کا کمال حاصل ہو، جس سے ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ نفس یقین بھی بڑھا ہوا ہے تو اس سے حضرت علی کی افضلیت لازم نہیں آتی۔ خوب سمجھ لو۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

ترجمہ: جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں، ہر بال کے اندر سو دانے ہوں۔ اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں، جاننے والے ہیں۔

ربط: اب پھر انفاق فی سبیل اللہ کے مضمون کی طرف لوٹ رہے ہیں، جس کے ذکر کی تکرار کی وجہ آیت ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا ﴾ کی تقریر میں بیان ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس مقام سے پھر دوسرے اغراض کے لئے اس کا ذکر چلا ہے جو عنوانوں کو ترجمہ پر منطبق کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت:

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امورِ خیر اور نیکی کے کاموں میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (اللہ کے نزدیک) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیاں اگیں (اور) ہر بال میں سو دانے ہوں (اسی طرح حق تعالیٰ ان کا ثواب سات سو گنا تک بڑھاتا ہے اور یہ افزونی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں (اس کے اخلاص اور مشقت کے لحاظ سے) عطا فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ سب کو یہ افزونی دے سکتے ہیں، مگر ساتھ ہی) جاننے والے (بھی) ہیں، اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں)

تفسیر: نیک کام میں خرچ کرنے کی نیت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں: ایک نمائش کی نیت کے ساتھ، اس کا کچھ ثواب نہیں، جیسا کہ عنقریب آتا ہے۔ دوسرے ادنیٰ درجہ کے اخلاص کے ساتھ، اس کا ثواب دس گنا ملتا ہے، ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ (جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اسے دس گنا ملے گا) اس میں اس ادنیٰ درجہ کا بیان ہے۔ تیسرے زیادہ اخلاص یعنی اس کے اوسط یا اعلیٰ درجہ کے ساتھ، اس کے لئے اس آیت میں وعدہ ہے یعنی دس سے زیادہ

سات سو تک مرتبوں کے فرق کے مطابق۔

اور اوپر ایک آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ میں بیان ہو چکا ہے کہ اس سات سو کے وعدہ کے بعد اور زیادہ کا بھی وعدہ ہو گیا ہے۔ اس طرح مشقت کی کمی وزیادتی سے فرق وتفاوت ہو جاتا ہے، مثلاً ہزار روپے والے کو ایک سو روپیہ دینے میں کم مشقت ہے جب کہ دو سو روپے والے کو ایک سو روپے دینے میں اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشقت ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ: جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ آزار پہنچاتے ہیں، ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا، ان کے پروردگار کے پاس، اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے۔

ربط: اب خیر کے کاموں میں خرچ کے مقبول ہونے کے لئے بعض دوسری شرائط بیان فرماتے ہیں۔

بھلائی کے کاموں میں خرچ کی قبولیت کے لئے بعض شرائط:

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے، اس کو زبان سے) احسان جتاتے ہیں اور نہ (اس کو برتاؤ سے) آزار پہونچاتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے پروردگار کے پاس (جاکر) ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا۔ اور (قیامت کے دن) نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ورنجیدہ ہوں گے۔

فائدہ: برتاؤ سے آزار پہونچانے کی مثال یہ ہے کہ اپنے احسان کی بنا پر اس کے ساتھ تحقیر سے پیش آئے۔ ظاہر ہے اس سے دوسرے کو اذیت ہوتی ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: مناسب بات کہہ دینا اور درگذر کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد آزار پہنچایا جاوے۔ اور اللہ تعالیٰ غنی ہیں حلیم ہیں۔

ربط: اب احسان جتانے اور ایذا رسانی کی مذمت فرماتے ہیں۔ (ناداری کے وقت میں معقول و) مناسب بات کہہ دینا اور (اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلائے یا اصرار کر کے تنگ کرے تو اس سے) درگذر کرنا ایسی خیرات (دینے) سے (ہزار درجہ) بہتر ہے جس کے بعد آزار پہونچایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی انہیں حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے لئے خرچ کرتا ہے۔ پھر آزار کس بنا پر پہنچایا جائے۔ اور آزار پہونچانے پر جو فوراً سزا نہیں

دیدیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں۔

فائدہ: تفسیر کے ضمن میں ناداری کی قید اس لئے لگائی کہ استطاعت کے وقت حاجت مند کی اعانت نہ کرنا خود برا ہے۔ پھر اس کو بہتر کیوں کہا جاتا ہے۔ البتہ ناداری کے وقت نرمی سے جواب دیدینا اور سائل کی سختی کو نظر انداز کر دینا چونکہ ثواب کا سبب ہے اس لئے اس کو خیر فرمایا۔ اور آزار پہنچانا حرام اور عذاب کا موجب ہے، گو بظاہر اس میں اس وجہ سے کہ اس میں دینا تو پایا گیا، جس سے ایک طرح کی خیریت معلوم ہوتی تھی، لیکن اس خیریت کی نفی فرمائی گئی اور اس آیت میں آزار پہونچانے سے مراد عام ہے، اس میں احسان جتانا بھی آ گیا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَٰفِرِينَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر۔ سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑ جاوے، سو اس کو بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ بتلائیں گے۔

ربط: اب احسان جتانے اور ایذا رسانی کا اور ان کے ساتھ ریا کا انفاق کے ثواب کے باطل ہونے کا موجب ہونا مع ایک مثال سے بیان فرماتے ہیں۔ جس کا مقصد ان امور سے منع فرمانا ہے۔

احسان جتانے، ایذا رسانی اور ریا سے ثواب کا باطل ہونا:

اے ایمان والو! تم احسان جتا کر یا ایذا پہونچا کر اپنی خیرات (کے ثواب کے بڑھنے) کو برباد مت کرو، جس طرح وہ شخص خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد (کر دیتا ہے) جو اپنا مال (محض) لوگوں کو دکھانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت کے دن پر (اس سے ایمان کی نفی کے قرینہ سے منافق مراد ہے) تو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر، جس پر کچھ مٹی (آ گئی) ہو، (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے تو اس کو (جیسا تھا ایسا ہی) بالکل صاف کر دے (اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک ایسا نیک عمل معلوم ہوتا ہے جس میں ثواب کی امید ہو۔ لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ایسا ہی ثواب سے خالی کورا چھوڑ دیا۔ چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ اصل کمائی نیک عمل کا نام ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے، اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ وہ

ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہیں بتائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہوکر اس کے صلہ میں جنت میں پہونچائے جاتے)

تفسیر: جاننا چاہئے کہ جس طرح طاعات کے صحیح ہونے اور ان کی بقا کے لئے ایمان شرط ہے کہ کافر کی کوئی طاعت صحیح ومقبول نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی شخص طاعت کے بعد کافر ہوجائے تو کفر سے پہلے کی ہوئی طاعت بھی باقی نہیں رہتی، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''حبط'' کہتے ہیں، اس طرح نصوص سے ثابت ہے کہ بعض طاعات کے صحیح ہونے اور بقا کے لئے ایمان کے علاوہ اور بھی کچھ شرطیں ہیں: جیسے نماز کے لئے وضو کہ اس کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے اور شفعہ یعنی دو رکعت والی نماز میں پہلی رکعت کے لئے دوسری رکعت بقا کی شرط ہے۔ اس طرح یہاں بھی اس آیت میں اور سابقہ آیت میں ﴿ لَا يُتْبِعُوْنَ ﴾ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کے لئے ایمان کے ساتھ صحیح ہونے اور بقا کے لئے بھی شرط ہے، صحیح ہونے کی ایک شرط اخلاص بھی ہے، جبکہ من واذی (احسان جتانے اور اذیت رسانی) کا ترک بقا کے لئے شرط ہے۔ اس لئے منافق اور ریاکار کے انفاق کو باطل کہا گیا ہے کہ اس میں صحیح ہونے کی شرط مفقود ہے۔ اور من واذی کو بھی باطل کرنے والا قرار دیا گیا ہے کہ اس میں بقا کی شرط مفقود ہے، اور چونکہ اول کا باطل ہونا ثانی کے مقابلہ میں زیادہ ظاہر ہے، اس لئے ثانی کو اول کے ساتھ تشبیہ دی گئی، اور مشبہ بہ (جس سے تشبیہ دی گئی ہے) میں جو دو قیدیں لگائی گئیں ایک نفاق کی اور دوسری ریا کی یہ محض شبہ کی تقویت کے لئے ہے، ورنہ دونوں امر فرداً فرداً بھی بطلان کا سبب ہیں، اور تقویت سے یہ فائدہ ہوا کہ من واذی سے نفرت دلانے میں مبالغہ ہوجائے۔

اس تحقیق کے بعد آیت سے معتزلہ کا یہ شبہ کرنا کہ سیئات بھی کفر کی طرح طاعات کے حبط کی موجب ہوتی ہیں، محض غلط قرار پایا، کیونکہ کسی خاص سیئہ (برائی) کا کسی خاص حسنہ (نیکی) کے اعتبار سے بقا کی شرط کی نفی کرنے والا ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ ہر سیئہ ہر حسنہ کے لئے موجب حبط ہوجائے، کیونکہ یہ باطل ہونا سیئہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ بقا کی شرط کی نفی کی وجہ سے ہے۔ خوب سمجھ لو۔ اور طاعات میں صحیح ہونے اور بقا کی مانند ان کے انوار و برکات کی بھی کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ آیت ایود کے ذیل میں اس کا بیان بھی آئے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ: اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی

غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں مثل حالت ایک باغ کے ہے، جو کسی ٹیکرے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ دونا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

ربط: باطل اور غیر مقبول صدقات کی مثال بیان فرما کر اب مقبول صدقات کی مثال بیان فرماتے ہیں:

مقبول صدقات کی مثال:

اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے خرچ کرتے ہیں (جو کہ خاص اس عمل سے حاصل ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس مشقت بھرے عمل کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تا کہ دوسرے اعمالِ صالحہ سہولت سے صادر ہوا کریں، تو ان لوگوں کے نفقات وصدقات کی حالت) ایک باغ کی طرح ہے جو کسی بلند سطح پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بارآور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ (باغ ہوا کی لطافت اور بارش کے سبب دوسرے باغوں سے یا دوسری دفعوں سے) دوگناہ (چوگناہ) پھل لایا اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی تھوڑی سی بارش بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ اس کی زمین اور موقع اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں تو ثواب بڑھا دیتے ہیں)

تفسیر: اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا مطلب ہر عمل میں ظاہر ہے۔ اور آیت میں آنے والے لفظ ﴿تَثْبِيتًا﴾ کی توضیح یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے، اور اہلِ سلوک کے برتاؤ میں ہے کہ جس کام میں نفس کو قدرے مشقت ہو، اس کو بار بار کرنے سے نفس کے اندر عادت کے سبب ایک راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے پھر دوسرے اعمال میں بھی پس وپیش نہیں کرتا۔ اور اس کی مزاحمت کی صفت مغلوب ہو جاتی ہے تو اس آیت میں اس امر کی ترغیب ہے کہ ہر عمل میں یہ نیت کر لینا بھی اچھا ہے کہ دوسرے اعمال کے لئے نفس میں آمادگی ہو اور مجاہدہ کا اور خود انفاق کے اس عمل کا بھی یہی حاصل ہے کہ اس سے جب ملکہ پیدا ہوگا تو اس عمل کو جو کہ مرضیاتِ الٰہیہ کا موجب ہے، بار بار کرے گا۔ جس سے ہمیشہ مرضیاتِ الٰہیہ حاصل ہوں گی۔ اس طرح نیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور ایسی عادت ہو جائے کہ آئندہ بھی ہمیشہ رضائے الٰہی حاصل کریں، تو اس تقریر پر دونوں غایت کا حاصل زمانہ حال میں بھی اور مستقبل میں بھی رضائے الٰہی قرار پائی۔ خوب سمجھ لو۔

اور اس تشبیہ میں جو دو طرح کی بارش فرض کی گئی ہے اس سے مقصود اخلاص کے مراتب کے فرق کا بیان کرنا ہے کہ چونکہ یہ انفاق ایمان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور اس میں من واذی وریا مفقود ہیں اور اخلاص موجود ہے تو لازمی طور پر مقبول ہو کر اجر وثواب میں اضافہ کا موجب ہو جاتا ہے، خواہ اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہو یا اوسط درجہ کا یا ادنیٰ درجہ کا۔ اضافہ کے لئے نفس

قبول ہر حال میں کافی ہے۔ اگرچہ اخلاص کے مراتب میں فرق سے قبولیت کے مرتبوں اور اضافہ میں بھی فرق ہو جائے گا۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ لَہٗ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَہُ الۡکِبَرُ وَ لَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَہَاۤ اِعۡصَارٌ فِیۡہِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾

ترجمہ: بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا، اس کے نیچے نہریں چلتی ہوں، اس شخص کے یہاں اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں، جن میں قوت نہیں، سو اس باغ پر ایک بگولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جاوے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

ربط: اس مقام پر تین قسم کے صدقات کا بیان ہے۔ اول: جس میں صحیح ہونے اور بقا کے شرائط پائے جائیں۔ یہ اس رکوع کے شروع کی دو آیتوں میں اور آیت ﴿ وَمَثَلُ الَّذِیۡنَ ﴾ الخ میں دو مثالوں کے ضمن میں مذکور ہیں ﴿ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ ﴾ الخ اور ﴿ کَمَثَلِ جَنَّۃٍۢ بِرَبۡوَۃٍ ﴾ الخ

دوسرے جس میں صحیح ہونے ہی کی شرط نہ پائی جائے یعنی ایمان و اخلاص انفراداً یا اجتماعاً نہ پایا جائے۔ اس کو ﴿ کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَہٗ ﴾ الخ میں اس مثال کے ساتھ بیان فرمایا ﴿ کَمَثَلِ صَفۡوَانٍ ﴾ الخ

تیسری قسم جس میں صحیح ہونے کی شرط تو پائی گئی، مگر بقا کی شرط نہیں پائی گئی۔ یعنی من واذی کا ترک کرنا نہیں پایا گیا۔ اس کو اس آیت میں ایک مثال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں اور پہلی قسم کی دو مثالیں لانے میں شاید اس کے مقبول ہونے کی وجہ سے شان کا زیادہ اہتمام مقصود ہے۔ واللہ اعلم

فاسد طاعتوں اور نفقات کی مثال:

بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو، کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی اس باغ میں زیادہ درخت ان میووں کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں۔ جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو (جو کہ زیادہ محتاجی کا زمانہ ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اس کو اہل و عیال سے بھی خبر گیری کی توقع نہیں ہوگی۔ اور ذریعۂ معاش صرف وہی باغ ہو) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ میں ایک آندھی آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو، پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کہ کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آ سکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا

کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کارآمد ہونے کی امید ہو جو کہ انتہائی محتاجی کا وقت ہوگا او۔قبولیت کا زیادہ مدار انہی طاعات پر ہوگا، پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے من واذی یا دوسرے معاصی سے ہماری طاعتیں باطل یا بے برکت ہوگئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوگیا۔ تو جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو طاعتوں کے باطل ہونے کو کیسے گوارا کرتے ہو؟) اللہ تعالیٰ اس طرح تمہارے (سمجھانے کے) لئے نظائر بیان فرماتے ہیں، تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے مطابق عمل کیا کرو)

تفسیر: مثال کی توجیہ کی تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے، البتہ اتنی بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ روح المعانی میں بروایت بخاری اور حاکم اور ابن جریر و عبد بن حمید حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں منقول ہے جسے حضرت عمرؓ نے بھی پسند فرمایا ہے کہ یہ آیت اپنے مضمون میں ان تمام طاعات کے لئے عام ہے جن کے بعد آدمی معاصی میں منہمک ہو کر ان طاعات کو خراب کردے، اس عموم میں نفقات بھی آگئے۔

اور اس خراب کرنے کی تحقیق یہ ہے کہ جیسا آیت ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم﴾ کے تحت اجمالاً بیان ہوا ہے کہ اعمال میں کچھ شرطیں ان کے انوار و برکات کی بھی ہوا کرتی ہیں تو وہ شرط، مطلقاً سیئات میں مشغول ہونے سے پرہیز کرنا ہے اور جب طاعات کے بعد معاش میں مشغول و مستغرق ہو جاتا ہے تو ان طاعات کے انوار و برکات سلب ہو جاتے ہیں جس کا اثر اس عالم میں تو یہ ہوتا ہے کہ طاعت کی جو مٹھاس دل میں پیدا ہوئی تھی وہ زائل ہو جاتی ہے، اور ایک طاعت سے دوسری طاعت کا سلسلہ چلا کرتا ہے اور ویسا ہی سامان جمع ہونے لگتا ہے جس کو توفیق کہتے ہیں، یہ توفیق بند ہو جاتی ہے، بلکہ معمول کی طاعات میں بھی کمی، ناغہ اور سستی ہونے لگتی ہے، اور ان فوت ہونے والے امور پر آخرت میں جو ثمرات ملتے، ان سے محروم رہے گا۔ یہ اثر اس عالم میں ہوگا اور اس نور و برکت کے سلب ہونے کو بھی کہیں کہیں آیات و احادیث میں حبط وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، تو یہ حبط مشہور اصطلاحی حبط نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو۔

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کردو، حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں، تعریف کے لائق ہیں۔

ربط: انفاق (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) میں جن امور کی رعایت ضروری ہے ان میں سے بعض کا تو ذکر ہو چکا، جیسے

من واذی اور ریا کا ترک کرنا وغیرہ۔ اور ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ ردی اور گھٹیا یا خراب نہ ہو۔ اس کو اب بیان فرماتے ہیں:

عمدہ مال کی رعایت:

اے ایمان والو! (نیک کام میں) اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے (استعمال کے) لئے زمین سے پیدا کیا ہے عمدہ چیز کو خرچ کیا کرو، اور ردی (گھٹیا، ناکارہ وخراب) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو۔ حالانکہ (اگر کوئی تمہیں تمہارے واجب حق کے عوض یا سوغات یعنی ہدیہ وتحفہ میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کو لینے والے نہیں، ہاں! مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات وصفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں چیز بھی کامل اور تعریف کے لائق ہی پیش کرنی چاہئے۔

تفسیر: شانِ نزول سے طیب کے معنی عمدہ کے لئے گئے، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض علماء نے لفظ کے عموم کی وجہ سے طیب کی تفسیر حلال سے کی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی چیز پوری طرح عمدہ اسی صورت میں ہے جب وہ حلال بھی ہو۔ اس بنا پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی۔ اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جائے گا۔ اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو، اور پھر بھی وہ بری ونکمی چیز خرچ کرے، جیسا کہ آیت کے الفاظ ﴿مَا كَسَبْتُمْ﴾ اور ﴿أَخْرَجْنَا﴾ اس کے موجود ہونے پر اور ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ﴾ عمداً نکمی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہے ہیں، اس کے برعکس جس کے پاس اچھی چیز موجود ہی نہ ہو، وہ اس ممانعت سے بری ہے اور اس کی وہ بری بھی مقبول ہے۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ مسئلے اخذ کئے ہیں:

مسئلہ (۱): تجارت کے مال میں زکوٰۃ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿مَا كَسَبْتُمْ﴾ کی وجہ سے۔

مسئلہ (۲): عشری زمین کی پیداوار میں عشر (دسواں حصہ یا بیسواں حصہ) واجب ہے، اس لئے کہ ارشاد ہے: ﴿أَخْرَجْنَا﴾۔ اور عشر کسان پر یعنی اس کو جوتنے وبونے والے پر ہے۔ زمین کے مالک پر نہیں۔ اس لئے کہ ارشاد ہے: ﴿لَكُمْ﴾ برخلاف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کہ وہ ﴿لَكُمْ﴾ کا مخاطب مجموع یعنی سب کو کہتے ہیں۔ عشر کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اس کی بنا پر اس آیت کا اطلاق انفاق واجب پر ہوگا۔

> اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ: شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف

سے گناہ معاف کردینے کا اور زیادہ دینے کا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں، خوب جاننے والے ہیں۔ دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

ربط: اب تنبیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو تمہیں انفاق کی اور عمدگی کی رعایت کی ترغیب دی ہے۔ اس میں شیطان اغوا کیا کرتا ہے۔ تم اس کے اغوا پر عمل مت کرنا۔

شیطان کی مزاحمت پر تنبیہ:

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے (کہ اگر خرچ کروگے یا اچھا مال خرچ کروگے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تمہیں بری بات (یعنی بخل و کنجوسی) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے (خرچ کرنے اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کردینے اور زیادہ دینے کا وعدہ کرتا ہے (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ خرچ کا عوض کسی کو دنیا میں بھی اور کسی کو آخرت میں زیادہ کرکے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب دینے والے ہیں (نیت کے مطابق ثمرات دیتے ہیں۔ اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی شخص سمجھتا ہے جس کو دین کی سمجھ ہو اور اللہ تعالیٰ) دین کی سمجھ جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں (اور سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کی سمجھ مل جائے، اسے بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نفع دینے والی نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)

تفسیر: یہاں ڈرانے سے مراد دور دراز کی اور وسوسوں کی باتیں ہیں۔ جو نیک کام میں خرچ کرنے کے وقت مال کی گنجائش کے باوجود کبھی کبھی دماغ میں آیا کرتے ہیں اور اس تخصیص کی دلیل ﴿ يَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ﴾ ہے۔ کیونکہ بخل تو وسعت ہی کے وقت مانا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے وہم میں ڈالنا شیطان کا فعل ہے اور بخیل لوگ ان وہموں میں غلطاں و پیچاں یعنی پریشان رہتے ہیں۔ آیت میں اس پر عمل کرنے کی ممانعت ہے۔ کیونکہ جب گنجائش ہے تو مناسب مقدار کے خرچ کرنے سے محتاج ہونے کا احتمال ہی غلط ہے۔ اس طرح آیت کا حاصل یہ ہوا کہ ایسے انفاق میں نقصان تو بالکل نہیں اور نفع ہر طرح کا ہے کہ مغفرت بھی ملے اور فضل بھی۔ تو سمجھداری کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی حالت میں شیطانی وسوسہ کو ہرگز قبول نہ کرے اور اگر ظاہراً اور یقیناً محتاجی کے اسباب و قرینے موجود ہوں تو خود شریعت ایسے شخص کو نفلی صدقات جیسے کاموں سے روکتی ہے۔ اور ایسے شخص کے خرچ نہ کرنے کو بخل بھی نہیں کہہ سکتے۔ خوب سمجھ لو۔ اور دین کی سمجھ سب سے زیادہ نفع دینے والی اس لئے ہے کہ اس سے عقائد درست ہوتے ہیں۔ اعمال کی توفیق ہوتی ہے اور عقائد و اعمال پر آخرت

میں نجات اور ثواب ہے، اور دنیا کی کوئی نعمت ثواب اور نجات کی برابری نہیں کر سکتی۔

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝۲۷۰

ترجمہ: اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو، سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔ اور بیجا کام کرنے والوں کا کوئی ہمراہی نہ ہوگا۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں انفاق سے متعلق جن شرائط کی رعایت کا حکم فرمایا ہے۔ اب اس رعایت کی تاکید ایک دوسرے پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ ہمیں سب خبر رہتی ہے۔ اس لئے ہر کام ٹھیک طریقہ سے کیا کرو۔

انفاق کی شرطوں کی رعایت کی تاکید:

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو یقیناً سب کی خبر ہے اور بیجا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا۔

تفسیر: کسی قسم کے خرچ میں سب خرچ آ گئے، وہ بھی جن میں مذکورہ تمام شرطوں کی رعایت ہوا اور وہ بھی جن میں سب کی یا بعض کی رعایت نہ ہو۔ مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا انفاق میں ریاکاری ہو یا اس کے بعد من واذی ہو یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے عموم میں سب نذریں آ گئیں، مثلاً مالی عبادت کی نذر ہوا اور اس مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں یا بدنی عبادت کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو۔ پھر یہ کہ اسے پورا کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ اور یہ کہنے سے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہے، مقصود یہ ہے کہ ہم اس کی جزا دیں گے۔ یہ اس لئے سنایا تا کہ رعایت کی ترغیب ہوا اور رعایت نہ ہونے پر ڈرایا جائے۔ اور بیجا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، بلکہ احکام کی مخالفت کرتے ہیں، ان کو صراحت کے ساتھ وعید سنادی۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝۲۷۱

ترجمہ: اور اگر تم ظاہر کر کے دو صدقوں کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کا اخفاء کرو اور فقیروں کو دے دو تو یہ اخفا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں۔

ربط: اب انفاق کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ اس کا اظہار افضل ہے یا اخفاء پوشیدہ رکھنا؟

ظاہر کر کے خرچ کرنا افضل ہے یا پوشیدہ طور پر؟

اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر انہیں چھپاؤ اور فقیروں کو دیدو تو یہ چھپانا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں۔

تفسیر: اس معاملہ میں مختلف اقوال ہیں، مگر احقر کے ذوق میں قرآن وحدیث کی ظاہری شہادت کے مطابق امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول جو کہ تفسیر کبیر میں منقول ہے راجح معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں فرض اور نفل سب صدقات شامل ہیں اور سب میں اخفا ہی افضل ہے۔ اس میں دینی مصلحت بھی ہے کہ ریا سے زیادہ دور ہے۔ لینے والا بھی نہیں شرماتا۔ اور دنیوی مصلحت یہ ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔

اور آیت میں اخفا کی افضلیت سے مراد فی نفسہ افضلیت ہے۔ چنانچہ اگر کسی موقع پر کسی وجہ سے مثلاً تہمت والزام سے بچنے یا دوسرے لوگوں کو شوق لگنے کی امید وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جائے تو نفی نفسہ کی افضلیت کے خلاف نہیں۔

دوسری بات یہ کہ سیئات کا کفارہ اخفا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور ذکر کی تخصیص، جبکہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات ضمیر کا مرجع ہو یا ترکیب میں شرط کی جزا ہو تو اس نکتہ کے لئے ہے کہ صدقہ کرنے والے شخص کا نفس اخفا میں کوئی ظاہری فائدہ نہیں دیکھتا، اس لئے تنگی محسوس کرتا ہے، اس لئے ایک بہت بڑے فائدہ پر تنبیہ کر دی جس کے حصول کی اعلان کے اعتبار سے زیادہ توقع ہے اور اسی لئے ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ کا اضافہ فرمایا یعنی اگر کسی اور کو خبر نہیں ہوتی تو تنگ دل کیوں ہوتے ہو، اللہ تعالیٰ کو تو خبر ہے۔

اور "کچھ گناہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حسنات یعنی نیک کاموں سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کی معافی کے دو طریقے ہیں، ایک توبہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ اور دوسرے فضل ورحمت۔

> لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمہ: ان کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ نہیں لیکن خدا تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت پر لے آویں اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے، بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے اور جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب پورا پورا تم کو مل جاوے گا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی۔

ربط: اب یہ بات بتاتے ہیں کہ صدقہ وخیرات دینے کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تخصیص نہیں ہے، اگر کافر بھی

حاجت مند ہو تو اس کے ساتھ بھی احسان کرنے سے پیچھے نہ ہو۔ بشرطیکہ وہ کافر اہل اسلام کو ضرر پہنچانے کے درپے نہ رہتا ہو۔

مسلمان اور کافر دونوں کے ساتھ احسان کرنا:

(چونکہ بہت سے صحابہ اس مصلحت کے تحت کفار کو خیرات نہیں دیتے تھے کہ شاید وہ اس تدبیر سے مسلمان ہو جائیں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں (صحابہ کرام اور رسولِ اکرم) دونوں کو خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد! (ﷺ) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا آپ کے ذمہ (فرض، واجب) نہیں۔ جس کے لئے اتنے دور دراز کے اہتمام کئے جائیں، لیکن (یہ تو) اللہ تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آئے یا نہ آئے اور ہدایت کا پہنچا دینا اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور (اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ) تم ذات پاک حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے سوا کسی دوسری غرض سے خرچ نہیں کرتے (کہ رضا جوئی کے لوازم سے ثواب ہے اور یہ غرض ہر حاجت مند کی حاجت رفع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے) اور جو کچھ مالِ خرچ کر رہے ہیں، یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تمہیں (آخرت میں) مل جائے گا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہیں کی جائے گی (اس لئے تمہیں اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے اور عوض ہر حال میں ملے گا۔ پھر تمہیں اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے، کافر کو نہ ملے)

تفسیر: خلاصہ یہ ہے کہ اصل میں تمہاری نیت بھی اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے اور وہ واقع میں بھی خاص تم ہی کو حاصل ہوگا۔ پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے کہ یہ نفع خاص اسی طریقہ سے حاصل کیا جائے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، کافر کو نہ دیں۔ شیخ سعدی کا شعر گویا اسی آیت کی تفسیر ہے:

گر او می برد پیش آتش سجود ۞ تو واپس چرا می کشی دستِ جود

(اگر وہ آگ کے سامنے سجدہ کرتا ہے تو تو جود وسخا کا ہاتھ پیچھے کیوں ہٹاتا ہے!)

اور جاننا چاہئے کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ تمہارا کھانا خاص متقی کھایا کریں، اس سے مراد دعوت کا کھانا ہے، جبکہ آیت میں حاجت کے کھانے کا ذکر ہے۔ اس لئے تعارض کا شبہ نہ کیا جائے۔

مسئلہ (۱): حربی کافر کو کسی بھی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ (۲): کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ اور عشر دینا جائز نہیں اور دوسرے صدقات خواہ واجب ہوں یا نفل سب جائز ہیں۔ اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع

ترجمہ: اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا امکان نہیں رکھتے ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے، تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے اور جو مال خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔

ربط: اوپر صدقات کے سلسلہ میں مؤمن کی تخصیص نہ ہونے کا بیان فرمایا تھا۔ اب اصل مستحق کا بیان ہے یعنی حاجت کے وقت سب کو دینا چاہئے۔ لیکن اصل حق ان لوگوں کا ہے جن میں خاص صفتیں پائی جاتی ہوں، یعنی اپنی طرف سے تو ایسے ہی لوگوں کی تحقیق و تفتیش کر کے دے، ویسے بغیر تفتیش کے جس کے حاجت مند ہونے کے بارے میں پتہ چل جائے، اس کو دیدیا کرے۔ اب اس میں کوئی تعارض نہیں رہا۔

صدقات کے اصل مستحق:

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں گھر کر رہ گئے ہیں اور دین کی اسی خدمت میں گھرے ہوئے اور مشغول رہنے کی وجہ سے وہ لوگ (طلب معاش یعنی روزگار کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عام حالات میں) امکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف (شخص) ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے انہیں خوش حال سمجھتا ہے (البتہ) تم ان لوگوں کو ان کے طرز (ہیئت و حالت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر و فاقہ سے چہرہ اور بدن میں کسی نہ کسی حد تک اضمحلال ضرور آ جاتا ہے۔ ویسے) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی انہیں حاجت مند سمجھے۔ یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ جو لوگ مانگنے کے عادی پیشہ ور ہیں، وہ اکثر لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کا خوب علم ہے (اور وہ اور لوگوں کو دینے سے ان کی خدمت کا فی نفسہ زیادہ ثواب دیں گے)

تفسیر: آیت کے آخری حصہ کی تفسیر میں فی نفسہ کی قید لگانے کی وجہ: ربط کی تقریر سے معلوم ہو چکی ہے یعنی اصل میں تو زیادہ ثواب اسی میں ہے، لیکن کسی عارض کی وجہ سے ان کے غیر میں ثواب کا زیادہ ہونا ممکن ہے۔ مثلاً ان لوگوں کی حاجت سے زیادہ دوسروں کی حاجت ہو۔ یا یہ توقع ہو کہ ان کی خدمت تو کوئی اور بھی کر دے گا۔ اور دوسرے بالکل ہی محروم رہ جائیں گے۔ اور جہاں یہ عوارض نہ ہوں وہاں یہ لوگ خدمت کے لئے افضل ہیں۔

اور اوپر کی آیت کے مضمون اور اس حدیث میں یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے جو اس کے تحت لکھی گئی ہے یعنی فی نفسہ متقی کی

خدمت افضل اور عارض کی وجہ سے غیر متقی بلکہ غیر مؤمن کے ساتھ احسان کرنے میں بھی افضلیت ممکن ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ ہمارے ملک میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دینیہ کی اشاعت میں مشغول ہیں، اس بنا پر سب سے اچھا مصرف طالب علم ٹھہرے۔

اور ان پر جو بعض ناتجربہ کاروں کا یہ طعن ہے کہ ان سے کمایا نہیں جاتا، اس کا جواب قرآن میں دیدیا گیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص ایسے دوکام نہیں کرسکتا جن میں سے ایک میں یا دونوں میں پوری مشغولیت کی ضرورت ہو اور جس کو علم دین کا کچھ مذاق ہے وہ مشاہدہ سے سمجھ سکتا ہے کہ اس عمل میں انتہائی مشغولیت اور انہاک کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ اکتسابِ مال یعنی کسی روزگار کا شغل نہیں چل سکتا کہ اکتسابِ مال کی مشغولیت کی وجہ سے علم دین کی پوری خدمت نہیں ہو پاتی، ناتمام رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس سے متعلق ہزاروں نظائر سامنے موجود ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾

ترجمہ: جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں پوشیدہ اور آشکارا سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا ان کے رب کے پاس اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

ربط: اب یہ بتانا مقصود ہے کہ بھلائی و نیکی کے کاموں میں خرچ کے معاملہ میں کسی زمانہ اور کسی حالت کی تخصیص نہیں۔ جب اور جہاں موقع ہو خرچ کرنا چاہئے، سب مقبول ہے۔

انفاق میں اوقات وحالات کی کوئی تخصیص نہیں:

جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں (یعنی اوقات کی تخصیص کے بغیر) پوشیدہ اور علانیہ (یعنی حالات کی تخصیص کے بغیر) تو ان لوگوں کو ان کا ثواب (قیامت کے دن) ان کے رب کے پاس (جاکر) ملے گا۔ اور (اس دن) ان پر نہ کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

تفسیر: اس عمومی حکم سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ پوشیدہ طور پر خرچ کرنا اس وقت افضل ہے جب تک کھلے عام خرچ کرنے میں کسی عارض کی وجہ سے ترجیح نہ ہو۔ مثلاً ایک مجمع میں کسی شخص کا دم نکلا جارہا ہے اور ہم اس کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں، ایسے میں یہ انتظار کرنا کہ جب سب ہٹ جائیں گے تب خبر گیری کریں گے، فارسی کی اس مثل کا مصداق ہوجاتا ہے تاتریاق ازعراق آوردہ شود، مارگزیدہ مردہ شود۔ (جب تک تریاق عراق سے لایا جائے گا، سانپ کا ڈسا ہوا مرجائے گا)

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں، اس سے یہ شبہ جاتا رہا کہ قیامت کے دن تو خاص بندے بھی بڑے خوف اور خطرہ میں مبتلا ہوں گے، شبہ دور ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ اگرچہ ان کے دلوں میں ڈر اور خطرہ ہو، لیکن

جس امر کا خطرہ ہے وہ ان پر واقع نہیں ہوگا، انہیں پیش نہیں آئے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہونگے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنادے لپٹ کر یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے۔ پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے، وہ اسی کا رہا۔ اور معاملہ اس کا خدا کے حوالے رہا اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جاویں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کے کام کرنے والے کو۔

ربط: انفاق کے مضامین کی تفصیل سے پہلے بر (بھلائی ونیکی) کے ابواب میں سے پنتیس (۳۵) حکموں کا بیان ہوا ہے۔ اب بعض احکام کا یہاں سے بیان ہوتا ہے اور ان بقیہ احکام کا ربط انفاق کے مضمون کے ساتھ اس سے اور زیادہ ہوگیا کہ یہ سب احکام انفاق کی طرح مال ہی کے ساتھ متعلق ہیں، چنانچہ ربوا ظاہر ہے کہ مال سے متعلق ہے، اسی طرح مقروض شخص کو مہلت دینا، قرض وادھار کے معاملات کو لکھوالینا۔ ان معاملات میں گواہ بنالینا۔ ان گواہوں اور لکھنے والوں کو بغیر کسی وجہ کے عذر نہ کرنا۔ گروی رکھنا رکھوانا (بھی مال ہی سے متعلق ہیں)

چھتیس واں حکم: ربوا کی حرمت اور مذمت:

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) وہ (قیامت میں قبروں سے) کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح ایسا شخص کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان لپٹ کر خبطی (یعنی حیران ومدہوش) بنادے۔ یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خور) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو سود کی طرح ہے (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کی طرح ہی ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ احکام کے مالک ہیں) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا؟) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارے میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل سے اور کفر کے اس قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آگیا (یعنی اس کو حرام سمجھنے لگا اور اس کا لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم

کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے۔ وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شریعت کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگی اور لیا ہوا مال اس کی ملکیت ہے) اور (باطنی) اس کا معاملہ (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ طور پر توبہ کرلی ہے، یہ) اللہ کے حوالہ رہا (اگر دل سے توبہ کی ہوگی تو اللہ کے نزدیک فائدہ دے گی، ورنہ کالعدم ہوگی) تمہیں بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (مذکورہ بالا نصیحت کو سننے کے بعد بھی اس قول اور اس فعل کا) پھر اعادہ کرے تو (اس وجہ سے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور اس وجہ سے کہ ان کا یہ فعل کفر ہے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے (اور اگرچہ سود لینے کی وجہ سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن انجام کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے، ورنہ آخرت میں تو بربادی یقینی ہے، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے اگرچہ صدقہ دینے میں فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتے ہیں (کبھی تو دنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت زیادہ ثواب ملے گا۔ جیسا کہ اوپر آیت میں ذکر ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کفر کرنے والے کو (جو مذکورہ بالا قول جیسے کفر کے کلمات منہ سے بکنے اور اسی طرح) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو مذکورہ فعل یعنی سود جیسے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے) پسند نہیں کرتے (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں)

تفسیر: آخرت میں جنون کی سی حالت ہونا قرآن سے تو اس فعل اور اس قول دونوں کے مجموعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حدیث سے صرف سود لینے کے فعل کا بھی یہ نتیجہ ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ روح المعانی میں طبرانی سے عوف بن مالک ؓ کی روایت سے مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے، جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں: فمن أكل الربوا بُعث يوم القيامة مجنونا يتخبط ثم قرأ الآية إلخ (جس نے سود کھایا اس کو قیامت کے دن پاگل کی شکل میں اٹھایا جائے گا وہ ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوگا، پھر آپ نے یہ آیت آخر تک پڑھی)

آسیب لپٹنے کی حقیقت:

قیامت میں سود خور کی جنون کی حالت کو جو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو شیطان نے لپٹ کر خبطی کر دیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آسیب کا لپٹ جانا ممکن ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جنات میں بعض خبیث ہوتے ہیں، وہ بعض اوقات کسی شخص کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان کے مسلط ہو جانے سے انسان بدحواس ہو جاتا ہے۔

چونکہ جنات کا وجود قرآن سے ثابت ہے، اور اس کے انگلی چبھونے کے اثر سے بچہ کا رونا حدیث سے ثابت ہے، لہٰذا اس آیت میں اس تاویل کی ضرورت نہیں کہ عربوں کے خیال کی بنیاد پر ایسا کہہ دیا گیا ہے۔

اور چونکہ آیت میں یہ کہیں نہیں ہے کہ بدحواسی کی علت ہمیشہ آسیب زدگی ہی ہوتی ہے، اس لئے اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ بدحواسی اور جنون بیماریوں کی ایک قسم ہے۔ شبہ دور ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر جنون کبھی جن کے اثر سے ہو اور

کبھی مرض کے اثر سے ہو یا دونوں کے اثر سے اس طرح ہو کہ پہلے جن کا اثر ہوا اور اس سے اخلاط میں تعطل اور تبخیر (گیس) پیدا ہو جائے یا کبھی پہلے اخلاط میں فساد پیدا ہوا اور اس سے تعفن پھیلانے والی ریاح پیدا ہوں اور ان ریاح کے ساتھ خبیث شیطانی روحیں متعلق ہو جائیں، جس طرح بعض موسموں میں بخار کے مادوں میں جان پڑ کر موذی کیڑے اور حشرات الارض پیدا ہو جاتے ہیں تو ان سب صورتوں میں کوئی بڑی اور سمجھ سے پرے کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اس قسم کے آثار کا انکار کرنا خالص دہریت اور الحاد ہے۔

اور بعض لوگوں کو جو قرآن مجید کی اس آیت سے شبہ ہو گیا ﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ﴾ الآیۃ تو یہاں حصر اس اعتبار سے ہے کہ شیطان جبراً معصیت نہیں کرا سکتا۔ لیکن اس آیت سے اس اثر کی نفی لازم نہیں آتی، جس سے یہاں بحث کی جا رہی ہے۔

البتہ یہ بات اب تک ثابت نہیں کہ مُردوں کی روحیں آ کر ستاتی ہیں۔ بلکہ ظاہراً یہ امر اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صالح لوگوں میں سے تھا تو اللہ کی نعمتوں میں مشغول ہوگا، اس کو یہاں ایذا رسانی کے لئے آنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر شقی و بدبخت لوگوں میں سے تھا تو اس کو اس کی مہلت کہاں ملے گی۔

جزا جنسِ عمل سے دی جائے گی:

اور قیامت میں جو اس کو یہ سزا دی جائے گی تو جرم کے ساتھ اس کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس شخص کا یہ کہنا ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ دین کے بارے میں اس شخص کی بے عقلی کو ظاہر کرتی ہے، اس لئے اس کو عقل کے زائل ہونے کی سزا دی جائے گی (یہ جنسِ عمل سے سزا ہے) اسی طرح خود یہ فعل یعنی سود لینا بھی اس شخص کی بے عقلی کی دلیل ہے، کیونکہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ گویا علم اور عقل ہی نہیں۔

فائدہ: حق تعالیٰ نے ان کے مذکورہ بالا استدلال کا جو جواب دیا ہے وہ حاکمانہ جواب ہے، جو قوانین کے بیان کرتے وقت بالکل کافی اور نہایت مناسب ہوتا ہے، جبکہ حکیمانہ جواب آیت ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ میں ہے کہ باطل میں سود بھی داخل ہے، جس کا حاصل اجمالی طور پر یہ ہے کہ اس میں دوسرے کے مال کا ناحق ضائع کرنا ہے۔ باقی تفصیل سے حکمتیں اور احکام اصول اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

> اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا، ان کے پروردگار کے نزدیک۔ اور ان پر کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

ربط: اوپر سود کے باب میں بد اعتقاد اور بدعمل لوگوں کا ذکر تھا، اب قرآن کی عادت کے مطابق خوش اعتقاد اور نیک عمل لوگوں کا ذکر فرماتے ہیں:

نیک عمل کرنے والے مؤمنین کی تعریف:

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کے پروردگار کے نزدیک ثواب ہوگا اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ کسی مقصود کے فوت ہونے سے) غم زدہ ہوں گے۔

تفسیر: اوپر کی آیت میں سود خوروں کا قول ﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ ان کے کفر پر دلالت کرتا تھا، اس کے مقابلہ میں اس آیت میں ﴿اٰمَنُوْا﴾ لایا گیا۔ اور وہاں ان کی بدعملی (سود) کا ذکر تھا۔ جس سے ان لوگوں کا دنیا کی طرف راغب ہونا بھی سمجھ میں آتا تھا، یہاں ان کی نیک عملی اجمالاً ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ سے اور تفصیلاً اللہ کی طرف راغب ہونا ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ سے اور بجائے سود کا مال حاصل کرنے کے بالعکس مال کا خرچ کرنا ﴿اٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ سے مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقابلوں کی رعایت سے کلام میں کس قدر حسن وخوبی آ گئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۞

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو! اگر تم ایمان والے ہو۔ پھر اگر تم نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔

ربط: اوپر آئندہ سود لینے کی ممانعت تھی۔ اب پچھلا چڑھا ہوا سود وصول کرنے کا حکم بتاتے ہیں۔

بقایا سود وصول کرنے کی ممانعت:

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا مقتضی اطاعت ہے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان سن لو (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کر پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کر پائے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ

دلایا جائے)

سود نہ چھوڑنے والوں سے قتال کی تفصیل:

آیت میں جنگ (جہاد) کے لئے فرمایا ہے، اس میں حسب ذیل تفصیل ہے:

سود نہ چھوڑنا اگر اس طرح ہے کہ اس کو حلال نہیں سمجھتا تو جہاد کی وجہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جو مسلمان کسی خاص شرعی حکم کی خلاف ورزی کرے اور امام کے کہنے سے بھی باز نہ آئے تو اس پر جبر کرنا چاہئے۔ اب دو چار پر تو جبر چل جائے گا اور اگر وہ جبر کو نہ مانے بلکہ گروہ بنا کر مقابلہ میں پیش آئے تو ان پر جہاد کرنا چاہئے۔ خواہ وہ امر سنت ہی کیوں نہ ہو، اس لئے فقہاء نے اذان کے ترک کرنے یا ختنہ کو ترک کرنے پر بھی قتال کا حکم دیا ہے، اور ایسے لوگوں کا حکم باغیوں جیسا ہوگا۔

اور اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تمہارا راس المال ملے گا۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں راس المال بھی نہ ملے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

اگر یہ توبہ نہ کرنا اس طرح ہے کہ سود کو حلال سمجھنے لگا تو چونکہ اس سے پہلے یہ شخص مسلمان ہے جیسا کہ آیت: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾: اس کا قرینہ بھی ہے اور سود کو حلال سمجھنا کفر ہے اور اسلام کے بعد کفر کرنا ارتداد ہے، اس لئے یہ شخص مرتد قرار دیا جائے گا کہ اگر نئے سرے سے اسلام قبول نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جاتا ہے، اور اس کا تمام مال اس کی ملکیت سے نکل جاتا ہے، پھر اس میں جتنا مال ارتداد سے پہلے کا حاصل کیا ہوا ہے، وہ تو اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور جو ارتداد کی حالت میں حاصل کیا ہے، وہ بیت المال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

اور اگر یہ توبہ نہ کرنا اس طرح ہے کہ اس کو حلال نہیں سمجھا مگر ترک نہیں کرتا تو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ اگر یہ مقابلہ میں پیش نہیں آیا تب تو جبر کر کے ترک کرا ہی دیں گے، توبہ نہ کرنے کی صورت میں یہ شق داخل ہی نہیں اور اگر مقابلہ میں پیش آیا تو باغی ہے اور باغی کے احکام میں یہ ہے کہ ان میں سے جو قتل سے بچا رہے، اس کا مال اس کی ملکیت سے تو نہیں نکلتا، مگر اس کے قبضہ سے نکال لیا جاتا ہے، یعنی چھین کر اپنے قبضہ میں بطور امانت رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جس وقت توبہ کر لیں گے ان کے مال انہیں واپس کر دیئے جائیں گے۔ یہ سب مسائل ہدایہ میں موجود ہیں۔

دار الحرب میں حربی سے سود لینے کا مسئلہ:

احقر نے اس آیت سے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ دار الحرب میں حربی سے سود لینا حرام ہے، کیونکہ یہ بقایا سود زمانہ جاہلیت کا تھا جب کہ مکہ دار الحرب تھا۔ اگر یہ معاملہ حلال ہوتا تو حلال معاملہ سے جو حق واجب ہو اس کا مطالبہ ہر حال میں درست ہے، اگرچہ مطالبہ کے وقت وہ معاملہ ناجائز ہو۔ مثلاً ایک نصرانی نے دوسرے نصرانی سے شراب خریدی، ان کے لئے یہ معاملہ حلال تھا، پھر دونوں مسلمان ہو گئے باوجودیکہ اب ایسی خرید و فروخت درست نہیں، مگر پچھلا روپیہ وصول کرنا درست

ہے۔تو جب ربوا میں پچھلا بقایا لینے کی اجازت نہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی حلال نہ تھا۔ پھر جب دو حربیوں میں آپس میں درست نہ ہوا تو مسلمان اور حربی میں کیسے درست ہوگا؟

رہا لیا ہوا سود واپس نہ ہونا تو کثیر حرج کو دور کرنے کے واسطے حرام کئے جانے کا علم نہ ہونے کے عذر کے تحت یہ تخفیف تھی، اور اس کے متعلق جو فقہی روایت مشہور ہے، احقر کے نزدیک اس کی خاص تفسیر ہے جس سے سود کی حلت لازم نہیں آتی۔ مزید تفصیل کے لئے یہ موقع نہیں (۱)

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

ترجمہ: اور اگر تنگدست ہو تو مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک۔ اور یہ کہ معاف ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو خبر ہو۔

ربط: اس حکم کے عام ہونے کے باوجود ماقبل کے ساتھ ایک خاص مناسبت بھی ہے، وہ یہ کہ سود خوروں کا قاعدہ تھا کہ وقت مقررہ پر مطالبہ کرنے پر اگر مقروض مہلت مانگتا تو مہلت کے عوض مزید سود لیتے تھے۔ اس آیت سے اس رسم بد کو بھی مٹانا ہے۔

سینتیسواں حکم: مفلس کو مہلت دینا ضروری ہے:

اور اگر (مقروض شخص) تنگ دست ہو (اور اس وجہ سے مقررہ وقت پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے، آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کرنے کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کردو تو تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تمہیں (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

مسئلہ (۱): مفلس کو مہلت دینا واجب ہے۔

---

(۱) حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنے ایک رسالہ: رافع الضَّنک عن منافع البَنک میں حدیث: لاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب کی یہ تشریح کی ہے:

"یہ حدیث حقیقت پر محمول نہیں، بلکہ مجازاً بمعنی نہی ہے (بمعنی نفی نہیں) اور حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان (بھی) سودی معاملہ ممنوع و ناجائز ہے، جیسے آیت کریمہ ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ میں نفی بمعنی نہی ہے، یعنی آیت کریمہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حج میں فحش گوئی، گناہ کی بات اور جھگڑا نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حج میں فحش گوئی، گناہ کی بات اور جھگڑا ممنوع و ناجائز ہے، اور حربی کا مال چونکہ غیر معصوم ہوتا ہے اس لئے اس سے کسی کو جواز کا شبہ ہوسکتا تھا، اس لئے حضرت نبی کریم ﷺ نے اس کے جواز کی نفی فرمادی"

اس کے بعد ایک فقہی نظیر پیش کی ہے جسے امداد الفتاوی (۱۵۸:۳) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ(۲): جب اس کو گنجائش ہو پھر مطالبہ کی اجازت ہے۔

مسئلہ(۳): البتہ اگر ابھی مفلس ہونے کی ہی تحقیق نہ ہو بلکہ شبہ ہو کہ شاید اپنی گنجائش کو چھپاتا ہے اور قصداً ٹالتا ہے تو حاکم کو چاہئے کہ قرض خواہ کی درخواست پر مقروض کو حوالات میں بند کردے اور جب قرائن سے یہ یقین ہو جائے کہ اب اس قدر تنگ ہو چکا ہے کہ اس کے پاس مال ہوتا تو ضرور دیدیتا، اس وقت رہا کردے۔

ع
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۟

ترجمہ: اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

حکم سابق کا تتمہ: تعمیل حکم میں کوتاہی پر ڈرانا:

اوپر کے احکام میں چونکہ ظاہراً کسی قدر مالی نفع کم معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ربوا میں آمدنی کا کم ہونا اور مہلت میں آمدنی کا دیر سے ملنا ظاہر ہے، اس لئے جو لوگ حکم کے مخاطب تھے ان کا مال کی طبعی محبت کی وجہ سے ان احکام میں کوتاہی کرنا بعید نہیں تھا، اس لئے اس موقعہ پر احکام میں کوتاہی کرنے پر کسی قدر ڈرانا مناسب معلوم ہوا جو اس آیت میں ارشاد فرمایا جاتا ہے۔ اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو، جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو اور کسی قسم کی خلاف ورزی نہ کرو)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ

ترجمہ: اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سکھلا دیا اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور وہ شخص لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس میں سے ذرہ برابر کمی نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر خفیف العقل ہو یا ضعیف البدن ہو یا خود لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک طور سے لکھوادے۔

اڑتیسواں حکم: قرض سے متعلق:

اوراس حکم میں کئی جزء ہیں:

پہلا جز: دستاویز لکھنے کا مشورہ: اے ایمان والو! جب تم مقررہ میعاد تک (کے لئے) ادھار کا معاملہ کرنے لگو (خواہ رقم ادھار ہو یا جو چیز خریدنی ہے وہ ادھار ہو، جیسا کہ بیع سلم میں ہوتا ہے) تو اس (کی یادداشت و دستاویز) کو لکھ لیا کرو۔ اور یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان (جو) کوئی لکھنے والا (ہو، وہ) انصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے)

دوسرا جز: لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے: اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو (لکھنا) سکھا دیا۔ اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے۔

تیسرا جز: دستاویز کا مقروض کی طرف سے ہونا: اور (لکھنے والے کو) وہ شخص (بتائے اور) لکھائے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا مقصد حق کا اقرار کرنا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضروری قرار پایا) اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے (بتانے میں) ذرا بھی کمی نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا اگر وہ کم عقل (معتوہ یا مجنوں) یا کمزور (یعنی نابالغ یا انتہائی بوڑھا) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود (بیان کرنے اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے ملک کا رہنے والا ہے اور دوسری زبان بولتا ہے اور لکھنے والا اس کی زبان نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) تو اس کا کارکن ٹھیک طرح سے لکھا دے۔

مسئلہ (۱): رقم ادھار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روپیوں کے گیہوں خریدے یا مکان خریدا اور وعدہ یہ قرار پایا کہ روپے چھ ماہ کے بعد دیں گے یا کچھ روپے فی الحال کسی کو دیئے اور یہ معاہدہ ہوا کہ مثلاً چھ ماہ کے بعد فلاں غلہ اتنا لیں گے اس کو شریعت کی اصطلاح میں بیع سلم کہتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز نہیں۔ البتہ ان کے جائز ہونے کے لئے بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مسئلہ (۲): ان شرطوں میں سے ایک شرط وہ بھی ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ ہے یعنی وہ میعاد پوری طرح متعین ہو جس میں کسی اختلاف ونزاع کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ مثلاً رمضان کی پندرہ تاریخ، اور یوں نہ کہے کہ مثلاً جب فصل کٹنے لگے گی، کیونکہ فصل کے کٹنے کی ابتدا اور انتہا میں فرق ہوا کرتا ہے۔

مسئلہ (۳): یہ لکھنا، لکھانا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے، اگر کوئی نہ لکھے لکھائے تو گنہگار نہیں ہوگا۔ یہاں مقصود صرف مصلحت ہے کہ اختلاف کا بالکل احتمال نہ رہے۔

مسئلہ (۴): یہ لکھنا چونکہ ایک مصلحت کے لئے ہے، اس لئے دَین کے ساتھ مخصوص نہیں، اگر دونوں طرف سے لین دینا نقد ہو جائے اور پھر بھی اس کے لکھنے میں مصلحت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً کوئی گاؤں، کھیت، مکان یا کارخانہ وغیرہ خریدا اور اس کا بیعنامہ لکھالیا تا کہ آئندہ چل کر کوئی انکار نہ کر بیٹھے۔

مسئلہ (۵): لکھنے والے کو لکھنے کا حکم اور انکار سے ممانعت یہ بھی استحباب کے لئے ہے، اس لئے اگر لکھنے والا لکھنے پر اجرت لے تو جائز ہے۔

مسئلہ (۶): کم عقل سے مراد مجنوں یا دیوانہ ہے جو بالکل پاگل نہ ہو، مگر عقل میں خلل ہو۔ اور کمزور سے مراد نابالغ یا بوڑھا ہے۔ ان میں نابالغ اور دیوانہ و مجنون کی خرید وفروخت اور اقرار تو شرعی طور پر نا قابل اعتبار ہے، بلکہ ان لوگوں کے ایسے معاملات کے صحیح اور نافذ ہونے کے لئے شرعی ولی کی اجازت درکار ہے۔ اور ایسا ولی جس کا تصرف ان کے مال میں نافذ ہو سکے صرف یہ ہیں: باپ، دادا، باپ کا وصی، دادا کا وصی۔ قاضی یعنی شرعی حاکم، اس لئے ان کا ہر معاملہ یا تو ولی کرے اور اگر یہ کریں تو ولی معلوم ہونے پر کہہ دے کہ میں جائز رکھتا ہوں اور اگر ولی کرے تب بھی اس معاملہ کا عوض رقم وغیرہ انہی کے مال میں واجب ہوگا، اگر چہ یہ مطالبہ ولی سے ہوگا مگر ان کے مال سے دے گا۔ اس طرح مقروض یہی رہیں گے۔ اور بوڑھا اگر بدحواس ہو جائے تب تو اس کا بھی یہی حکم ہے، ورنہ وہ خود معاملہ کر سکتا ہے یا کسی کو اپنے آرام کے لئے اپنی طرف سے کسی کو مختار کر دے اس کو وکیل کہتے ہیں، اور گونگے اور دوسری زبان بولنے والے کے لئے سمجھانے والے اور مترجم کی ضرورت ہے، وہ ہر معتبر آدمی ہو سکتا ہے۔ پس آیت کے ترجمہ میں استعمال کئے گئے لفظ 'کارکن' میں یہ سب یعنی اصطلاحی ولی، وکیل، سمجھانے والا اور مترجم شامل ہیں۔

مسئلہ (۷): لکھنے کے اس حکم کے بعد گواہ بنانے کا حکم اس امر کی دلیل ہے کہ معاملات میں خط حجت نہیں، اور اسی کی تصریح فقہاء نے کی ہے، اور دین کے معاملات میں خط کا حجت ہونا اس سے ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے سلاطین کے نام فرمان بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ گواہ نہیں بھیجے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

ترجمہ: اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ کر لیا کرو، پھر اگر وہ دو گواہ مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جاوے تو ان میں سے ایک دوسرے کو یاد دلا لے۔

چوتھا جز: گواہ بنانا: اور (قرض کے اس معاملہ میں دستاویز لکھنے کی پختگی کے لئے) اپنے مردوں میں سے دو شخصوں کو

گواہ (بھی) کرلیا کرو (اور شرعی طور پر دعوی کے ثبوت کا اصل مدار یہی گواہ ہیں، خواہ دستاویز نہ ہو۔ اور ایسے معاملات میں بغیر گواہوں کے خالی دستاویز حجت اور معتبر نہیں۔ دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے ہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر، سن کر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آ جاتا ہے، جیسا کہ عنقریب قرآن میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو۔ (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ ذہن و حافظہ سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے)

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا

ترجمہ: اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب بلائے جایا کریں۔

پانچواں جز: گواہوں کا گواہ بننے سے انکار نہ کرنا: اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں، جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں، (کہ اس میں اپنے بھائی کی اعانت ہے)

فائدہ: گواہی کے احکام میں بہت تفصیل ہے، لیکن جن حقوق کا یہاں بیان ہے یعنی مالی معاملات، ان سے متعلق چند مسائل تحریر کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ (۱): ان گواہوں میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں: اسلام، عقل، بالغ ہونا، آزادی، یعنی غلام نہ ہونا۔ عدالت یعنی دین داری کی وجہ سے معتبر ہونا اور یہ سب صفتیں اس آیت سے بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ کیونکہ رجالکم وغیرہ میں مخاطب وہی ہیں جو اوپر ﴿ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ ﴾ میں ہیں۔ ایمان کا تو صاف طور سے ذکر ہے اور معاملات عاقل، بالغ اور آزاد لوگوں میں ہی واقع ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ان صفات کا شرط ہونا اس سے معلوم ہوا۔ اور عدالت ﴿ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ ﴾ سے معلوم ہوئی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عدالت ظاہری کافی ہے یا خاص طور سے تحقیق و تفتیش بھی کی جائے۔

مسئلہ (۲): گواہ بننے کے لئے بلانے پر چلا جانا مستحب ہے، البتہ گواہ بن جانے کے بعد گواہی دینے کے لئے جانا بعض صورتوں میں فرض ہے۔ جیسا کہ عنقریب اگلی آیت میں آئے گا۔

مسئلہ (۳): کلمہ ﴿ فَتُذَكِّرَ ﴾ سے صاف سمجھ میں آ گیا کہ گواہی کا دارومدار یادداشت و حافظہ پر ہے اس لئے اگر دستاویز دیکھ کر واقعہ یاد نہ آیا تو گواہی دینا درست نہیں۔

مسئلہ (۴): چونکہ ثبوت کا دارومدار گواہی پر ہے، لہٰذا خود دستاویز لکھنا ضروری نہیں ہے اور اگر لکھی جائے تو ضروری

نہیں کہ اس پر گواہوں کے دستخط ہوں۔ان کا دستاویز کو صرف سن لینا، یا واقعہ کا مشاہدہ کر لینا خواہ دستاویز نہ ہو کافی ہے۔ پہلی صورت میں گواہی اس طرح دیں گے کہ ہمیں فلاں شخص نے اپنا اقرار و عہد سنایا۔ یا دوسرے نے سنایا۔ اور فلاں نے اس کی صحت کا اقرار کیا۔ اور دوسری صورت میں کہیں گے کہ ہمارے روبرو یہ معاملہ ہوا۔ البتہ دستاویز پر گواہوں کا دستخط کر دینا یادداشت کی سہولت کا موجب اور احتیاط و مصلحت کے قریب ہے، کیونکہ اکثر دستاویز پر اپنے دستخط دیکھ کر وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ مگر واقعہ کا مشاہدہ کئے بغیر یا معاہدہ کرنے والے کی زبان سے معاہدہ کے اقرار کی بات سنے بغیر گواہی لکھنا جیسا کہ دور حاضر میں رائج ہے، اسلام کے نزدیک ناجائز ہے۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ

ترجمہ: اور تم اس کے لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم کسی شبہ میں نہ پڑو، مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو، جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام نہیں۔

پہلے جز کا تتمہ: اور تم اس (قرض کی دستاویز) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو، خواہ وہ (قرض کا معاملہ) چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے۔ اور اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ لینا ہی زیادہ اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست یعنی نقد ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور نقصان) نہیں۔

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠

ترجمہ: اور خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو۔

چوتھے جز کا تتمہ: اور (اس میں بھی اتنا ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے۔ مثلاً فروخت کرنے والا کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول ہی نہیں ہوئی یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی یا خریدار کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لیا تھا۔ یا ابھی تو خریدی ہوئی چیز میرے پاس پوری پہونچی ہی نہیں)

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ ۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جاوے اور نہ کسی گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کروگے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ سے ڈرو۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جاننے والے ہیں۔

دوسرے اور پانچویں جز کا تتمہ: اور (جس طرح ہم نے اوپر لکھنے والے اور گواہ کو منع کیا کہ وہ لکھنے اور گواہی سے انکار نہ کریں، اسی طرح ہم تمہیں بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے بھی) کسی لکھنے والے کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کیلئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کروگے تو اس میں تمہیں گناہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کردیا ہے، وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ تمہیں (مفید احکام کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ فرماں بردار اور گنہگار کو بھی جانتے ہیں، ہر ایک کو مناسب بدلہ دیں گے)

لکھنے میں تین فائدے:

پہلے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کا حق دوسرے کے پاس نہ جائے گا۔ نہ اس کا حق پہلے کے پاس رہے گا۔ حقوق العباد کے تلف ہونے سے حفاظت رہے گی۔ دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ گواہوں کو آسانی ہوگی۔ تیسرے کا حاصل یہ ہے کہ اہل معاملہ کا دل صاف رہے گا۔ طبیعت کو راحت رہے گی۔ دوسرے سے دل میں کدورت نہ ہوگی۔ تینوں فائدوں کا الگ الگ ہونا ظاہر ہے، اور ان فائدوں کا اس طرح بیان کرنا لکھنے کے مستحب ہونے کا قرینہ ہے، اس طرح گواہ کرنا بھی مستحب ہے۔ البتہ لکھنے والے اور گواہ کو ضرر پہونچانا حرام ہے۔ ﴿ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ﴾ اس کا واضح قرینہ ہے۔ اور اگر لکھنے والا اجرت مانگے یا گواہ کو آنے جانے کے خرچ کی ضرورت ہو تو ان کو مفت کام کرنے پر مجبور کرنا بھی ضرر پہنچانے میں داخل ہے اور حرام ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ نہ لکھنے میں الزام نہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی مضرت نہیں ورنہ گناہ تو کسی بھی معاملہ کے نہ لکھنے میں نہیں ہے۔ اور نقد تجارت میں لکھنے کے اہتمام کی تاکید نہ فرمانا حرج سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے، کیونکہ ایسے معاملات تو ہر وقت ہوتے رہتے ہیں، اور اکثر معمولی قسم کے بھی ہوتے ہیں، اور دست بدست نقد ہونے کی وجہ سے اختلاف اور نزاع کا احتمال کم ہی ہوتا ہے۔

اس لئے یہ مسئلہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر کسی نقد تجارت میں یہ باتیں نہ ہوں مثلاً وہ معاملہ بڑا ہو اور کم ہوا کرتا ہو اور اس میں آئندہ اختلاف ونزاع پیدا ہوجانے کا احتمال ہو تو اہتمام کو ترک کرنے کی ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے لکھنے کا اہتمام کیا جائے گا، جیسا کہ عام عادت اور عمل بھی ہے کہ بڑے بڑے معاملات کی دستاویز برابر لکھی جاتی ہیں چاہے ادھار نہ ہو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ

ترجمہ: اور اگر تم کہیں سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ سو رہن رکھنے کی چیزیں جو قبضہ میں دی جائیں۔ اور اگر ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو جس شخص کا اعتبار کیا گیا ہے اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق ادا کردے۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے۔

انتالیسواں حکم: گروی رکھنا:

اور اس کا گذشتہ آیتوں کے ساتھ خاص تعلق بھی ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔ اور اگر تم (قرض کا معاملہ کرنے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے لئے وہاں) کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مقروض شخص کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں۔ اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ہر ایک شخص دوسرے کا اعتبار کرتا ہو (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کرلیا گیا ہے (یعنی مقروض) اسے چاہئے کہ حق (پورا پورا) ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو کہ اس کا پروردگار ہے (اور اس کا حق نہ مارے)

فائدہ: جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ رہن یا گروی رکھنا جس طرح سفر میں جائز ہے، حضر یعنی اپنے گھر پر رہتے ہوئے بھی جائز ہے، یہاں سفر کی تخصیص کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ اس کی ضرورت حضر کے مقابلہ میں سفر میں زیادہ پڑتی ہے۔ کیونکہ حضر میں اطمینان کے اور بھی ذرائع موجود ہوتے ہیں، مثلاً لکھنا اور گواہ بنانا جو اکثر سفر میں میسر ہونا دشوار ہوتا ہے۔

مسئلہ: جو چیز رہن رکھی جائے جب تک اس پر رہن لینے والے کا قبضہ نہ ہو جائے، وہ رہن نہیں ہوتا۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾ ع

ترجمہ: اور شہادت کا اخفاء مت کرو۔ اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں۔

چالیسواں حکم: شہادت کا چھپانا حرام ہے:

اس کا بھی پہلے والے مضامین سے خاص تعلق ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اور یہ حکم مالی اور غیر مالی حقوق مثلاً طلاق و نکاح وغیرہ کے لئے عام ہے، اس لئے احقر نے اس کو تمام وجوہ سے گذشتہ مضمون کے تابع نہیں سمجھا، بلکہ مستقل حکم قرار دیا ہے: اور شہادت کو مت چھپاؤ۔ اور جو شخص اس کو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے اگر کوئی چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہوگا چنانچہ وہ سزا دیں گے)

مسئلہ (۱):: گواہی کا چھپانا دو طرح سے ہوتا ہے: ایک یہ کہ بالکل بیان نہ کرے اور دوسرے یہ کہ غلط بیان کرے۔

دونوں میں اصل واقعہ چھپ گیا اور دونوں صورتیں حرام ہیں۔

مسئلہ (۲): جب کسی حق دار کا حق اس کے شہادت نہ دینے کی وجہ سے ضائع ہونے لگے اور وہ درخواست بھی کرے تو ایسے وقت میں گواہی دینے سے انکار کرنا حرام ہے۔

مسئلہ (۳): اور اگر صاحبِ معاملہ کو اس بات کا علم نہ ہو کہ اس شخص کو میرا واقعہ معلوم ہے تو اس کے حق کے ضائع ہونے کی صورت میں یہ بات اس پر ظاہر کر دینا واجب ہے۔ البتہ اگر علم ہونے کے بعد وہ اس شخص سے شہادت کی درخواست نہ کرے تو اس کے ذمہ واجب نہیں کہ خود جا کر گواہی دیتا پھرے۔

مسئلہ (۴): چونکہ گواہی دینا واجب ہے، لہٰذا اس پر اجرت لینا جائز نہیں، البتہ آنے جانے کا خرچ اور حاجت کے مطابق خوراک صاحب معاملہ کے ذمہ ہے۔ اگر زیادہ آجائے تو واپس کر دے۔

فائدہ: دل کو اس لئے گنہگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھ لے، کیونکہ اول ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں۔ اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں، ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا کہ پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔ پھر جس کے لئے منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

ربط: اوپر گواہی کے چھپانے کو دل کا گناہ بتایا تھا۔ اس لئے اگلی آیتوں میں اس مسئلہ کی تحقیق فرماتے ہیں کہ دل کے بدنما اعمال میں سے کس فعل پر گناہ ہے اور کس فعل پر گناہ نہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان افعال میں سے جو اختیاری ہیں، جیسے فاسد عقائد اور مذموم اخلاق اور معصیت کے عزائم ان پر گناہ ہے اور اضطراری یعنی غیر اختیاری افعال پر جیسے وسوسے اور اندیشے گناہ نہیں۔ یہ مضمون ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا ﴾ سے شروع ہو کر ﴿ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ پر ختم ہو گیا۔ اور شروع سے پہلے ﴿ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ میں اس کی تمہید ہے اور ختم کے بعد دعا میں اس کی تائید ہے۔ اس طرح یہ مضمون اپنے عموم کی وجہ سے ایک لحاظ سے مستقل بھی ہے، اس لئے اگر اس کو اکتالیسواں حکم کہا جائے تو صحیح ہو سکتا ہے۔ اور ایک لحاظ سے پہلے کلام کی تکمیل ہے، اس لئے اسے پہلے والے مضمون کی توضیح اور تفصیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ حسن اتفاق ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملات کی گنتی بھی چالیس تک پہونچی تھی اور ان کے آخر میں بھی ایک مضمون ایسا تھا جسے چالیسویں کا اتمام کرنے والا بھی کہہ سکتے تھے اور اکتالیسواں کہنا بھی ممکن تھا۔ یہی عدد اور یہی حالت یہاں پر یعنی نیکی

وبھلائی کے ابواب کے آخری حکم میں بھی واقع ہوئی اور اس سورت کا بڑا حصہ یہی دو مضمون ہیں۔ اور یہ بھی کلام الٰہی کے محاسن میں سے ہے۔

دل کے افعال پر مواخذہ کی تحقیق:

اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (جیسے خود آسمان اور زمین بھی اسی کی ملکیت ہیں، جب وہ مالک الکل (سب کے مالک) ہیں تو اگر وہ اپنے مملوک بندوں کے لئے کوئی قانون مقرر کریں جیسا کہ آگے ایک قانون آتا ہے تو کچھ عجیب اور بعید نہیں) اور (وہ قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (فاسد عقائد ومذموم اخلاق اور معصیات کے عزائم) تمہارے نفسوں میں ہیں اگر تم انہیں (زبان اور جوارح یعنی جسم کے دوسرے اعضا سے) ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دیا یا مذموم تکبر کو ظاہر کر کے کہہ دیا کہ میں فلاں سے اچھا ہوں یا جس معصیت کا عزم تھا اس کو عملاً کر ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے دوسرے گناہوں کی طرح (ان کا) حساب لیں گے، پھر (حساب لینے کے بعد کفر وشرک کے سوا) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا اسے سزا دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (تو دل کے اندر کی چھپی ہوئی بات پر مطلع ہو کر اس پر حساب لینا تعجب کی بات نہیں)

تفسیر: اس مسئلہ کا حاصل ربط کی تقریر میں لکھ چکا ہوں کہ ﴿مَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ﴾ سے مراد دل کے اختیاری امور ہیں۔ تو جس طرح زبان اور جوارح کے افعال دو قسم کے ہیں: ایک اختیاری جیسے ارادہ سے بولنا اور ارادہ سے کسی کو مارنا اور دوسرے غیر اختیاری جیسے زبان سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور بلا ارادہ واختیار کچھ اور نکل گیا یا رعشہ کی وجہ سے حرکت ہو رہی ہے، ان میں سے افعال اختیاری پر ثواب وعذاب ہوگا اور غیر اختیاری پر نہیں ہوگا۔

اسی طرح دل کے افعال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اختیاری جیسے کفر کا عقیدہ جسے جان بوجھ کر دل میں بٹھایا ہے یا سوچ سمجھ کر خود کو بڑا سمجھنا اس خیال کو قائم رکھنا یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا۔ اور غیر اختیاری جیسے کفر یا معصیت کے برے وسوسے آنا وغیرہ۔ اس میں بھی اختیاری پر مواخذہ ہے اور غیر اختیاری پر نہیں۔

اور جس طرح زبان اور جوارح کے افعال میں کفر کے سوا باقی میں مغفرت اور دائمی عذاب کا احتمال ہے، اس طرح دل کے افعال میں بھی دونوں احتمال ہیں۔ چنانچہ آیت میں اسی کا بیان ہے کہ اختیاری گناہوں پر اگرچہ وہ دل کے افعال ہوں مواخذہ کیا جائے گا۔

آیت سے صحابہ کے خوف اور جواب نبوی کی وضاحت:

مگر چونکہ اس آیت میں اختیاری ہونے کی قید کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں تھا اس لئے صحابہ ظاہر الفاظ کی عمومیت

دیکھ کر اس آیت کو اختیاری و غیر اختیاری دونوں قسم کے افعال کے سلسلہ میں عام سمجھ کر گھبرا گئے اور عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ! اب تک تو ہم ایسے افعال کے مکلف تھے جو ہماری طاقت و اختیار میں تھے، جیسے نماز و روزہ و زکوٰۃ و جہاد، اب یہ آیت آئی ہے جو ہماری طاقت سے باہر ہے۔

باوجودیکہ حضور ﷺ اس آیت کا صحیح مطلب جانتے تھے، لیکن انتہائی خشیت کے غلبہ کی وجہ سے آپ کی نظر بھی الفاظ کے ظاہری عموم کی طرف چلی گئی جس طرح آپ نے ایک منافق کے جنازہ کی نماز اس آیت کے نازل ہونے کے بعد پڑھی ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ (آپ ان کے لئے مغفرت طلب کریں یا مغفرت طلب نہ کریں، اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی ہرگز مغفرت نہیں کریں گے) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اعتراض کرنے پر آپ نے جواب دیا کہ مجھے ان کے لئے مغفرت طلب کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے ایک امر کو اختیار کیا۔ اس طرح اس کی بنیاد بھی انتہائی رحمت کے غلبہ سے اختیار کے ظاہری لفظ پر نظر فرمانا تھی۔ اسی طرح یہاں واقع ہوا اس لئے وحی کے انتظار میں آپ نے خود آیت کی تفسیر ظاہر نہیں فرمائی، بلکہ ادب اور اطاعت کی تعلیم کے لئے ارشاد فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ اہل کتاب کی طرح ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) کہو؟ بلکہ تمہیں یہ کہنا چاہئے ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ (ہم نے سنا اور خوشی سے سنا۔ ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور آپ کی طرف لوٹنا ہے) چنانچہ صحابۂ کرام نے اس طرح کہا، لیکن جو معنی ان کی سمجھ میں آئے تھے ان کی بنا پر اطاعت کا عہد کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی اور جسم پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اگلی دو آیتیں نازل فرمادیں، جن میں سے ایک میں مسلمانوں کی مدح اور دوسری میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر ارشاد فرمادی۔ جس کو بعض آیتوں میں منسوخ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ پہلے کے بزرگوں میں مراد کی وضاحت کو بھی نسخ کہہ دیا کرتے تھے، اس تقریر سے آیت کا ربط بھی ظاہر ہو گیا۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ: اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مؤمنین بھی۔ سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے سنا اور

خوشی سے مانا، ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

مؤمنوں کی مدح وستائش:

رسول (ﷺ) اس چیز (کے حق ہونے) کا اعتقاد رکھتے ہیں جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مؤمن بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کا عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ (کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور ان کا پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا، اس طور پر کہ کہتے ہیں) کہ اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھتے) میں تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں، کسی کو نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے قبول کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں۔ اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے۔

تفسیر: احقر کے ذوق میں اس مقام پر صرف مؤمنوں کی مدح فرمانا مقصود ہے، لیکن ان کی مدح کی تقویت کے لئے ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو بھی شامل کر دیا، جس میں اس طرف اشارہ ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا کامل ہونا تو بلاشبہ یقینی ہے، اسی طرح ان صحابہ کا ایمان بھی کامل ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کا ذکر رسول کے ایمان کے ذیل میں کیا جائے، اگرچہ دونوں کا کامل ہونا ایک درجہ میں نہ ہو کہ صحابہ کا ایمان کامل ہے اور آپ (ﷺ) کا اکمل یعنی بہت ہی کامل۔ ناقص کسی کا نہیں۔ یہ مدح تو جملہ معترضہ کے طور پر تھی، آگے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر وتوضیح ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر جو اس کی طاقت میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔

مضمون ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا﴾ کی توضیح:

(یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا۔ اس سے مراد امور اختیاری نہیں بلکہ صرف اختیاری امور مراد ہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو (احکام شرعیہ میں) مکلف نہیں بناتا (یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اس کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو۔ اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس

پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادے سے کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا۔ اور جس کے ساتھ قصد و ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ اور چونکہ وسوسے طاقت سے خارج ہیں، اس لئے ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا اور نہ ان پر عذاب رکھا)

تفسیر: اس بیان سے اوپر کے مضمون کی اچھی طرح توضیح ہوگئی اور شبہ بھی بالکل زائل ہوگیا، اور حدیث سے اس کی مزید توضیح ہوگئی کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: حق تعالیٰ نے میری امت سے ان باتوں سے درگذر فرمایا ہے جو دل میں خیالات پیدا ہوں جب تک ان پر عمل نہ کرے یا تکلم نہ کرے (بخاری) اور عمل، فعل اختیاری کو کہتے ہیں۔ اس میں افعالِ قلبی اختیاری بھی داخل ہو گئے۔

اور یاد رکھو کہ یہاں ثواب وعقاب کا جو مدار کسب واکتساب پر رکھا ہے اس سے وہ ثواب وعقاب مراد ہے جو بطور ابتدا کے ہو۔ تسبب یا ہبہ کے واسطہ سے انجام پانے والا مراد نہیں، کیونکہ دوسری نصوص سے ثابت ہے کہ نیک یا بد کام شروع کرنے والوں کو اس عمل کو آئندہ کرنے والوں کے عمل کی وجہ سے ثواب وعقاب ہوگا۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ طاعت کر کے دوسرے کو ثواب بخش دینے سے بھی ثواب ملے گا۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ ثواب وعقاب بطور ابتدا یعنی بلاواسطہ نہیں بلکہ سبب اور بانی بن جانے کے واسطہ سے یا ہبہ کر دینے کے واسطہ سے ہے۔ لہٰذا اب شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ ان صورتوں میں دوسرے کے اکتساب سے ثواب یا عقاب کیسے ہوگیا؟ خصوصاً سبب بننا تو حقیقت میں خود بھی اختیاری ہے۔ البتہ ہبہ کے بعد ثواب کا مل جانا یہ جس کو ہبہ کیا گیا ہے اس کا اختیاری نہیں اور بطور ابتدا بھی نہیں ہے۔ اس سے سورۂ والنجم کی آیت ﴿ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى ﴾ کا اشکال بھی جاتا رہا یعنی وہ حصر بھی بطور ابتدائے ثواب کے ہے۔ اور اس مقام پر یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ فائدہ کا انکار عقاب کی نفی ہے نہ کہ ثواب کی نفی۔ چنانچہ بغیر اکتساب کے ثواب مل جانے سے متعلق چار جواب ہوئے۔ دو سبب بننے میں: اول ابتدا کی قید، دوسرے سبب بننے کا اختیاری ہونا۔ اور دو ثواب کے ہبہ کرنے میں: اول ابتدا کی قید جو یہاں اور سورۂ والنجم میں عام ہے۔ دوسرے فائدہ کی خصوصیت جو اس مقام کے ساتھ خاص ہے۔ اور بغیر اکتساب کے عذاب ہونے کے دو جواب ہو گئے یعنی ابتدا کی قید اور سبب بننے کا اختیاری ہونا۔

غیر اختیاری امور کی نہ تکلیف ہے نہ ثواب وعقاب:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ اور ﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ ﴾ دونوں جملوں کے مدلول سے قاعدہ کلیہ ثابت ہوا کہ غیر اختیاری امر کی نہ تکلیف ہے یعنی نہ اس کا مکلف بنایا گیا ہے اور نہ ہی اس پر اخروی عذاب ومواخذہ ہے، اور جس طرح اس قاعدہ میں غیر اختیاری قلبی امور داخل ہیں اسی طرح غیر اختیاری ظاہری افعال بھی داخل ہیں، ان افعال کی طرح جو خطا یعنی غلطی

سے یا بغیر ارادہ وقصد کے یا نسیاناً یعنی بھول سے صادر ہو جائیں، کیونکہ اہتمام کے باوجود یاد نہ رہنا بھی اختیار سے خارج ہے۔

اس طرح اس قاعدہ کے تحت دو قسمیں داخل ہوئیں: پہلی نوع کا ذکر تو جزوی طور پر مقام مقصود ہونے کی وجہ سے اور کلی طور پر قاعدہ کی کلیت کی وجہ سے: دونوں طرح ہو چکا۔ اور دوسری نوع کا ذکر صرف کلی طور پر قاعدہ کی کلیت کے وجہ سے ہوا ہے، اس لئے جزوی طور پر بھی اس کا ذکر فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ چند دیگر مناسب مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں اور ان سب کو دعا کے پیرایہ میں وارد کیا ہے۔

چنانچہ ان میں سے جن چیزوں کا پہلے سے وعدہ نہیں ہوا اور ان کے واقع ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہے ان کو تو دعا کی صورت میں لانے کی وجہ ظاہر ہے اور جن چیزوں کا واقع ہونا یقینی ہے، جیسے خطا و نسیان یعنی غلطی اور بھول چوک پر مواخذہ نہ ہونا کہ اوپر قاعدہ کلیہ سے اور حدیث میں صریح عنوان سے اس کا وعدہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت سے خطا و نسیان اور جس فعل پر جبر و زبردستی ہو سب اٹھا لئے گئے ہیں یعنی ان پر گناہ نہیں ہوتا جیسا کہ روح المعانی میں طبرانی سے روایت ہے اور کہا کہ نووی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

احقر کے ذوق میں ان کو دعا کی صورت میں لانے کی وجہ زمانۂ نبوت تک تو یہ ہے کہ اگرچہ تجاوز کا وعدہ ظاہراً مطلق ہے مگر اس کی بنیاد صرف یہی ہے کہ بندہ کو اس کا مکلّف نہیں کیا گیا اور مکلّف ہونا نہ ہونا یہ شرعی حکم ہے اور شرعی حکم میں نسخ کا احتمال ہر وقت رہتا ہے، پس اس دعا کا حاصل یہ ہوگا کہ یا اللہ جس طرح اب تک اس کا مکلّف نہیں بنایا، آئندہ بھی مکلّف نہ بنائیے۔ اور اس حکم کو منسوخ نہ فرمائیے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر منسوخ ہوگا تو تکلیف مالا یطاق یعنی ایسے امر کا مکلّف بنانا جس کی طاقت وقدرت نہ ہو: لازم آئے گا اور وہ عقلاً جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق کا عقلاً ممنوع ہونا قابلِ تسلیم نہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر اور مالک ہے، البتہ شرعاً ممنوع ہے، اس لئے نسخ سے وہ ممانعت دور ہو جاتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ جب وہ کام ہو نہیں سکے گا تو اس کا مکلّف کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ حکمت کے خلاف ہوگا، اگرچہ قدرت میں داخل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو حکمت، عمل میں منحصر نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ جس طرح دنیا میں خطا و نسیان کو بعض آثار کے اعتبار سے کالعدم قرار نہیں دیا۔ چنانچہ قتل خطا پر کفارہ کا حکم دیا گیا ہے اور بھول کر بات کر لینے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس پر آخرت میں بعض آثار مرتب ہوتے ہوں، مثلاً اس لئے محاسبہ ہونا کہ بندہ کو اپنا مملوک محض ہونا ظاہر ہو جائے، پھر معذرت کے بعد معاف کر دیں تو علم کا افادہ خود یہ فائدہ اور حکمت قابل ذکر ہے۔ اور اگر عمل ہی کو فائدہ سمجھا جائے تو بھی ممکن ہے کہ خطا اور نسیان کے اور اس طرح وسوسوں اور اندیشوں کے جتنے مرتبے معاف کئے گئے ہیں ان میں بعض اختیاری ہوں چنانچہ غور و فکر سے یہی معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان کا مکلّف بنانے میں کوئی

اشکال نہ تھا۔

اور حدیثوں میں جو عن امتی کی قید لگائی گئی ہے اس سے سابق مراتب کے بعض درجات میں مکلف ہونے کی بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ ورنہ محض تکلیف مالایطاق کی نفی تو تمام امتوں کو لفظ 'نفسا' سے عام معلوم ہوتی ہے، یہ وجہ تو نبوت کے زمانہ میں معلوم ہوتی ہے اور نبوت کے زمانہ کے بعد محض گذشتہ نعمتوں کی یاد دہانی ہے کہ دیکھو ہم نے اس طرح فضل کیا تھا کہ دعا سکھائی تھی اور پھر اس کو قبول کیا تھا۔ اور اپنا سابق حکم منسوخ کیا تھا جس کی بدولت وہ آسانی آئندہ بھی ہمیشہ کے لئے جاری ہے۔ واللہ اعلم۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

ع ۴۰

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگذر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

دعا کی تعلیم:

اے ہمارے رب! ہم پر مواخذہ و گرفت نہ فرمایئے، اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے بھول چوک ہو جائے (اور ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب! اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (ذمہ داری و تکلیف کا دنیا یا آخرت میں) نہ ڈالئے جسے ہم نہ اٹھا سکیں اور ہم سے درگذر کیجئے اور ہمیں بخش دیجئے اور ہم پر رحم کیجئے۔ آپ ہمارے کارساز (سارے کام بنانے والے) ہیں (اور کارساز طرف دار و حمایتی ہوتا ہے) اس لئے آپ ہمیں کافروں پر غالب کیجئے۔

تفسیر: ان جملوں میں نسیان و خطا کا جملہ تو ظاہراً اوپر کے مضمون کا تتمہ ہے جیسا کہ اوپر اس کی تقریر گذر چکی اور جملہ ﴿ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ ﴾ بھی غور کرنے سے دلالۃ النص کے مرتبہ میں ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ کا تتمہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ گذشتہ امتوں جیسے دشوار اور مشکل احکام جبکہ انسانی وسعت و قدرت میں داخل ہیں، جیسا کہ مشاہدہ اور ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ کے مضمون کے صادق ہونے کا وجوب اس کی دلیل ہے اور اس کے مکلف نہ بنانے کی دعا کی گئی ہے تو مالایطاق

کے مکلف نہ بنانے کی دعا بدرجۂ اولیٰ لازم آگئی۔

یہ مذکورہ بالا جملے تو شریعت کی تکلیف کے اعتبار سے ہوئے۔ اب آگے جملہ ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا﴾ میں تکوینی تکلیف سے بچنے کی دعا ہے۔ جس میں دنیا اور آخرت کی تمام مصیبتیں اور عقوبتیں داخل ہوگئیں۔

جب دونوں قسم کی تکلیفوں کے متعلق دعا ہو چکی تو آگے ہر مضمون کے مقابلہ میں ایک ایک دعا لائی گئی چنانچہ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ سے خطا ونسیان وغیرہ سے تجاوز کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ سے اصرار کے ساتھ تکلیف نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ایسے احکام کے عادی لوازم سے عمل کا نہ ہوسکنا ہوگا۔ اور عمل نہ ہونے کا تقاضہ گنہگار اور عذاب میں مبتلا ہونا تھا۔ جو کہ ایک حد تک مغفرت میں خلل ڈالنے والا ہے۔ اس لئے مغفرت کی درخواست سے بالواسطہ طور پر حمل کا نہ ہونا لازم آگیا۔ اور ﴿وَارْحَمْنَا﴾ سے جن چیزوں کے اٹھانے کی طاقت نہیں ان کا بوجھ نہ ڈالنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ رحم کا یہی تقاضہ ہے پھر اپنی ذاتی مصلحتوں کے ختم ہونے کے بعد اپنے دشمنوں پر غلبہ کی دعا ہے، جس کی درخواست پر سارے معاملوں کی درستی کی تکمیل ہوگئی، یعنی محبوب کے ساتھ جو تعلق ہے وہ بھی درست ہوگیا اور دشمنوں کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ بھی اپنی منشا وخواہش کے مطابق ہوگیا۔

فائدہ: حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں قبول ہوئیں، بعض کے بارے میں تو ظاہر ہے اور بعض کے بارے میں اگر کوئی شبہ ہو تو اس کے لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر قبول نہ ہونے میں کسی وقت قبولیت سے زیادہ ظاہری یا باطنی مصلحت ہو تو وہ قبول نہ ہونا بھی قبول ہونا ہے، کیونکہ اصلاً قبول بالذات مقصود نہیں، بلکہ مقصود للمصلحت ہے اور ﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ﴾ کی تفسیر کو بھی ملاحظہ کرلیا جائے۔

سورۃ آل عمران مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس میں دو سو آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝

ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ الف، لام، میم، اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں اور وہ زندہ ہیں۔ سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں۔

ربط: اس سورت کا پہلی سورت کے ساتھ ربط سورۂ بقرہ کے ختم پر گذر چکا۔ چونکہ زبان اور ہتھیاروں سے جھگڑا جو کہ ربط کی وجہ ہے توحید کے معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے، اس لئے اس سورۃ کا آغاز توحید کے مضمون سے کیا ہے۔

توحید کا بیان:

﴿ الٓمّٓ ﴾ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود بنانے کے قابل نہیں اور وہ زندہ (جاوید) ہیں۔ سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں۔

تفسیر: اس مقام پر حی اور قیوم صفتیں لانے میں باطل معبودوں کے معبود نہ ہونے کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ ان میں یہ صفتیں نہیں ہیں اور جو کوئی ازل سے ابد تک موجود نہ ہو اور خود اپنی حفاظت میں دوسروں کی محتاج ہو، وہ معبود بننے کے لائق نہیں۔ کیونکہ عبادت کا مطلب خود کو انتہائی ذلیل کر کے پیش کر دینا ہے اور انتہائی ذلیل کر کے پیش کرنا اس کا حق ہے جس کو انتہائی عزت حاصل ہو اور انتہائی عزت اس کے لئے مخصوص ہے جو انتہائی درجہ کامل ہو۔ اور زندہ و باقی رہنے میں دوسرے کا محتاج ہونا انتہائی نقص و کمزوری ہے جو انتہائی عزت کے منافی ہے، اس لئے انتہائی ذلیل کر کے پیش کرنا اس کا حق نہیں ہو سکتا۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے۔ واقعیت کے ساتھ، اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان

کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکی ہیں اور بھیجا تھا توریت اور انجیل کو، اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے اور اللہ تعالیٰ نے بھیجے معجزات۔

ربط: آگے توحید کی دلیل نقلی بیان کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام کتبِ الٰہیہ، جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور ان انبیاء کی خبریں۔ جن کا نبی ہونا معجزوں سے ثابت ہے۔ توحید پر متفق ہیں۔ اور اس استدلال کے ضمن میں ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ سے نبوت محمدیہ کے ثابت ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔

کتابوں اور انبیاء کی حقانیت کا اثبات:

اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے، واقعیت کے ساتھ اس کیفیت کے ساتھ کہ وہ ان (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے (نازل) ہو چکی ہیں اور (اسی طرح) اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے واسطے توریت اور انجیل بھیجی تھیں (اور اسی سے قرآن کا ہدایت ہونا بھی لازم آگیا کیونکہ ہدایت کا مصداق راہ نمائی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کی تصدیق کے واسطے) معجزات بھیجے [1]

> اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

ترجمہ: بے شک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے، ان کے لئے سزا سخت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غلبہ والے ہیں بدلہ لینے والے ہیں۔

ربط: اس آیت میں توحید کے منکروں کے لئے وعید ہے: بے شک جو لوگ اللہ کی (ان) آیتوں کا انکار کرنے والے ہیں (جو توحید پر دلالت کرتی ہیں) ان کے لئے سخت سزا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غلبہ (اور قدرت) والے ہیں (کہ بدلہ لے سکتے ہیں) اور بدلہ لینے والے (بھی) ہیں۔

تفسیر: یعنی انتقام کا ممکن ہونا اور واقع ہونا دونوں ثابت ہیں۔

> اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہ ایسی ذات ہے کہ تمہاری صورت بناتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بجز اس کے وہ غلبہ والے ہیں، حکمت والے ہیں۔

(۱) بیضاوی میں جو احتمالات مذکور ہیں ان میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ فرقان سے مراد معجزات ہیں ۱۲ منہ

مضمونِ توحید کا تتمہ:

بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے (نہ کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں۔ (اس طرح ان کا علم بھی نہایت کامل ہے) وہ ایسی (پاک) ذات ہے کہ تمہاری صورت (شکل) جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے (کسی کی کیسی صورت اور کسی کی کیسی۔ اس طرح ان کی قدرت بھی کامل ہے اور اس طرح حیات یعنی زندگی اور قیومیت یعنی سنبھالنے کی اہلیت اور علم اور قدرت جو تمام صفات میں سب سے اہم اور اعلیٰ و بنیادی ہیں، ان میں کامل طور سے بغیر کسی کی شرکت کے موجود ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ) اس (ذات پاک) کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (اور) وہ غلبہ والے ہیں (توحید کا انکار کرنے والے سے انتقام لے سکتے ہیں، لیکن) حکمت والے (بھی) ہیں (کہ مصلحت کے تحت دنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے)

فائدہ: روح المعانی میں ابن جریر کی روایت سے ربیع سے نقل کیا گیا ہے کہ کچھ نصاری حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذہبی گفتگو شروع کی۔ آپ نے اپنی مفصل تقریر میں تثلیث یعنی تین خدا ماننے کو باطل ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دائمی حیات اور کامل قیومیت اور قدرتِ تخلیق میں متفرد ہونے سے استدلال فرمایا اور یہ سب باتیں انہیں ماننی پڑیں۔

> هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڱ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ: وہ ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں کتاب کا، اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے شورش ڈھونڈھنے کی غرض سے۔ اور اس کا مطلب ڈھونڈھنے کی غرض سے حالانکہ اس کا مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں، سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

ربط: جب توحید ثابت ہو چکی تو اس سے تثلیث بھی باطل ہو گئی۔ پھر بھی بعض توحید کے منکر وہم میں ڈالنے والے خلاف توحید کلمات سے استدلال کر سکتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مناظرہ میں بعض نصاری نے لفظ روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے جو کہ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں، اپنے مقصد کے لئے الزامی طور پر استدلال کیا تھا، جیسا کہ روح المعانی میں

در منثور سے ابن ابی حاتم وابی جریر کی روایت سے ربیع سے نقل کیا ہے۔ اس آیت میں اس شبہ کا جواب ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کلمات کہ جن کی مراد واضح نہیں، دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں، کیونکہ عقائد کا مدار واضح نصوص پر ہیں اور خفی مراد والی باتوں پر جبکہ ان کی تفسیر معلوم نہ ہو اجمالی طور پر ایمان لے آنا واجب ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تفتیش کی اجازت نہیں۔

آیات کی دو قسمیں: محکم اور متشابہ اور لوگ بھی دو طرح کے: پختہ علم والے اور فتنہ پرور:

وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی، جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو معنی و مراد کے اعتبار سے شک وشبہ سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آیتیں (اس) کتاب (یعنی قرآن) کی بنیادی آیات ہیں یعنی جن کے معنی ظاہر نہیں، ان کو بھی ظاہر معنی والی آیتوں کے مطابق بنایا جاتا ہے) اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جن کی مراد مشتبہ ہے (یعنی ان کا مطلب خفی ہے خواہ مجمل ہونے کی وجہ سے خواہ کسی ظاہر مراد والی نص کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے) تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے۔ وہ (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد) کا غلط مطلب ڈھونڈھنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مدد حاصل کریں) اس کے اسی حصہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جن کی مراد مشتبہ ہے۔ حالانکہ اس کا (صحیح) مطلب حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (ہاں اگر وہ خود قرآن یا حدیث کے ذریعہ سے صراحت کے ساتھ یا اشارہ سے بتادیں جیسے لفظ صلوٰۃ کی مراد صراحت سے معلوم ہوگئی اور استواء علی العرش وغیرہ کی تاویل بعض اہل علم کی رائے پر قواعد کلیہ سے معلوم ہوگئی تو بس اسی قدر دوسروں کو بھی خبر ہو سکتی ہے۔ زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا، جیسے مقطعات کے معنی کسی کو معلوم نہیں ہوئے اور بعض کی رائے میں استواء علی العرش وغیرہ کے معنی بھی معلوم نہیں ہوئے) اور (اس واسطے) جو لوگ علم (دین) میں پختہ (اور سمجھ دار) ہیں، وہ (ایسی آیتوں کے سلسلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالی طور پر) یقین رکھتے ہیں۔ سب (آیتیں ظاہر معنی والی بھی اور خفی معنی والی بھی) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں (اس لئے ان کے جو بھی کچھ معنی اور مراد واقعی شکل میں ہو، وہ حق ہے) اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہوں۔ نقصان دینے والی اور فضول باتوں میں نہ لگیں)

فائدہ: روح اللہ اور کلمۃ اللہ بھی لغت کے لحاظ سے ایسے ہی متشابہ کلمات ہیں، لیکن شرعی اور عقلی قواعد کی مدد سے ثابت ہوگیا کہ اس سے مجاز مراد ہے، حاصل مراد یہ ہے کہ روح والے کا وجود اللہ کے حکم اور اس کے کلمۃ سے ہوا۔ اس طرح یہ تاویل حق ہوگی اور اس کے خلاف جیسا کہ مخالفین نے مذکورہ بالا مناظرہ میں سمجھا تھا: باطل ہے۔

اضافہ: متشابہ اور محکم کی بحث میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ایک طویل حاشیہ لکھا ہے، اور اس کا نام رکھا ہے:

التواجه بما یتعلق بالمتشابه، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

قرآنِ کریم میں جو لفظ متشابہ ہے وہ معروف (اصطلاحی) متشابہ سے عام ہے، منصوص متشابہ کی تعریف یہ ہے کہ اس کی مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ـــ اور بعض کے قول میں: اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے سوا ـــ کسی کو حتمی اور یقینی طور پر معلوم نہ ہو، اور جس لفظ کی مراد مجاز یا کنایہ کے مشہور ہونے کی بنا پر معلوم ہو وہ متشابہ نہیں، اگرچہ اس کے اصلی معنی میں کوئی دشواری لازم آتی ہو۔

پھر متشابہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک: یہ کہ اس کے لغوی معنی بھی کسی کو معلوم نہ ہوں، جیسے حروف مقطعات، اس میں خاموشی اختیار کرنا اور معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا واجب ہے۔

دوم: یہ کہ اس کے لغوی معنی معلوم ہوں، لیکن کسی عقلی یا نقلی خرابی کی وجہ سے اسے مراد نہ لے سکیں۔

پھر اس قسم دوم کی دو قسمیں ہیں:

ایک: یہ کہ اس کے لغوی معنی ایک ہی ہوں: جیسے سمع، بصر، اور کلام، ان کی سب کے نزدیک تفسیر جائز ہے، مگر اس قید کے ساتھ کہ یہ صفات ہماری صفات کی طرح نہیں۔

دوم: اس کے لغوی معنی کئی ہوں، یعنی وہ لفظ مشترک ہو یا احتمال ہوں۔

پھر اس قسم دوم کی دو قسمیں ہیں:

ایک: یہ کہ ان معانی اور وجوہ میں سے کسی دلیل سے ایک معنی کو ترجیح نہ دی گئی ہو، نہ قطعی شکل میں نہ ظنی شکل میں، اس میں بھی خاموشی اختیار کرنا واجب ہے، اس کی مثال اس وقت ذہن میں نہیں ہے، البتہ امام صاحب سے مروی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ دُہر کیا ہے؟

دوم: یہ کہ کسی ایک معنی کو ترجیح دی گئی ہو، خواہ دلیل قطعی سے یا دلیل ظنی سے، اس میں اگر منصوص لفظ ہی استعمال کریں تو جواز میں کوئی اختلاف نہیں، جیسے استواء کا ترجمہ نہ کیا جائے، نہ اس کے مشتقات استعمال کئے جائیں، اور یہ قید بڑھا دی جائے کہ إستواءً ا یلیق به تو جائز ہے، یہی جمہور مفسرین کا طریقہ ہے، اور ائمہ کے قول: الإستواء معلوم، والكيف مجهول، والإيمان به واجب، والسوال عنه بدعة کا یہی محمل ہے۔

اور اگر ایسے لفظ سے تفسیر کی جائے جو منصوص نہیں، جیسے استواء کی تفسیر استقرار یا علو سے کرنا تو اس میں دو مسلک ہیں:

ا۔ سلف کا مسلک: تنزیہ مع التفویض ہے، یعنی لفظ کو حقیقی معنی ہی پر محمول کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ اللہ کا سمع و بصر اور استواء بندوں کے سمع و بصر اور استواء کی طرح نہیں ہے، پھر وہ صفات کیسی ہیں؟ اس کو اللہ کے حوالے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی صفات کی نوعیت بہتر جانتے ہیں، اور اس مسلک کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے

مضامین کی عام تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، اور عام تبلیغ بغیر ترجمہ کے نہیں ہوسکتی، پس اگر ترجمہ میں اصل منصوص لفظ ہی استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی محذور نہیں۔

۲-خلف کا مسلک: تنزیہ مع التاویل ہے، مگر یہ بیمار اذہان کی تشفی کے لئے ہے، یعنی صاف کہا جائے کہ اللہ کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں، پھر اس صفت کی اللہ کے شایانِ شان تاویل کی جائے، یعنی درجۂ احتمال میں اس کا مطلب بیان کیا جائے کہ استواء سے مراد استیلاء (استقرار) یا علو (بلندی) ہے تو یہ جائز ہے۔

اس کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے تین تنبیہات پر رسالہ ختم کیا ہے، جو مکمل بیان القرآن کے حاشیہ پر چڑھا ہوا ہے، وہاں قارئین ملاحظہ فرماسکتے ہیں (تلخیص از سعید احمد پالن پوری)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ ع

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ آپ ہم کو ہدایت کر چکے ہیں۔ اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرمایئے، بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو جمع کرنے والے ہیں، اس دن میں جس میں ذرا شک نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف نہیں کرتے وعدہ کو۔

ربط: ان آیتوں میں ان حق پرستوں کے دوسرے کمال کا ذکر ہے کہ حق تک پہونچنے کے باوجود اس پر نازاں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حق پر قائم رہنے کی دعا کرتے ہیں۔

حق پرستوں کی دعا:

اے ہمارے پروردگار! آپ ہمیں (حق کی طرف) ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھا پن پیدا نہ کیجئے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت (خصوصی) عطا فرمایئے۔ (وہ رحمت یہ ہے کہ ہم راہِ مستقیم پر قائم رہیں) بیشک آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کجی سے بچنے اور حق پر قائم رہنے کی یہ دعا کسی دنیوی غرض سے نہیں مانگتے، بلکہ محض آخرت کی نجات کے واسطے مانگتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ بیشک اس دن تمام لوگوں کو (حشر کے میدان میں) جمع کرنے والے ہیں۔ جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں (یعنی قیامت کے دن میں۔ اور شک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے (اس لئے قیامت کا آنا لازمی ہے اور ہمیں اس کی فکر ہے)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاُولٰٓئِكَ

هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿۱۰﴾ كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں، ہرگز ان کے کام نہیں آسکتے ،ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی۔ اور ایسے لوگ جہنم کا سوختہ ہوں گے۔ جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے لوگوں کا۔ کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے دارو گیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب سے اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ آپ ان کفر کرنے والوں سے فرمادیجئے کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے۔ اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ربط: یہاں تک زبان سے بحث و مباحثہ اور جھگڑے کا بیان تھا۔ اب ہتھیاروں کے ذریعہ مقابلہ کا بیان ہے اور موت کا لقمہ بننے اور ماتحت آنے کی وعید ہے جو واضح طور پر اس آیت میں بیان کی گئی ہے ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور اس سے پہلے کی آیت تمہید کے طور پر ہے۔

منکرین کے لئے دونوں جہاں میں ذلت و رسوائی کی وعید:

یقینی بات ہے کہ جو لوگ کفر کرتے ہیں، ان کے مال (و دولت) اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ذرا بھی کام نہیں آسکتے اور ایسے لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے (ان کا معاملہ ایسا ہے) جیسا معاملہ فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے (کافر) لوگوں کا تھا (وہ معاملہ یہ تھا) کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو (یعنی خبروں اور احکام) کو جھوٹا بتایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان سے مواخذہ فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ (کی گرفت بڑی سخت ہے، کیونکہ ان کی شان یہ ہے کہ وہ) سخت سزا دینے والے ہیں (اسی طرح ان لوگوں کا معاملہ ہوا کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ اس لئے ان کو بھی ایسی ہی سزا ہوگی۔ اور) آپ ان کفر کرنے والوں سے (یوں بھی) فرمادیجئے کہ (تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ گرفت صرف آخرت میں ہوگی بلکہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہوگی۔ چنانچہ دنیا میں) عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کئے جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے اور (جہنم) برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر: مقابلہ میں کام آنے کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے عوض صرف مال و اولاد نافع اور کافی ہوجائیں۔ دوسرے یہ کہ مال و اولاد اللہ تعالیٰ کے مد مقابل ہو کر ان کے عذاب سے بچالیں۔ مقابلہ کا لفظ دونوں جگہ بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت میں دونوں معنی کی نفی کر دی گئی۔

اور آیت میں کفار سے مراد خاص کفار ہیں، جن سے یہ خطاب ہوا تھا۔ چنانچہ مشرکوں پر قتل اور قید کی مصیبت اور

یہودیوں پر قتل وقید کے ساتھ جزیہ اور جلا وطنی کی بھی عقوبت واقع ہوئی۔اس لئے یہ شبہ نہیں کرنا چاہئے کہ دنیا میں سب کفار تو مغلوب نہیں پائے جاتے۔اور رہی آخرت کی سزا تو وہ سب کفار کے لئے لازم ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۚ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: بے شک تمہارے لئے بڑا نمونہ ہے دو گروہوں میں جو کہ باہم ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تھے۔ایک گروہ تو اللہ کی راہ میں لڑتے تھے اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے۔یہ کافر اپنے کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصے ہیں، کھلی آنکھوں دیکھنا۔اور اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دے دیتے ہیں۔بلاشک اس میں بڑی عبرت ہے بینش والے لوگوں کو۔

اوپر کفار کے مغلوب ہونے کی خبر دی گئی ہے۔اب اس کی ایک کافی نظیر دلیل کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں: بیشک تمہارے (استدلال کے) لئے بڑا نمونہ ہے۔دو گرہوں (کے واقعہ) میں جو کہ (بدر کی لڑائی میں) ایک دوسرے کے مد مقابل ہوئے تھے۔(ان میں سے) ایک گروہ تو (یعنی مسلمان) اللہ کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے (اور کافر اتنے زیادہ تھے کہ) یہ کافر اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے کہ (وہ) ان مسلمانوں سے کئی گنا (زیادہ) ہیں (اور دیکھنا بھی کچھ وہم اور خیال کا نہیں بلکہ) کھلی آنکھوں سے (دیکھنا کہ جس کے واقعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔لیکن ان کے اتنی زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا) اور (غالب و مغلوب کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے) اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیدیتے ہیں۔چنانچہ بلاشبہ اس میں نظر والوں کے لئے بڑی عبرت (اور نمونہ) ہے۔

تفسیر: روایات کے مطابق اس دن مسلمان تین سو تیرہ اور کفار ایک ہزار تھے۔گویا کفار مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے۔اس آیت میں اس کثرت کو بیان فرمایا ہے کہ کفار خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہمارا گروہ زیادہ ہے مگر پھر بھی انجام دیکھ لیا کہ مسلمان ہی غالب رہے۔اس سے ہر انصاف پسند، صاحب عقل و شعور استدلال کر سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو کفار کی کثرت اور دولت و ثروت اس کو روک نہیں سکتی۔

اور سورۂ انفال میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اول اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ ﷺ کے خواب میں کفار کی تعداد کم دکھائی تھی کہ آپ مسلمانوں سے خواب بیان فرما دیں تو مقابلہ کی جرأت و ہمت بڑھے، پھر جب دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل آئے تب بھی مسلمانوں کو کفار کم معلوم ہوئے، جبکہ کفار کو بھی مسلمان کم معلوم ہوئے تا کہ مقابلہ ہو جائے۔پھر اللہ

تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کر دیا۔

اس مقام پر دو امر قابل تحقیق ہیں: اول یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا خواب خلافِ واقعہ کیوں ہوا اور اس طرح مسلمانوں کا کفار کو کم دیکھنا بھی خلافِ واقعہ تھا۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر ہزار میں سے مثلاً سو دو سو دکھائے جائیں اور آٹھ سو نو سو چھپا دیئے جائیں تو اس کو خلافِ واقعہ دیکھنا نہیں کہہ سکتے۔ خلافِ واقعہ کہتے ہیں: غلط دیکھنے کو۔ یہاں تو بعض کو نہ دیکھنا تھا، غلط دیکھنا نہ تھا۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ کفار کو مسلمانوں کا کم معلوم ہونا جو سورۂ انفال میں مذکور ہے اور کفار کا خود اپنی جماعت کو مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ دیکھنا جو اس مقام پر مذکور ہے۔ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے (یعنی دونوں باتیں واقعہ کے مطابق ہیں)

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی، عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے، سونے اور چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔ یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

ربط: اوپر آیت: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ﴾: میں اموال اور اولاد کا آخرت میں کام نہ آنا بیان فرمایا تھا۔ جس سے ان چیزوں کا بے قدر و قیمت ہونا لازم آیا تھا۔ اب اسی لازم کو وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ اور اس کے بعد آخرت کی نعمتوں کا قابل قدر و رغبت ہونا اور ان نعمتوں کا تقویٰ کی بدولت حاصل ہونا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس کے بعد کسی قدر تقویٰ کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد ایمان کے شعبے مثلاً: مناجات وصبر وصدق وقنوت وانفاق واستغفار کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ چند مضامین اسی ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔

دنیوی لذتوں کا بے قدر و قیمت ہونا:

(اکثر) لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے نشان لگے ہوئے گھوڑے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب دنیوی زندگی کی استعمال کی چیزیں ہیں۔ اور انجام کار خوبی (کی چیز) تو اللہ ہی کے پاس ہے (جو موت کے بعد کام آئے گی، جس کی تفصیل اگلی آیت میں آ رہی ہے)

تفسیر: یہ جو فرمایا کہ ان چیزوں کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے، میرے ذوق میں اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ محبت

ومیلان اکثر و بیشتر فتنہ کا سبب بن جانے کی وجہ سے خطرہ کی چیز تھی، مگر اکثر لوگ اس کو نقصان دینے والی نہیں سمجھتے، بلکہ اس میلان کو مطلقاً اچھا سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ: آپ فرما دیجئے! کیا میں تم کو ایسی چیز بتلادوں جو بہتر ہے ان چیزوں سے؟ ایسے لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں ان کے مالک کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے پائیں میں نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور ایسی بیبیاں ہیں جو صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں بندوں کو۔

آخرت کی نعمتوں کی نفاست:

آپ (ان لوگوں سے یہ) فرما دیجئے! کیا میں تمہیں ایسی چیز بتادوں جو ان (مذکورہ) چیزوں سے (بدرجہا) بہتر ہو (تو سنو) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے ہیں (تقوی اختیار کرتے ہیں) ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے ایسے باغ یعنی بہشت وجنت ہیں، جن کے نیچے نہریں جارہی ہیں (یہ لوگ) ان (جنتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان کے لئے) ایسی بیویاں ہیں جو (ہر طرح) صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لئے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشنودی ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں (کے حال) کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے ڈرنے والوں یعنی متقیوں کو یہ نعمتیں دیں گے۔ آگے ان متقیوں یا ڈرنے والوں کی کچھ تفصیلی صفات بیان کی جاتی ہیں)

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

ترجمہ: ایسے لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کردیجئے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچالیجئے۔ صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور فروتنی کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور اخیر شب میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

متقیوں کے کچھ اوصاف:

(متقی: ایسے لوگ ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، اس لئے آپ ہمارے گناہوں کو

معاف کردیجئے۔ اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راست باز سچے ہیں۔ اور (اللہ تعالیٰ کے سامنے) عاجزی کرنے والے ہیں اور (نیک کاموں میں مال) خرچ کرنے والے ہیں۔ اور رات کے آخری حصہ میں (اٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

تفسیر: یہ کہنا کہ ہم ایمان لے آئے، اس لئے آپ ہمارے گناہوں کو معاف کردیجئے، اس وجہ سے ہے کہ بغیر ایمان کے مغفرت نہیں ہوتی۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ ہم اس کفر کو اپنے آپ سے دور کرچکے جو ہمیشہ کی مغفرت کے لئے رکاوٹ ہے۔ اب آپ ہمیں معاف کردیجئے، خواہ ابتدائی مرحلہ ہی میں یا بعد کے مرحلہ میں اور رات کے آخری حصہ کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس وقت اٹھنے میں مشقت بھی ہے اور وہ قبولیت کا وقت بھی ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ﴿۱۸﴾

ترجمہ: گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی کہ بجز اس ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور اہلِ علم نے بھی، وہ اس شان سے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں۔ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

ربط: سورت کے شروع میں نصاریٰ کے مقابلہ ومناظرہ میں توحید کو ثابت اور تثلیث کو باطل کیا گیا ہے، پھر درمیان کے مضامین اسی کی مناسبت سے لائے گئے تھے۔ اب توحید کے اسی مضمون کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے بعد کی آیتوں میں اسلام کے حق ہونے کی وضاحت اور اہل کتاب کے ساتھ حجت بازی ومقابلہ آرائی کو بیان کیا گیا۔ پھر حق کو قبول نہ کرنے والوں کی مذمت اور اس کے مقابلہ میں اہل اسلام کے غلبہ کی پیشین گوئی اور اس کے بعید ہونے کو قدرتِ کاملہ ثابت کرکے ختم کرنا۔ پھر مؤمنوں کو کفار کی دوستی سے ممانعت، پھر رسول کی اتباع کے بغیر توحید کا معتبر نہ ہونا، پھر رسول اللہ ﷺ کی رسالت ومحبوبیت کی تائید کے لئے چند مقبول شخصیتوں کے قصے۔ یہ سب مضامین اس پارہ کے تین پاؤ تک ترتیب کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور ان امور کے بیان سے دور تک کا ربط معلوم ہوگیا۔

مضمونِ توحید کی طرف رجوع:

اللہ تعالیٰ نے اس (مضمون) کی (آسمانی کتابوں میں) گواہی دی ہے کہ اس ذات (پاک) کے علاوہ کوئی بھی معبود ہونے کے لائق نہیں ہے۔ اور فرشتوں نے بھی (اپنے ذکر وتسبیح میں اس کی) گواہی دی ہے۔ کیونکہ ان کے ذکر: توحید سے بھرے ہوئے ہیں) اور (دوسرے) اہل علم نے بھی (اپنی تقریروں وتحریروں میں اس کی گواہی دی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے) اور وہ معبود بھی اس شان کے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں۔ (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان

کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔ وہ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔

تفسیر: آیت میں الفاظ ﴿ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ﴾ فرمائے گئے ہیں۔ جن کا ترجمہ ہم نے اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے کیا ہے۔ اس قائم بالقسط کی صفت غالباً یہ ظاہر کرنے کے لئے بڑھائی ہے کہ وہ ایسے نہیں کہ صرف اپنی تعظیم وعبادت ہی کراتے ہوں، بلکہ وہ سب کے کام بھی بناتے ہیں۔ اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ دلیل تو نقلی ہے جو لوگ نقلی دلیلوں کو نہیں مانتے اور عقلی باتیں ہی کرتے ہیں ان پر یہ کیسے حجت ہوگی؟ کیونکہ یہ دلیل خاص اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے اور وہ بھی دلیل نقلی کے منکر نہیں تھے، جبکہ دلائل عقلی دوسرے مواقع پر موجود ہیں۔

> اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۛ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾

ترجمہ: بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اس کا حساب لینے والے ہیں۔

ربط کے لئے آیت ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ ﴾ سے پہلے کا بیان دیکھ لیجئے۔

اسلام کی حقانیت کی صراحت:

بلاشبہ (حق اور مقبول) دین، اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔ اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (اس طرح کہ دین اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو (اسلام کے حق ہونے کی) دلیل پہونچ چکی تھی۔ محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے (یعنی اسلام کے حق ہونے میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ ان میں دوسروں سے بڑا بننے کا مادہ ہے اور اسلام لانے میں یہ سرداری جو اب ان کو عوام پر حاصل ہے، فوت ہوتی تھی۔ اس لئے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ الٹا اس کو باطل بتانے لگے) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا (جیسا ان لوگوں نے کیا) تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اس کا حساب لینے والے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے حساب کا انجام عذاب ہوگا)

> فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ ع

ترجمہ: پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے حجتیں نکالیں تو آپ فرما دیجئے کہ میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی، اور کہئے اہل کتاب سے اور عرب سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ لوگ اسلام لے آویں

تو وہ لوگ بھی راہ پر آجاویں گے اور اگر وہ لوگ روگردانی رکھیں سو آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خود دیکھ لیں گے بندوں کو۔

ربط: اب اہل کتاب منکروں اور ان کے ساتھ عرب کے مشرکوں کے عناد سے پیدا ہونے والے انکار اور جھگڑے کا جواب ہے۔

عناد رکھنے والوں کے جھگڑے کا جواب:

(اسلام کے حق ہونے پر دلیل قائم ہونے کے بعد) اگر یہ لوگ پھر بھی (خواہ مخواہ کی) حجت بازی کریں، تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیروکار تھے وہ بھی (اپنا اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکے ہیں، رخ کرنا: کنایہ ہے اس امر کا کہ ہم سب اسلام اختیار کر چکے ہیں۔ جس میں اللہ کے معبود ہونے کے عقیدہ کے ساتھ دل کی توجہ خاص اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے، اور دوسرے مذاہب میں کچھ نہ کچھ شرک شامل ہو گیا تھا) اور (اس جواب کے بعد سوالیہ انداز میں) اہل کتاب سے اور اہل عرب (مشرکوں) سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ تو اگر وہ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہ راست پر آجائیں گے اور اگر وہ لوگ (اس سے بدستور) روگردانی جاری رکھیں تو (آپ اس کا بھی غم نہ کیجئے، کیونکہ) آپ کے ذمہ صرف (احکام خداوندی کا) پہونچا دینا ہے اور (آگے) اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں کو خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے۔ (آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہے)

فائدہ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ منکرین کے مقابلہ میں اتنا کہہ دینا کیسے کافی ہو سکتا ہے کہ "تم نہ مانو تو میں تو مان گیا" کیونکہ یہ ہر منکر کے مقابلہ میں نہیں فرمایا گیا، بلکہ خاص ان منکروں کے مقابلہ میں فرمایا گیا ہے جن کا انکار کسی واقعی شبہ کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ دلائل کے قائم ہو جانے کے بعد محض عناد اور عداوت کی وجہ سے تھا کہ جب انہیں کوئی شبہ ہی نہیں تو ان کے سامنے بار بار دلائل بیان کرنا بے کار ہے، ایسے میں یہی آخری جواب ہے کہ بھائی! مت مانو، ہم تو مان چکے۔ خوب سمجھ لو!

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝

ترجمہ: بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ایسے شخصوں کو جو اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں، سو ایسے لوگوں کو خبر سنا دیجئے ایک سزائے دردناک کی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے سب اعمال غارت ہو گئے دنیا میں اور آخرت میں اور ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

ربط: سورت کے شروع میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا، پھر مذکورہ بالا آیت میں ﴿ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ کے عنوان میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل تھے۔ اب اس آیت میں یہود کے کچھ خاص احوال بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں ابن ابی حاتم کی روایت سے اس آیت کی تفسیر میں خود حضور ﷺ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے تینتالیس نبیوں کو ایک وقت میں قتل کیا۔ انہیں نصیحت کرنے کے لئے ایک سو ستر بزرگ کھڑے ہوئے تو اسی دن ان کا بھی کام تمام کر دیا، فقط، اور بنی اسرائیل اکثر یہودی تھے۔

یہود کے کچھ حالات کی مذمت:

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں (جیسے یہود کہ انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے) اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں (اور وہ قتل کرنا ان کے خیال میں بھی ناحق ہوتا ہے) اور ایسے لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو (افعال واخلاق کے) اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے۔ (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ (مذکورہ تمام افعال کے سبب سے) ان کے دنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی) سارے اعمال (صالحہ) غارت ہو گئے۔ اور (سزا کے وقت) ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر: دنیا میں غارت ہونا یہ ہے کہ ان کے ساتھ اہل اسلام جیسا معاملہ نہ ہوگا۔ اور آخرت میں یہ کہ ان کی مغفرت نہ ہوگی۔ اگرچہ نصیحت کرنے والوں کا قتل کفر نہیں ہے کہ اس سے اعمال غارت وضبط ہوں پھر بھی گناہ کبیرہ ہیں۔ لیکن چونکہ اس مجموعہ میں دوسرے اجزاء کفر ہیں۔ اس لئے اعمال غارت ہونے کی بات صحیح ہوئی۔ اور چونکہ نبوت محمدیہ کے زمانہ کے یہود اپنے اسلاف کے قبیح اعمال کا نہ انکار کرتے تھے، نہ انہیں برا سمجھتے تھے، اس لئے ان پر بھی الزام صحیح ہوا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھتے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ پھر ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں۔ بے رخی کرتے ہوئے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی۔ اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کی تراشی ہوئی باتوں نے۔ سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ ہم ان کو اس تاریخ میں جمع کر لیں گے جس میں ذرا شبہ نہیں اور پورا پورا بدلہ مل جاوے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کیا تھا اور ان شخصوں پر ظلم نہ کیا جاوے گا۔

ربط: ان آیتوں میں یہودیوں کی ایک خاص حالت اور ایک خاص قول کی مذمت ہے۔

یہودیوں کی مذمت کا تتمہ:

(اے محمد ﷺ) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جنہیں کتاب (آسمانی یعنی توریت) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا (کہ اگر ہدایت کے طالب ہوتے تو وہ حصہ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے کافی تھا) اور اللہ کی اسی کتاب کی طرف انہیں اس غرض سے بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان (مذہبی اختلاف کا) فیصلہ کردے۔ پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ بے رخی کرتے ہوئے انحراف کرتے ہیں (اور) یہ (بے اعتنائی) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں (اور یہی اعتقاد رکھتے ہیں) کہ ہمیں دوزخ کی آگ صرف گنتی کے چند دنوں تک لگے گی (پھر مغفرت ہو جائے گی) اور ان کو ان کی گھڑی ہوئی باتوں نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے (جیسے اس گھڑے ہوئے عقیدہ نے دھوکہ دیا یہاں تک کہ وہ اللہ کی کتاب سے بے توجہی کرنے لگے) تو (ان کفریہ احوال وافعال واقوال کے سبب) ان کا کیا (برا) حال ہوگا۔ جب کہ ہم انہیں اس تاریخ میں جمع کرلیں گے جس (کے آنے) میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ اور (اس تاریخ میں) ہر شخص کو پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ جو کچھ اس نے (دنیا میں) کیا تھا۔ اور ان لوگوں پر (بدلہ کے وقت بالکل بھی) ظلم نہیں کیا جائے گا (کہ بغیر جرم کے یا جرم سے زیادہ سزا ہو جائے)

حوالہ: یہودیوں کا جو قول ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ﴾ نقل کیا گیا ہے، اس کی تحقیق پارہ آلم کے نصف پر گذر چکی ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: آپ یوں کہئے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے! آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں۔ آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ آپ رات کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں اور آپ جاندار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں اور بے جان چیز کو جاندار سے نکال لیتے ہیں اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔

ربط: چونکہ اوپر کی آیتوں میں حجت بازی اور جھگڑے کا بیان تھا، بعض آیتوں میں زبان کے اور بعض میں ہتھیاروں کے جیسا کہ ﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ﴾ میں تھا، اب ان آیتوں میں اس کی مناسبت سے امت

محمدیہ کے کفار پر غالب آنے کی پیشین گوئی کی طرف مناجات کی تعلیم کے عنوان میں اشارہ ہے جیسا کہ شانِ نزول سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روم وفارس کے فتح ہوجانے کا وعدہ فرمایا تو منافقوں اور یہودیوں نے اس کو سمجھ میں نہ آنے والی بات قرار دے کر مذاق اڑایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جیسا کہ روح المعانی میں واحدی سے ابن عباس اور انس رضی اللہ عنہما کی روایت سے مروی ہے۔

مناجات کے عنوان سے مؤمنوں کے غلبہ کی بشارت:

(اے محمد! ﷺ) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہئے کہ اے اللہ! تمام ملک کے مالک! آپ ملک (کا جتنا حصہ چاہیں) جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں۔ اور جس (کے قبضہ) سے چاہیں ملک (کا حصہ) لے لیتے ہیں۔ اور آپ جس کو چاہیں غالب کردیتے ہیں اور جس کو چاہیں پست کردیتے ہیں۔ ساری بھلائیاں آپ ہی کے اختیار میں ہیں، بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ آپ (بعض موسموں میں) رات (کے حصوں) کو دن میں داخل کردیتے ہیں (جس سے دن بڑا ہونے لگتا ہے) اور بعض (موسموں میں) دن (کے حصوں) کو رات میں داخل کردیتے ہیں (جس سے رات بڑھنے لگتی ہے) اور آپ جاندار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے انڈے سے بچہ) اور بے جان چیز کو جاندار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندہ سے انڈا) اور جس کو چاہتے ہیں بے حساب رزق دیتے ہیں۔

تفسیر: یعنی ہر طرح کی قدرت ہے پس آپ کے لئے کمزوروں کو قوت وسلطنت دیدینا کیا مشکل ہے۔ اس دعا میں اس کے امکان پر ایک قسم کا استدلال ہے اور کفار کے اس کو سمجھ میں نہ آنے والی اور محال بات قرار دینے کا دفاع وازالہ ہے۔ اور آیت میں جو فرمایا: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾: اس میں خیر کی تخصیص اس لئے مناسب ہوئی کہ یہاں مقصود خیر وبھلائی کا طلب کرنا ہے، جیسے کوئی امیدوار کہے کہ ملازم رکھنا آپ کے اختیار میں ہے، اگرچہ نوکر کا موقوف کردینا بھی اختیار میں ہوتا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّآ أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ: مسلمانوں کو چاہئے کہ کفار کو دوست نہ بناویں مسلمانوں سے تجاوز کرکے اور جو شخص ایسا کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں، مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

ربط: اوپر کفار کی مذمت کا بیان تھا۔ اس آیت میں اس میں سے بات نکالتے ہوئے ان کے ساتھ دوستی کرنے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جب کفار کے قبیح اعمال، آیات کا انکار اور اللہ ورسول سے عداوت وغیرہ معلوم

ہو چکے تو ایسے قبیح و منکر اور خدا اور سول کے دشمنوں سے دوستی کب زیبا ہے۔

کفار سے دوستی کی ممانعت:

مسلمانوں کو چاہئے کہ (ظاہر میں یا باطن میں) مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کر کے کفار کو دوست نہ بنائیں۔ تجاوز دو صورتوں میں ہوتا ہے: ایک یہ کہ مسلمان سے بالکل دوستی نہ رکھیں، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ کفار سے بھی دوستی رکھیں۔ ممانعت میں دونوں صورتیں داخل ہیں۔ اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا تو وہ اللہ سے دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں (کیونکہ جن دو شخصوں میں آپس میں عداوت) ہو، ان میں سے ایک سے دوستی کر کے دوسرے سے دوستی کا دعویٰ اعتبار کے قابل نہیں ہوسکتا) مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تمہیں ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ ہو (وہاں ضرر کو دفع کرنے کی ضرورت ہے) اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتا ہے (کہ اس کی ذات سے ڈر کر احکام کی مخالفت مت کرو) اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس لئے اس وقت کی سزا سے ڈرنا ضروری ہے)

فائدہ: کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملات ہوتے ہیں: (۱) موالات یعنی دوستی (۲) مدارات یعنی ظاہری خوش اخلاقی (۳) مواسات یعنی احسان و نفع رسانی۔

ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالات تو کسی حال میں جائز نہیں، چنانچہ آیت ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ﴾ اور آیت ﴿لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ میں یہی مراد ہے۔ اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے: (۱) دفع ضرر کے واسطے، ان کے نقصان سے بچنے کے لئے (۲) اس کافر کی دینی مصلحت یعنی ہدایت کی توقع کے لئے (۳) اکرام ضیف یعنی مہمان نوازی کی خاطر اور اپنی مصلحت یعنی ذاتی فائدہ اور مال و مرتبہ کی طلب کے لئے درست نہیں۔ خاص طور سے جبکہ دینی نقصان کا خوف و اندیشہ نہ ہو، تو یہ ملنا جلنا اور ربط و ضبط بدرجۂ اولیٰ حرام ہوگا۔

زیر نظر آیت میں اسی نقصان سے بچنے کی حالت کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد مدارات ہے، جس کو صورت کے لحاظ سے موالات میں داخل کر کے موالات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور اوپر والی آیت میں چونکہ موالات حقیقی مراد ہے، لہٰذا اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا اور ہدایت کی توقع پر مدارات کرنا سورۂ عبس کی آیت ﴿ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴾ (تو آپ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، عبس ۶) میں مذکور ہے۔ اور مہمان ہونے کی وجہ سے خاطر مدارات کرنا اس حدیث میں ہے، جس میں آپ نے بنو ثقیف کو مسجد میں ٹھہرایا تھا۔ اور سورۂ عبس میں جو شکایت ہے، اس کی وجہ مومن پر کافر کو مقدم رکھنا ہے۔

پس یہ جو سوال کیا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس تصدی سے منع فرمایا ہے تو اس سے مدارات کے جواز پر استدلال کس طرح صحیح ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں انکار اور شکایت کی وجہ کافر کو مقدم رکھنا ہے، کافر کی مدارات پر شکایت نہیں ہے۔ اور مال وجاہ، قدر و منزلت اور مرتبہ وغیرہ اپنی مصلحت کے لئے ممانعت آیت ﴿ اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ ﴾ (کیا ان کے پاس عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ النساء ۳۹) میں مذکور ہے۔

اور مواسات کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب کے ساتھ جو براہ راست لڑائی میں مشغول ہیں، نا جائز ہے۔ اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے۔ ﴿ لَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ ﴾ (جو لوگ تم سے نہیں لڑے، اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے سے نہیں روکتا الممتحنہ ۸) میں اس کی وضاحت ہے۔

اور اس آیت میں مواسات کو مجاز کے طور پر تولی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور فاسقوں بدعتیوں کا بھی یہی حکم ہے جیسا کہ روایتوں سے ظاہر ہے۔ اور اس جگہ آیت میں وارد لفظ "تقۃ" کے ترجمہ میں قوی اندیشہ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ خالی خیال اور وہم کا اعتبار نہیں ہے۔ چنانچہ آیت ﴿ يَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰٓى اَنۡ تُصِيۡبَنَا دَآٮِٕرَةٌ ؕ ﴾ (کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہ پڑ جائے) میں اسی کا انکار ہے۔ اسی طرح امیروں کی صحبت سے ممانعت آئی ہے۔

شیعوں کے تقیہ کا آیت سے کوئی تعلق نہیں:

بعض لوگوں کو اس آیت سے شیعوں کے تقیہ کے جواز کا شبہ ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا اس تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ضرر کے اندیشہ کے وقت دوستی کے اظہار اور عداوت کو پوشیدہ رکھنے کا ذکر ہے اور شیعوں کے مشہور تقیہ میں کفر کا اظہار اور ایمان کو پوشیدہ رکھنا ہوتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس بات کا یہاں ذکر نہیں ہے، لیکن دوسری آیت میں جبر و اکراہ کے عنوان سے ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشہور تقیہ اور اکراہ میں بھی دو فرق ہیں: اول یہ کہ اکراہ صرف ضرر کو دور کرنے کے خوف سے ہوتا ہے اور تقیہ مذکورہ نفع کے حصول کے لئے بھی ہوتا ہے۔ دوسرے اکراہ میں اس ضرر کا شدید اور خوف کا قوی ہونا ضروری ہے اور تقیہ میں ضرر کا خفیف اور خوف کا وہم کے درجہ میں ہونا بھی کافی ہے۔ اس طرح اصطلاحی تقیہ کا قرآنِ کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اصطلاح بدل کر لفظ تقۃ سے موالات کی اجازت کی صورت کو تقیہ کہنے لگے تو اس سے کوئی بحث نہیں، تاہم یہ اس کے لئے مفید مطلب نہیں۔

قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ يَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ‌ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۞

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اگر تم پوشیدہ رکھو گے اپنا ما فی الضمیر یا اس کو ظاہر کرو گے، اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں۔ اور وہ تو

سب کچھ جانتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر کی آیت میں کفار کے ساتھ دوستی کرنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اب اس ممانعت کے عام ہونے کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ نہ بلا ضرورت ان سے ظاہری دوستی جائز ہے اور نہ ہی باطنی طور پر اصلی دوستی جائز ہے۔ اور اس مضمون کو ایسے عام انداز میں بیان فرمایا ہے جس سے تمام ظاہری و باطنی گناہوں سے بچا جاسکے۔

کفار سے دوستی کی عام ممانعت:

آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ اگر تم اپنے دل کی باتوں کو (دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھو گے، یا اس کو (زبان یا جسم کے دوسرے اعضاء وغیرہ سے) ظاہر کرو گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال میں) جانتے ہیں اور (اس کی کیا تخصیص ہے) وہ تو سب کچھ جانتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہیں) اور (علم کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔ (تو اگر تم کسی قبیح امر کا ارتکاب کرو گے خواہ ظاہری طور پر ہو یا باطنی طور پر تو وہ تمہیں سزا دے سکتے ہیں)

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ: جس روز ہر شخص اپنے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو بھی، اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان میں دور دراز کی مسافت ہوتی۔ اور خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں بندوں پر۔

ربط: اب اوپر والے مضمون کی تاکید کے لئے قیامت کا آنا اور اس میں کسی عمل کی تخصیص کے بغیر تمام اعمال کا پیش نظر ہونا اور اس وقت گنہگاروں کا پچھتانا بیان فرماتے ہیں۔

سابق مضمون کی تاکید:

جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو اپنے سامنے پائے گا۔ اور اپنے کئے ہوئے برے کاموں کو بھی (پائے گا۔ اس روز) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا اچھا ہوتا جو اس کے اور اس دن کے درمیان بہت زیادہ دوری ہوتی (تاکہ اپنے اعمالِ بد کا معائنہ نہ کرنا پڑتا) اور (تم سے پھر دوبارہ کہا جاتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتے ہیں۔ اور (یہ ڈرانا اس وجہ سے ہے کہ) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں (اس مہربانی کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ یہ آخرت کی سزا سے بچے رہیں۔ اور بچنے کا طریقہ اعمالِ بد کا ترک کرنا ہے۔ اور برے اعمال کا ترک

کرنا عام حالات میں بغیر ڈر و خوف کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ڈراتے ہیں۔ اس طرح یہ ڈرانا عین شفقت و رحمت ہے)

فائدہ: اس دن جن لوگوں کے اچھے اور برے دونوں قسم کے عمل پیش ہوں گے، ان کی نسبت یہ فرمانا کہ وہ لوگ اس دن کے نہ آنے کی تمنا کریں گے، نہایت بلاغت ہے، کہ باوجودیکہ ان کے کچھ اعمال اچھے اور نیک بھی ہوں گے، مگر ان کے ہونے کی ذرا خوشی نہ ہوگی، صرف اعمالِ بد کی وجہ سے رنج و تکلیف ہوگی تو ایسے میں جس کے پاس اعمال بد ہی بد ہوں گے اس کا کیا پوچھنا! اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جن کے اعمال صرف نیک و صالح ہوں گے وہ بھی اس تمنا میں شریک ہوں گے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔ آپ یہ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی اور رسول کی، پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں توحید کا وجوب اور کفر کی مذمت بیان کی گئی تھی۔ اب رسالت کے اعتقاد اور رسول کی اتباع کے وجوب کو بیان فرماتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح توحید کا انکار کفر ہے، اسی طرح رسالت کا انکار بھی کفر ہے۔

رسالت کے اعتقاد اور رسول کی اتباع کا وجوب:

آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (اپنے زعم میں) اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کریں) تو تم لوگ (اس مقصود کو حاصل کرنے کے طریقوں میں) میری اتباع کرو (کیونکہ میں خاص طور سے اسی تعلیم کے لئے مبعوث ہوا ہوں، تم ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سارے گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کے طریقہ کی بھی تعلیم دیتا ہوں۔ اس پر عمل کرنے سے لامحالہ وعدہ کے مطابق گناہ معاف ہو جائیں گے۔ مثلاً گناہوں سے توبہ کر لینا، اللہ تعالیٰ کے فوت شدہ حقوق کا قضا کر لینا۔ حقوق العباد کا ادا کر دینا یا معاف کرا لینا (اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے عنایت فرمانے والے ہیں) (اور) آپ یہ (بھی) فرما دیجئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیا کرو (کہ اصل مقصود تو یہی ہے) اور رسول کی (اطاعت کیا کرو۔ یعنی میری اطاعت اس حیثیت سے کرنا ضروری ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، اس نے میری معرفت اپنی اطاعت کے طریقے بتائے ہیں) پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ (آپ کی اطاعت سے کہ اس کی بنیاد رسالت

کا اعتقاد ہے) اعراض کریں تو (وہ لوگ سن لیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے (اور اس صورت میں یہ لوگ کافر ہوں گے تو انہیں محبت کا دعویٰ کرنا یا محبوبیت کی ہوس رکھنا محض ہوائی قلعہ بنانا ہے)

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد اور عمران کی اولاد کو تمام جہانوں پر۔ بعضے ان میں بعض کی اولاد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں، خوب جاننے والے ہیں۔

ربط: عناد رکھنے والے بعض لوگ واضح عقلی و نقلی دلائل کے باوجود رسالت کے مسئلہ کو سمجھ سے دور اور ناقابل قبول قرار دیتے تھے، اس لئے ان آیتوں میں اس مسئلہ کی تائید کے لئے تاکہ ان نظیروں کے ذریعہ سمجھ سے دور ہونے کا خیال ختم ہو جائے، چند مشہور انبیاء علیہم السلام کا مختصر طور پر منتخب و مقبول ہونا بیان فرماتے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام و حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ارشاد فرمائیں گے، اور ان حضرات کو اس مقصد کے لئے خاص کرنے کی وجہ ان کا زمانۂ نبوت سے قریب ہونا ہے۔

بعض انبیاء علیہم السلام کی برگزیدگی:

بیشک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لئے) (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) کو اور (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد (میں سے بعض) کو (جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو جو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ہمارے رسول ﷺ کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں) اور عمران کی اولاد (میں سے بعض) کو (اگر یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہیں۔ اور اگر یہ عمران حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں۔ غرض ان سب حضرات کو نبوت کے لئے) تمام جہانوں (کی مخلوقات) پر منتخب فرمایا ہے۔ ان میں بعض، بعض کی اولاد ہیں (جیسے آدم علیہ السلام کی اولاد سب ہیں اسی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد سب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولاد عمران بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں، خوب جاننے والے ہیں (کہ سب کی باتوں کو سنتے ہیں، سب کے حالات کو جانتے ہیں۔ چنانچہ جس کے اقوال و احوال کو نبوت کی شان کے مطابق دیکھا۔ اس کو نبی بنا دیا)

فائدہ: اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کا خاص طور سے اولوالعزم انبیاء کا ذکر آ گیا۔ باقی خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کا اس میں اس لئے ذکر نہیں ہوا کہ ان کا نبی ہونا تمام آسمانی ملت والوں کے یہاں مشہور اور مسلم تھا۔ اور آل

ابراہیم میں اس کے باوجود کہ آل عمران بھی داخل ہیں۔لیکن عموم کے بعد تخصیص کے طور پر ان کا دوبارہ ذکر فرمایا۔اگر آل عمران سے حضرات موسیٰ وہارون علیہما السلام مراد ہیں تب تو اہتمام کی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اولوالعزم انبیاء میں سے ہونا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں تو اولوالعزم انبیاء میں سے ہونے کے علاوہ خود اس مقام کی مناسبت اس تکرار کی متقاضی ہے۔کیونکہ آگے اس سے متصل ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا ہے،جس کو حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ کے ذکر سے شروع فرمایا ہے۔اور یہ جو فرمایا ہے کہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں تو شاید اس سے مقصود ان سب حضرات کے اتحاد یا ذاتی شرف کے ساتھ نسب کے شرف کا بیان فرمانا ہو، یا اس امر کا جتلانا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد میں نبوت رہی ہے، اگر آپ کو بھی نبوت مل گئی تو بعید کیا ہے۔واللہ اعلم

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ: جبکہ عمران کی بی بی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں نے نذر مانی ہے آپ کے لئے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جاوے گا، سو آپ مجھ سے قبول کر لیجئے، بے شک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں۔

حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ:

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ عمران (حضرت مریم کے والد) کی بیوی نے (حمل کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں نے آپ کی (عبادت) کے لئے اس بچہ کی نذر (یعنی منت) مانی ہے جو میرے پیٹ میں ہے کہ وہ (اللہ کے گھر کی خدمت کے لئے) آزاد (فارغ) رکھا جائے گا (اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی) اس لئے آپ (اس کو) میری طرف سے قبول فرما لیجئے۔بیشک آپ خوب سننے والے، خوب جاننے والے ہیں (کہ میری عرضداشت کو سن رہے ہیں اور میری نیت کو جانتے ہیں)

فائدہ: اس زمانہ کی شریعت میں ایسی نذر ماننا جائز تھا۔مگر صرف اولاد نرینہ کے ساتھ مخصوص تھا۔اس لئے انھوں نے اس گمان کی بنیاد پر نظر مانی تھی کہ شاید لڑکا پیدا ہو۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝

ترجمہ: پھر جب لڑکی جنی، کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو وہ حمل لڑکی جنی۔حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ

جانتے ہیں اس کو جو انھوں نے جنی اور وہ لڑکا لڑکی کے برابر نہیں اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو آپ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔

آگے کا قصہ:

پھر جب (انھوں نے) لڑکی کو جنم دیا (حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ (لڑکی کی شان کو) زیادہ جانتے ہیں جس کو انھوں نے جنم دیا۔ اور (کسی طرح بھی) وہ لڑکا (جو انھوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں (ہو سکتا تھا، بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات و برکات عجیب و غریب ہوں گے۔ یہ ارشاد خداوندی جملہ معترضہ کے طور پر تھا۔ آگے پھر ان بی بی کا قول ہے) اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ (حفاظت) میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔

چنانچہ ان کی یہ عرض بھی قبول ہوئی، جیسا کہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث میں آیا ہے کہ ہر بچہ کی ولادت کے وقت شیطان چھیڑتا ہے اور اس کے چھیڑنے سے بچہ چلاتا ہے۔ سوائے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اور چونکہ یہ عرض بالکل ولادت ہوتے ہی کی تھی، اس لئے اس وقت تک انہیں شیطان نے نہیں چھویا تھا۔ اس لئے اس میں اس اشکال کی گنجائش نہیں کہ شیطان تو ولادت کے وقت ہی چھیڑتا ہے تو دعا سے پہلے ہی چھیڑ چکا ہوگا۔ اور اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو شیطان چھوتا ہو۔ باقی جہاں تک حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی تخصیص کا معاملہ ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ان بی بی کی دعا وضاحت کے ساتھ منقول ہے۔ اس لئے دعا کی قبولیت کو صراحت کے ساتھ ظاہر فرما دیا۔

اور بعض لوگوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اگر شیطان کو ایسی قدرت حاصل ہو تو سب کو ہلاک کر دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو اس سے زیادہ قدرت نہیں دی گئی ہے۔ اور فرشتے نگہبان بھی ہیں اور مریم بمعنی عابدہ نام رکھنے کی وضاحت میں یہ اشارہ ہے کہ میں اپنی نذر پر حتی الامکان قائم ہوں۔ اس لڑکی کو بھی مسجد کے لئے فارغ کر دوں گی۔ اگر خدمت کے لئے نہیں تو عبادت ہی کے لئے سہی۔ واللہ اعلم

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۚ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: پس ان کو ان کے رب نے بوجہ احسن قبول فرما لیا اور عمدہ طور پر ان کو نشو و نما دیا اور زکریا کو ان کا سرپرست بنایا

جب کبھی زکریا ان کے پاس عمدہ مکان میں تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے، یوں فرماتے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں؟ وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں۔

باقی واقعہ:

(غرض حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس پہنچی۔ اور وہاں کے مجاوروں اور عابدوں سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی شامل تھے۔ جا کر کہا کہ میں نے اس لڑکی کو خاص خدا کے لئے نذر مان کر وقف کیا ہے۔ اس لئے میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ لہٰذا اس کو لائی ہوں آپ لوگ لے کر رکھئے۔ تو چونکہ حضرت عمران اس مسجد کے امام تھے۔ اور جب حضرت مریم اپنی ماں کے پیٹ میں تھیں وہ وفات پا چکے تھے۔ ورنہ انہیں لینے کے سب سے زیادہ مستحق خود وہی تھے۔ باپ ہونے کی وجہ سے بھی اور امام ہونے کی وجہ سے بھی۔ اس لئے ہر شخص انہیں لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ترجیح کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں ان کی خالہ ہیں اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ماں کے بعد وہی رکھنے کی مستحق ہیں، مگر دوسرے لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے۔ آخر قرعہ پر اتفاق ہوا اور قرعہ کی صورت بھی خلاف عادت عجیب و غریب قرار پائی، جس کا بیان آگے آئے گا۔ اس میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کامیاب ہوئے۔ چنانچہ وہ انہیں مل گئیں۔ اور انھوں نے بعض روایات کے مطابق ایک انا کو ملازم رکھ کر دودھ پلوایا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ انہیں دودھ پینے کی حاجت نہیں ہوئی، کہ وہ خود ہی بیٹھنے اٹھنے لگیں۔ انہیں مسجد سے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا۔ جب جاتے باہر تالا لگا جاتے، آ کر کھول لیتے۔ اسی قصہ کو آگے مختصر طور پر بیان کیا ہے) چنانچہ ان (مریم رضی اللہ عنہا) کو ان کے رب نے بوجہ احسن یعنی زیادہ بہتر طریقہ پر قبول فرمالیا اور ان کو عمدہ طور پر نشو و نما دی۔ اور (حضرت) زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا۔ (چنانچہ) (حضرت) زکریا (علیہ السلام) جب کبھی (اسی) عمدہ مکان میں (جس میں ان کو رکھا تھا) ان کے پاس تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں؟ وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (جو خزانہ غیب ہے، اس میں) سے آئیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں (جیسا کہ اس موقع پر بغیر کسی مشقت کے محض اپنے فضل سے عطا فرمایا)

تفسیر: یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول کر لیا، اس کی ظاہری علامت یہ تھی کہ اس عجیب و غریب قرعہ میں جو معجزہ کے طور پر تھا حضرت زکریا علیہ السلام غالب آئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی مرضی تھی کہ یہ ان کے پاس رہیں اور پلیں بڑھیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قبول کر کے حضرت زکریا علیہ السلام کو کفیل بنانے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔

اور یہ جو فرمایا کہ ان کو عمدہ طور پر نشو ونما دی۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ابتدا ہی سے عبادت وطاعت میں مشغول رکھا۔ دوسرے یہ کہ دوسرے بچوں کی نشو ونما کے مقابلہ میں ان کا ظاہری نشو ونما زیادہ تھا۔

اور حضرت زکریا علیہ السلام جوان سے پوچھتے تھے کہ یہ کہاں سے آیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سوا اس مکان میں کوئی نہیں آسکتا تھا۔ خود تالا لگا جاتے اور خود آکر کھولتے۔ دوسرے وہ چیزیں بھی بے موسم کے میوے ہوتے تھے، اس لئے تعجب ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ رزق محض عالم غیب سے آتا تھا اور یہ قصہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی کرامت تھی۔ جس کا اولیاء اللہ کے لئے ثابت ہونا اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔

اور ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ ﴾ کا مضمون ممکن ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا ہی کا قول ہو اور ممکن ہے کہ قصہ کو نقل کرنے کے بعد حق تعالیٰ کا ارشاد ہو۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝

ترجمہ: اُس موقع پر دعا کی زکریا نے اپنے رب سے، عرض کیا کہ اے میرے رب! عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد، بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

زکریا علیہ السلام نے اولاد کی دعا کی:

(حضرت) زکریا نے اس موقع پر اپنے رب سے دعا کی۔ عرض کیا کہ اے میرے رب! مجھے خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد عطا کیجئے، بیشک آپ بہت دعا سننے والے ہیں۔

تفسیر: اس موقع کا مطلب یہ ہے کہ جب زکریا علیہ السلام نے بے موسم کے میوے آتے ہوئے دیکھے تو سوچا کہ اگرچہ میں اور میری بیوی دنیوی معمول کے اسباب کے اعتبار سے اولاد کی پیدائش کے قابل نہیں رہے۔ جیسا کہ اگلی ہی آیت میں ہے: ﴿ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ ﴾ لیکن ان میووں کی طرح جو کہ خلاف عادت آتے ہیں، اگر میرے یہاں بھی خلاف عادت اولاد ہو جائے تو کوئی بعید نہیں ہے۔ اور اگرچہ قدرت خداوندی کا پہلے سے بھی عقیدہ رکھتے تھے، کیونکہ نبی تھے اور سچے عقائد نبوت کے لوازم میں شامل ہیں۔ لیکن خلاف عادت ہونے کی وجہ سے درخواست کی جرأت نہ فرماتے تھے۔ اب چونکہ میوے کے واقعہ کو بار بار مشاہدہ کرنے کی وجہ سے خاص اس وقت میں ایک طرح کی عادت معلوم ہوئی جس سے رکاوٹ کا سوال دور ہو گیا۔ اس لئے درخواست پیش کی۔

اور اچھی کا مطلب یہ ہے کہ بابرکت ہو اور نیک کردار ہو، اور حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قرآنِ کریم میں کئی جگہ مختلف مضامین کے ساتھ منقول ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس دعا میں سارے مضامین ہوں، موقع ومحل کے لحاظ سے کہیں

کوئی نقل کر دیا کہیں کوئی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ: پس پکار کر کہا ان سے فرشتوں نے اور وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ کی، جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا ہونگے اور اپنے نفس کو بہت روکنے والے ہوں گے اور نبی بھی ہونگے اور اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی:

چنانچہ ان سے فرشتوں نے پکار کر کہا: جس وقت وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ (نامی بیٹا ہونے) کی بشارت دیتے ہیں۔ جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ اور دوسرے وہ دین کے) مقتدا ہوں گے۔ اور (تیسرے) اپنے نفس کو (لذتوں سے) بہت روکنے والے ہوں گے۔ اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے اور (پانچویں) اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

تفسیر: محراب سے مراد یا تو مسجد بیت المقدس کی محراب ہے، یا اس سے وہ مکان مراد ہے جس میں حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو رکھا تھا، کیونکہ اس جگہ محراب کے معنی عمدہ مکان کے کئے ہیں۔ اور کلمۃ اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت، باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کی تصدیق کا اس لئے ذکر کیا کہ دونوں ہی حضرات ایک ہی زمانہ میں تھے۔ البتہ یحییٰ علیہ السلام عمر میں ان سے کچھ بڑے تھے۔ اور لذتوں سے روکنے میں ساری مباح خواہشات اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح کرنا وغیرہ سے بچنا داخل ہوگیا۔ اس صفت کی مدح کے طور پر بیان فرمانے کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے۔ جبکہ احادیث سے نکاح کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسی ہو کہ ان پر آخرت کے معاملات کا شغل اس قدر غالب تھا کہ انہیں اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ نہ ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے۔ اس وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے، ان میں یہ بھی قید ہے: من استطاع منکم الباءۃ إلخ: (جو تم میں سے گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہے) اور شائستگی میں اعلیٰ درجہ سے وہ درجہ مراد ہے جس کا نہ ہونا نبوت کے منافی نہیں۔ اس لئے نبوت کی صفت کے بعد اس کا ذکر کرنا غیر مفید نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ اور فرشتوں کا ان کے ساتھ نماز میں باتیں کرنے میں اس کے باوجود کہ باتوں سے حضور قلب فوت ہوجاتا ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا

پیغام تھا۔ اس کی طرف توجہ ہی تو عین حضور قلب ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

ترجمہ: زکریا نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آپہنچا اور میری بی بی بچہ جننے کے قابل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسی حالت میں لڑکا ہو جاوے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار! میرے واسطے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز اشارہ کے۔ اور اپنے رب کو بکثرت یاد کرنا اور تسبیح پڑھنا دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی۔

زکریا علیہ السلام کی دعا کا تتمہ:

(حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے (باری تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا اور میری بیوی (بھی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ اسی حالت میں لڑکا ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں، کر دیتے ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل رہ گیا ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے باتیں نہیں کر سکو گے، سوائے (ہاتھ یا سر وغیرہ کے) اشارہ کے (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے) اور (اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے پر قدرت نہ رہے، اللہ کے ذکر پر قادر ہو گے تو) اپنے رب کو (دل سے بھی) بکثرت یاد کرنا اور (زبان سے بھی) تسبیح و تقدیس کرنا، دن ڈھلے بھی اور صبح (کے وقت) بھی (اس لئے کہ اس کی قدرت رہے گی)

تفسیر: باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے معتقد بھی تھے اور اس کی قدرت کے نمونوں کا بار بار مشاہدہ بھی کر چکے تھے اور خود ہی درخواست کی تھی اور دعا کی قبولیت کا علم بھی ہو گیا تھا۔ پھر یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ لڑکا کیسے ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا اس اعتبار سے نہیں تھا کہ اس کو اللہ کی قدرت سے بعید سمجھتے تھے اور اس میں شبہ تھا، بلکہ مقصود کیفیت کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی کی جو موجودہ حالت ہے کہ دونوں خوب بوڑھے ہیں، کیا یہی حالت رہے گی یا اس میں کچھ تبدیلی کی جائے گی؟ تو جواب کا حاصل یہ ہوا کہ نہیں بوڑھے ہی رہو گے اور پھر اسی حالت میں اولاد ہوگی۔ اب اس میں کوئی اشکال نہ رہا۔

اور یہ جو فرمایا کہ لڑکا کیسے ہوگا، تو لڑکا ہونے کی بات یحییٰ نام سے معلوم ہوگئی، اور نشانی کی جو درخواست کی اس کی وجہ یہ ہے کہ خوشی جلدی حاصل ہو جائے۔ دوسرے پہلے ہی شکر میں مشغول ہوں۔ اور یہ نشانی جو مقرر کی گئی کہ آدمیوں کے ساتھ کلام کرنے کی قدرت نہیں رہے گی، اس میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ نشانی کی درخواست سے ان کا جو مقصود تھا کہ شکر ادا کریں۔ اس کے لئے ایسی نشانی تجویز کی گئی کہ اس مقصود کے سوا کسی دوسرے کام کے نہ رہیں گے۔ اس طرح نشانی بھی ہوگئی اور مقصود بھی پوری طرح حاصل ہوگیا۔ پس یہ کلام نہ کرنا اضطراری یعنی مجبوری کی صورت تھی، اور نشانی بننے کی صلاحیت اسی میں واضح ہے برخلاف اختیاری طور پر کلام نہ کرنا کہ اس کے نشانی بننے میں تکلف ہے جس کا ارتکاب کی کوئی ضرورت نہیں، پھر اس کی کوئی دلیل بھی نہیں۔

اور بعض آیتوں میں لفظ ثلاثة لیال یعنی تین رات آیا ہے، مراد تین دن اور تین رات ہیں، پس دونوں آیتیں صحیح ہیں۔ اور اگرچہ ان دنوں میں وہ خود ہی ذکر و تسبیح میں مشغول رہتے، کیونکہ نشانی پوچھنے سے یہی مقصود تھا، لیکن ذکر کی شان کے اظہار کے لئے اور ان کے مقصود کی اچھائی کے اظہار کے لئے حق تعالیٰ نے بھی اس کا ذکر فرمایا۔ اور صبح و شام سے یا تو تمام اوقات سے کنایہ ہے یا صرف دن مراد ہے، کیونکہ رات کے خواب یعنی سونے کا وقت ہونے کی وجہ سے ساری رات کا ذکر نہیں ہوگا۔

> وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے، اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

ربط: اوپر سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کا قصہ چلا آرہا ہے۔ درمیان میں مناسبت کی وجہ سے حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ آ گیا تھا۔ اب پھر حضرت مریم رضی اللہ عنہا کا قصہ پورا فرماتے ہیں۔

حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے قصہ کی تکمیل:

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریمؑ سے) کہا کہ اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے اور (تمام ناپسندیدہ افعال و اخلاق سے) پاک بنایا ہے اور (مقبول فرمانا کچھ ایک دو عورتوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس زمانہ کی) تمام دنیا بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے (اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ) اے مریم! اپنے پروردگار کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ (یعنی نماز ادا) کیا کرو، اور (نماز میں) رکوع (بھی) کیا کرو، ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

تفسیر: بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہودیوں نے نماز میں رکوع چھوڑ دیا تھا، جیسے بعض لوگ ہم میں قومہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ رکوع کرتے تھے، اس لئے حکم فرمایا کہ نماز کے طریقہ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا جو رکوع کیا کرتے تھے، اس لئے کہ رکوع کا اہتمام مقصود ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ منقول امر کسی کے نزدیک ثابت نہ ہو تو بہتر وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صلوٰۃ کے فرائض میں قیام و سجود کی ہیئت میں عادۃً خلل کم ہو سکتا ہے برخلاف رکوع کے کہ اس کی ہیئت میں خلل کے زیادہ ہونے کا احتمال ہے، جیسا کہ اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ لوگ رکوع میں کم جھکتے ہیں، جس سے وہ قیام سے قریب رہتا ہے اور چونکہ اس ہیئت میں معائنہ کو ایک خاص دخل ہے، اس لئے ﴿ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ بڑھا دیا کہ جس طرح کامل رکوع کرنے والے کیا کرتے ہیں، ویسا کیا کرنا۔

دوسری بات تحقیق کے قابل یہ ہے کہ فرشتوں کا کلام کرنے کا تعلق خاص نبوت سے نہیں ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین کو فرشتوں کو سلام کرنے کی روایت ہے۔ نبوت کا خاصہ وہ کلام ہے کہ ایسے شخص سے کیا جائے جس کو تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو۔ اگرچہ اس خاص کلام کی تبلیغ کا حکم نہ ہو۔

اور لفظ نساء سے جو کہ بالغ خواتین کے ساتھ خاص ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا یہ کہنا حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے بالغ ہونے کے بعد تھا اور اس بنا پر لفظ اصطفا کے دوبارہ لانے کی یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلا اصطفا بچپن کا ہو، مثلاً ان کا نذر میں قبول کیا جانا، بے موسم میووں کے آنے میں ان کی کرامت کا ظاہر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرا اصطفاء جوانی کا ہو جس سے فرشتوں کا کلام کرنا اور بغیر شوہر کے بچہ پیدا ہونے کی کرامت، پھر اس بچہ ہی کی زبان سے ان کی برأت ثابت ہونے کی کرامت وغیرہ وغیرہ۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

ترجمہ: یہ قصے منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں، ہم ان کی وحی بھیجتے ہیں آپ کے پاس اور آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ اپنے اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ ان سب میں کون شخص حضرت مریم کی کفالت کرے، اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔

ربط: اوپر اور آگے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم رضی اللہ عنہا دونوں کے تھوڑے تھوڑے قصوں کا ذکر ہے۔ اور چونکہ گذشتہ واقعات کی اس طرح خبر دینا کہ نہ کسی سے سنا ہو نہ خود دیکھا ہو اور نہ کسی کتاب میں پڑھا ہو جیسے حضور ﷺ کی شان تھی، خارق عادت امور میں سے ہے جو مختلف شرطوں کے ساتھ نبوت کی دلیل ہے۔ اس لئے اس

آیت میں آپ کی نبوت پر ان قصوں کی خبر دینے سے استدلال فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا قصوں سے محمد ﷺ کی نبوت پر استدلال:

یہ قصے (جن کا اوپر ذکر ہوا جناب رسول اللہ ﷺ کے اعتبار سے اس وجہ سے کہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ ان کے معلوم کرنے کا نہیں تھا) غیب کی خبروں میں سے ہیں۔ ہم آپؐ کے پاس ان کی وحی بھیجتے ہیں (اس کے ذریعہ آپ کو یہ خبریں معلوم ہوتی ہیں اور پھر آپ انہیں دوسروں کو بتاتے ہیں) اور (ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت مریمؑ کے رکھنے میں اختلاف کر رہے تھے، جس کا فیصلہ آخر کار قرعہ پر قرار پایا تھا) آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلم (پانی میں) ڈال رہے تھے (اور قرعہ نکلنے کی صورت یہ قرار پائی تھی کہ جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہہ جائے وہ مستحق سمجھا جائے۔ اس طرح قرعہ سے غرض اس امر کا طے کرنا تھا) کہ ان سب میں سے حضرت مریم کی (پرورش کی) کفالت کون کرے؟ (چنانچہ آپ نہ تو اس وقت موجود تھے) اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ وہ لوگ اس معاملہ میں (قرعہ سے پہلے) باہم اختلاف کر رہے تھے (جسے دور کرنے کی ضرورت کے لئے یہ قرعہ اندازی قرار پائی۔ اور ان خبروں کے معلوم ہونے کے لئے دوسرے ذرائع کا نہ ہونا بھی یقیناً معلوم ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں یہ خبریں دینا آپ کی نبوت کی دلیل ہے)

فائدہ (۱): اوپر جو ایک آیت میں ﴿ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ﴾ فرمایا تھا۔ اس میں قرعہ کے اس قصہ کی طرف اشارہ تھا، جس کی تفصیل بیان کرنے کا وعدہ اُس آیت کے ترجمہ کے ذیل میں کیا گیا تھا۔ اور قرعہ کی یہ صورت خارق عادت تھی، جس میں حضرت زکریا علیہ السلام کا کامیاب ہونا، ان کا معجزہ تھا۔

فائدہ (۲): شریعت محمدیہ میں حنفی مسلک پر قرعہ کا یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب شریعت میں معلوم و متعین ہیں، ان میں قرعہ اندازی ناجائز اور جوئے میں داخل ہے۔ مثلاً کسی مشترک شے میں جس کا نام نکل آئے وہ سب لے لے یا جس بچہ کے نسب میں اختلاف ہو اس میں جس کا نام نکل آئے وہی باپ سمجھا جائے۔ اور جن حقوق کے اسباب کسی رائے پر رکھے جائیں ان میں قرعہ جائز ہے۔ مثلاً مشترکہ گھر کی تقسیم میں ایک شخص کو مشرقی حصہ دیدیں اور دوسرے کو مغربی حصہ کہ ایسا کرنا ساجھاداروں کے اتفاق یا قاضی کے فیصلہ سے بغیر قرعہ کے بھی جائز تھا۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝

ترجمہ: جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا اور اس

کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا با آبرو ہونگے دنیا اور آخرت میں اور منجملہ مقربین ہونگے اور آدمیوں سے کلام کریں گے گہوارہ میں اور بڑی عمر میں اور شائستہ لوگوں میں سے ہونگے۔

ربط: اوپر کی آیت بطور جملہ معترضہ کے تھی، جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لائی گئی تھی۔ اب پھر حضرت مریم رضی اللہ عنہا کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں زیادہ مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے۔

حضرت مریم کے ساتھ ملائکہ کے کلام کا تتمہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا آغاز:

(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریمؑ سے یہ بھی) کہا کہ اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں جو اللہ کی جانب سے ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی بشارت جو باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا ہونے کے سبب کلمۃ اللہ کہلائے گا) اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں (بھی انہیں نبوت عطا ہوگی) اور آخرت میں (بھی کہ اپنی امت کے مؤمنوں کے بارے میں ان کی شفاعت قبول ہوگی) با آبرو ہوں گے اور (جیسے ان میں نبوت وشفاعت کی صفت ہوگی، جس کا تعلق دوسروں سے بھی ہے۔ اسی طرح ان میں ذاتی کمال کی صفت بھی ہوگی کہ اللہ کے نزدیک مقربین میں سے ہوں گے۔ اور (صاحب معجزہ بھی ہوں گے کہ) آدمیوں سے گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں ہی) اور بڑی عمر میں (بھی دونوں حالتوں میں یکساں) کلام کریں گے (اور دونوں کلاموں میں کوئی فرق نہ ہوگا) اور (اعلیٰ درجہ کے) شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

فائدہ: اس شائستگی کی حقیقت اوپر لفظ صالحین کی تفسیر میں گذر چکی ہے، جہاں یہ لفظ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لئے آیا ہے اور اس بشارت کا دینا سورۂ مریم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دوسرے عنوان سے منسوب ہے، اس لئے بعض علماء نے تو یہ کہا ہے کہ یہاں بھی ملائکہ سے صرف حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں، ان کے لئے جمع کا لفظ استعمال کرنا جنسی معنی کے اعتبار سے ہے، جیسے محاورہ ہے کہ اس مسئلہ میں علماء یہ کہتے ہیں، خواہ ایک ہی عالم سے سنا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ اور فرشتے بھی ہوں۔ اور انھوں نے خواہ تفصیل کے ساتھ جبرئیل کی بشارت کی تصدیق کر کے اجمال کے ساتھ یہ بشارت دی ہو۔ اور کلمۃ اللہ اور ابن مریم دونوں خطابوں میں ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے ورنہ باپ کی طرف نسبت ہوتی اور بچپن میں بولنے کا قصہ سورۂ مریم میں آئے گا۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

ترجمہ: حضرت مریمؑ بولیں: اے میرے پروردگار! کس طرح ہوگا میرے بچہ، حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ویسے ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ

دیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

بغیر باپ کے عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی بشارت پر حضرت مریمؑ کا تعجب اور اس کا جواب:

حضرت مریمؑ بولیں: اے میرے پروردگار! میرے بچہ کیسے ہوگا، حالانکہ مجھے کسی بشر نے (صحبت کے طور پر) ہاتھ نہیں لگایا؟ (نہ جائز طریقہ سے نہ ناجائز طریقہ سے، اور عادت کے طور پر تو بچہ بغیر مرد کے پیدا نہیں ہوتا۔ تو معلوم نہیں کہ ویسے ہی محض قدرت خداوندی سے بچہ ہوگا یا مجھے نکاح کا حکم دیا جائے گا) اللہ تعالیٰ نے (فرشتہ کے واسطہ سے جواب میں) فرمایا کہ ایسے ہی (بغیر مرد کے) ہوگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے صرف ان کا چاہنا کافی ہے۔ انہیں کسی واسطہ، ذریعہ یا خاص سبب کی ضرورت نہیں۔ اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ (موجود) ہو جا، پس وہ چیز (موجود) ہو جاتی ہے (یعنی اگر اسباب و وسائل کی بنا پر فرمادیا کہ موجود ہو جا تو وہ اسی طرح ہو جاتی ہے اور اگر اسباب و وسائل سے پہلے موجود ہونے کو فرمادیا تو وہ اسی طرح ہو جاتی ہے)

فائدہ: اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ آخر اسباب و وسائل بھی تو شے ہیں، اگر ان کے لئے بھی اسباب و وسائل کی ضرورت ہو تو ان میں بھی یہی کلام ہوگا جس سے تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اور اگر ضرورت نہ ہو تو اس میں وسائل اور دیگر اشیا برابر ہیں، دیگر اشیاء کی ایجاد بھی بغیر وسائل کے ممکن ہوگی۔ اور اس ممکن کی خبر مخبر صادق (سچی خبر دینے والے سچے رسول ﷺ) نے دی۔ اس لئے اس کے ہونے کا عقیدہ رکھنا لازم ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کی تحقیق پارہ آلم کے ختم کے قریب گذر چکی ہے۔ دہرانے کی ضرورت نہیں۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ان کو تعلیم فرمادیں گے کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور توریت اور انجیل اور ان کو بنی اسرائیل کی طرف بھیجیں گے کہ میں تم لوگوں کے پاس کافی دلیل لے کر آیا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے، پھر اس کے اندر پھونک مار دیتا ہوں، جس سے وہ پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے،

اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مُردوں کو خدا کے حکم سے اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو رکھ کر آتے ہو، بلاشبہ ان میں کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے تھی، یعنی توراۃ کی، اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعض ایسی چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں، اور میں تمہارے پاس دلیل لے کر آیا ہوں، حاصل یہ کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، بیشک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں، سو تم لوگ اس کی عبادت کرو، پس یہ ہے راہ راست!

عیسیٰ علیہ السلام کے فضائل کی خوش خبری:

اور (اے مریم! اس مولود مسعود یعنی نیک بخت بچہ کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ) اللہ تعالیٰ ان کو (آسمانی) کتابوں، سمجھ کی باتوں اور (بالخصوص) توریت و انجیل کی تعلیم فرمائیں گے۔ اور انہیں (تمام) بنی اسرائیل کی طرف (پیغمبر بنا کر اور ﴿اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ﴾ سے ﴿مُّسْتَقِیْمٌ﴾ تک کا مضمون دے کر) بھیجیں گے (یعنی یہ کہ) میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں، جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے۔ پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ اللہ کے حکم سے (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں مادرزاد اندھے کو اور برص کے مریض کو اچھا کر دیتا ہوں (یہ دوسرا معجزہ ہوا) اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں (یہ تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ جو کچھ تم اپنے گھروں میں کھا (کر آ) تے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا) بیشک ان (معجزات) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے اگر تم ایمان لانا چاہو۔ اور میں اس طرح آیا ہوں کہ اس کتاب کی تصدیق کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی تورات کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعض ایسی چیزیں حلال کر دوں جو تم پر (موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں) حرام کر دی گئی تھیں (اس لئے کہ ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہو گئی) اور (میرا نسخ کا یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے۔ بلکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحب نبوت کا قول نسخ کے دعویٰ میں حجت ہوتا ہے) حاصل یہ کہ (جب میرا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہو چکا تو میری تعلیم کے مطابق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے ڈرو اور (دین کے بارے میں) میرا کہنا مانو (اور میری دینی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں (یہ تو عقیدہ کی تکمیل کا حاصل ہے۔ اس لئے تم لوگ اس (رب) کی عبادت کرو (یہ عمل کی تکمیل کا حاصل ہے) پس یہی سیدھا راستہ ہے (دین کا راستہ جس میں عقائد اور اعمال دونوں کی تکمیل ہو۔ اس سے نجات اور اللہ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے)

فائدہ: پرندہ کی شکل بنانا تصویر بنانے کا عمل تھا جو اس شریعت میں جائز تھا۔ ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہوگیا، اور مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو اچھا کرنے کا امکان اگر طبعی اسباب سے ثابت ہوجائے تو اس کے اعجاز کی وجہ یہ تھی کہ وہ طبعی اسباب کے بغیر اچھے ہوجاتے تھے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

ترجمہ: سو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے انکار دیکھا تو آپ نے فرمایا: کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو میرے مددگار ہوجاویں اللہ کے واسطے؟ حوارییں بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے، ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ اس کے گواہ رہئے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں ان چیزوں پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے رسول کی، سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ آخری معاملہ:

(غرض مذکورہ بشارت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شان سے پیدا ہوئے اور بنی اسرائیل سے مذکورہ بالا مضمون کی گفتگو ہوئی۔ اور معجزے ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپ کی نبوت کے منکر رہے) تو جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے انکار دیکھا (اور انکار کے ساتھ) آزار کے درپے بھی پایا۔ اور اتفاق سے کچھ لوگ انہیں ایسے ملے جو حواری کہلاتے تھے) تو (حواریوں سے) آپ نے فرمایا: کیا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (مخالفین ومنکرین کے مقابلہ میں دین کے معاملہ میں) اللہ کے واسطے میرے مددگار ہوجائیں (جس سے دین کی دعوت کے معاملہ میں مجھے کوئی ایذا نہ پہنچائے) حواری بولے کہ ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں، ہم (آپ کی دعوت کے مطابق) اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ اس (بات) کے گواہ رہئے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرماں بردار ہیں (پھر اہتمام کی زیادتی اور توثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم ان چیزوں (یعنی احکام) پر ایمان لے آئے جو آپ نے نازل فرمائیں اور ہم نے (ان رسول) کی پیروی اختیار کی (اس لئے ہمارا ایمان قبول فرماکر) ہمیں ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو (مذکورہ بالا مضامین کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی کامل مؤمنوں میں ہمارا بھی شمار فرمائیے)

فائدہ: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ کے ترجمہ میں جو ہم نے ''آپ کی دعوت کے مطابق'' کی قید ظاہر کردی ہے، اس سے ایمان بالرسول کے ضمن میں ایمان باللہ بھی آگیا۔ جس کی مناجات ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ میں تصریح ہوگئی۔

عمومِ بعثت کا اشکال اور اس کا جواب:

یہاں یہ امر قابلِ تحقیق ہے کہ اوپر کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حواریوں کو بھی دین کی دعوت فرمائی۔ احقر کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ اگر حواری بھی بنی اسرائیل میں سے ہوں تب تو کچھ اشکال ہی نہیں اور اگر بنی اسرائیل سے نہ ہوں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام نہیں، ان کے زمانہ میں اس قوم کے علاوہ جن کی طرف بعثت ہوئی ہے دوسرے لوگوں پر بشرطیکہ ان تک خبر پہنچے اصول دینیہ میں تو تمام شریعتوں کے اصول متحد ہونے کی وجہ سے اس نبی کا اتباع واجب ہوتا ہے اور فروع میں یہ تفصیل ہے کہ ان باقی لوگوں میں جن کی طرف کوئی دوسرے نبی مبعوث ہوئے ہوں، ان پر تو صرف اس خاص نبی کا اتباع واجب ہوتا ہے اور جن کی طرف کوئی نبی مبعوث نہ ہوئے ہوں، ان پر اس نئے نبی کا اتباع لازمی ہوتا ہے، اب چونکہ حواریوں کی طرف کوئی خاص نبی مبعوث نہیں ہوئے تھے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع ان پر واجب تھا۔ اس لئے انہیں دین کی دعوت فرمائی، اور اس سے بعثت کا عموم لازم نہیں آیا۔ کیونکہ بعثت کے عموم سے مراد یہ ہے کہ اس دعوت سے کوئی شخص فروع میں بھی مستثنیٰ نہ ہو، تو ہمارے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ یہ بات خاص ہے۔ اور اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان عام ہونے کی وجہ سے بعثت کے عموم کا شبہ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ توحید میں مخالفت کرنے کی سزا تھی جو کہ واجب الاتباع اصول میں سے ہے۔

پھر اس مقام پر یہ باتیں لکھنے کے بعد روح المعانی میں مائدہ (دسترخوان) کے نزول کے قصہ کے ضمن میں ایک روایت ملی، جس کو ابوالشیخ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تیس روزے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے جو درخواست کرو گے وہ قبول ہوجائے گی۔ انھوں نے روزے رکھ کر مائدہ یعنی دسترخوان کے نازل ہونے کی درخواست کی الخ اور قرآن میں یہ بات نص سے ثابت ہے کہ یہ درخواست کرنے والے حواری تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حواری بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اب مذکورہ شبہ کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔ فللّٰہ الحمد۔ اور سورۃ الصف میں ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ کے بعد ﴿فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ کا آنا بھی ظاہری طور پر اس کی تائید کرتا ہے۔

ع ۵ / ۱۴

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۞ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۞

ترجمہ: اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں

سے اچھے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! بیشک میں تم کو وفات دینے والا ہوں، اور میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ منکرین ہیں روزِ قیامت تک، پھر میری طرف ہوگی سب کی واپسی، سو میں تمہارے درمیان فیصلہ کردوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے۔

یہود کا مکر اور حق تعالیٰ کی حفاظت:

اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اسرائیل میں سے آپ کی نبوت کے منکر تھے، آپ کو ضرر پہنچانے اور ہلاک کرنے کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر وحیلہ سے آپ کو گرفتار کر کے سولی دینے پر آمادہ ہوئے) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی۔ (جس کی حقیقت کا ان لوگوں کو پتہ نہ چلا، کیونکہ ایک اور شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل کا بنادیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا جس کی وجہ سے وہ محفوظ رہے اور اس ہم شکل کو سولی دیدی گئی۔ ان لوگوں کو اس تدبیر کا علم ہی نہ ہوسکا، اس تدبیر کو دفع کرنے پر تو قدرت کیا ہوتی) اور اللہ تعالیٰ تمام تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ دوسروں کی تدبیریں کمزور ہوتی ہیں اور کبھی قبیح اور بے موقع بھی ہوتی ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خالص خیر اور حکمت کے مطابق ہوتی ہیں۔ اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت تردد اور پریشانی سے دوچار ہوئے) فرمایا: اے عیسیٰ! (کچھ غم نہ کرو) بیشک میں (اپنے وعدہ کئے ہوئے وقت پر طبعی موت سے تمہیں) وفات دینے والا ہوں (اب جبکہ تمہارے لئے طبعی موت مقدر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں سولی پر جان دینے سے محفوظ رہو گے) اور (فی الحال) میں تمہیں اپنے (عالم بالا کی) طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تمہیں ان لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں جو (تمہارے) منکر ہیں۔ اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں انہیں قیامت تک لوگوں پر غالب رکھنے والا ہوں جو کہ (تمہارے) منکر ہیں (گو اس وقت یہ منکر غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں) پھر (جب قیامت آجائے گی اس وقت) سب کی واپسی (دنیا اور برزخ سے) میری طرف ہوگی، اس لئے (اس وقت) میں تمہارے (سب کے) درمیان ان امور میں (عملی) فیصلہ کروں گا، جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے (کہ انہی امور میں سے عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ہے)

فائدہ: اس آیت میں چند وعدوں کا ذکر ہے جو اس وقت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گئے:

(۱) مقررہ وقت پر طبعی طور پر موت دینا، جس سے مقصود دشمنوں سے حفاظت کی بشارت دینا تھا، یہ مقررہ وقت اس وقت آئے گا جب قیامت کے قریب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر تشریف لائیں گے جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

(۲) دوسرا وعدہ فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھا لینے کا ہے۔ چنانچہ یہ وعدہ ہاتھ کے ہاتھ پورا کیا گیا۔ جسے پورا کرنے کی

خبر سورۂ نساء میں دی گئی ہے۔ ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ (بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔آیت ۱۵۸)
اب آسمان پر زندہ موجود ہیں۔

اور اگر چہ پہلا وعدہ بعد میں پورا ہوگا لیکن اس کا ذکر پہلے ہے، کیونکہ یہ دوسرے وعدہ کے لئے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔اور دلیل اپنے مرتبہ کے لحاظ سے پہلے ہوتی ہے، اور واؤ چونکہ ترتیب کے لئے لازمی نہیں، اس لئے اس کے مقدم ومؤخر کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

(۳) تیسرا وعدہ تہمت سے پاک کرنا۔ یہ اس طرح پورا ہوا کہ جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور یہودیوں کے تمام بیجا الزاموں اور افتراؤں کو جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لگاتے تھے، مثلاً نعوذ باللہ ان کے نسب کے سلسلہ میں طعنہ زنی کرنا، ان کو خدائی کا دعویدار بنانا وغیرہ۔ ان سب کو صاف کردیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان مضامین کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے جس سے آپ کے نسب اور عقیدہ کی پاکی ظاہر ہے۔

(۴) چوتھا وعدہ آپ کے منکروں پر قیامت تک آپ کی اتباع کرنے والوں کا غالب رہنا۔ یہاں اتباع سے مراد خاص اتباع ہے یعنی نبوت کا اعتقاد۔ چنانچہ متبعین یا پیروکاروں کے مصداق وہ لوگ ہیں جو آپ کی نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس میں نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں داخل ہیں۔

اگر چہ اس وقت نصاریٰ کا اتنا اتباع آخرت کی نجات کے واسطے اس لئے کافی نہیں کہ ایک دوسرے جز میں وہ اتباع نہیں کرتے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے بھی فرما گئے ہیں۔ لیکن یہاں کامل اتباع مراد ہی نہیں ہے۔ اور منکرین سے یہودی مراد ہیں۔ جو عیسوی نبوت کے منکر تھے۔

اس طرح آیت کا حاصل یہ ہوا کہ امت محمد یہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر حاکم اور غالب رہیں گے۔ چنانچہ جلد ہی یہ وعدہ پورا ہو گیا اور یہودی ذلیل وخوار ہوئے۔ اور ان کی سلطنت برباد ہوئی، پھر آج تک یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہیں یا تو نصاریٰ کی رعایا وتابع ہیں یا اہل اسلام کے [1]۔ اور قیامت کے قریب تک ایسے ہی رہیں گے، صرف چالیس دن کے لئے دجال کا ایک طرح کا شر وفساد پھیلے گا جو کہ یہود کا سردار ہے۔ لیکن اول تو وہ فوراً مٹ جائے گا، پھر ان کی کوئی باضابطہ امن اطمینان سے حکومت نہیں ہوگی۔ اور ایسی عارضی شورش کو سلطنت نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح مورخ مسعودی سے جو بعض اصحاب قلم نے بعض عباسیوں کے زمانہ میں یہود کی کچھ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے سلسلہ میں نقل کیا ہے، وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی سلطنتوں کے مقابلہ میں اس قابل نہیں کہ اس کو ان دونوں کے برابر

---

(۱) اور آج جو ہر جگہ اور ہر شعبۂ زندگی میں یہود کی بالادستی نظر آتی ہے وہ ﴿ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾ کی وجہ سے ہے، اگر امریکہ اور برطانیہ: اسرائیل کے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیں تو مسلمان ایک دن میں ان کو وہاں سے نکال دیں، بلکہ یہ انہیں کا بویا ہوا ﴿ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ ﴾ ہے ۱۲ سعید احمد پالن پوری

یا ان پر غلبہ کہا جاسکے، بلکہ اس حالت میں بھی ان دونوں کو غالب اور یہود کو مغلوب ہی کہا جائے گا، جس کا اس آیت میں وعدہ کیا گیا ہے۔

(۵) پانچواں وعدہ قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کے متعلق فیصلہ فرمادینے کے بارے میں ہے۔ چنانچہ قیامت آئے گی اور یہ وعدہ پورا ہوگا۔ اور ترجمہ میں ''عملی'' کی قید لگانے کا یہ فائدہ ہے کہ شرعی دلیل سے تو فیصلہ یہاں ہی ہوگیا ہے۔ چنانچہ یہود کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب یعنی سولی پر چڑھایا گیا۔ وہ دفن ہوئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے۔ اور عیسائی کہتے تھے کہ صلیب پر چڑھائے جانے اور دفن ہونے کے بعد وہ زندہ ہو کر آسمان پر گئے۔ قرآن مجید نے اس ارشاد ﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ ﴾: (نہ انھوں نے ان کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا۔ النساء ۱۵۷) سے دونوں کی نفی فرمادی۔ اور ان کے اشتباہ کے منشا پر اگلے فقرہ ﴿ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ (لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا) میں تنبیہ فرمادی۔

اگر کوئی شخص حقیقت کا منکر ہو اور صلیب پر چڑھائے جانے سے متعلق بیان کے تواتر یعنی لگاتار مشہور ہونے کا مدعی ہو تو اس کا جواب صاف ظاہر ہے کہ وہاں آپ کے حامی تو خوف کی وجہ سے جمع ہی نہیں تھے، صرف مخالف یہودی ہی جمع تھے۔ اس لئے وہ تھوڑی سی تعداد تواتر کہلانے کے لئے کافی نہیں۔ دوسرے نصرت الٰہی سے ایک شخص کو ان کا ہم شکل بنادیا گیا، جس کی وجہ سے خود ان کو اشتباہ ہوگیا۔ اور بعض علماء کے مطابق وہاں موجود لوگوں کی طرف سے غلط خبر اڑا دینے کی وجہ سے جو لوگ وہاں موجود نہیں تھے ان پر معاملہ مشتبہ ہوگیا کہ کسی بھی طرح مشاہدہ نہ رہا۔ تیسرے ان کا دشمن ہونا خود ان کے جھوٹ پر اتفاق کو ثابت کرتا ہے۔ اس طرح تواتر کی شرطیں مفقود ہوگئیں۔

قادیانی تحریف پر ضروری تنبیہ:

تفسیر کی تقریر سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو آج کل بغیر دلیل کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور آپ دفن کردیئے گئے۔ اور اب آپ قیامت کے قریب تشریف نہیں لائیں گے اور اس بنا پر عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے متعلق احادیث میں تحریف کرتے ہیں کہ اس سے مثیل عیسیٰ (حضرت عیسیٰ جیسی دوسری شخصیت) مراد ہے اور پھر اس 'مثیل' کا مصداق خود کو قرار دیتا ہے۔

اس مدعی کے پیدا کئے ہوئے تمام شبہات کی بنیاد دو امر ہیں: ایک نقلی دوسرا عقلی۔ نقلی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کے بارے میں لفظ ﴿ مُتَوَفِّيْكَ ﴾ (آپ کو وفات دینے والا ہوں) فرمایا ہے۔ عقلی یہ کہ جسد عنصری (عناصر سے بنے ہوئے جسم) کا آسمان پر جانا محال ہے۔ اور اس بنیاد پر معراج کے قصہ میں بھی تاویل کی ہے۔

نقلی دلیل کا جواب تفسیر سے ظاہر ہوگیا کہ اگر ﴿ مُتَوَفِّيْكَ ﴾ کے معنی وفات کے بھی لئے جائیں تب بھی یہ وعدہ قیامت کے قریب آسمان سے نزول کے وقت کے اعتبار سے ہے۔ اس سے ان کے دعویٰ کے مطابق قتل کرنے یا صلیب

پر چڑھائے جانے کے وقت موت کے واقع ہونے یا اٹھائے جانے یا فی الحال زندہ ہونے کی نفی لازم نہیں آتی۔ اور دوسرے دلائل سے اٹھایا جانا اور زندہ ہونا ثابت ہے، اس لئے اس کا عقیدہ رکھنا اور قائل ہونا واجب ہے۔

رفع یعنی اٹھایا جانا تو آیت ﴿ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ سے ثابت ہے جو اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے جسم سمیت اٹھائے جانے کے معنی میں نص ہے، اور بغیر کسی مجبوری کے حقیقی کی بجائے مجازی معنی لینا ممنوع ہے۔ اور یہاں مجبوری کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اور آپ کا زندہ ہونا احادیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: عیسیٰ مرے نہیں وہ قیامت کے دن سے پہلے تمہاری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں (اس حدیث کو علامہ سیوطی نے در منثور میں روایت کیا ہے اور ابن کثیر نے آلِ عمران میں نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے کہا ہے: مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ ہم سے احمد بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ ہم سے عبداللہ بن ابی جعفر نے اپنے والد کے واسطہ سے بیان کیا کہ ہم سے ربیع بن انس نے حسن کے واسطہ سے بیان کیا۔ اس طرح ان سے ایک اثر بیان کیا پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے فرمایا کہ عیسیٰ مرے نہیں ہیں اور قیامت کے دن سے پہلے تمہاری طرف لوٹنے والے ہیں اور اس کو سورۂ نسا میں دوسرے طریق سے ان پر موقوف کرتے ہوئے بیان کیا۔ اور وہ حسنؒ کے نزدیک مرفوع ہے اور ان پر موقوف ہے اور اس طرح اس کو ابن جریر نے ان سے مرفوعاً روایت کیا ہے، جیسا کہ رسالة التصريح بما تواتر في نزول المسيح (ص:٦١) میں بیان کیا گیا ہے۔

اور اجماع ظاہر ہے کہ کسی بھی سلف یا خلف مستند عالم سے اس کے خلاف نقل نہیں کیا گیا ہے۔

اور اگر ﴿ مُتَوَفِّيْكَ ﴾ میں وفات کے معنی نہ لئے جائیں جیسا کہ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ توفی کے معنی پورا لینے کے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میں تمہیں آسمان پر پورا یعنی جسم سمیت لے لوں گا۔ تو اس جواب میں استدلال کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔

یا وفات کے معنی لیں اور پھر زندہ ہونے کے بعد اٹھائے جانے کے قائل ہوں جیسا کہ بعض کی یہ رائے بھی ہے تو بھی فی الحال زندہ موجود ہونے کی نفی لازم نہیں آتی۔

اور عقلی دلیل کے جواب کے لئے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (اللہ ہر چیز پر قادر ہے) کافی ہے۔ البتہ جو امور ذاتی طور پر ممتنع ہیں وہ شے کے عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ یا جو شرعاً ممتنع ہیں، ان کا واقع نہ ہونا یقینی ہے۔ اور جسم کے اٹھائے جانے کا امتناع نہ ثابت ہوا ہے اور نہ ہی ہو سکے گا۔ اس لئے مدعی کا دعویٰ بالکل باطل اور گمراہی ہے۔ اور احادیث کی تحریف ایک فاسد کی دوسرے فاسد پر بنیاد رکھنا ہے۔ پھر مصداق کی تعیین بغیر مرجح کی ترجیح ہے۔ کیا دوسرا شخص ایسا 'مثیل' ہونے کا اپنے لئے دعویٰ نہیں کر سکتا؟ اس بحث میں یہ تحریر مختصر ہے، مگر ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اور تفصیلی بحث میں بہت سے رسالے اور کتابیں ہمارے زمانہ کے علماء حق نے شائع فرما دیئے ہیں اگر شوق ہو تو مطالعہ فرمائے جائیں، لیکن سمجھ دار آدمی

اس مختصر تقریر سے تمام شبہات کا جواب سمجھ سکتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ٘ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۝

ترجمہ: تفصیل یہ ہے کہ جولوگ کافر تھے، سوان کو سخت سزا دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اُن لوگوں کا کوئی حامی نہ ہوگا، اور جولوگ مؤمن تھے اور انھوں نے نیک کام کئے تھے، سوان کو اللہ تعالیٰ ان کے ثواب دیں گے اور اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے ظلم کرنے والوں سے۔

ربط: اوپر کی آیت میں ارشاد تھا کہ میں ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن عملی فیصلہ کروں گا۔ اب اس آیت میں اُس فیصلہ کا بیان ہے۔

قیامت کے دن اہل حق اور اہل باطل میں کیا فیصلہ ہوگا؟

(فیصلہ کی) تفصیل یہ ہے کہ (ان اختلاف کرنے والوں میں) جولوگ کافر تھے۔ ان کو (ان کے کفر پر دونوں جہانوں میں) سخت سزا دوں گا۔ دنیا میں بھی (کہ وہ تو ہو چکی) اور آخرت میں بھی (کہ وہ باقی ہے) اور ان لوگوں کا کوئی حامی (حمایتی) نہ ہوگا۔ اور جولوگ مؤمن تھے اور انھوں نے نیک کام کئے تھے تو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کا) ثواب دیں گے اور (کفار کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (ایسے) ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (جو اللہ تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں، یعنی چونکہ یہ ظلم عظیم ہے، معافی کے قابل نہیں، اس لئے وہ شدید غضب کے مستحق ہو کر سزا یاب ہونگے)

ایک خفیف اشکال کا جواب:

اس آیت کے مضمون میں ایک خفیف سا اشکال ہے کہ قیامت کے فیصلہ کے بیان میں یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ دنیا اور آخرت میں سزا دوں گا، کیونکہ اُس وقت تو دنیوی سزا نہیں ہوگی۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس کہنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم سے کہے کہ اس وقت تو ایک سال قید کی سزا کرتا ہوں، اگر جیل خانہ میں کوئی شرارت کی تو دو سال کر دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سال آج کی تاریخ سے شروع ہوں گے، اس طرح اس بنا پر یہ یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال مراد نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس شرارت کے وقت اگر چہ کچھ مدت گذر چکی ہو پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم ہو جائے گا تو حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعی سزا کی تکمیل ایک سال زیادہ ملا کر ہوگی۔

اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں تو سزا ہو چکی، اس کے ساتھ آخرت کی سزا ملا کر یہ مجموعی سزا قیامت کے دن

مکمل کردی جائے گی۔ یعنی دنیا کی سزا آخرت کی سزا کے لئے کفارہ نہیں ہوگی۔ ایمان والوں کے برخلاف کہ اگر ان پر دنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور آخرت کی عقوبت خفیف یا ختم ہوجاتی ہے۔

اور اس کی وجہ کی طرف ﴿ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اہل ایمان، ایمان کے سبب محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں۔ اور اہل کفر مبغوض یعنی غضب کے مستحق ہیں۔ مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔

اور کفار میں دو احتمال ہیں یا تو خاص کفار یعنی یہودی یا مطلق کفار جن میں دوسرے فرقے بھی شامل ہوجائیں گے، سب کے لئے آخرت کی سزا تو ظاہر ہے اور دنیوی سزا یہود کے لئے تو یہی کافی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا یعنی وہ ہمیشہ مغلوب رہیں گے اور دوسرے کفار کی سزا بھی مختلف اوقات میں ہوتی رہتی ہے کہ وہ کبھی مسلمانوں کو جزیہ دیتے ہیں، کبھی ہلاک کئے جاتے ہیں، کبھی دوسرے امراض و مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اگرچہ یہ واقعات اہل اسلام کو بھی پیش آتے ہیں، مگر ان کے لئے وہ مبغوضیت کی سزا کے طور پر نہیں ہوتے بلکہ رحمت اور سیئات کا کفارہ ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۞

ترجمہ: یہ ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ منجملہ دلائل کے ہے اور منجملہ حکمت آمیز مضامین کے ہے۔

ربط: یہ قصہ یہاں ختم ہوگیا۔ اب اس خبر دینے کا خارق عادت ہونا یعنی معجزہ ہونے کی وجہ سے نبوت محمدیہ کی دلیل ہونا بیان فرماتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر آیت ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ﴾ میں اس کی تقریر گذر چکی۔ اور آگے بھی آتی ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ سے نبوت محمدیہ پر استدلال:

یہ (مذکورہ قصہ) ہم تمہیں (وحی کے ذریعہ) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ آپ (کی نبوت) کے دلائل میں سے ہے اور حکمت سے بھرے ہوئے مضامین میں سے ہے۔

تفسیر: یعنی اس کے قدرت الٰہیہ اور دیگر علوم پر دلالت کرنے کی وجہ سے یہ ذاتی طور پر بھی علم و حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے اور آپ کے اعتبار سے بھی نبوت کے دعوی کی سچائی پر دلیل ہے، کیونکہ آپ کو یہ قصہ ماضی کے دوسرے قصوں کی طرح وحی کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہوا، اس لئے ایسی حالت میں خبر دینا خارق عادت (معجزہ) ہے جو کہ نبوت کے ثبوت کے دلائل میں سے ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞

ترجمہ: بے شک حالتِ عجیبہ عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالتِ عجیبہ آدم کے ہے کہ ان کو مٹی سے بنایا پھر ان کو حکم دیا کہ ہو جا، بس وہ ہو گئے۔

ربط: قصہ کے ختم ہونے کے بعد اب اہل کتاب کے مباحثہ اور لڑائی کی طرف رجوع ہے، جیسے سورت کے شروع میں نصاریٰ پر عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کی نفی پر دلائل قائم کئے تھے۔ اب بھی اس مضمون کا بیان ہے چونکہ نصاریٰ کے شبہات میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تھا جس سے انہیں آپ کی خدائی یا اللہ کا بیٹا ہونے کا شبہ ہو گیا تھا، اس لئے اس استدلال کا ناکافی ہونا بتاتے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے نصاریٰ کے استدلال کا جواب:

بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی عجیب حالت (یعنی ان کی ازلی تجویز) میں حضرت آدم (علیہ السلام) کی عجیب حالت کی طرح ہے کہ ان کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا، پس وہ (جاندار) ہو گئے۔

تفسیر: جواب کی تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا قدرت الٰہیہ سے کوئی بعید نہیں۔ چنانچہ ان سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام بغیر باپ اور ماں کے محض مٹی سے پیدا ہو چکے ہیں۔ اس طرح بغیر باپ کے پیدا ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ اور بغیر ماں کے پیدا ہونے میں حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ کیونکہ آدمی کا صرف ماں کے خون سے بننا اتنا عجیب نہیں جتنا مٹی سے بننا زیادہ عجیب ہے۔ پھر جب آدم علیہ السلام کا خدا نہ ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے تو اس بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کا شبہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور ازلی تجویز کا مطلب یہ ہے کہ پیدا کرنے سے پہلے علم الٰہی میں یوں مقدر تھا کہ ان حضرات کی پیدائش اس کیفیت سے ہوگی۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

ترجمہ: یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے، سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جیے۔

ربط: اب مذکورہ بالا مضمون کے حق ہونے کی تاکید فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا مضمون کی تاکید:

یہ واقعی معاملہ (جس کا اوپر ذکر ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا ہے) اس لئے آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

فائدہ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ آپؐ کے اندر شبہ کرنے کا احتمال تھا۔ اصل یہ ہے کہ فائدہ کا مقصود کبھی کبھی

مخاطب کی خصوصیت ہوتی ہے کہ تم ایسا کام نہ کرنا، جبکہ اس کام کے کرنے کا احتمال ہو۔ اور کبھی اس سے قطع نظر نفس مضمون کی تاکید اور مہتم بالشان ہونا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے وفادار وزیر کو کہیں جاتے وقت اپنے پرانے احکام و معمولات کی جن کو وزیر ایسے موقع پر پہلے بھی تعمیل کرتا آیا ہے، تاکید کرے۔ اگر چہ یہ بھی اطمینان ہو کہ یہ بغیر تاکید کے بھی حسب معمول عمل کرے گا۔ وہاں یہی مقصود ہوتا ہے، اس طرح آیت میں یہی دوسرا معاملہ مراد ہے۔ خوب سمجھ لو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝

ترجمہ: پس جو شخص آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حجت کرے آپ کے پاس علم آئے پیچھے تو آپ فرمادیجئے کہ آجاؤ ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو، اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو، پھر ہم خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو ناحق پر ہوں۔

ضدی لوگوں کو چپ کرنے کا ایک طریقہ: مباہلہ کی دعوت دینا بھی ہے:

اب جو کوئی آپ کے پاس (واقعی) علم آجانے کے بعد (بھی) عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا کرے تو آپ (جواب میں یوں) فرمادیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آجاؤ، ہم (اور تم) اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود ہم بھی اپنے آپ کو اور تم بھی اپنے آپ کو بلا (کر جمع کر) لیں۔ پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں، اس طرح کہ ان پر لعنت بھیجیں جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں۔

تفسیر: مطلب یہ کہ دلیل سے گفتگو ختم نہ ہو تو یوں کرلو کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ جو اس معاملہ میں باطل پر ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت ہو۔ کیونکہ لعنت کے معنی حق کی رحمت سے دور ہوجانا ہیں اور رحمت سے دور ہوجانا اللہ کے قہر و غضب سے قریب ہونا ہے۔ اس طرح اس کا حاصل یہ ہوا کہ جھوٹے پر قہر و غضب نازل ہو۔ تو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ اس صورت میں اہل عناد کے نزدیک بھی صادق اور کاذب کی پوری تعیین واضح ہوجائے گی۔

اس طرح بددعا کرنے کو عربی میں مباہلہ کہتے ہیں۔ اور اس میں دراصل خود مباحثہ کرنے والوں کا مذکورہ مضمون کی بددعا کرنا ہے۔ اپنے اعزا و اقربا کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم اس سے اہتمام بڑھ جاتا ہے، کیونکہ ایسے لوگوں کے نقصان اور ہلاکت سے خود طبعی طور پر انسان کو رنج ہوتا ہے۔ اس لئے اس مضمون سے کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہو اس کے یہ عزیز و اقارب بھی ہلاک ہوجائیں اور مصیبت میں مبتلا ہوں، اپنے دعویٰ کی سچائی کا اور زیادہ کامل یقین ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی کہ حضور ﷺ نے نجران کے رہنے والے نصاری کو اسلام کی دعوت کا فرمان لکھا تھا۔ اور اس کے مضمون کا خلاصہ ترتیب وار تین امور تھے: یا تو اسلام قبول کرو یا جزیہ دو یا پھر قتال و جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے شرحبیل اور عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن فقص کو حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا، ان لوگوں سے آپ کی مذہبی گفتگو ہوئی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بات چیت کی نوبت آ گئی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ نے ان کو اس مضمون کی خبر دی اور خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی و حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم سمیت تشریف لا کر مباہلہ کے لئے تیار ہوئے۔ شرحبیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ہمراہیوں سے کہا کہ تمہیں ان کا نبی ہونا معلوم ہے۔ نبی سے مباہلہ کر کے فلاح نہیں پا سکتے، بلا شبہ ہم سب ہلاک ہو جائیں گے، تب ان دونوں نے کہا کہ پھر کیا رائے ہے؟ شرحبیل بولا کہ میری رائے یہی ہے کہ ان کی رائے کے مطابق ان سے صلح کر لو۔ چنانچہ آپ سے عرض کیا گیا آپ نے ان پر جزیہ مقرر فرما دیا اور انھوں نے منظور کر لیا۔ یہ بات روح المعانی میں دلائل البیہقی کی روایت سے مروی ہے، مگر اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آنے کا ذکر نہیں ہے۔ اور نبوت پر پختہ یقین کی بات دلائل ابی نعیم کی روایت میں ہے۔ اور صحیحین میں مزید دو شخصوں عاقب اور سید کے آنے کا بھی ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب ہوں۔

فائدہ: آیت میں الفاظ ﴿ أَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ﴾ (ہم بھی اپنے آپ کو اور تم بھی اپنے آپ کو) سے مراد تو خود اہل مباحثہ ہیں اور ﴿ نِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ ﴾ سے مراد خاص زوجہ بیوی مراد نہیں، بلکہ اپنے گھر کی جو بھی عورتیں ہوں مراد ہیں، جن میں بیٹی بھی داخل ہے۔ چنانچہ آپ اس وجہ سے کہ حضرت فاطمہ کو جو اولاد میں سے سب سے زیادہ عزیز تھیں، لائے۔ اسی طرح ﴿ أَبْنَاءَنَا ﴾ سے خاص صلبی اولاد مراد نہیں، بلکہ اولاد کی اولاد بھی اس میں شامل ہے۔ جو مجازاً اولاد کہلاتے ہیں یعنی عرف عام میں اولاد کے مثل سمجھے جاتے ہوں۔ اس میں نواسے اور بھی داخل ہیں۔ چنانچہ آپ حضرات حسنین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو لائے۔

پس بعض شیعوں کا یہ کہنا کہ حضرت علی ﴿ نِسَاءَنَا ﴾ میں تو ظاہر ہے داخل نہیں اور اسی طرح ﴿ أَبْنَاءَنَا ﴾ میں بھی داخل نہیں کہ داماد بیٹا نہیں ہوتا۔ اس لئے ﴿ أَنفُسَنَا ﴾ میں داخل ہوں گے تو عین رسول ہوئے اور خلافت بلافصل کے مستحق ہوئے۔

یہ بات بالکل بناء الفاسد علی الفاسد ہے یعنی غلط بات کی غلط بات پر بنیاد رکھنا ہے کہ اول تو ہم نے ان کا ابناء میں داخل ہونا ثابت کر دیا۔ دوسرے اگر ﴿ أَنفُسَنَا ﴾ میں داخل ہونا بھی مان لیا جائے تو محاورہ میں اپنے متعلقین پر خواہ وہ متعلق کوئی بھی ہو اور تعلق کسی درجہ کا بھی ہو ﴿ أَنفُسَنَا ﴾ کا اطلاق صحیح ہے۔ چنانچہ قرآن میں ﴿ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ ﴾ آیا ہے (البقرۃ ۸۵) جبکہ وہاں تقتلون قومکم مراد ہے۔

اب بھی ضرورت کے وقت مباہلہ جائز ہے:

ردالمحتار کے باب الرجعۃ میں حلالہ کی بحث میں البحر الرائق سے غایۃ البیان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مباہلہ اب بھی ضرورت کے وقت جائز اور مشروع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لعان کا مشروع ہونا مباہلہ کے مشروع ہونے کی کافی دلیل ہے اور عبد بن حمید نے قیس بن سعد سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس اور ایک شخص کے درمیان کسی چیز کے بارے میں تنازع ہوا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو مباہلہ کی دعوت دی اور یہ آیت پڑھی اور اپنے ہاتھ اٹھائے اور رکن یمانی کی طرف رخ کیا گویا آپ رضی اللہ عنہ اپنے اس عمل سے مباہلہ کی کیفیت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے۔ اور اس میں ہاتھ اٹھائے جائیں گے۔ اور حاکم کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ وہاں ہاتھ کاندھوں تک اٹھائے جائیں گے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے۔

مباہلہ ظنی اختلافی مسائل میں جائز نہیں:

اور ردالمختار باب اللعان بحث صفت اللعان میں جواز کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مباہلہ کرنے والا سچا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ صدق سے مراد صدق قطعی ہے، صدق ظنی نہیں، اس لئے مسائل اختلافیہ ظنیہ میں ناجائز ہوگا۔

اور مباہلہ کا انجام کہیں صراحت کے ساتھ تو نظر سے نہیں گذرا۔ مگر حدیث میں مذکورہ بالا قصہ کے متعلق اتنا ذکر ہے کہ اگر وہ لوگ مباہلہ کر لیتے تو ان کے اہل وعیال اور اموال سب ہلاک ہوجاتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جل جاتے، اسے جلالین میں امام احمد کی روایت سے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ اس سے قیاس کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر اب بھی یہی ہلاکت یا عظیم ضرر ہوگا، لیکن ضرر کے لائق ہونے میں دیر لگنے یا ظاہر نہ ہونے پر شبہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ حق وباطل کی تعیین کے لئے شرعی دلائل کافی ہیں۔ مباہلہ پر موقوف نہیں کہ اس کی بڑی غرض زبانی تنازعہ کا ختم کرنا ہے واللہ اعلم

> إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ: بے شک یہ مذکور وہی ہے سچی بات اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اور بلا شک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں۔

ربط: او پر عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے ان کے خدا ہونے پر استدلال کرنا باطل ثابت ہوگیا اور جواب پورا ہوگیا۔ اب اہتمام کے لئے اس مضمون کا حق ہونا اور نتیجہ کے طور پر حق تعالیٰ کا واحد معبود ہونا بیان فرماتے ہیں۔

مذکورہ مضمون بالا کی حقیت کی تاکید اور توحید کا اثبات:

بے شک یہ مذکورہ بات ہی سچی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں (یہ توحید ذاتی ہوئی) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے، حکمت والے ہیں (یہ توحید صفاتی ہوئی)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ ع

ترجمہ: پھر اگر سرتابی کریں تو بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں، فساد والوں کو۔

ربط: اب فساد پھیلانے والوں اور عناد رکھنے والوں سے جو کہ اتنی حجتوں کے بعد بھی نہ مانیں، گفتگو کی ممانعت ہے اور ان کا معاملہ اپنے حوالہ ہونے کا اعلان فرماتے ہیں۔

اہل فساد کا انجام:

پھر (ان سب حجتوں کے بعد بھی) اگر (وہ حق قبول کرنے سے) سرکشی کریں تو (آپ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجئے، کیونکہ) بیشک اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو خوب جاننے والے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے، خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم اس کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

ربط: اوپر اہل کتاب سے مباحثہ و جھگڑا تھا، جس کو بہتر طریقہ سے ختم کردیا گیا۔ اب انہیں پھر لطف و نرمی کے ساتھ حق کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور اوپر روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اور آگے الفاظ کے عموم سے یہود و نصاریٰ دونوں کی طرف ہے۔

اہل کتاب کو نرمی کے ساتھ اسلام کی دعوت:

(اے محمد ﷺ) آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے

ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے۔ پھر اگر (اس کے بعد بھی) وہ لوگ (حق سے) منہ پھیریں تو تم (مسلمان) لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو (اس بات کے) ماننے والے ہیں) (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)

تفسیر: اس مضمون کو مسلم اس لئے کہا گیا کہ تمام آسمانی شریعتوں میں اس کی تعلیم دی گئی ہے اور اجمالی وکلی طور پر اہل کتاب بھی اس کو مانتے ہیں کہ توحید فرض ہے، اور شرک کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ شرک میں اس لئے مبتلا تھے کہ وہ اس کو توحید کے خلاف اور شرک نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس تقریر میں لطف و نرمی یہ ہوئی کہ ان کو مسلمہ کلیات یاد دلانے کے بعد ان کلیات میں مختلف فیہا جزئیات کے داخل ہونے کو ثابت کرنا آسان ہو گیا۔

اور ان کے شرک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ حق تعالیٰ کی بعض خصوصی صفات مثلاً الوہیت یا خدائی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت عزیر علیہ السلام کے لئے ثابت کرتے تھے، جس کو آیت میں غیر اللہ کی عبادت کہا گیا۔ اسی طرح مطلق طور پر قابل اطاعت ہونے کی صفت کو جو کہ باری تعالیٰ کے خواص میں سے ہے، اپنے احبار اور راہبوں کے لئے مانتے تھے، جس کو آیت میں ﴿ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے حلال اور حرام کرنے کو، خواہ وہ اجماع کے ساتھ معمول بنائے ہوئے محکم اور قطعی نصوص کے بھی خلاف ہو، واجب العمل سمجھتے تھے اور شرک کی حقیقت یہی ہے کہ واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ کے خواص کو ممکن الوجود یعنی مخلوقات کے لئے ثابت مانا جائے، لیکن ان کو اشتباہ اس سے ہو گیا تھا کہ وہ بالذات اور بالعرض کا فرق کرتے تھے۔ حالانکہ یہ فرق غیر مختص صفات میں صحیح ہے اور مختص صفات میں غیر صحیح ہے اور شرک کو دفع نہ کرنے والا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "خدا کو چھوڑ کر" تو یہ اول تو اس وجہ سے ہے کہ احبار و رہبان کی ایسی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کے احکام ترک ہو ہی جاتے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "خدا کی توحید کو چھوڑ کر" اور ظاہر ہے کہ شرک کے ساتھ توحید چھوٹ ہی جاتی ہے۔ اور چونکہ ظاہر میں: شرک خدا اور غیر خدا دونوں کو ماننا ہے، اس لئے بعض مقامات میں ﴿ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ فرما دیا۔ اور یہ کہنے کے لئے جو فرمایا کہ "تم گواہ رہو" اس میں یہ تعلیم ہے کہ جب بات واضح ہو جانے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو حجت تمام کرنے کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے بات ختم کر دینی چاہئے۔

تقلید فقہاء جائز اور مشروع ہے:

تنبیہ: اس آیت کے ذریعہ ایسی تقلید باطل قرار پاتی ہے، جیسی اہل کتاب کرتے ہیں، جس کا ابھی بیان ہوا اور جو تقلید جمہور اہل اسلام میں اب رائج ہے، وہ جائز اور مشروع ہے۔ اور وہ اس آیت کے مضمون میں داخل نہیں، جس کا محل وہ مسائل ہیں جو ظنی ہیں اور جن میں دونوں طرف کا احتمال ہے، جب تک کہ نص قطعی محکم اور جس پر اتفاق ہو یا جس کا اجماع

کے خلاف ہونا ثابت نہ ہو (نہ پایا جائے) ورنہ نص اور اجماع کو مقدم رکھا جائے گا۔

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۞ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞ اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَـلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۞

ترجمہ: اے اہل کتاب! کیوں حجت کرتے ہو ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد، کیا پھر سمجھتے نہیں ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں تو حجت کر ہی چکے تھے، جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی، سو ایسی بات میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصلاً واقفیت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن طریق مستقیم والے صاحبِ اسلام تھے۔ اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے ابراہیم کے ساتھ، البتہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی ہیں اور یہ ایمان والے۔ اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے۔

ربط: مندرجہ بالا مباحثہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق گفتگو تھی کہ نصاریٰ ان کے خارق عادت معجزے والے امور سے ان کی الوہیت یعنی خدائی کو ثابت کرتے تھے، اس کو دلائل کے ذریعہ باطل ثابت کر دیا کہ اگر چہ خارق عادت کام حق ہیں، مگر یہ الوہیت کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ اب ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق گفتگو ہے، جس کا سبب یہ ہوا کہ ایک بار نجران کے نصاریٰ اور یہود کے کچھ علماء حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں جمع ہو گئے اور ہر فریق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے طریق پر بتانے لگا۔ جیسا کہ ابن اسحاق اور بیہقی سے ابن عباسؓ کی روایت سے لباب النقول میں وارد ہے۔ جس سے مقصود اپنے اپنے طریق کی حقانیت اور جواز و مشروعیت کی بقا ثابت کرنا تھا اور ان کے اس باطل مقصود سے رسالت محمدیہ پر الزام آتا تھا۔ کیونکہ آپ کی شریعت دوسرے طریقوں کو منسوخ بتا رہی ہے اور ناسخ و منسوخ مشروعیت میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے حق تعالیٰ ان کے قول کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اور اگر بفرض تقدیر ملت ابراہیمی اور یہودیت و نصرانیت کی مطابقت مان لی جائے تو شریعت محمدیہ کے مؤخر ہونے کی وجہ سے یہودیت و نصرانیت کی مشروعیت کی بقا لازم نہیں، لیکن چونکہ خود مطابقت کا دعویٰ ہی غلط تھا، اس لئے سرے سے اسی کو غلط قرار دیا۔ اس طرح اس تقدیر پر سابقہ مباحثہ میں توحید کے مسئلہ کو حق قرار دیا گیا ہے اور اس بحث میں رسالت کے مسئلہ کو حق قرار دیا ہے۔

ملتِ ابراہیمی کے بارے میں اہل کتاب کے دعوی کی تردید:

اے اہل کتاب! (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں بحث وحجت کیوں کرتے ہو؟ (کہ وہ یہودی طریقہ پر تھے یا نصرانی طریقہ پر) حالانکہ توریت وانجیل ان کے (زمانہ کے بہت) بعد میں نازل کی گئیں (اور یہ دونوں طریقے ان دونوں کتابوں کے نازل ہونے کے بعد ظاہر ہوئے۔ پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر حضرت ابراہیم ان طریقوں پر کیسے ہوسکتے ہیں؟) کیا (ایسی خلاف عقل بات منہ سے نکالتے ہواور) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو؟ ہاں! تم ایسے ہو کہ تم ایسی بات میں تو حجت کرہی چکے تھے، جس سے تمہیں کسی قدر تو واقفیت تھی (اگر چہ اس میں ایک غلط بات جوڑ کر غلط نتیجہ نکالتے تھے۔ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خارق عادت امور مراد ہیں، کہ وہ واقعہ کے مطابق ہیں، البتہ اس میں یہ مقدمہ غلط ملالیا گیا کہ ایسے خوارق والا الٰہ یا ابن الالٰہ یعنی خدا کا بیٹا ہوگا۔ لیکن یہ مقدمہ تو اشتباہ پیدا کرنے والا تھا۔ اس لئے اس کو نا کافی واقفیت کہیں گے۔ جب اس میں تمہاری غلطی ظاہر ہوگئی) تو (پھر) ایسی بات میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تمہیں بالکل ہی واقفیت نہیں (کیونکہ اس دعوی کے لئے تو تمہارے پاس اشتباہ کا بھی کوئی منشا نہیں، کیونکہ ان کے اور ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے فروعات میں مطابقت بھی نہیں تھی) اور (ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کو) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے (اسی لئے تو ایسے بے سروپا دعوے کرتے ہو، جس سے علم بھی عدم علم کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ تو اب اللہ تعالیٰ سے ان کے طریقہ کے بارے میں سنو کہ) ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔ بلکہ البتہ سیدھے راستے والے (یعنی) صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے (اس طرح یہود ونصاری کو تو مذہبی طریق کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ ہوئی، ہاں!) بلاشبہ (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ سب سے زیادہ خصوصیت رکھنے والے وہ لوگ تھے جنھوں نے (ان کے وقت میں) جنھوں نے ان کا اتباع کیا تھا۔ اور یہ نبی (محمد ﷺ) اور ایمان والے ہیں (جو نبی ﷺ کی امت ہیں) اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے حامی ہیں (کہ انہیں ان کے ایمان کا ثواب دیں گے)

تفسیر: اگر ان یہود ونصاری کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں یہ دعوی بغیر تاویل کے تھا خواہ جہالت کی وجہ سے یا عناد کی وجہ سے، تب تو رد ظاہر ہے۔ اور ان کی غلطی بدیہی ہے اور اگر اس تاویل سے تھا کہ ان کا جو طریقہ تھا وہی ہماری شریعت میں مقرر ہوا تو رد کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ فروع میں موافقت نہ ہونا تو ظاہر ہے اور اصول میں مطابقت مراد ہے تو یہودیت کے اصولوں کی حقیقت مخصوص فروع کے ساتھ موافقت ہے۔ اسی طرح نصرانیت کا بھی معاملہ ہے۔ اور یہ مجموعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے یہ دعوی واضح طور پر سامنے آنے والے معنی کے اعتبار سے غلط ہوا۔

اور اگر جدید اصطلاح مقرر کی جائے تو اول تو شرعی الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلط ہے۔ دوسرے باطل کا وہم پیدا کرنے کی وجہ سے روکا جارہا ہے اور جس کا وہم ہورہا ہے وہ غلط ہے۔ اس بنیاد پر غلطی نظریاتی ہوگی۔
رہا یہ اشکال کہ اسی طرح اسلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آیا ہے پھر وہ صاحب اسلام کیسے ہوئے؟ اس کا جواب سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۲ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے۔
اور یہاں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کی جو زیادہ خصوصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ثابت کی گئی ہے اس کی وجہ تمام اصولوں میں مکمل اور بہت سارے فروعات میں مطابقت ہے۔ چنانچہ یہ مضمون بھی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۵ کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔ وہیں یہ اشکال بھی رفع کردیا گیا ہے کہ اس سے حضور ﷺ کی نبوت کے مستقل ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ ﴿ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ ﴾ کی خصوصیت امت ہونے کے اعتبار سے اور بعض کے مضمون کی مطابقت کے اعتبار سے ہے، اور جملہ ﴿ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴾ کی وضاحت بھی اسی جگہ گذر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔ اس طرح گویا یہ بعد کا مضمون حجت بازی و جھگڑے کا تتمہ ہے کہ یہود و نصاری ابراہیمی طریقہ کی مطابقت کا دعوی نہیں کرسکتے۔ البتہ امت محمدیہ اس کی مستحق ہے۔

وَدَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ یُضِلُّوۡنَكُمۡ، وَمَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۞

ترجمہ: دل سے چاہتے ہیں بعضے لوگ اہلِ کتاب میں سے اس امر کو کہ تم کو گمراہ کردیں۔ اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کرسکتے مگر خود اپنے آپ کو اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے۔

ربط: مندرجہ بالا آیتوں میں اہل کتاب کی گمراہی کا بیان تھا کہ وہ اس درجہ گمراہ ہوگئے ہیں کہ ایسی حجتوں کے باوجود الزام اور اتمام کے حق کو قبول نہیں کرتے۔ اب ان کے دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذکر فرماتے ہیں یعنی خود تو گمراہ تھے ہی، اس سے بڑھ کر یہ کہ اوروں کو بھی گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں۔

اہل کتاب کا گمراہ کرنا:

اہل کتاب میں سے بعض لوگ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں (دین حق سے) گمراہ کردیں۔ اور وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرسکتے (وہ خود کو گمراہی کے وبال میں گرفتار کررہے ہیں) اور اس کی خبر نہیں رکھتے۔

تفسیر: اگر ﴿ یُضِلُّوۡنَكُمۡ ﴾ میں خطاب کی ضمیر کے مخاطب خاص صحابہ ہیں تب تو یہ فرمان کہ کسی کو گمراہ نہیں کرسکتے بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ یہاں بھی مراد یہی ہوگی کہ تم میں سے کسی کو گمراہ نہیں کرسکتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان خاص حضرات میں سے وہ کسی کو گمراہ نہ کرسکے۔ اور اگر مراد مطلق اہل اسلام ہیں تو اس ارشاد کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ معاملہ ان کے اختیار و قدرت سے خارج ہے، اور یوں کوئی خود ہی گمراہ ہوجائے تو اور بات ہے۔ ﴿ مَا یُضِلُّوۡنَ ﴾ مذکورہ معنی کے

منافی نہیں۔اور یہ جو فرمایا کہ اس کی خبر نہیں رکھتے ،اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر توجہ نہیں دیتے ،ورنہ ان میں جو علماء تھے وہ چونکہ اسلام کی حقانیت کا علم رکھتے تھے، جیسا آگے ﴿ تَشْهَدُوْنَ ﴾ اور ﴿ تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے ظاہر ہوتا ہے۔اس لئے گمراہ کرنے کے وبال سے بھی باخبر تھے اور لفظ طائفہ سے مراد جہلاء ہوں تو ﴿ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ میں کوئی اشکال نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:اے اہلِ کتاب! کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ حالانکہ تم اقرار کرتے ہو۔اے اہلِ کتاب! کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی کو غیر واقعی سے اور چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو۔

ربط:اب ان کے گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے پر انہیں ملامت فرماتے ہیں۔

اہلِ کتاب کو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے پر ملامت:

اے اہلِ کتاب! اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو؟ (جو کہ توریت اور انجیل میں نبوتِ محمدیہ پر دلالت کرتی ہیں۔کیونکہ حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا ان آیات کو جھٹلانا ہے اور اللہ کی آیتوں کو جھٹلانا کفر ہے) حالانکہ تم (اپنی زبان سے) اقرار کرتے ہو (کہ وہ آیتیں حق ہیں، یہ تو ان کے گمراہ ہونے پر ملامت ہوئی۔آگے ان کے گمراہ کرنے پر ملامت فرماتے ہیں کہ) اے اہلِ کتاب! حق (یعنی نبوتِ محمدیہ) کو باطل (یعنی تحریف شدہ عبارت یا فاسد تفسیر) کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو) اور (کیوں) حق کو جانتے بوجھتے چھپاتے ہو؟

تفسیر: دونوں جگہ جو ﴿ تَشْهَدُوْنَ ﴾ اور ﴿ تَعْلَمُوْنَ ﴾ فرمایا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اقرار نہ کرنے اور علم نہ ہونے کی حالت میں کفر وغیرہ جائز ہے۔جو چیز ذاتی طور پر قبیح ہو وہ تو کسی حال میں جائز ہو ہی نہیں سکتی۔بلکہ وجہ یہ ہے کہ اقرار نہ کرنے اور علم کی صورت میں کفر اور زیادہ قبیح اور زیادہ ملامت کے قابل ہے اور ﴿ تَلْبِسُوْنَ ﴾ اور ﴿ تَكْتُمُوْنَ ﴾ کی حقیقت کا حاصل سورۃ البقرۃ آیت ۴۲ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

ترجمہ:اور بعضے لوگوں اہلِ کتاب میں سے کہا کہ ایمان لے آؤ اس پر جو نازل کی گئی ہے مسلمانوں پر شروع دن میں

اور انکار کر بیٹھو آخر دن میں، عجب کیا وہ پھر جاویں۔ اور کسی کے روبرو اقرار مت کرنا مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو۔ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ یقیناً ہدایت اللہ کی ہے، ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی، یا وہ اور لوگ تم پر غالب آجاویں، تمہارے رب کے نزدیک، اے محمد! آپ کہہ دیجئے کہ بیشک فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے۔ وہ اس کو جسے چاہیں عطا فرماویں، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں۔ خاص کر دیتے ہیں اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔

ربط: اوپر بیان تھا کہ بعض اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، آگے ان کی ایک تدبیر کو بیان فرماتے ہیں جو انھوں نے مؤمنوں کو گمراہ کرنے کے لئے تجویز کی تھی۔

نومسلموں کو شک میں مبتلا کرنے والے اہل کتاب کے مکروفریب کا بیان:

اور اہل کتاب میں سے بعض لوگوں نے (آپسی مشورہ کے طور پر) کہا کہ (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ) مسلمانوں پر جو (کتاب رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے) نازل کی گئی ہے۔ اس پر شروع دن میں (بظاہر) ایمان لے آؤ، اور (پھر) دن کے آخر میں (یعنی شام کو) اس کا انکار کر بیٹھو، کوئی بعید نہیں (کہ اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی قرآنِ کریم اور اسلام کے حق ہونے میں شک پیدا ہو جائے اور) وہ (اپنے دین سے) پھر جائیں (اور یہ خیال کریں کہ یہ لوگ اہل علم ہیں اور انہیں کوئی تعصب بھی نہیں ہے کہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ پھر گئے تو یقینی بات ہے کہ انہیں علمی دلائل سے اسلام کا غیر حق ہونا ثابت ہو گیا ہوگا۔ اور لازمی بات ہے کہ انھوں نے اسلام میں کوئی خرابی دیکھی ہوگی۔ اس لئے تو پھر گئے۔ اور اہل کتاب نے آپس میں یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو دکھانے کے لئے صرف ظاہری طور پر ایمان لانا) اور (سچے دل سے) کسی ایسے شخص کے سوا جو تمہارے دین کا پیرو ہو اقرار مت کرنا (اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سامنے تو اپنے قدیم دین کا اقرار خلوص کے ساتھ کرنا چاہئے۔ باقی غیر مذہب والوں یعنی مسلمان کے سامنے ویسے ہی مذکورہ بالا مصلحت کے تحت زبانی اسلام کا اقرار کر لینا۔ حق تعالیٰ ان کی اس تدبیر کے گھٹیا و بے ہودہ ہونے کا اظہار فرماتے ہیں کہ اے محمد! ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ (ان چالاکیوں سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ یقیناً ہدایت تو (جو بندوں کی ہوتی ہے، وہ) اللہ ہی کی (طرف سے ہوتی) ہے (اس طرح جب ہدایت اللہ کے قبضہ میں ہے تو وہ جس کو ہدایت پر قائم رکھنا چاہیں اس کو کوئی بھی سرکشی کی تدبیر سے نہیں ڈگمگا سکتا۔ آگے ان کے اس مشورہ اور تدبیر کی علت بتاتے ہیں کہ اے اہل کتاب! تم) ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے۔ جیسی تمہیں ملی تھی (یعنی کتاب اور آسمانی دین) یا دوسرے لوگ تمہارے رب کے نزدیک (اس دین حق کی تعیین میں) تم پر غالب آجائیں۔ (علت کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں مسلمانوں پر یہ حسد ہے کہ انہیں آسمانی کتاب کیوں مل گئی۔ یا یہ لوگ ہم پر مذہبی مناظرہ میں کیوں غالب آجاتے ہیں۔

اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام کا درجہ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ آگے اس حسد کا رد ہے کہ اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ بیشک فضل تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ اسے جس کو چاہیں عطا فرما دیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں فضل کی کمی نہیں۔ اور) خوب جاننے والے ہیں (کہ کس وقت کس کو کیا دینا مناسب ہے، اس لئے جس کو چاہیں) اپنی رحمت (اور فضل) کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں (چنانچہ اس وقت اپنی حکمت کے تحت مسلمانوں پر فضل اور رحمت فرما دی۔ اس میں حسد کرنا فضول اور جہالت و نادانی ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اہل کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ اس کو تمہارے پاس لا رکھے، اور ان میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے، مگر جب تک کہ تم اس کے سر پر کھڑے رہو، یہ اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے بارے میں کسی طرح کا الزام نہیں اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں۔ اور وہ بھی جانتے ہیں۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں دین کے معاملوں میں اہل کتاب کی خیانت یعنی ان کا اللہ کی آیتوں کا کفر کرنا، اور حق و باطل کا خلط ملط کرنا اور حق کو چھپانا اور مؤمنوں کو گمراہ کرنے کی تدابیر کا ذکر تھا۔ اب ان آیتوں میں ان کی مالوں میں خیانت کا ذکر ہے۔ اور چونکہ ان میں سے بعض لوگ امانت دار تھے، اس لئے دونوں قسموں کا ذکر فرمایا۔

اہل کتاب کے اہل امانت اور اہل خیانت کا ذکر:

اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس کوئی بڑا انبار بھی امانت رکھ دو تو وہ (واپس مانگتے ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے۔ اور انہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ (بھی) تمہیں ادا نہ کرے (بلکہ امانت رکھانے کا بھی اقرار نہ کرے) الا یہ کہ تم (امانت رکھ کر برابر) اس کے سر پر کھڑے رہو (تو خیر اس وقت تک نہ مکرے لیکن جہاں الگ ہوئے پھر ادا کرنے کا تو کہاں سوال پیدا ہوتا ہے، سرے سے امانت ہی سے مکر جائے یہ امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر غیر اہل کتاب کے (مال کے) بارے میں (اگر کچھ چوری چھپے لے لیا جائے تو مذہبی طور پر) کسی طرح کا الزام نہیں (یعنی غیر اہل کتاب قریش وغیرہ کا مال چرا لینا چھپا لینا سب جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوی کو رد فرماتے ہیں) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جانتے

بوجھتے جھوٹ گھڑتے ہیں (کہ اس فعل کو حلال سمجھتے ہیں کہ دل میں وہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال نہیں کیا۔ محض ان کا گھڑا ہوا دعویٰ ہے)

تفسیر: یہاں جس بعض کی مدح وستائش کی گئی ہے اگر اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لے آئے تھے، تب تو اس میں کوئی اشکال نہیں (جیسا کہ معالم التنزل میں ضحاک کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام ہیں کہ کسی شخص نے ان کے پاس بارہ سواوقیہ سونا امانت رکھا تھا۔ اور انھوں نے جوں کا توں ادا کر دیا تھا، جبکہ دوسرے بعض سے مراد فخاص بن عازورا یہودی ہے کہ کسی قریش نے ایک دینار امانت رکھا اور اس نے اس میں بھی خیانت کی۔

اور اگر خاص مؤمن مراد نہ ہوں بلکہ مطلقاً اہل کتاب میں امین اور خائن دونوں کا ہونا بیان کرنا مقصود ہو تو مدح اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول کے اعتبار سے نہیں کیونکہ بغیر ایمان کے کوئی بھی صالح عمل مقبول نہیں ہوتا۔ نہ اس پر ثواب ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (جو شخص صرف دنیاوی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ سب آخرت میں ضائع ہو جائے گا اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ بے اثر ہے، سورۃ ہود ۱۵ و ۱۶) بلکہ یہ مدح اس اعتبار سے ہے کہ اچھی بات چاہے کافر کی ہی کیوں نہ ہو کسی درجہ میں بہر حال اچھی ہے، جس کا اثر دنیا میں نیک نامی وغیرہ اور آخرت میں اس عذاب میں کمی ہے جو اس کی ضد کے ارتکاب کرنے سے ہوتا۔ اور ثواب کا نہ ہونا جو سورۂ ہود کی آیت سے معلوم ہوتا ہے، وہ عذاب نہ ہونے کے منافی نہیں۔ اور اس بیان سے اسلام کی انتہائی بے تعصبی ثابت ہوتی ہے کہ مخالف کی خوبی کی بھی واقعی قدر کے مطابق داد دی جاتی ہے۔

> بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: الزام کیوں نہ ہوگا؟ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بیشک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں متقیوں کو، یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اور اپنی قسموں کے ان لوگوں کو

کچھ حصہ آخرت میں نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ ان سے کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

ربط: اوپر ﴿ وَيَقُولُونَ ﴾ میں ان کے دعوی کا رد تھا۔ اب اس رد کی تاکید اور عہد کو پورا کرنے کی فضیلت اور عہد شکنی کی مذمت کی صراحت ہے۔

اہل کتاب کے قول کا رد اور عہد کو پورا کرنے کی فضیلت اور غداری کی برائی:

(خیانت کرنے والے پر) الزام کیوں نہ ہوگا (ضرور ہوگا۔ کیونکہ اس سے متعلق ہمارے یہ دو قانون ہیں: ایک یہ کہ) جو شخص اپنے عہد کو (خواہ وہ عہد، اللہ تعالیٰ سے ہوا ہو یا جواز کی شرط کے ساتھ کسی مخلوق سے) پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بیشک اللہ تعالیٰ (ایسے) متقیوں (یعنی ڈرنے والوں) کو محبوب رکھتے ہیں (اور دوسرا قانون یہ ہے کہ) یقیناً جو لوگ اس عہد کے مقابلہ میں جو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے (مثلاً انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا) اور اپنی قسموں کے مقابلہ میں مثلاً حقوق العباد اور معاملات کے سلسلہ میں قسم کھالینا) حقیر معاوضہ (یعنی دنیوی نفع) لے لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) کچھ حصہ نہ ملے گا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے (لطف و محبت کے ساتھ) کلام فرمائیں گے۔ اور نہ ان کی طرف (محبت کی نظر سے) دیکھیں گے اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کریں گے۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب (تجویز) ہوگا۔

تفسیر: احقر نے مخلوق کے ساتھ عہد کے سلسلہ میں ''جواز کی شرط کے ساتھ'' اس لئے کہا کہ اگر وہ عہد ناجائز ہے تو اس کو پورا کرنا حرام ہے۔ اور اللہ کے عہد کی مثال میں ''انبیاء علیہم السلام پر ایمان'' کا اس لئے ذکر کیا کہ یہود ہمارے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ ویسے یہ تخصیص بطور مثال ہے، ورنہ اللہ کے عہد میں سارے احکام آگئے۔ جس کی عمومیت میں مال سے متعلق احکام بھی داخل ہیں اور ﴿ أَيْمَانِهِمْ ﴾ میں اس کی زیادہ وضاحت ہوگئی اور ﴿ يُزَكِّيهِمْ ﴾ کا ایک صحیح ترجمہ اور بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہ کریں گے۔ جیسے مؤمنوں کی کریں گے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عہد پورا کرنے پر جو محبت کی بشارت ہے، اس میں ایمان بھی شرط نہیں، کیونکہ اللہ کے عہد کی عمومیت میں ایمان بھی داخل ہے، جبکہ اتقی کی عمومیت سے اور زیادہ تاکید ہوگئی۔

اور یہ جو کہا گیا کہ نعمت کا کچھ حصہ نہ ملے گا۔ اگر یہ آیت کفار کے حق میں لی جائے تو یہ سب وعیدیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں اور اگر فاجروں اور فاسقوں کے لئے بھی عام کہا جائے تو معنی یہ ہیں کہ کچھ دن تک وہ ان وعیدوں کے مستحق ہوں گے، اس میں نہ ہمیشہ کی کی بات ہے نہ یقینی طور پر واقع ہونے کی، کیونکہ اہل سنت کے نزدیک بغیر سزا کے معافی بھی صحیح ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور بے شک ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب میں تا کہ تم لوگ اس کو کتاب کا جزو سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کے پاس سے ہے، حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں، اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔

ربط: اوپر خیانت کی مذمت کا بیان تھا۔ اب ان کی خیانت کی ایک عادت کہ اللہ کی کتاب میں ایک خاص طریقہ سے تحریف کرتے ہیں: بیان فرماتے ہیں۔

اہل کتاب کی ایک عادت کہ ایک خاص طریقہ سے تحریف کرتے تھے:

اور بے شک ان میں سے بعض (لوگ) ایسے ہیں کہ کتاب (پڑھنے) میں اپنی زبان کج کرتے ہیں (یعنی اس میں کوئی غلط لفظ یا تفسیر ملا دیتے ہیں اور غلط پڑھنا کج زبانی کہلاتا ہے) تا کہ تم لوگ (جو اس کو سنو تو) اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا حصہ سمجھو۔ حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں۔ اور وہ (صرف دھوکہ دینے کے لئے اس عملی طریقہ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ یہ (لفظ یا مطلب) اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے۔ یعنی یہ الفاظ یا قواعد نازل ہوئے ہیں۔

ان سے ثابت ہے) حالانکہ وہ (کسی بھی طرح) اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں (اس سے ان کا جھوٹا ہونا لازم آ گیا۔ آگے تاکید کے لئے پھر اس کی مزید تصریح ہے) اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں (اور اپنے جھوٹ بولنے کے بارے میں وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں)

تحریف لفظی اور معنوی:

یہ بھی ممکن ہے کہ تحریف لفظی کرتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تفسیر غلط بیان کرتے ہوں۔ تحریف لفظی میں تو دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ہی اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، جبکہ غلط تفسیر میں یہ تو نہیں ہوتا، لیکن یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ تفسیر شریعت کے قواعد سے ثابت ہے اور شریعت کے قواعد کا اللہ کی جانب سے ہونا ظاہر ہے۔ ایک صورت میں صورت کے لحاظ سے جز ہونے کا دعویٰ ہوگا اور ایک صورت میں معنی کے لحاظ سے کتاب کا جز ہونے کا دعویٰ ہوگا، اس معنی کر کے کہ یہ جز شریعت سے ثابت ہے، اور ہر امر جو شریعت سے ثابت ہے وہ حقیقت میں کتاب سے ثابت ہے، کیونکہ دوسرے شرعی دلائل احکام کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں، نہ کہ احکام کو ثابت کرنے والے۔ اس لئے احقر نے ترجمہ میں دونوں احتمالوں کی رعایت

رکھی۔ ملحدوں نے اس امت میں بھی حدیث میں تحریف لفظی اور قرآن میں تحریف معنوی کی ہے، کیونکہ قرآنی الفاظ نصاً اللہ کی طرف سے محفوظ ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

ع ۸ / ۱۶

ترجمہ: کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرماویں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ، خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو۔ اور بوجہ اس کے کہ تم پڑھتے ہو، اور نہ یہ بات بتلاوے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو، کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلاوے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب کے افعال واقوال پر اعتراض تھا۔ ان آیات میں اہل کتاب کے ایک لغو اعتراض کو باطل کیا گیا ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر کیا تھا جیسا کہ لباب النقول میں ابن اسحاق اور بیہقی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں یہود اور نجران کے نصاریٰ جمع ہوئے اور آپ نے انہیں اسلام کی طرف بلایا تو ابو رافع قرظی یہودی نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں، جیسے نصاریٰ (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی عبادت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

انبیاء علیہم السلام اپنی معبودیت کی بات کبھی نہیں کہہ سکتے:

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرمائیں جن میں سے ہر ایک کا مقتضی کفر و شرک کی ممانعت ہے اور پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ (کی توحید کو چھوڑ کر) میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ (یعنی نبوت اور شرک کا حکم ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے) لیکن (وہ نبی یہ تو کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ کی عبادت کرو) اس وجہ سے کہ تم (اوروں کو بھی اللہ کی) کتاب سکھاتے ہو، اور اس وجہ سے کہ تم (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو (اور اس کتاب میں توحید کی تعلیم ہے) اور نہ (وہ بشر جس کو نبوت عطا کی گئی) یہ بات بتائے گا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے لو۔ کیا (بھلا) وہ تمہیں کفر کی بات بتائے گا۔ اس کے بعد کہ تم (اس عقیدۂ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعم خویش) مسلمان ہو؟

تفسیر: شاید اعتراض کرنے والے نے عناد کی وجہ سے اطاعت اور عبادت میں فرق نہ کیا ہو، اس لئے اعتراض کر دیا ہو۔ جواب میں تصریح فرمادی کہ نبی سے غیر اللہ کی عبادت کا حکم شرعی طور پر محال ہے اور عبادت واطاعت کا فرق ظاہر تھا۔

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ توحید کے عقیدہ کا پابند ہونے کی علت کتاب کی تعلیم اور اس کے درس کو قرار دیا۔ حالانکہ عوام میں یہ مفقود ہے جبکہ توحید کا حکم موجود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ علت محض تقاضہ کرنے والی ہے، شرط نہیں ہے۔ اس لئے عوام میں دوسرا مقتضی یعنی علم کا موجود ہونا کافی ہے، اور اس کی تخصیص اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اور موقع ومحل کے تقاضہ کی وجہ سے ہے، کیونکہ مخاطب صاحب علم تھا۔ تیسرے اس وجہ سے کہ عوام اکثر خواص کے مقلد ہوتے ہیں۔ اس طرح خواص کے ایمان کا تقاضہ عام طور پر عوام کے لئے بھی تقاضہ ہوجاتا ہے اور انبیا وملائکہ کے ذکر سے اس موقع کے مضمون کی تاکید ہوگئی کہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں، بلکہ علت کے عموم یعنی نبوت کے منافی ہونے اور شرک کے حکم کی وجہ سے یہ مضمون عام ہے۔ اس کے ذریعہ دوسرے مشرک فرقوں پر بھی اعتراض کا اشارہ ہوگیا کہ سب کا عقیدہ نبوت کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اور احقر نے ''خاص اس عقیدہ'' کی جو تخصیص کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جواب کے مخاطب یہود ہیں، نہ کہ مسلمان۔ اور اعتراض کے وقت وہ توحید کے مدعی تھے۔ اس خاص امر کو لغت کے اعتبار سے اسلام کہہ دیا۔ پھر وہ معترض خواہ واقعی طور پر توحید کا پیرو ہو یا محض زعم ہی زعم ہو۔ کیونکہ بعض یہود شرک کے عقیدے بھی رکھتے تھے۔ واللہ اعلم

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آوے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرف داری بھی کرنا۔ فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

ربط: اوپر ﴿ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ ﴾ سے اہل کتاب کی ان حرکتوں کا ذکر تھا جو ان سے اسلام کے خلاف اور اس کو ضرر ونقصان پہنچانے سے متعلق صادر ہوئی تھیں۔ اب اس سے بڑھ کر یہ بتاتے ہیں کہ انہیں مخالفت کرنے اور ضرر ونقصان پہنچانے کی تو کہاں اجازت ہوسکتی ہے ان پر تو خود اسلام کا قبول کرنا واجب تھا۔ کیونکہ اس مضمون کا عہد تمام انبیاء علیہم السلام تک سے لیا گیا ہے۔ پھر ان کی امتوں پر تو بدرجۂ اولیٰ واجب ہوگا اور اسی سلسلہ میں آیت ﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ ﴾ میں اسلام کو ترک کرنے پر زجر وتنبیہ اور ﴿ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ میں اسلام کی حقیقت کا خلاصہ اور آیت ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ ﴾ میں غیر اسلام کا مقبول نہ ہونا اور آیت ﴿ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ ﴾ سے ﴿ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ تک میں اسلام سے منہ

پھیرنے والوں کی سوائے توبہ کرنے والوں کے مذمت اور عقوبت کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام کی حقیقت ہر زمانہ میں احکام الٰہی کی اطاعت ہے۔ جیسا کہ پارہ الٓم کے آخر میں واقع آیت ﴿ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ ﴾ کی تفسیر میں اس معنی کے اعتبار سے تمام حضرات انبیاء علیہم السلام کا ملت اسلام پر ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اطاعت اب ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ کی اطاعت میں منحصر ہوگئی ہے کیونکہ آپ کا دوسری شریعتوں کو منسوخ کرنے والا نبی ہونا صحیح مستند اور ٹھوس دلائل سے ثابت ہے۔ اس لئے آپ کا انکار لازمی طور پر اطاعت الٰہی کے منافی ہے۔ اس لئے اب لفظ اسلام کا اطلاق صرف دین محمدی ﷺ پر ہی ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے تمام اشکالات وشبہات جو بظاہر اس مقام پر ہوسکتے تھے، دفع ہوگئے۔

انبیاء علیہم السلام سے دوسرے رسولوں کی تصدیق کا عہد لیا گیا ہے:

(اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) سے عہد لیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور (شریعت کا) علم دوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آئے جو اس (علامت) کا مصداق (اور مطابق) ہو جو تمہارے پاس (موجود کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی شریعت کے نزدیک معتبر دلائل سے اس کی رسالت ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رسالت) پر (دل سے) ایمان بھی لانا اور (ہاتھ پاؤں سے) اس کی طرف داری بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس (مضمون پر میرا عہد (اور حکم) قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد فرمایا تو (اپنے اس اقرار کے) گواہ (کے طور پر) رہنا (کہ اقرار کرنے والے کے برخلاف اللہ تعالیٰ گواہی سے پھرنے کو برا سمجھتا ہے کیونکہ کسی غرض کی وجہ سے اقرار والے کا پھر جانا کوئی زیادہ بعید نہیں ہوتا۔ اس طرح تم اس اقرار سے مت پھرنا) اور میں (بھی) اس (مضمون) پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں (یعنی واقعہ کی خبر اور علم رکھنے والا ہوں)

تفسیر: انبیاء علیہم السلام سے اس عہد کے لئے جانے کی تو قرآن مجید میں تصریح ہے۔ باقی ان کی امتوں سے یہ عہد یا تو اسی وقت لیا گیا ہوگا یا ممکن ہے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے لیا گیا ہو۔ اور چونکہ اس کا ایسا واجب ہونا جو انبیاء اور امتوں سب پر بالعموم واجب ہو، بہت ظاہر ہے۔ اس لئے اس کا ذکر نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اس عہد کا محل یا تو پہلی بار عالم ارواح ہو یا صرف دنیا میں وحی کے ذریعہ لیا گیا ہو۔

اس عہد کا حاصل ظاہر ہے کہ ہر رسول جس کی رسالت دلائل سے ثابت ہو، کی تصدیق اور نصرت فرض ہے۔ آخر میں اس کے مصداق جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کو یہ عہد اس لئے سنایا کہ جب حضور ﷺ کی رسالت دلائل سے ثابت ہے تو لامحالہ اس عہد کے مضمون میں داخل ہیں پھر تم پر یقیناً آپ کی تصدیق اور نصرت فرض ہے اور اسلام

کا یہی حاصل ہے۔

اور کتاب وحکمت جو دو چیزیں ارشاد فرمائیں تو اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بعض انبیا اصلاً صاحب کتاب نہیں ہوئے۔ البتہ صاحب علم سب تھے اور اگر ''اصلاً'' کی قید نہ لگائیں تو یہ مضمون بھی عام ہوگا۔ اور یہ وسوسہ کہ عالم ارواح کا عہد تو یاد نہیں، اس لئے دور ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی معتبر شخص عہد کرنے کو بیان کردے تو اپنی یاد کی طرح ہی اس کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور یہاں دلائل قطعیہ نے بیان کر دیا ہے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝

ترجمہ: سو جو شخص رُوگردانی کرے گا بعد اس کے تو ایسے ہی لوگ بے حکمی کرنے والے ہیں۔

ربط: اوپر عہد کا بیان تھا، اب عہد شکنی پر وعید ہے۔

عہد شکنی کی پر وعید:

تو (امتوں میں سے) جو شخص اس کے بعد (اس عہد سے) روگردانی کرے گا (جبکہ انبیاء تک سے عہد لیا گیا، تو امتیں تو کس گنتی میں ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں۔

فائدہ: چونکہ روگردانی کرنے والے امتوں کے لوگ تھے اور خطاب وغیرہ کا لفظ بھی نہیں ہے۔ اس لئے آیت کو عام معنی میں لینے کی ضرورت نہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝

ترجمہ: کیا پھر دینِ خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ کے سامنے سب سرافگندہ ہیں، جتنے آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، خوشی سے اور بے اختیاری سے اور سب خدا کی طرف لوٹائے جاویں گے۔

ربط: اوپر اسلام کے عہد کے پورا کرنے کے واجب ہونے اور اس کو توڑنے کی حرمت کا ذکر تھا۔ اب اس عہد شکنی پر زجر وتنبیہ ہے۔

اسلام کو نہ ماننے پر ڈانٹ:

کیا (دین اسلام سے جس کا عہد لیا گیا ہے، روگردانی کر کے) پھر (اس) دین خداوندی کے سوا کسی اور طریقہ کو چاہتے ہیں؟ حالانکہ حق تعالیٰ (کی یہ شان ہے کہ ان) کے (حکم کے) سامنے سب سرافگندہ (سر جھکائے ہوئے تابعدار)

ہیں، جتنے آسمانوں میں (ہیں) اور (جتنے) زمین میں ہیں (بعض راضی) خوشی (اور اختیار سے) اور بعض بے اختیاری سے (اول تو اس عظمت ہی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی ان کے عہد کی مخالفت نہ کرے، خاص طور سے جبکہ آئندہ سزا کا بھی ڈر ہو۔ چنانچہ) سب خدا ہی کی طرف (قیامت کے روز) لوٹائے (بھی) جائیں گے (اور اس وقت مخالفوں کو سزا ہوگی)

تفسیر: حق تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں: ایک تکوینی یعنی جن پر آثار کا مرتب ہونا بندہ کے اختیار میں نہیں۔ جیسے جلانا، مارنا، اور بیمار کرنا وغیرہ۔ دوسرے تشریعی یعنی جن کے آثار بندہ کے اختیار میں ہیں جیسے نماز پڑھنے کو فرمانا کہ اس کا اثر نماز پڑھنے کا عمل ہے اور وہ بندہ کے اختیار میں ہے۔ اس طرح اس مقام کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ کے تکوینی احکام کے تحت تو سب مسخر ہیں اور کرھاً سے یہی مراد ہے۔ اور بہت سے تشریعی احکام کے بھی فرماں بردار ہیں اور طوعاً کا یہی مطلب ہے۔ اس طرح حکم کی ایک قسم تو سبھی پر جاری ہے اور دوسری قسم کو بھی بہت سے لوگوں نے قبول کر رکھا ہے جس سے حاکم کی عظمت نمایاں ہے۔ اب بعض جو دوسری قسم کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو کیا کوئی اور اس عظمت کا مالک ہے، جس کی مطابقت کے لئے یہ مخالفت کرتے ہیں؟

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ واسماعیلؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں۔

ربط: اوپر اسلام کی حقیت کا بیان تھا۔ اب حضور ﷺ کو اس کی حقیقت کا حاصل ظاہر کر دینے کا ارشاد ہے۔

اسلام کی حقیقت کا حاصل:

(اے محمد! ﷺ) آپ (دین اسلام کے حاصل کے اظہار کے لئے) فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس (حکم) پر جو (حضرات) ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں، ان) کی طرف بھیجا گیا اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو (حضرات) موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (تو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (ایمان لانے میں دوسرے سے) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع (فرماں بردار) ہیں (انھوں نے یہ دین

ہمیں بتایا اور ہم نے اختیار کرلیا)

فائدہ: بالکل اسی مضمون کی آیت سورۂ بقرہ آیت ۱۳۶ گذر چکی ہے جو ملت ابراہیم کے خلاصہ کے عنوان سے شروع ہوئی ہے، اس کے ضروری متعلقات وہاں لکھ دیئے ہیں۔ ملاحظہ کرلئے جائیں۔ مقصود یہ ہے کہ اسلام کی اس حقیقت ہی سے اس کی خوبی ظاہر ہے، پھر اس کو ترک کرنا سخت بددینی اور ناانصافی ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جو اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

ربط: اب اللہ کے دین یعنی اسلام کے سوا کسی دوسرے طریقہ کا اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہونا بتاتے ہیں۔

اسلام کے سوا کسی دین کا مقبول نہ ہونا:

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (اللہ کے نزدیک) مقبول (ومنظور) نہ ہوگا۔ اور وہ (شخص) آخرت میں تباہ ہونے والوں میں ہوگا (یعنی نجات نہ پائے گا)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہوگئے بعد اپنے ایمان لانے کے اور بعد اپنے اس اقرار کے کہ رسول سچے ہیں اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل پہنچ چکے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور آدمیوں کی بھی سب کی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی میں رہیں گے ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پاوے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جاوے گی، ہاں مگر جو لوگ توبہ کرلیں اس کے بعد اور اپنے کو سنواریں سو بیشک خدا تعالیٰ بخش دینے والے، رحمت کرنے والے ہیں۔

ربط: اب اسلام سے منہ پھیرنے والوں میں سے ان لوگوں کا بیان ہے جو اسلام کو قبول کر کے پھر اس سے پھر گئے۔ پھر ان میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ بعض تو اس کفر پر قائم رہے اور بعض پھر توبہ کر کے اسلام لے آئے۔ اس آیت میں ان دونوں کا بیان ہے۔

مرتد لوگوں کا اور دوبارہ ایمان لانے والوں کا بیان:

(پہلے ان مرتد لوگوں کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہ کر اس کو ہدایت سمجھتے رہے۔ چونکہ ان کا عقیدہ یا دعوی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اب ہدایت عطا فرمائی ہے، لہٰذا ان کی مذمت میں اس کی نفی بھی فرماتے ہیں، کہ بھلا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت (عطا) کریں گے جو (دل سے) اپنے ایمان لانے کے بعد اور (زبان سے) اپنے اس اقرار کے بعد کافر ہو گئے کہ رسول (ﷺ) رسالت کے دعوی میں) سچے ہیں اور اس کے بعد کہ ان کو (اسلام کی حقانیت کے) واضح دلائل پہنچ چکے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت (عطا) نہیں کیا کرتے (یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو کبھی بھی اسلام کی توفیق نہیں دیتے، بلکہ مقصود ان کے اس مذکورہ بالا دعوی کی نفی کرنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ کر جو یہ طریقہ اختیار کیا ہے اس کی ہمیں اللہ نے ہدایت دی ہے۔ نفی کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا بے ڈھنگا راستہ اختیار کرے، وہ اللہ کی ہدایت پر نہیں۔ اس لئے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اللہ نے ہدایت دی ہے۔ کیونکہ کفر ہدایت کا راستہ نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگ یقیناً گمراہ ہیں۔ اور) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور (بہت سارے) انسانوں کی بھی (غرض) سب کی (اور پھر وہ لعنت بھی اس طرح رہے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس (لعنت) میں رہیں گے (اور چونکہ اس لعنت کا اثر جہنم ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور) ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا۔ اور نہ (داخل ہونے سے پہلے) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت ہی دی جائے گی (آگے ان کا بیان ہے جو پھر مسلمان ہو گئے، ان کو اس حکم سے مستثنیٰ فرماتے ہیں۔ یعنی) ہاں مگر جو لوگ اس (کفر) کے بعد توبہ کر لیں (یعنی مسلمان ہو جائیں) اور اپنے (دل) کو (بھی) سنواریں (یعنی منافقانہ طور پر صرف زبان سے توبہ کافی نہیں) تو بیشک (ایسے لوگوں کے لئے) اللہ تعالیٰ بخش دینے والے، رحمت کرنے والے ہیں۔

فائدہ: ایسی ہی آیت ۱۶۲ سورۂ بقرہ میں گذری ہے۔ اس کی ضروریات کی تفسیر وہاں دیکھ لی جائے۔ اور یھدی اور لا یھدی میں جو ان کے زعم کے مطابق ہدایت کی نفی فرمائی ہے۔ اس کی مثال ہمارے محاوروں میں ایسی ہے جیسے کسی بدمعاش کو کوئی حاکم اپنے ہاتھ سے سزا دے اور وہ کہے کہ مجھے حاکم نے اپنے ہاتھ سے خصوصیت عنایت فرمائی ہے اور اس کے جواب میں کہا جائے کہ ایسے بدمعاش کو ہم خصوصیت کیوں دینے لگے۔ یعنی یہ امر خصوصیت ہے ہی نہیں۔ اور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایسا شخص کسی طرح خصوصیت کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ وہ شائستہ بن جائے۔ اس طرح یہ اشکال جاتا رہا کہ بسا اوقات ارتداد کے بعد بھی ہدایت ہو جاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝

ترجمہ: بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد، پھر بڑھتے رہے کفر میں، ان کی توبہ ہرگز مقبول نہ

ہوگی اور ایسے لوگ پکے گمراہ ہیں۔

ربط: اوپر توبہ کرنے والوں کو سزا سے مستثنیٰ فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ اس خاص توبہ کی حقیقت اسلام قبول کرنا ہے۔ چونکہ اس بات کا احتمال تھا کہ لفظ توبہ کو سن کر اور اس کی حقیقت میں غور نہ کر کے کوئی مرتد کہنے لگے کہ میں بھی تو توبہ کیا کرتا ہوں یعنی ان امور سے جو اس کی کفر والی ملت میں قبیح ہیں تو میں بھی نجات کا مستحق ہوں گا۔ اس لئے اس آیت میں بغیر اسلام کے محض گناہوں سے توبہ کا قبول نہ ہونا بیان فرماتے ہیں۔

بغیر ایمان کے توبہ کا قبول نہ ہونا:

بے شک جو لوگ اپنے ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے رہے (یعنی کفر پر قائم رہے، یعنی ایمان نہیں لائے) ان کی توبہ (جو وہ دوسرے گناہوں سے کرتے ہوں) ہرگز مقبول نہیں ہوگی (کیونکہ گناہوں سے توبہ ایک فروعی طاعت ہے۔ اور فروعی طاعتوں کے مقبول ہونے کی شرط ایمان ہے) اور ایسے لوگ (اس توبہ کے بعد بھی بدستور) پکے گمراہ ہیں۔

فائدہ: جو کافر اصلی ہو، شریعت میں اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ع ۱۷

ترجمہ: بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ بھی مر گئے حالتِ کفر ہی میں سو ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی نہ لیا جاوے گا اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے۔ ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے کوئی حامی بھی نہ ہونگے۔

ربط: اوپر کی آیت میں کفر میں بڑھنا آیا ہے، جس کی تفسیر مرتے وقت تک کفر پر قائم رہنا یعنی کفر ہی پر موت کا آنا ہے۔ اس آیت میں اس تفسیر کی تصریح ہے اور اوپر کی آیت ظاہری طور پر مرتد کے بارے میں تھی۔ حالانکہ جس حکم کا ذکر کیا گیا وہ عام ہے۔ اس لئے اس آیت میں اس کی بھی نفی ہے۔ اس طرح اس آیت میں تین نئے امور سے متعلق فائدے بیان ہوئے ہیں۔

مرتے دم تک کافر رہنے والے سے فدیہ قبول نہ ہونا:

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ حالت کفر ہی میں مر بھی گئے تو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا اگرچہ وہ فدیہ میں اسے دینا بھی چاہے (اور بغیر دیئے تو پوچھتا ہی کون ہے) ان لوگوں کو دردناک سزا ہوگی اور ان لوگوں کا کوئی حامی (مددگار) بھی نہ ہوگا۔

فائدہ: لفظ "اگرچہ" مبالغہ کے لئے ہوتا ہے اور یہاں مبالغہ کی وجہ یہ ہے کہ خود دینے کی درخواست کرنے میں ایک طرح کی معذرت وندامت کے معنی بھی ہوتے ہیں جس میں عام طور سے قبولیت کے زیادہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس حالت کے برعکس کہ مجرم کی درخواست کے بغیر اس سے جرمانہ کے طور پر زبردستی لیا جائے۔ اس میں تو معذرت کی بھی کوئی دلیل نہیں اور اس میں نفع بھی دور کا اور بہت کم ہے۔ اس طرح حاصل یہ ہوا کہ جب اس کافر کی براءت کے لئے مال خرچ کرنے کا قریبی طریقہ بھی نفع بخش اور مقبول قرار نہیں پایا تو اس کا بہت کم اور دور کا نفع تو بدرجۂ اولیٰ غیر نفع بخش اور غیر مقبول ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

اور یہ جو فرمایا کہ زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض اس کے پاس ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ﴿ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِى الْاَرْضِ ﴾ الخ (اور اگر ظلم کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی ہی چیزیں اور بھی ہوں اور وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے فدیہ میں ان کو دینے لگیں (تو نہ لیا جائے گا) اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ سورۃ الزمر ۴۷) اور ایک آیت میں ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ الخ (یقیناً جو لوگ کافر ہیں، اگر ان کے پاس تمام دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی ہی چیزیں اور بھی ہوں تاکہ وہ ان کو دے کر قیامت کے دن عذاب سے چھوٹ جائیں، تب بھی وہ چیزیں ان سے ہرگز قبول نہ کی جائیں گی اور ان کو دردناک عذاب ہوگا۔ المائدۃ ۳۶) اور وہاں مال کا نہ ہونا تو معلوم ہی ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو بھی خوب جانتے ہیں۔

ربط: اوپر کفار کے لئے فدیہ کا فائدہ مند نہ ہونا بیان کیا گیا تھا۔ اب بتاتے ہیں کہ مؤمنوں کے لئے دنیا میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یقیناً آخرت میں نفع بخش ہو سکتا ہے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر کفار اپنے اموال سے آخرت میں فائدہ اٹھانا چاہیں تو مسلمان ہو کر یہاں دنیا میں فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کریں۔

خرچ کرنے کی ترغیب اور اس کے آداب:

(اے مسلمانو!) تم خیر کامل (مکمل نیکی یا بھلائی اور سب سے بڑے ثواب) کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے، جب تک اپنی (بہت) پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے۔ اور (یوں) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (چاہے غیر پیاری چیز ہی کیوں نہ ہو) اللہ تعالیٰ اس کو بھی خوب جانتے ہیں (مطلق ثواب اس پر بھی دیدیں گے۔ لیکن خیر کامل اور کامل ثواب حاصل

کرنے کا وہی طریقہ ہے)

فائدہ: آیت سے معلوم ہوا کہ ثواب تو ہر طرح کا خرچ کرنے سے ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، مگر زیادہ ثواب محبوب چیز کے خرچ کرنے سے ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝

ترجمہ: سب کھانے کی چیزیں نزولِ توراۃ کے قبل باستثناء اس کے جس کو یعقوب نے اپنے نفس پر حرام کرلیا تھا، بنی اسرائیل پر حلال تھیں۔ فرمادیجئے کہ پھر توراۃ لاؤ پھر اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ سو جو شخص اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے سو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب سے حجت دلائل اور بحث ومباحثہ کا سلسلہ چلا آرہا ہے، کہیں یہود سے کہیں نصاریٰ سے، کہیں دونوں سے۔ ایک معاملہ کا اب بیان ہوتا ہے۔ جس کا قصہ روح المعانی میں کلبی سے واحدی کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے مکمل طور پر شریعت کے اصول کے اعتبار سے اور اکثر فروع کے اعتبار سے اپنا ملت ابراہیمی پر ہونا بیان فرمایا تو یہود نے اعتراض کے طور پر کہا کہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کا دودھ پیتے ہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ دونوں چیزیں حرام تھیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں حضرت ابراہیم پر یہ حلال تھیں۔ یہود نے کہا کہ جتنی چیزیں ہم حرام سمجھتے ہیں یہ سب حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک ان کے حرام ہونے کا حکم پہنچا۔ اللہ نے یہود کی غلط بیانی ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر اونٹ کے گوشت کے حرام ہونے کے یہود کے دعوی کی تکذیب:

(کھانے کی جن چیزوں کے بارے میں گفتگو ہے، یہ) کھانے کی تمام چیزیں (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہرگز حرام نہیں چلی آرہی ہیں، بلکہ یہ چیزیں توریت کے نازل ہونے سے پہلے سوائے اس کے (یعنی اونٹ کے گوشت کے) جسے (حضرت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ایک خاص وجہ سے) اپنے نفس پر حرام کرلیا تھا (اور پھر وہ ان کی اولاد میں بھی حرام رہیں، باقی سب چیزیں خود) بنی اسرائیل (تک) پر (بھی) حلال تھیں (تو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ان کے حرام ہونے کا دعوی کب صحیح ہوسکتا ہے اور توریت کے نازل ہونے سے پہلے اس لئے فرمایا کہ توریت کے نازل ہونے کے بعد ان مذکورہ حلال چیزوں میں سے بھی بہت سی چیزیں حرام ہوگئی تھیں۔ جس کی کچھ تفصیل سورۂ

انعام کی اس آیت میں ہے: ﴿ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ﴾ الخ (اور ہم نے یہود پر تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ہم نے ان پر حرام کر دی تھیں۔ سوائے اس کے جو ان کی پشت پر یا ان کی آنتوں پر لگی ہوئی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو۔ ہم نے ان کو یہ سزا ان کی شرارت کے سبب دی تھی۔ اور ہم یقیناً سچے ہیں۔ انعام آیت ۱۴۶) اور اگر اب بھی یہود کو حرام ہونے کے حکم کے قدیم ہونے کا دعویٰ ہے تو اے محمد ﷺ آپ ان سے) فرما دیجئے کہ (اچھا تو) پھر توریت لے آؤ اور اس کو (لا کر) پڑھو۔ اگر تم (اپنے اس دعویٰ میں) سچے ہو (تو اس میں کوئی آیت وغیرہ اس مضمون کی نکال کر دکھادو، کیونکہ نقل ہونے والے امور میں نص کی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری نصوص میں یقیناً اس کی نفی ہے۔ اب صرف توریت باقی ہے تو اسی میں دکھادو۔ چنانچہ اس میں نہ دکھا سکے تو اس دعویٰ میں ان کا جھوٹ ثابت ہو گیا۔ آگے اسی کی بنیاد پر فرماتے ہیں) تو جو شخص اس (دلیل کے جھوٹا ہونے کے ظاہر ہونے) کے بعد (بھی) اللہ تعالیٰ پر جھوٹی بات کی تہمت لگائے (جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اونٹ کے گوشت وغیرہ کو حرام فرمایا ہے) تو ایسے لوگ بڑی ناانصافی کرنے والے ہیں۔

فائدہ: وہ خاص وجہ یہ ہوئی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء[1] کا مرض ہو گیا تھا، تب آپ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس سے شفا دیدیں تو مجھے جو کھانا سب سے زیادہ محبوب ہو، اس کو چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ انہیں شفا ہو گئی اور آپ کو اونٹ کا گوشت سب سے زیادہ محبوب تھا، اس لئے آپ نے اس کو ترک فرما دیا (حاکم وغیرہ نے سند صحیح سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ روح المعانی میں ہے اور ترمذی سورۂ رعد میں مرفوعاً مروی ہے) پھر یہی تحریم جو نذر کی وجہ سے ہوئی تھی بنی اسرائیل میں بھی وحی سے باقی رہی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی شریعت میں نذر سے تحریم بھی ہو جاتی ہوگی جس طرح ہماری شریعت میں مباح چیز نذر کی وجہ سے واجب ہو جاتی ہے۔ مگر کسی چیز کو حرام کرنے کی نذر جو حقیقت میں یمین ہے ہماری شریعت میں جائز نہیں، بلکہ اس قسم کو توڑنا اور پھر قسم توڑنے کا کفارہ واجب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ﴾ (اے نبی! آپ ایسی چیز کو حرام کیوں کرتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے؟ سورۃ التحریم آیت ۱) تفسیر کبیر میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا سو تم ملت ابراہیم کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں۔ اور وہ مشرک نہ تھے۔

ربط: اوپر یہود کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو گیا اور قرآن اس کے مناقض (خلاف) ہے تو اس کی سچائی عقل کے طور پر ثابت

(۱) عرق النسا: چڈوں سے ٹخنوں تک پہنچنے والا درد ۱۲

ہوگئی۔اس آیت میں اسی سچائی کی صراحت ہے اور اس پر ایک فرع بیان کی گئی ہے۔

قرآن کی سچائی کے ظاہر ہونے پر اسلام کی دعوت:

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا تو (اب) تم (کو چاہئے کہ قرآن کی حقیت کے ثابت ہونے کے بعد) ملت ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع (اختیار) کرو۔جس میں ذرا بھی کجی (ٹیڑھا پن) نہیں، اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرک نہیں تھے۔

حوالہ: سورۂ بقرہ (آخر پارہ الٓمّٓ) میں ایسی آیت آچکی ہے۔اس کی تفسیر وہاں لکھ دی ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٩٧﴾

ترجمہ: یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا، وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔اس میں کھلی نشانیاں ہیں منجملہ ان کے ایک مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو جاوے وہ امن والا ہو جاتا ہے، اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی۔اور جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہیں۔

ربط: اوپر سے حجتوں کا سلسلہ چلا آرہا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ تھی کہ یہود نے بیت المقدس کو خانہ کعبہ سے افضل بتایا تھا۔مسلمان خانہ کعبہ کو افضل کہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے بحث میں مسلمانوں کا حق پر ہونا بیان فرمایا۔روح المعانی میں ابن المنذر وغیرہ کی روایت میں ابن جریج سے ان کی بلاغات میں اور کبیر میں یہود کے اس دعویٰ کی غرض یہ لکھی ہے کہ تحویل قبلہ پر اعتراض کرنا مقصود تھا کہ افضل قبلہ کو چھوڑ کر غیر افضل کو اختیار کیا۔

دوسری عبادت گاہوں پر بیت اللہ کی افضلیت:

یقیناً جو مکان (عبادت گاہوں میں) سب سے پہلے لوگوں (کی عبادت گاہ بننے کے واسطے (اللہ کی جانب سے) مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ (شہر) مکہ میں ہے (یعنی خانہ کعبہ) جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے (یعنی اس میں دینی نفع یعنی ثواب ہے) اور (عبادت خاص یعنی نماز کا رخ بتانے میں) دنیا بھر کے لوگوں کا رہنما ہے (مطلب یہ کہ وہاں حج ہوتا ہے اور مثلاً حدیث کی تصریح کی رو سے وہاں نماز کا ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے۔دینی برکت تو یہ ہوئی اور جو وہاں نہیں ہیں انہیں اس مکان کے ذریعہ نماز کا رخ معلوم ہوتا ہے، یہ رہنمائی ہوئی۔غرض) اس میں (کچھ تشریعی اور کچھ

تکوینی) کھلی نشانیاں (اس کی افضلیت کی موجود) ہیں۔(چنانچہ تشریعی نشانیوں میں اس کے مبارک اور مذکورہ تفسیر کے مطابق ہدایت ہونے کا تو بیان ہو چکا۔اور کچھ کا بیان مقامِ ابراہیم کے بعد ہے۔یعنی اس میں داخل ہونے والے کا امن کا مستحق ہو جانا۔اور اپنی شرائط کے ساتھ اس کے حج کا فرض ہونا، جو کہ پہلے بیان کی گئی حج کی مطلق مشروعیت پر زیادہ ہے۔ ان چار تشریعی نشانیوں کا ذکر تو اس جگہ ہے۔اب درمیان میں تکوینی نشانیوں کا ذکر فرماتے ہیں کہ) ان (نشانیوں) میں سے ایک مقام ابراہیم (نشانی) ہے اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) جو شخص اس (کے متعلقہ حدود) میں داخل ہو جائے وہ (شرعی طور پر) امن والا ہو جاتا ہے اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے (مگر سب کے ذمہ نہیں، بلکہ خاص خاص کے) یعنی اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک (پہنچنے) کی سبیل (راہ) کی طاقت واستطاعت رکھے اور جو شخص احکامِ خداوندی کا منکر ہو تو (اللہ تعالیٰ کا اس سے کیا نقصان ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ساری دنیا والوں سے بے نیاز ہیں (کسی کے ماننے پر ان کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے، بلکہ خود اس انکار کرنے والوں کا ہی نقصان ہے)

تفسیر: اس کے تمام عبادت گاہوں سے پہلے مقرر ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیت المقدس سے بھی پہلے بنا ہے۔چنانچہ صحیحین کی حدیث میں اس کی تصریح بھی ہے۔اور لِلنَّاسِ اور لِّلْعٰلَمِیْنَ کا عموم اس طرح ہے کہ سابقہ شریعتوں میں بھی یہ بابرکت اور زیارت کے لئے مقصود رہا ہے۔اور مقام ابراہیم ایک پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی اور اس پتھر میں آپ کے قدموں کے نشان بن گئے ہیں (روح المعانی میں سعید بن جبیر کی روایت) اس طرح اس کا عجیب نشان ہونا تو ظاہر ہے، لیکن اس نشان کا کعبہ کی طرف منسوب ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس میں یہ بات کعبہ کی تعمیر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔اور اب وہ پتھر خانہ کعبہ سے ذرا فاصلہ پر ایک محفوظ جگہ میں رکھا ہے۔اور ان مذکورہ آیتوں میں اس مقام ابراہیم کا نشان ہونا تو معلوم وظاہر ہے۔باقی احکام تشریعی کا نشانِ فضیلت ہونا ان کے غیر محسوس ہونے کے باوجود اس لئے ہے کہ وہ احکام صحیح دلیلوں سے ثابت ہیں۔

اس طرح استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ دیکھو یہ شرعی احکام خانہ کعبہ سے متعلق ہیں، جن کا متعلّق ہونا دلائل سے ثابت ہے اور ایسے احکام بیت المقدس سے متعلق شریعت میں بیان نہیں کئے گئے۔اس طرح اس کی افضلیت ثابت ہو گئی۔

اور امن سے متعلق تفسیر سورۂ بقرہ کی آیت کے تحت گذر چکی ہے۔اور سبیل کی تفسیر حدیث میں زاد وراحلہ یعنی سامان سفر اور سواری سے فرمائی ہے جسے حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور بدن کی صحت اور نظر کی سلامتی اور عقل واسلام وآزادی یعنی غلام نہ ہونا وغیرہ دوسرے دلائل سے ثابت ہیں۔

اور جاننا چاہئے کہ باوجودیکہ مقام ابراہیم کے سوا یہاں باقی آیات ونشانیاں تشریعی ہیں، لیکن ان کا دلوں پر اثر تکوینی طور پر بھی ایسا تھا کہ جاہلیت کے زمانہ میں بھی ان کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔مثلاً دور دراز سے حج کو آنا۔طواف کرنا،

حد حرم میں امن قائم رکھنا، جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے اور بعض امور کا قرآن میں بھی بعض مقامات میں مذکور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ ﴾ (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر اس (دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے جائیں، القصص ۵۷) اور ﴿ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴾ (پوری سورت) اور ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً ﴾ (اور اللہ تعالیٰ ایک بستی (مکہ) کی عجیب حالت بیان فرماتے ہیں کہ اس کے باشندے بڑے امن واطمینان کے ساتھ رہتے تھے، النحل ۱۱۲)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب! تم کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں۔ آپ فرمادیجئے اے اہل کتاب! کیوں ہٹاتے ہو اللہ تعالیٰ کی راہ سے ایسے شخص کو جو ایمان لاچکا اس طور پر کہ کجی ڈھونڈتے ہو اس راہ کے لئے حالانکہ تم خود بھی اطلاع رکھتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

ربط: اوپر سے اہل کتاب کے اقوال اور خیالات ونظریات کا رد ہوتا چلا آرہا ہے، اب ان کے ایک فعل پر رد وملامت ہے جس کا قصہ مختصر طور پر یہ ہوا تھا کہ ایک یہودی شماس بن قیس مسلمانوں سے بہت زیادہ کینہ اور بغض رکھتا تھا۔ اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں یعنی اوس اور خزرج کو ایک جگہ جمع اور آپس میں متحد دیکھا تو اس کو حسد کے سبب سخت ناگوار ہوا، چنانچہ ان کے درمیان تفریق ڈالنے کی فکر میں لگ گیا، آخر یہ تجویز کیا کہ ایک شخص کو وہاں بھیج دیا کہ ان دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک طویل مدت سے لڑائی چلی آرہی تھی، اس سے متعلق دونوں فریق کے جو فخریہ اشعار تھے وہ ان کی مجلس میں جاکر پڑھ دے۔ چنانچہ اشعار کا پڑھنا تھا کہ فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں گرما گرمی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ لڑائی کا موقع اور وقت مقرر ہو گیا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ کیا اندھیر گردی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے، پھر مسلمان ہونے کے باوجود اور آپس میں ایک دوسرے سے متفق ہونے اور الفت ومحبت رکھنے کے بعد یہ واہیات حرکت ہے، کیا کفر کی سابقہ حالت کی طرف لوٹنا چاہتے ہو؟ آپ کے سمجھانے سے سب متنبہ ہوئے اور سمجھا کہ یہ شیطانی حرکت تھی، تب ایک دوسرے سے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی۔ اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح المعانی بروایت ابن اسحاق اور ایک جماعت نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے) یہ مضمون

کئی آیتوں تک چلا گیا ہے، جس میں پہلے ملامت ہے ان اہل کتاب پر جنھوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت کے ساتھ کی گئی کہ اس فعل پر ملامت سے پہلے ان کو کفر پر بھی ملامت کی۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ لوگ خود بھی مسلمان ہو جاتے، اس کے برعکس دوسروں کو گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہیں۔ پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے۔

کفر اور گمراہ کرنے پر اہل کتاب کو ملامت:

(اے محمد! ﷺ) آپ (ان اہل کتاب سے) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم (اسلام کی حقانیت کی حجت ظاہر ہو جانے کے بعد) اللہ کے احکام کا کیوں انکار کرتے ہو؟ (اس میں اصول وفروع سب آ گئے) حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سارے کاموں کی خبر رکھتے ہیں (تمہیں اس سے بھی ڈر نہیں لگتا اور اے محمد! ﷺ ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسے شخص کو جو (اس دین کے حق ہونے پر) ایمان لا چکا، اللہ کی راہ (یعنی اس کے دین حق) سے کیوں ہٹانے کی کوشش کرتے ہو؟ اس طرح کہ اس راہ کے (اندر پیدا کرنے کے) لئے کجی (کی باتیں) ڈھونڈتے ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا قصہ میں کوشش کی تھی کہ اس کارروائی سے ان کے دین میں نااتفاقی پیدا کرنے کی کوشش کی وجہ سے گناہ بھی ہے اور قوت وترقی کو زائل کرنا بھی ہے، کہ اس سے ان معاملات میں خلل پڑ جائے گا اور ان بکھیڑوں میں پڑ کر ان کو دین حق سے دوری ہو جائے گی) حالانکہ تم خود بھی اس حرکت کے قبیح ہونے کا علم رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہیں (مقررہ وقت پر اس کی سزا دیں گے)

فائدہ: یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب خاص یہود سے متعلق ہے، لیکن الفاظ کے عام ہونے کی وجہ سے اہل کتاب میں نصاریٰ بھی آ گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے باز رکھنے کے مضمون میں ان لوگوں کا رسول اکرم ﷺ سے متعلق بشارتوں کو چھپانا یا بدلنا بھی داخل ہو گیا۔ چنانچہ حسن اور قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے یہی تفسیر اختیار کی ہے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ھُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ع ۱۰

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ لوگ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے کافر بنا دیں گے۔ اور تم کفر کیسے کر سکتے ہو، حالانکہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہِ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے۔

ربط: اب مذکورہ واقعہ سے متعلق مسلمانوں کو فہمائش ہے۔

مسلمانوں کو سمجھانا:

اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں میں سے کسی فرقہ کا کہنا مانو گے جن کو کتاب دی گئی ہے (یعنی اہل کتاب میں سے) تو وہ لوگ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں (عقیدہ کے لحاظ سے یا کم از کم عمل کے لحاظ سے) کافر بنادیں گے، اور (بھلا) تم کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو؟ یعنی تمہارے لئے کب روا ہو سکتا ہے) حالانکہ (کفر کی ممانعت کرنے والے تمام اسباب جمع ہیں، کیونکہ) تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام (قرآن میں) پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) تم میں اللہ کے رسول (ﷺ) موجود ہیں (اور دونوں ایمان پر قائم رہنے کے قوی ذریعے ہیں، اس لئے تمہیں چاہئے کہ ان دونوں ذریعوں کی تعلیم وتلقین کے مطابق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے (یعنی ایمان پر پوری طرح قائم رہتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑنا یہی ہے کہ اس کی ذات وصفات کی تصدیق کرے، اس کے احکام مانے، کسی دوسرے مخالف کی موافقت نہ کرے) تو (ایسے شخص کو) ضرور راہِ راست کی ہدایت کی جاتی ہے (یعنی وہ راہِ راست پر ہوتا ہے اور راہِ راست پر ہونا ہر صلاح وفلاح کی اصل ہے۔ چنانچہ اس میں ایسے شخص کے لئے صلاح وفلاح کی بشارت اور وعدہ ہے)

تفسیر: ترجمہ کے دوران کفر کے عموم کے لئے جو "عقیدہ یا عمل کے لحاظ سے" کہا گیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفر کے ایک معنی تو معروف ومشہور ہیں اور وہ کفر اعتقادی ہے اور ایک معنی یہ ہیں کہ عقیدہ کے لحاظ سے تو مؤمن ہو مگر کام کافروں جیسے کرے، اس کو بھی مجازاً کفر کہہ دیتے ہیں، کفر عملی سے یہی مراد ہے، قرآن وحدیث میں اس کا بھی استعمال بہت آیا ہے۔

چنانچہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کی اطاعت سے کفر کا ڈر ہے کہ اگر اطاعت عقائد میں کی جائے تو کفر اعتقادی ہوگا اور اگر اطاعت اعمال ومعاصی میں کی جائے جیسے ان کی اشتعال انگیزی کی وجہ سے آپس میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے تو یہ عمل کافروں جیسا ہوگا۔

اور اگر یہ آیت خاص صحابہ سے خطاب ہو، جیسا کہ قصہ سے معلوم ہوتا ہے تب تو ﴿ فِيكُمْ رَسُولُهُ ﴾ میں کوئی تکلف نہیں، اور اگر عام ہو جیسا کہ مضمون کا عموم تقاضہ کر رہا ہے تو آپ کی نبوت کے آثار وشواہد کا قیامت تک موجود رہنا خود آپ ہی کے تشریف فرما ہونے کے درجہ میں ہے، کیونکہ آپ کے ظاہری طور پر رونق افروز ہونے کے زمانہ میں بھی آپ کا ہادی ہونا اسی وصف کے اعتبار سے تھا، پس اصل مؤثر یہ وصف ہی قرار پایا۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ

فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جو ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔ اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو۔

ربط: اوپر مسلمانوں کو فہمائش تھی، اب اس کا تتمہ بیان کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تفہیم کا تتمہ:

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے (ایسے) ڈرا کرو (جیسے) اس سے ڈرنے کا حق ہے (کامل ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کفر اور شرک سے بچے ہو اسی طرح تمام معاصی سے بھی بچا کرو، اور بغیر شرعی وجہ کے لڑنا معصیت ہے تو اس سے بھی بچنا فرض ہے) اور سوائے اسلام (کامل) کے (جس کا حاصل وہی ہے جو کامل طور پر ڈرنے کا حاصل تھا) اور کسی حالت پر جان مت دینا (یعنی مرتے دم تک اسی کامل تقوی اور کامل اسلام پر قائم رہنا) اور اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو (یعنی اللہ کے دین کو جس میں اصول اور فروع سب آ گئے) اس طرح کہ سب آپس میں متحد بھی رہو اور آپس میں نا اتفاقی مت کرو (جس کی اس دین میں ممانعت بھی ہے) اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام (ہوا) ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم (آپس میں) دشمن تھے (یعنی اسلام سے پہلے، چنانچہ اوس وخزرج میں ایک طویل مدت سے جنگ چلی آتی تھی اور عام طور پر اکثر اہل عرب کی یہی حالت تھی) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اب) تمہارے دلوں میں (ایک دوسرے کی) الفت (محبت) ڈال دی تو تم اللہ تعالیٰ کے (اس) انعام (دلوں میں الفت پیدا کرنے) سے (اب) آپس میں بھائی بھائی (کی طرح) بن گئے اور (ایک انعام جو کہ مذکورہ بالا انعام کی بھی اصل ہے، فرمایا کہ) تم لوگ (بالکل) جہنم کے گڈھے کے کنارہ (ہی) پر (کھڑے) تھے (یعنی کافر ہونے کی وجہ سے دوزخ سے اتنے قریب تھے کہ دوزخ میں جانے کے لئے بس دم نکلنے کی دیر تھی) تو اس (گڈھے) سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی (یعنی اسلام نصیب کیا جس سے جہنم میں داخلہ کی علت زائل ہو گئی، تو تم ان (انعاموں کی قدر کرو، اور آپس کے جدال وقتال سے جو کہ معصیت ہے، ان انعامات کو ضائع مت کرو، کیونکہ اس جدال وقتال سے الفت ومحبت کا انعام تو بالکل ہی زائل ہو جائے گا، اور اسلام کے انعام میں خلل پیدا ہو جائے گا اور اس میں نقص آ جائے گا، یہ بھی ایک طرح سے ضائع ہونا ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ حکم واضح طور

پر بیان فرمایا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے دوسرے احکام (بھی) بیان کر کے بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم لوگ سیدھے راستہ پر (قائم) رہو۔

تفسیر: ڈرنے کے حق کا یہ مطلب نہیں کہ جیسی حق تعالیٰ کی عظمت کا حق ہے، کیونکہ یہ تو کسی سے نہیں ہوسکتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تمہارے ذمہ حق مقرر اور واجب ہے جس کی تفسیر ترجمہ کے دوران لکھ دی گئی ہے، اس کے مقابلہ میں ایک تقویٰ ادنیٰ درجہ کا ہے یعنی کفر و شرک سے بچ جانا۔ اگرچہ معصیت میں مبتلا رہے۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ درجہ کے تقویٰ پر اکتفا مت کرو، بلکہ اعلیٰ اور کامل درجہ کا تقویٰ اختیار کرو، جس میں معاصی سے بھی بچنا آ گیا۔

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں۔ اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں مسلمانوں کو ہدایت پر قائم رہنے کا حکم تھا، اب حکم ہے کہ دوسروں کو بھی ہدایت کے لئے کوشش کرو جیسا کہ اس سے کفار کو اول خود گمراہ ہونے پر ملامت تھی پھر دوسروں کو گمراہ کرنے کی برائی تھی۔

لوگوں کی ہدایت کا حکم:

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی ضروری ہے کہ جو (دوسرے لوگوں کو بھی) بھلائی کی طرف بلایا کرے اور نیک کام کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسائل کی تفصیل:

اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ:

او۲- جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے پر قادر ہو یعنی قرائن سے غالب گمان رکھتا ہے کہ اگر میں امر و نہی یعنی حکم دینے اور روکنے کا کام کروں گا تو مجھے کوئی بڑا نقصان نہیں پہونچے گا، اس کے لئے واجب امور میں امر و نہی کرنا واجب ہے اور مستحب امور میں مستحب۔ مثلاً نماز پنج گانہ فرض ہے تو ایسے شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے اور نوافل مستحب ہیں ان کے لئے نصیحت کرنا مستحب ہے۔

اور جو شخص مذکورہ حالت میں قادر نہ ہو اس پر واجب امور میں بھی امر و نہی واجب نہیں، البتہ اگر ہمت کرے تو ثواب ملے گا۔

۳- پھر اس امر و نہی میں قدرت رکھنے والے کے لئے واجب امور میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قدرت ہاتھ سے کام لینے کی ہو تو ہاتھ سے اس کا انتظام واجب ہے، جیسے محکوموں کے اعتبار سے حاکم یا خاص طور پر اپنے اہل وعیال کے اعتبار سے ہر شخص کو اور اگر صرف زبان سے قدرت ہو تو زبان سے کہنا واجب ہے اور غیر قادر کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ واجبات ترک کرنے والے اور محرمات کا ارتکاب کرنے والے سے دل سے نفرت رکھے۔

۴- پھر قدرت رکھنے والے کے لئے دوسری شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کو اس امر سے متعلق پورا حکم معلوم ہو اور آداب میں سے ایک ضروری ادب یہ ہے کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی کرے اور واجبات میں اولاً نرمی اور نہ ماننے پر سختی کرے۔

۵- اور صاحبِ قدرت کے سلسلہ میں ایک تفصیل یہ ہے کہ جہاں ہاتھ سے یہ کام لینے کی قدرت ہو وہاں تو امر و نہی میں اس کا ترک کرنا کبھی بھی جائز نہیں اور جہاں زبان سے کام لینے کی قدرت کا معاملہ ہو اگر اس میں فائدہ ہونے سے مایوسی ہو تو اس کا ترک کرنا جائز ہے، لیکن ایسی حالت میں محبت اور ربط و تعلق کا ترک کرنا بھی واجب ہے، مگر شدید ضرورت کی صورت میں ہے۔

۶- پھر قدرت رکھنے والے کے ذمہ اس کا وجوب واجب کفایہ ہے یعنی اگر اتنے لوگ اس کام کو کر رہے ہوں کہ ضرورت کے مطابق کام چل رہا ہو تو دوسرے اصحابِ قدرت کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔

یہ کل چھ مسئلے اس مقام پر بیان کئے گئے اور علم کی شرط لگانے سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اکثر جاہل یا جاہلوں جیسے لوگ وعظ کہتے پھرتے ہیں اور بے دھڑک بغیر تحقیق کے روایات اور احکام بیان کر دیتے ہیں وہ سخت گنہ گار ہوتے ہیں، سننے والوں کو بھی ایسے لوگوں کا وعظ سننا جائز نہیں۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾﴾

ترجمہ: اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا ان کے پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد۔ اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی۔ اس روز کہ بعضے چہرے سفید ہو جاویں گے اور بعضے چہرے سیاہ ہونگے ان سے کہا جاوے گا کیا تم لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد تو سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے۔ اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہونگے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ربط: اوپر تقوی کے حکم کے بعد دین کے معاملہ میں اتفاق واتحاد کا حکم تھا اور اختلاف وانتشار سے منع کیا گیا تھا، اب اس مضمون کی تفصیل ہے۔

اختلافات پھیلانے کی ممانعت اور اس پر وعید:

اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے (دین کے معاملہ میں) ان کے پاس (واضح احکام پہونچنے کے بعد آپس میں تفریق کرلی اور (نفسانیت سے) آپس میں اختلاف کرلیا، اور ان لوگوں کے لئے بہت بڑی سزا ہوگی اس روز (یعنی قیامت کے دن جس میں) بعض چہرے سفید (وروشن) ہو جائیں گے اور بعض چہرے سیاہ (اور تاریک) ہوں گے، تو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے، ان سے کہا جائے گا: کیا تم (ہی) لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے تھے؟ تو (اب) اپنے کفر کے سبب سزا چکھو، اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (یعنی جنت) میں (داخل) ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اختلافِ مذموم اور جائز:

آیت میں تفریق واختلاف کی جو مذمت ہے اس سے وہ تفریق مراد ہے جو اصولِ دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کی وجہ سے ہو، جیسا کہ ہوس پرستوں نے اہل سنت کے ساتھ اختلاف کیا، چنانچہ آیت میں جو یہ قید ہے کہ "واضح احکام آنے کے بعد" یہ قید خود اس کا قرینہ ہے، کیونکہ اصول سب واضح ہوتے ہیں اور فروع بھی بعض تو ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ جو فروع غیر واضح ہیں خواہ نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے یا نصوص میں ظاہری تعارض (ٹکراؤ) کی وجہ سے جن میں تطبیق کی واضح وجہ موجود نہ ہو، ایسے فروع میں اختلاف ہو جانا اس آیت کی وعید کے تحت نہیں آتا، چنانچہ وہ مذموم نہیں ہے اور یہ امت مرحومہ کے درمیان ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور اس کی اجازت کے لئے یہ حدیث کافی ہے جسے شیخین نے عمرو بن عاص سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب کوئی حاکم اپنے اجتہاد سے شرعی حکم کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور جب کوئی حکم اجتہاد سے کرے اور وہ غلط ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے اور اس اختلاف کی مشروعیت پر امت کا اجماع ہی کافی ہے۔ اور روح المعانی میں بیہقی سے قاسم بن محمد کا قول اور مدخل سے عمر بن عبد العزیز کا قول اس مضمون کا نقل کیا ہے کہ صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے رحمت اور رخصت کا موجب ہو گیا۔

اور الذین تفرقوا واختلفوا کے مصداق میں کفر تم کی وجہ سے مفسرین کے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سب سے جامع قول یہ ہے کہ کفر سے مراد عام ہے چاہے توحید کا انکار ہو یا رسالت کا انکار یا بدعت کا عقیدہ۔ یہ سب دلائل کے واضح ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ اے صحابہ! یا اے سب مسلمانو! تم ان اہل تفریق اور اہل کفر اور اہل عذاب کی طرح مت ہونا، اگرچہ جس کو تشبیہ دی گئی اس میں معصیت عملی تھی اور جس سے تشبیہ دی گئی اس میں معصیت

اعتقادی، مگر تشبیہ کے لئے یہ فرق نقصان دہ نہیں اور جتنا فرق تشبیہ کی وجہ سے ہے، اتنا ہی فرق وعید میں بھی ضروری ہے، اس لئے دونوں طرف میں مماثلت پوری طرح لازم نہیں آئی۔

﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے۔ اور اللہ کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جاویں گے۔

ربط: اوپر مرحوم یعنی رحم کے مستحق اور مغضوب یعنی غضب کے مستحق دونوں کی جزاوسزا کا بیان تھا۔ اب اس جزاوسزا کی خبر کا صحیح ہونا جملہ ﴿ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ﴾ میں اور اس جزاوسزا کا مناسب ہونا جملہ ﴿ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا ﴾ میں اور ان لوگوں کا اللہ کی ملکیت و مملوک ہونا، جس کا تقاضہ اطاعت کا واجب ہونا ہے جملہ ﴿ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ الخ میں اور کسی غیر کا بالکل اختیار نہ ہونا جملہ ﴿ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ میں بیان فرماتے ہیں، اور وعدہ اور وعید کا باوقعت ہونا انہی امور کے ثابت ہونے پر موقوف ہوتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا حکم میں اللہ تعالیٰ کا سچا، حکمت والا اور منفرد ہونا:

(جو آیتیں اوپر بیان کی گئیں) یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو تم کو صحیح طور پر پڑھ کر سناتے ہیں (اس سے تو مذکورہ بالا مضمون کا صحیح ہونا معلوم ہوا) اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے (اس لئے جو کچھ کسی کے لئے جزاوسزا تجویز کی ہے وہ بالکل مناسب ہے، اس سے مذکورہ تجویز کا مناسب ہونا معلوم ہوا) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (تو جب سب ان کی ملک ہیں تو ان سب کے ذمہ اطاعت واجب تھی۔ اس سے ان کا ملکیت اور مملوک ہونا اور اطاعت کا واجب ہونا ثابت ہوا) اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جائیں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا)

فائدہ: جاننا چاہئے کہ یہاں ظلم کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو جو کچھ بھی کریں وہ ظلم نہیں ہوسکتا، تو اس کی نفی سے جو اس مقام پر مقصود ہے یعنی اعمال پر مذکورہ اجر کا مرتب ہونا: وہ حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ مرتب نہ ہونے کی بنیاد پر بھی مذکورہ معنی میں ظلم نہ ہونا صادق آتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ عقلاً اور شرعاً بندوں کے افعال میں جو ظلم کہلاتا ہے، وہ بھی وہاں نہ ہوگا۔ اس سے اس مقام کا مقصود بخوبی حاصل ہوگیا۔

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا۔ ان میں سے بعضے تو مسلمان ہیں اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں مسلمانوں کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا حکم فرمایا تھا۔ اب اسی کی تاکید کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ تم لوگوں کے اچھی جماعت ہونے کی وجہ مذکورہ بالا امور بھی ہیں، اس لئے ان میں کمی نہ آنے پائے۔

امت محمدیہ کے بہترین ہونے کا بیان:

(اے امت محمد! علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) تم لوگ (تمام مذہبوں والوں سے) بہتر، اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں (کو ہدایت کا نفع پہونچانے) کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔ اور نفع پہونچانا ہی سب سے اچھی جماعت ہونے کی وجہ بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ) تم لوگ (شریعت کے تقاضوں کے مطابق زیادہ اہتمام کے ساتھ) نیک کاموں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو (اور اس پر قائم رہتے ہو) اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ساری دین کی باتوں پر ایمان لانا آ گیا، کیونکہ وہ سب باتیں اللہ کی بتائی ہوئی ہیں، جس نے ان کا انکار کیا، اس کا ایمان اللہ پر بھی نہ ہوا) اور اگر (یہ) اہل کتاب (بھی جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں، تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لئے (ان کی موجودہ حالت سے جسے وہ اپنے زعم میں اچھی سمجھتے ہیں) زیادہ اچھا ہوتا (اس لئے کہ پھر یہ بھی اسی مذکورہ اچھی جماعت میں داخل ہو جاتے۔ مگر افسوس کہ یہ سب مسلمان نہ ہوئے، بلکہ) ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں (اور اچھی جماعت میں داخل ہیں) اور ان سے زیادہ تر کافر ہیں (اور اس جماعت سے خارج ہیں۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جو بیچارے اسلام لے آتے ہیں، انہیں دینی اور دنیوی نقصان پہونچانے کی فکر میں ہیں)

تفسیر: یہ خطاب تمام امت محمدیہ کو عام ہے، جیسا کہ کمالین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت احمد بن حنبل کی سند سے مرفوعاً منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت تمام امتوں میں بہترین ہے، پھر ان میں سے صحابہ سب سے اوپر اور سب سے اچھے مخاطب ہیں۔ اس طرح اوس وخزرج کے قصہ سے مناسبت بھی ظاہر ہو گئی۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے جو زیادہ اہتمام کرنے کی قید لگا دی گئی ہے، اس سے مراد ہاتھ کے ذریعہ حکم دینا اور روکنا ہے جو اس کا اعلیٰ درجہ ہے۔

یہ درجہ اس امت میں دوسری امتوں سے دو وجہوں سے زیادہ ہے۔ ایک جہاد کا شریعت کی رو سے جائز ہونا جس کا مقصد کفر اور فساد کا دفع کرنا ہے۔ دوسرے حضرت محمد ﷺ کی دعوت کے عموم کی وجہ سے، اس کا تمام قوموں کے لئے

عام ہونا، جیسا کہ ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ عام لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کی یہ صورت سابقہ شریعتوں کے برخلاف ہے کہ بعض میں جہاد کا حکم نہیں تھا اور بعض میں سابق انبیا کی بعثت کے مخصوص لوگوں کی طرف ہونے کی وجہ سے ساری قوم کے لئے عام نہ تھا، اور ظاہر ہے کہ عمل زیادہ ہونے سے اجر زیادہ ہوتا ہے، بلکہ صرف دوسری وجہ بھی کافی ہے، اس طرح یہ بھی اس امت کے بہترین ہونے کے اسباب میں سے ہوا۔

اور بہترین ہونے کی بات اس میں محدود نہ سمجھی جائے کہ اس کے بہترین ہونے کی دوسری وجہیں بھی بیان کی گئیں۔ چنانچہ احقر نے ربط کی وجہ سے اس فقرہ میں کہ "مذکورہ" بالا امور بھی ہیں، اس محدود نہ ہونے کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ رہا ایمان پر ثابت قدم رہنے کا بہترین وجہ ہونا حالانکہ یہ بظاہر بھی شریعتوں والوں میں مشترک و یکساں معلوم ہوتا ہے، تاہم اس کی توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شریعت دوسری شریعتوں سے اکمل یعنی زیادہ کامل ہے اور زیادہ کامل پر ایمان لانا اور اس پر قائم رہنا بھی زیادہ کامل ہوگا۔ لہٰذا اس اعتبار سے مشترک و یکساں نہیں رہے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں، ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہمارے نبی ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔

﴿ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾

ترجمہ: وہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے مگر ذرا خفیف سی اذیت۔ اور اگر وہ تم سے مقاتلہ کریں تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے پھر کسی کی طرف سے ان کی حمایت بھی نہ کی جاوے گی۔

ربط: پہلی آیت میں اہل کتاب کے مسلمانوں سے عقیدہ میں مخالف ہونے اور اس سے پہلے ان کے مسلمانوں کو دینی نقصان پہونچانے کی تدبیر کرنے کا بیان تھا، اب ان کے مسلمانوں کو دنیاوی نقصان پہونچانے کی فکر کرنے اور اس کے ساتھ ان کی ناکامی کی پیشین گوئی کے ذریعہ تسلی کر دینے کا ذکر ہوتا ہے۔

اہل کتاب کی مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکنے کی اطلاع:

وہ (اہل کتاب) تمہیں (اے مسلمانو!) ہرگز کوئی ضرر نہ پہونچا سکیں گے، سوائے ہلکی سی اذیت کے (یعنی زبانی برا بھلا کہہ کر دل دکھانا) اور اگر وہ (اس سے زیادہ کی ہمت کریں اور) تم سے (مقابلہ میں آکر) جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ) کسی کی طرف سے ان کی حمایت بھی نہیں کی جائے گی۔

فائدہ: یہاں "اس سے بڑھ کر" اس لئے کہا گیا کہ غالب آجانے کے مقابلہ میں خالی حمایت اور طرف داری آسان ہے، کیونکہ غالب آنے کے لئے بڑا سامان چاہئے، اور خالی حمایت کے لئے صرف زبان ہلانی یا ذرا دوڑ دھوپ کر لینی پڑتی ہے، تو جب وہ لوگ ایسے ذلیل اور بدنام ہیں کہ کوئی زبانی بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا تو غالب آنے کی بدرجۂ اولیٰ نفی ہوگی۔

یہ ایک پیشین گوئی ہے جو اسی طرح واقع ہوئی۔ چنانچہ زمانۂ نبوت میں اہل کتاب، صحابہ پر جو کہ موقع کے لحاظ سے

اس مضمون کے خاص مخاطب ہیں، کسی موقع پر بھی غالب نہیں آئے۔ خاص طور سے یہود جن کی برائیوں کا یہاں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ صحابہ کو اشتعال انگیزی کے ذریعہ آپس میں لڑنے پر آمادہ کر دینے کے جس قصہ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، وہ انہی کی کارستانی تھی، یہ بہت ذلیل و خوار کیے گئے، بعض پر جزیہ عائد ہوا، بعض قتل کیے گئے اور بعض علاقہ سے نکال دیئے گئے، چنانچہ اگلی آیت میں یہی مضمون مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾﴾

ترجمہ: جمادی گئی ان پر بے قدری جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے اور جمادی گئی ان پر پستی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے، اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ سے نکل نکل جاتے تھے۔

ربط: ابھی مندرجہ بالا فائدہ کے آخر میں بیان ہوا۔

یہود کی ذلت کا بیان:

ان پر (خاص) بے قدری (یعنی جان کی بے امنی سکہ کے نقش کی طرح) جمادی گئی، جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے، مگر ہاں! (دو ذریعوں سے امن میسر ہو جاتا ہے) ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب ج اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے (اللہ کی طرف کا ذریعہ یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی اللہ کی عبادت میں ایسا مشغول ہو کہ مسلمانوں سے لڑتا بھڑتا نہ ہو، وہ جہاد میں قتل نہیں کیا جاتا۔ خواہ اس کی عبادت آخرت میں نفع بخش نہ ہو، اور اللہ کی طرف کے ذریعہ میں یہ بھی آ گیا کہ اہل کتاب میں سے وہ نابالغ یا عورت ہو۔ بغیر کسی کوشش کے حاصل ہونے والی یہ اہلیت بھی جو محض اللہ کی جانب سے ہے۔ اپنے آپ میں قتل سے امن کا سبب ہے اور آدمیوں کی طرف کے ذریعہ سے مراد معاہدہ اور صلح ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ ذمی اور صلح کے تحت آنے والے بھی محفوظ و مامون ہیں یا کسی قوم کا ان سے لڑنے کا ارادہ نہ کرنا جیسا کہ بعض زمانوں میں ہوا یا آئندہ ہوگا، جس کا ذکر آیت ﴿إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰٓى إِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ (آلِ عمران ۵۵) کی تفسیر میں ہوا ہے۔ یہ امن بھی آدمیوں ہی کی جانب سے ہے۔ باقی اور کسی کو امن نہیں) اور وہ (لوگ) اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان پر پستی اور مسکنت جمادی گئی (کہ ان کی طبیعتوں میں بھی اولو العزمی نہیں رہی اور جزیہ اور وطن سے اخراج بھی مسکنت میں داخل ہے) یہ (ذلت اور غضب) اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ

اللہ کے احکام کے منکر ہو جاتے تھے اور پیغمبروں کو قتل کر دیا کرتے تھے (اس طرح سے کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (ذلت وغضب) اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے اطاعت نہیں کی اور (اطاعت کے) دائرہ سے (بار بار) نکل جایا کرتے تھے۔

حوالہ: اس طرح کی ایک آیت سورۃ البقرۃ ۶۱ بھی گذر چکی ہے، اس کی تفسیر سے متعلق ضروری امور وہاں دیکھ لیں۔ اور اس ذلت ومسکنت کی تفصیل سورۂ بقرہ ہی کی آیت ۵۸ کے تحت بیان ہو چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔ اور روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں ہے کہ غیب کی یہ خبر دینے میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے۔ چنانچہ بنو قینقاع، بنو قریظہ و بنو نضیر اور خیبر کے یہود، مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکام رہے اور پھر روز بروز ذلیل ہی ہوتے چلے گئے۔

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

ترجمہ: یہ سب برابر نہیں ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں، اللہ کی آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں، اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ شائستہ لوگوں میں ہیں۔ اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس سے محروم نہ کئے جاویں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: اوپر اہل کتاب کی بداعمالیوں کے ذکر میں ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کے ذریعہ مختصر طور پر ان لوگوں کو مستثنیٰ فرما دیا تھا جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے بھائی اور ثعلبہ بن شعبہ (روح المعانی) اب اس استثناء کی تفصیل ہے۔

اہل کتاب مومنوں کی مدح وستائش:

یہ (اہل کتاب) سب برابر نہیں ہیں (بلکہ) ان (ہی) اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو (دین حق پر) قائم ہے (اور) رات کے اوقات میں اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں (اور) اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، اور (دوسروں کو) نیک کام بتاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) شائستہ لوگوں میں (شمار کئے جاتے) ہیں۔ اور یہ لوگ نیک کام کریں گے اس (کے ثواب) سے محروم نہیں کئے جائیں گے اور (محروم) ہونے کا احتمال ہی کب ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ

اہل تقویٰ کو خوب جانتے ہیں (اور یہ لوگ اہل تقویٰ ہیں، اس لئے ان کے اعمال اور اخلاص کی اچھی طرح خبر ہے اور وہ وعدہ ہو ہی چکا تو وعدہ اور علم کے بعد نہ خفا ہونے کا احتمال ہے نہ وعدہ خلافی کا۔

فائدہ: یہ ضروری نہیں کہ اس مقام پر جتنے امور کا ذکر ہوا ہے سب فرض ہی ہوں، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان میں بعض امور نفل بھی ہیں، جیسے راتوں کو بیدار رہ کر قرآن کی تلاوت کرنا یا تہجد کی نماز پڑھنا، جو خصوصیت کے ساتھ یا عمومی طور پر ﴿ يَسْجُدُوْنَ ﴾ سے مراد ہے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب وہ لوگ نفل تک کے پابند ہیں تو فرائض اعمال اور عقائد کو تو کیوں کر ضائع کریں گے۔ آیت کا حاصل ان لوگوں کی مدح ہے کہ انھوں نے ان صفات کو اختیار کیا ہے جو کہ اس امت کے بہترین ہونے کے اسباب میں سے ہیں، اس لئے ﴿ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ اور ﴿ يَأْمُرُوْنَ ﴾ کو خصوصیت کے ساتھ لائے جس کی وہاں بہترین ہونے کی وجہ سے تصریح تھی، ورنہ ﴿ قَآئِمَةٌ ﴾ کے عموم میں یہ سب امور داخل ہو گئے تھے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: جو لوگ کافر رہے ہرگز اُن کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ذرا بھی اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

ربط: اوپر ان لوگوں کی مدح تھی جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اب ان لوگوں کی مذمت ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان نہیں ہوئے۔

کفر پر اصرار کرنے والوں کی مذمت:

اور جو لوگ کافر رہے، اللہ تعالیٰ کے (عذاب کے) مقابلہ میں ان کے مال اور ان کی اولاد ذرا بھی ہرگز کام نہ آئیں گے، اور وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (کبھی نجات نہ ہوگی)

حوالہ: ایسی ہی ایک آیت آلِ عمران ۱۰ آ چکی ہے اور چونکہ الفاظ عام ہیں، اس لئے سب کفار کا یہی حکم ہے۔

﴿ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس دنیوی زندگانی میں، اس کی حالت اس حالت کی مثل ہے کہ ایک ہوا ہو، جس میں تیز سردی ہو، وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنھوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ اس کو برباد کر ڈالے، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے۔

ربط: اوپر فرمایا ہے کہ کفار کے اموال واولاد کام نہ آئیں گے چونکہ بعض کفار بزعم خود طاعات میں بھی خرچ کیا کرتے تھے، خواہ وہ طاعت متفقہ ہو، جیسے مسکینوں کو کھانا کھلانا یا اختلافی ہو جیسے اپنے مذہب کی نصرت، اور بظاہر اس کے بعض مواقع قبولیت اور نفع کا احتمال رکھتے تھے، اس لئے اب عام الفاظ سے اس احتمال کو ختم فرماتے ہیں کہ ان کا کوئی اتفاق (خرچ کرنا) خواہ کسی بھی طرح ہو اللہ کے نزدیک قابل توجہ نہیں ہے اور وجہ اس کی ظاہر ہے، کیونکہ اگر وہ مصرف واقع ہی میں طاعت نہیں تب تو ظاہر ہے اور اگر واقع میں طاعت ہے تو اس کے لئے ایمان شرط ہے اور یہاں وہ مفقود ہے۔

اور اولاد کا نفع بخش نہ ہونا دوبارہ بیان نہیں فرمایا، کیونکہ اس میں طاعت میں انفاق جیسا احتمال نہیں تھا، وجہ یہ ہے کہ اگر وہ اولاد بھی کافر ہے تو وہ خود ہی ہلاک وتباہ ہونے والی ہے اور اگر مؤمن ہے تو اور زیادہ دشمن ہوگی اور یہ دونوں معاملے طاعت میں انفاق کے برخلاف بہت ہی واضح تھے کہ اُس کا نفع بخش نہ ہونا ذرا خفی ہے جس پر شرط کے مفقود ہونے سے استدلال کیا جاتا ہے۔

کفار کے انفاق کے ضائع ہونے کا بیان:

وہ (کافر لوگ) اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں (برباد اور ضائع ہونے میں) اس کی حالت (ایسی ہے جیسے ایک ہوا ہو، جس میں تیز سردی (یعنی پالا) ہو (اور) وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے جنھوں نے (بددینی کی وجہ سے) اپنا نقصان کر رکھا ہو، تو وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کر ڈالے (اس طرح ان لوگوں کا خرچ کرنا آخرت میں سب ضائع ہو جائے گا) اور (اس ضائع کرنے میں) اللہ تعالیٰ نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی (کفر کا ارتکاب کر کے جو قبولیت کی راہ میں رکاوٹ ہے) اپنے آپ کو نقصان پہونچا رہے تھے (نہ وہ کفر کرتے اور نہ ان کا سب کچھ خرچ کیا ہوا ضائع ہوتا)

فائدہ: بظاہر تشبیہ کے درست ہونے کے لئے مشبہ بہ یعنی جس سے تشبیہ دی جارہی ہے اس میں ﴿ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ کی قید لگانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ جو شخص ظالم اور بددین نہ ہو، ایسی ہوا سے اس کی کھیتی کو بھی نقصان پہونچ سکتا ہے اور تشبیہ کی غرض حاصل ہو سکتی ہے تو یہ قید لگانے میں نکتہ یہ ہے کہ یہاں محض ضیاع میں تشبیہ دینا مقصود ہے اور محض ضیاع بددین آدمی کے ساتھ مخصوص ہے کہ دنیا میں اس کا سب کچھ ضائع ہو گیا اور آخرت میں کچھ بدلہ بھی نہیں ملے گا۔ برخلاف مسلمان کے کہ اس کا جو کسی قسم کا نقصان دنیا میں ہوتا ہے اس کو اس کے بدلہ میں ثواب اور گناہوں کی معافی عطا ہوتی ہے، جیسا کہ حدیثوں میں تصریح ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ

كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحب خصوصیت مت بناؤ، وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوا پڑتا ہے، اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو۔ ہاں تم تو ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو اور یہ لوگ تم سے اصلا محبت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ کے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں۔ بیشک خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں دلوں کی باتوں کو۔ اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کے لئے موجب رنج ہوتی ہے اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم استقلال اور تقوی کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر احاطہ رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر اہل کتاب کی خاص طور سے یہود کی بداعمالیوں اور قبیح و مذموم حرکتوں کا ذکر رہا ہے۔ اب اہل ایمان کو خطاب کرتے ہیں کہ جب یہ لوگ ایسے ہیں تو ان سے دوستی یا دوستانہ سلوک روا مت رکھو۔

کافروں کے ساتھ خصوصی تعلق رکھنے کی ممانعت:

اے ایمان والو! اپنے (لوگوں کے) سوا (دوسرے مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت اور برتاؤ میں) خصوصی تعلق والا مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے (اور دل سے بھی) تمہارے (دینی و دنیاوی) نقصان کی تمنا رکھتے ہیں (ان کے دلوں میں تمہاری طرف سے اس قدر بغض بھرا ہوا ہے کہ) واقعی (وہ) بغض (بعض اوقات) ان کے منہ سے (بات چیت میں بے اختیار) ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور جس قدر ان کے دل میں (بھرا ہوا) ہے وہ تو بہت زیادہ ہے (چنانچہ) ہم (ان کی عداوت و دشمنی کی) علامتیں (اور قرینے) تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان یقینی علامتوں سے دیکھ لو) ہاں (سمجھو) تم تو ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت (کا برتاؤ) رکھتے ہو اور یہ لوگ تم سے بالکل محبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (اس میں ان کی کتابیں بھی آ گئیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، مگر وہ تمہارے اس ایمان کے باوجود تم سے محبت نہیں رکھتے، اور

تم ان کے اس ایمان کے نہ ہونے کے باوجود ان سے محبت رکھتے ہو) اور (تم ان کے ایمان کے اس ظاہری دعوی سے شبہ مت کرنا کہ وہ بھی تو ہماری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ) یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں تو (صرف تمہیں دکھانے کو منافقانہ طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب (تم سے) الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصہ سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں (یہ اس شدت غضب سے کنایہ ہے جو مجبوری کے وقت ہوتا ہے) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ تم اپنے غصہ میں مر رہو (مراد یہ ہے کہ اگر تم مر بھی جاؤ گے تب بھی تمہاری مراد پوری نہیں ہوگی) بیشک اللہ تعالیٰ دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں جو رنج وغبار اور عداوت تمہاری طرف سے بھری ہوئی ہے سب بتادی اور ان کا یہ حال ہے کہ) اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آتی ہے (مثلاً تم میں آپس میں اتفاق ہو جائے، غیروں پر غلبہ ہو جائے) تو ان کے لئے رنج کا سبب بنتی ہے (جس کا سبب انتہائی سخت درجہ کا حسد ہے) اور اگر تمہیں کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے (جو اس اچھی حالت کی ضد ہو) تو اس سے وہ (بڑے) خوش ہوتے ہیں (جس سے ان کی فطری برائی ثابت ہے۔ اس طرح جب ان کے یہ حالات ہیں تو وہ اس قابل کب ہیں کہ ان سے دوستی رکھی جائے یا دوستانہ سلوک وبرتاؤ کیا جائے۔ یہ تقریر سننے والے کے دل سے دوستی کا خیال ختم کرنے کے لئے تو کافی ہے ہی، اس کے ساتھ ہی ان کی مخالفتوں سے باخبر ہو کر وہ اس فکر میں پڑ سکتا ہے کہ جب یہ ایسے دشمن ہیں تو کہیں ہمیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچادیں۔ اس لئے آگے اس سلسلہ میں تسلی ہے) اور اگر تم صبر کرو اور تقوی کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم لوگوں کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی (تم اس سے بےفکر رہو۔ اس طرح دنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں دوزخ کی سزا ہوگی، کیونکہ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو (اپنے علم سے) گھیرے ہوئے ہیں (کوئی عمل ان سے چھپا ہوا نہیں ہے، اس لئے وہاں سزا سے بچنے کے لئے کسی حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں)

فائدہ: یہاں جو غیر مذہب کے لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ انہیں اپنا ہم راز نہ بنایا جائے۔ چنانچہ روح المعانی میں حضرت حسن رحمہ اللہ کا ایک حدیث کی تائید کرنا جو بیہقی کی روایت سے مشرکین کو ہم راز بنانے کی ممانعت میں آئی ہے، اس آیت کے تحت منقول ہے۔ اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے خاص انتظامی معاملوں میں ان کو دخل نہ دینے دیا جائے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک نصرانی کو منشی بنانے سے انکار فرمانا اسی آیت کی بنا پر ہے۔ اور اگرچہ شان نزول خاص ہے، مگر الفاظ کے عموم کی وجہ سے حکم عام ہے، چنانچہ اسلاف کا اس سے استدلال کرنا اس کی تائید بھی کرتا ہے۔ اس مسئلہ کی باقی ضروری تفصیل سورۂ آلِ عمران کی آیت ۲۸ کی تفسیر میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

اور احقر نے جو ﴿ عَنِتُّمْ ﴾ کے ترجمہ میں دینی ودنیوی نقصان کی بات لکھی ہے اس میں دینی نقصان تو وہ ہے جسے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۰ میں بیان فرمایا ہے، اور دنیوی نقصان کے بہت سارے معاملات ہیں۔ اور یہودیوں نے

مؤمنوں میں جو تفریق پیدا کرنی چاہی تھی اس میں دونوں مضرتیں شامل ہیں۔

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ بات چیت میں بغض ظاہر ہوا پڑتا ہے تو یہ معاملہ دیکھا جاتا ہے کہ جب دل میں غبار بہت زیادہ ہوتا ہے تو کتنا ہی اپنے آپ کو سنبھالے مگر کچھ نہ کچھ زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ اور یہ کہنے کے لئے جو فرمایا ﴿مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ اس میں فن اخلاق کے متعلق ایک زبردست فائدہ بھی ہے کہ جب کسی سے تعلق ختم کرنا کسی ایسی مصلحت کے تحت ضروری ہو جس کی رعایت کرنا واجب ہو تو اس شخص کو کوئی دل خراش بات کہہ دینا تعلق ختم کرنے میں بہت مؤثر ہوتا ہے۔ مگر یہ اذیت شرعی اباحت کی حد سے تجاوز نہ کرے تو یہاں یہ نفع بھی ہے اور باوجودیکہ یہاں کہنے کا حکم بظاہر صرف حضور ﷺ کو ہے مگر آپ کے پیروکار اس خطاب میں بھی آپ کے تابع رہیں گے۔

اور آخر میں جو یہ فرمایا ہے کہ ان کی تدبیر سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، اگر اس خطاب کی خصوصیت پر نظر رکھی جائے تب تو کوئی اشکال ہی نہیں، کیونکہ یہ یہود، رسول اللہ کے صحابہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکے۔ اور اگر عام کیا جائے جیسا کہ اس کو صبر اور تقویٰ کے ساتھ علت قرار دینا عموم کے لئے مناسب بھی ہے تو اگر کہیں صبر و تقویٰ کی کمی سے مخالف کو غلبہ ہو گیا ہے تب بھی اشکال نہیں، اور اکثر ایسا ہی ہوا ہے، اور اگر صبر اور تقویٰ کے باوجود کبھی غلبہ ہوا ہے، اگر چہ ایسا کم ہی ہوا ہے۔ اور وہ بھی آزمائش کی مصلحت کے تحت ہے تو اشکال دور کرنے کی یہ تقریر ہے کہ یہاں نفی حقیقی نقصان کی ہے نہ کہ نقصان کی صورت کی، تو چونکہ مؤمنوں کو اس میں دنیوی فائدے، جیسے اخلاق کا سنوارنا وغیرہ اور دینی فائدے جیسے ثواب اور اللہ کی قربت اس ظاہری نقصان سے زیادہ مل جاتے ہیں اور اس سے رضا اور توکل کی وجہ سے ان کے دلوں میں تشویش پیدا نہیں ہوتی، اور دل کی تشویش ہی نقصان کی روح ہے۔ اس لئے وہ نقصان قابل توجہ اور حقیقی نہیں محض صورت کے اعتبار سے نقصان ہے جس کا حقیقت کے مقابلہ میں کوئی اعتبار نہیں، جیسا کہ کسی جماعت کا ایک شخص قتل ہو جائے اور باقی لوگوں کو فتح حاصل ہو جائے تو عرف میں اس کو اسی بنا پر ضرر یعنی نقصان نہیں کہتے۔ خوب سمجھ لو۔

﴿ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ هَمَّتْ طَّاۗىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور جبکہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے، مسلمانوں کو مقابلہ کرنے کے لئے مقامات پر جما رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سب سن رہے تھے سب جان رہے تھے، جب تم میں سے دو جماعتوں نے دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا اور پس مسلمانوں کو تو اللہ ہی پر اعتماد کرنا چاہئے۔

ربط: یہاں تک زبانی مقابلہ کا مضمون تھا۔ اب ہتھیاروں کے ذریعہ مقابلہ کا مضمون بیان کیا جاتا ہے جس کے ضمن میں تین قصوں کی طرف اشارہ ہے: (۱) غزوۂ احد اور یہی زیادہ ہے (۲) غزوۂ بدر ﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ ﴾ اور

اس کے بعد کی آیتوں میں۔ اور (۳) غزوۂ حمراء الاسد ﴿ اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ﴾ سے شروع ہونے والا مضمون۔

اور مقابلہ کی اس مناسبت کے علاوہ اگلے مضمون کی اوپر والے مضمون سے ایک خاص مناسبت یہ بھی ہے کہ اوپر فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْئًا ﴾ آگے کا مضمون اس کی دلیل کے طور پر ہے کہ تم خود اپنے قتال و جہاد کے قصے یاد کرلو کہ جہاں پورے صبر و تقوی سے کام لیا جیسے بدر وہاں کافروں کی تدبیروں سے کوئی نقصان نہیں پہونچا، اور تم غالب رہے اور جہاں اس میں کسی قدر کمی آگئی تھی وہاں نقصان ہوگیا۔ جب احد میں مغلوب ہوگئے اور پھر حمراء الاسد میں باوجودیکہ احد کے واقعہ سے تازہ زخم خوردہ تھے، لیکن صبر، ثابت قدمی اور تقوی سے کام لیا تو پھر کامیاب ہوئے۔ اس سے مندرجہ بالا مضمون کی پوری تائید ہوگئی۔

واقعہ غزوۂ احد:

۱۷ رمضان بروز جمعہ ۲ ہجری کو جب غزوۂ بدر جو کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ ہوئی ہے قریش کے کفار کو شکست ہوئی تو اگلے ہی سال یعنی نصف شوال ۳ ہجری میں وہ پھر سے بدلہ لینے کے لئے مدینہ پر چڑھ آئے، تین ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، رسول اللہ ﷺ ایک ہزار آدمیوں کو لے کر مقابلہ کے لئے میدان میں تشریف لائے، میدان میں پہنچنے کے بعد عبداللہ بن ابی منافق جو کسی طرح دباؤ کے تحت ساتھ چلا آیا تھا، اپنے تین سو[1] آدمیوں کو لے کر میدان سے

(۱) منافقوں کی تعداد صرف تین سو ہی نہیں تھی، ہم یہ بات اس لئے کہہ رہے ہیں کہ کوئی یہ سوال نہ کرے کہ یہاں سے لے کر دور تک قصۂ احد چلا گیا ہے اور جگہ جگہ منافقوں کا ذکر آتا رہا ہے اور شروع ہی میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ منافقوں کا سردار اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر جنگ کے میدان سے واپس ہوگیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اب لشکر میں کوئی منافق نہیں تھا صرف مخلص مؤمن ہی تھے، لیکن آگے چل کر بار بار منافقوں کا ذکر خاص میدانِ جنگ ہی کے سلسلہ میں آتا ہے تو یہ باتوں میں تعارض ٹکراؤ ہوا۔

جواب کی واضح شکل یہ ہے کہ منافقوں کا تین سو میں محدود ہونا بہت مشکل ہے، یہ منافق اکثر یہود تھے اور مدینہ میں ان کی کثرت تھی، جو کہ معلوم ہے۔ تو تین سو کے جدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب وہاں کوئی منافق موجود نہیں رہا۔ چنانچہ رواتیوں سے قطع نظر خود قرآنِ مجید کی بعض آیتوں سے ان کی کثرت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا یَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ﴾ جو جلد ہی آگے آیت ۱۵۴ میں) آرہی ہے۔

رہی یہ بات کہ یہ لوگ جدا کیوں نہیں ہوئے، تو یا تو اتفاق سے انہیں موقع نہیں ملا یا قصداً یہ سوچ کر رہ گئے ہوں گے کہ مسلمانوں کو موقع موقع سے غلط اور برے مشورے دیں گے، یا ان کے شدت پسند لوگوں کو خبر پہنچا دیں گے جیسا کہ دوسری ←

واپس ہوگیا، بعض صحابہ نے سمجھایا بھی، مگر وہ کہنے لگا کہ اگر لڑائی کا موقع ہوتا تو ہم شریک ہوتے، بے فائدہ کون اپنی جان دے، انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ اور بنی حارثہ ہیں ان منافقوں کو واپس ہوتے دیکھ کر ان کی ہمت میں بھی کچھ سستی پیدا ہونے لگی اور دلوں میں واپسی کا خیال آنے لگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس عملی غلطی سے محفوظ رکھا، ان کے دلوں سے اس وسوسہ کو دور کیا۔ غرض سات سو آدمی رہ گئے، حضور اقدس ﷺ نے موقع کے لحاظ سے میدان میں احد پہاڑ کے قریب سب کی صف آرائی کی اور عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ صحابی کو پچاس تیراندازوں پر وافر مقرر کر کے لشکر کی پشت پر ایک مورچہ پر مقرر فرمایا کہ اس مورچہ کی حفاظت کرنا کہ ہماری پشت کی طرف سے دشمن نہ آجائے، اور یہاں ہی سے تیراندازی کرتے رہنا۔ چنانچہ بڑے موقع سے لڑائی شروع ہوئی اور مسلمان غالب آگئے، عبداللہ بن جبیر کے ساتھی یہ سمجھ کر کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم نقصان کے خطرہ کی وجہ سے تھا، اب تو ہمارے بھائی غالب ہوگئے، اب کیا اندیشہ رہ گیا، اس لئے وہ حکم ختم ہوگیا، اس طرح بارہ آدمیوں کے سوا سب اس جگہ سے ہٹ کر کافروں کا پیچھا کرنے کے لئے چل پڑے اور غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے۔ کافروں نے موقع پا کر مورچہ پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ کردیا۔ اب آگے بھی کفار تھے اور پیچھے بھی کفار۔ اس حالت میں حضور کے دندانِ مبارک یعنی اس کا ایک ریزہ شہید ہوگیا۔ اس دوران کسی کافر نے نعرہ لگادیا کہ محمد قتل ہوگئے۔ ان ناگہانی حادثوں اور پریشانیوں سے سراسیمہ ہوجانے کی وجہ سے اس وقت سوائے ایک جماعت کے تمام مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، جو کہ ان زبردست اسباب کے پیش نظر کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہاں یہ قصہ اتنا ہی لکھا گیا ہے۔ جس کی اس موقع پر تفسیر میں ضرورت ہے۔

احد کے قصہ کا آغاز:

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ آپ صبح کے وقت (قتال کی تاریخ سے پہلے) اپنے گھر سے (اس غرض سے) چلے (کہ) مسلمانوں کو (کافروں سے) قتال و جہاد کے لئے (مناسب) مقامات پر مقرر کردینے کے لئے آمادہ کر رہے تھے (پھر اسی تجویز کے مطابق سب کو ان مقامات پر مقرر کردیا) اور اللہ تعالیٰ (اس وقت کی باتیں) سب سن رہے تھے (اور اس وقت کے حالات) سب جان رہے تھے۔ جب (اسی کے ساتھ یہ قصہ بھی ہوا کہ) تم (

← آیتوں میں ان کے ساتھ ہونے کی اور ساتھ ہونے کی اس مصلحت کی تصریح ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ، فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ﴾: (یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں سب کو دوزخ میں جمع کردیں گے۔ جو ایسے ہیں کہ تم پر کوئی افتاد پریشانی آنے کے منتظر رہتے ہیں، پھر اگر اللہ کی طرف سے تمہیں فتح حاصل ہوتی ہے تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے (النساء ۱۴۱ اور ﴿وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾ (اور تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں التوبہ ۴۷) اس لئے قصہ کی اجزاء میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

مسلمانوں) میں سے دو جماعتوں (یعنی بنوسلمہ اور بنوحارثہ) نے دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں (اور ہم بھی عبداللہ بن ابی کی طرح اپنے گھروں کو لوٹ جائیں) اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا (بھلا ان کو کب ہمت ہارنے دیتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس خیال پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا) اور (ہم آئندہ کے لئے ان جماعتوں کو اور دوسرے تمام لوگوں کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ جب تم مسلمان ہو تو (مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہئے) اور ایسی کم ہمتی کبھی نہیں کرنی چاہئے۔

فائدہ: صحابہ پر اللہ تعالیٰ کی کیسی عنایت ہے کہ غلطی کے بیان کے ساتھ ہی انہیں ولایت کی بشارت بھی سنادی، جس میں معافی کا اعلان صاف طور سے ظاہر ہے اور غلطی بھی کتنی معمولی بتائی کہ واپسی نہیں صرف ہمت ہارنا یا کم ہمتی، پھر اس کا بھی وقوع نہیں، بلکہ صرف خیال کہ یا تو صدور ہی صرف اتنا ہوا ہو یا صادر ہونے کا ذکر نہیں فرمایا، پھر امر اول پر اندازِ بیان بھی ایسا جس سے ان حضرات کا انتہائی تقرب ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی مقولہ کے مطابق نزدیکاں رابیش تر بود حیرانی (قریبی لوگوں کو زیادہ پریشانی ہوتی ہے)، اور اس بشارت کی وجہ سے ان میں سے بعض صحابہ کا صحاح یعنی صحیح احادیث والی کتابوں میں یہ قول آیا ہے کہ ہم عتاب کے اظہار کے باوجود اس آیت کے نازل نہ ہونے کی تمنا نہیں رکھتے، کیونکہ اس آیت میں عتاب کے ساتھ ہی عنایت کا کلمہ ﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ﴾ بھی تو ہے۔ خوب کہا گیا ہے:

اگر یکبار گوید بندۂ من ❁ از عرش بگذرد خندۂ من

وہ اگر ایک بار کہے: میرا بندہ! ÷ تو میری ہنسی عرش سے بھی گذر جاتی ہے۔

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ﴾

ترجمہ: اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم بے سروسامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکرگزار رہو۔

ربط: اوپر آیت ﴿ وَاِذْ غَدَوْتَ ﴾ کی تمہید میں ربط کا بیان گذر چکا ہے۔ اب بدر کے قصہ میں مدد کا صبر اور تقویٰ کی بدولت ہونا بیان فرماتے ہیں۔

بدر کی نصرت کا قصہ:

اور یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے (غزوۂ) بدر میں تمہاری مدد فرمائی، حالانکہ تم (محض) بے سروسامان تھے (کیونکہ مجمع بھی کفار کے مقابلہ میں کم تھا، وہ ایک ہزار تھے اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے اور ہتھیار وغیرہ بھی بہت کم تھے) تو (چونکہ یہ فتحیاب اور منصور ہونا تقویٰ کی بدولت تھا، جس میں استقلال اور صبر یعنی ثابت قدمی بھی داخل ہے تو تم پر لازم ہے کہ آئندہ بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) تاکہ تم (مدد کی اس نعمت کے) شکرگذار رہو (کیونکہ

شکر گذاری صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پورا شکر یہ ہے کہ زبان اور دل بھی مشغول ہو اور طاعات کی بھی پابندی ہو۔ خاص طور سے جبکہ اس طاعت کا اس نعمت میں دخیل ہونا بھی ثابت ہو جائے)

فائدہ: بدر اصل میں ایک کنویں کا نام ہے جسے بدر بن قریش نے کھودا تھا جیسا کہ القاموس میں ہے، یہ جنگ اسی کنویں کے قریب ہوئی تھی۔ آگے اللہ کی طرف سے اس غزوہ میں ہونے والی نصرت (امداد) کی تفصیل ہے۔

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ ؕ بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ﴾

ترجمہ: جبکہ آپ مسلمانوں سے یوں فرما رہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جائیں گے۔ ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے۔

بدر کے قصہ کا تتمہ:

(یہ نصرت اس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ (اے محمد! ﷺ) مسلمانوں سے (جبکہ وہ یہ خبر سن کر کہ مشرکوں کے لئے اور مدد آرہی ہے، پریشان تھے، اللہ کی وحی کی بنیاد پر) یوں فرما رہے تھے کہ کیا تمہارے (دلوں کی تقویت کے) لئے یہ امر کافی نہیں ہوگا کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کرے، جو (اسی کام کے لئے آسمان سے) اتارے جائیں گے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجہ کے فرشتے ہوں گے، ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جا سکتا تھا، اور اس سے پہلے مسلمانوں کی دعا اور استغاثہ پر ایک ہزار ملائکہ کے بھیجنے کا وعدہ ہو چکا تھا، جیسا کہ سورۂ انفال آیت ۹) میں ہے تو یہ زیادہ کا دوبارہ وعدہ دل کو زیادہ تقویت پہونچانے میں مؤثر ہے۔ چنانچہ اوپر سے سوال کا جواب خود ہی ارشاد ہوا کہ) ہاں! کیوں نہیں (کافی ہوگا؟ یعنی کافی ہوگا، اب آگے اور زیادہ کا مزید ایک وعدہ ہے، لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ اور وہ یہ کہ) اگر مقابلہ کے وقت ثابت قدم رہو گے اور متقی (بنے) رہو گے (یعنی کوئی امر، بات یا کام طاعت کے خلاف نہ کرو گے) اور (اگر) وہ لوگ تم پر ایک دم سے (بھی) آپہونچیں گے (جس میں عام طور سے مخلوق سے مدد کا پہونچنا مشکل ہوتا ہے) تو (جب بھی) تمہارا رب تمہاری مدد پانچ ہزار فرشتوں سے فرمائے گا، جو کہ ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے (جیسا کہ عام طریقہ ہے کہ فوج کی کوئی خاص وردی ہوتی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ وہ فرشتے خاص اسی کام کے لئے بھیجے جائیں گے۔ یہ خبر دینے کا یہ فائدہ ہے کہ جو شخص کسی خاص کام کے لئے آتا ہے، عام طور سے اس کام کی اس سے زیادہ امید ہوتی ہے، اس بار بار کے وعدہ سے دلوں کو اور زیادہ تقویت کا فائدہ ہوا)

فائدہ: یہ تین وعدے تھے اول ایک ہزار کا، دوسرا تین ہزار کا اور تیسرا پانچ ہزار کا۔ تو پہلے کا سبب تو سورۂ انفال میں استغاثہ اور دعا کی تصریح ہے۔ دوسرے کا سبب مشرکوں کے لئے امداد آنے کی خبر سن کر روایات سے پریشان ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہما نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکوں کی امداد کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ خبر بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اور اگرچہ قریبی سبب یہ پریشانی ہے لیکن اصل سبب جیسا کہ اس آیت کے ربط کی وجہ سے اوپر والی آیتوں یعنی ﴿اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ﴾ سے جس کا بیان ﴿وَاِذْ غَدَوْتَ﴾ کی تمہید کے شروع میں گذر چکا ہے، معلوم ہوتا ہے) یہ ہے کہ صبر اور تقوی کی جو صفتیں ان حضرات میں پہلے سے موجود تھیں، وہ ان پر رحمت کے متوجہ ہونے اور پریشانی دور کرنے کا سبب ہوا۔ بلکہ اگر پہلے وعدہ کا اصلی سبب بھی اسی پہلے سے موجود صبر اور تقوی کو کہا جائے تو بہت مناسب ہے، کیونکہ تقوی کی برکت دعا کے قبول ہونے میں بھی ظاہر ہوتی ہے، اور تیسرے وعدہ کا سبب خود اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی قتال کے وقت صبر اور تقوی۔ اس طرح بظاہر تینوں وعدوں کا سبب الگ ہے، اور اسی لئے وعدے بھی الگ الگ ہوئے، مگر حقیقت میں سبب کا سبب ایک یعنی تقوی ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے یہ آیتیں لائی گئی ہیں۔

آگے اس بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ تیسرا وعدہ پورا ہوا یا نہیں تو شعبی کا قول تو یہ ہے کہ اس میں ایک شرط ﴿یَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ﴾ بھی تھی اور وہ واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ کرز بن جابر کا گروہ نہیں آیا۔ اس طرح شرط کے فوت ہونے سے مشروط بھی فوت ہوگیا، پس واقع میں اس شرط کے بغیر وعدہ ہی نہیں ہوا تھا، اور بعض نے کہا ہے کہ وہ وعدہ ﴿یَاْتُوْکُمْ﴾ کے ساتھ مشروط نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود وعدہ کی تاکید اور مبالغہ ہے، جیسا کہ احقر نے ترجمہ کی تقریر میں اشارہ کردیا ہے۔ اس لئے یہ وعدہ بھی واقع ہوا۔ اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ ہر نئے وعدہ کی تعداد پہلے والے وعدہ کی تعداد سمیت ہے یا اس کے علاوہ ہے۔ یہ دونوں اختلاف روح المعانی سے نقل کئے ہیں اور اسی میں ابن عباسؓ کا قول ابن اسحاق اور طبرانی سے منقول ہے کہ ملائکہ کی یہ خاص وضع یوم بدر میں سفید عمامے تھے جن کا شملہ کمر پر پڑا تھا۔ اور یوم حنین میں سرخ عمامے تھے، اور احد کے قصہ میں بدر کی نصرت کا قصہ یاد دلانا مقابلہ کے قرینہ سے اس بات کا اشارہ ہے کہ احد میں نصرت کا نہ ہونا تقوی میں خلل واقع ہوجانے کی سے وجہ سے ہوا اور یہ خلل ایک تو واقعہ سے پہلے ہوا کہ بدر میں کفار کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، جس کا قصہ سورۂ انفال میں ہے اور بعض مفسرین نے ﴿بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا﴾ کی جو آگے اس سورۃ کی آیت ۱۵۵ میں ہے یہی تفسیر کی ہے اور ﴿ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ﴾ کی تفسیر میں حسنؒ سے منقول ہے (روح المعانی) اور دوسرا خلل مورچہ سے ہٹ جانا ہے۔ اس طرح مضمون کا حاصل یہ ہوا کہ بدر کے واقعہ میں اگلے اور پچھلے تقوی: دونوں کی برکت سے نصرت ہوئی، اور احد میں اگلے اور پچھلے خلل کے اثر کی وجہ سے مدد نہ ہوئی، اور احد میں

ملائکہ کے نزول کی بات کسی قوی دلیل پر مبنی نہیں۔ اور یوں ملائکہ متعینہ طور پر ساتھ رہتے ہی ہیں، لیکن گفتگو اس غرض کے لئے نزول کے سلسلہ میں ہے۔ اور ملائکہ کے ذریعہ اس امداد کی نسبت جو شبہ کیا گیا ہے اس کا جواب جلد ہی آگے آتا ہے۔ اور اس عدد میں یہ نکتہ ممکن ہے کہ کافر ایک ہزار تھے، اس لئے ایک ہزار فرشتے آئے، پھر جب کافر مسلمانوں سے تین گنا تھے، اس لئے فرشتے بھی تین ہزار ہو گئے کہ کافروں سے تین گنا رہیں، پھر پانچ ہزار میں یہ رعایت ہے کہ لشکر کے پانچوں حصوں کے ساتھ ایک ایک ہزار رہیں۔ واللہ اعلم

﴿ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لئے کی کہ تمہارے لئے بشارت ہو اور تا کہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں حکیم ہیں۔ تا کہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کردے یا ان کو ذلیل وخوار کردے، پھر وہ ناکام لوٹ جائیں۔

ربط: اب مذکورہ بالا مدد ونصرت کی حکمت کا بیان ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ کی حکمت

اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد (مذکورہ بالا جو ملائکہ کے ذریعہ ہوئی) محض اس (حکمت) کے لئے کہ تمہارے لئے (غلبہ کی) بشارت ہو (یعنی غلبہ کی توقع سے خوش ہو جاؤ اور تا کہ) تمہارے دلوں کو (اضطراب سے) قرار ہو جائے (اس طرح ایک فائدہ جلب منفعت یعنی نفع حاصل کرنے کا ہوا اور دوسرا دفع مضرت یعنی نقصان کو دور کرنے کا۔ چونکہ فطری طور پر اسباب سے تسلی ہوتی ہے، اس لئے اس سبب کا سامان کیا گیا) اور (واقع میں تو) نصرت یعنی مدد (اور غلبہ) صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں (کہ ویسے بھی غالب کر سکتے ہیں لیکن) حکیم (بھی) ہیں (وہ جب چاہیں اسباب کے ذریعہ غلبہ دیتے ہیں یہ تو ملائکہ کے ذریعہ امداد کی حکمت ہوئی، آگے منصور ومظفر یعنی فتح یاب ہونے کی حکمت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہیں غلبہ اس لئے دیا) تا کہ کفار میں سے ایک گروہ کو (جان سے) ہلاک کردے (چنانچہ ستر کافر رئیس قتل کئے گئے) یا ان (میں سے بعض) کو ذلیل وخوار کردے (یعنی شکست دیدے) پھر وہ ناکام لوٹ جائیں (یعنی ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو جائے اور اگر دونوں ہو جائیں تو اور بھی بہتر۔ چنانچہ دونوں باتیں ہوئیں بلکہ تیسری ایک اور بات ہوئی کہ ستر قید ہوئے)

فائدہ: یہاں امداد کی حکمت بہت ہی صراحت کے ساتھ فرمائی، جس میں غور کرنے سے اس مضمون پر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہوا کہ ان فرشتوں کے نزول سے اصل مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کو سکون واطمینان

ہو، ایسی سکون کا طریقہ کیا تھا؟ یہ سورۂ انفال آیت ۱۲ میں ہے۔ اور ثابت قدم کرنے کی وجہوں میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے روحانی تصرف سے مؤمنوں کے دلوں کو قوت پہونچادیں، جیسا کہ اہل تصرف کیا کرتے ہیں، اور جیسا کہ وحی کے نزول کی ابتدا میں جناب رسول اللہ ﷺ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے دبانے کی یہ بھی توجیہ کی جاتی ہے، اس طرح نہ تو فرشتوں کا نظر آنا ضروری ہے اور نہ یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی فرشتہ تمام کافروں کو ہلاک کرسکتا تھا، پھر کئی ہزار کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر کئی ہزار نے بھی تمام کفار کو ہلاک نہیں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصلی کام ان کا قتال نہ تھا، جیسا کہ حنین اور احزاب میں بھی ملائکہ آئے۔ اور ان کا خود قتل کرنا منقول نہیں، حالانکہ سورۂ انفال کی آیت ۱۲ ہی میں ﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ (گردنوں پر مارو) کی ایک تفسیر میں یہی کہا گیا ہے کہ یہاں ملائکہ کو خطاب ہے۔ اور بعض روایات میں آیا بھی ہے کہ بعض مشرکوں کو قتل کا ارادہ کیا، مگر ان کے سر خود بخود ہی جدا ہو کر جا پڑے (کمالین، عن سہل بن حنیف بروایت الحاکم وتصحیح بیہقی) جس سے کچھ قتال کرنا بھی معلوم ہوتا ہے، مگر یہ ملائکہ کا اصلی کام نہیں تھا، بلکہ اس میں یہ حکمت ہوسکتی ہے کہ ایک آدھ واقعہ ایسا ہوجائے تو صحابہ کو خارجی آثار سے ملائکہ کی معیت کا اور زیادہ یقین ہوجائے جس سے دلوں کو اور زیادہ قوت حاصل ہو۔ چنانچہ بعض صحابہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آواز بھی سنی اور بعض نے خود ملائکہ کو بھی دیکھا (مسلم) اور اگرچہ تصرف روحانی کے مقصود کا حاصل ہونا اس پر موقوف نہیں تھا کہ ان کے نزول کی خبر بھی دی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے دل کو اور زیادہ تقویت ہوتی ہے، خوب سمجھ لو۔ اور اوپر نصرت کے سبب یعنی تقوی کا بیان تھا اور یہاں حکمت یعنی بشارت کا بیان ہے، اس لئے آپس میں کوئی تعارض یا ٹکراؤ نہیں ہے۔

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ع

ترجمہ: آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہوجائیں یا ان کو کوئی سزا دیں، کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں۔ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں بخش دیں اور جس کو چاہیں عذاب دیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحمت کرنے والے ہیں۔

ربط: اب پھر احد کے قصہ کی طرف رجوع ہے بیچ میں مختصر طور پر موقع ومحل کی مناسبت سے بدر کے قصہ کا بیان ہوگیا تھا اور اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ غزوۂ احد میں حضور اقدس ﷺ کا دندانِ مبارک شہید ہوگیا، سامنے کے جو چار دانت ہوتے ہیں دو اوپر کے دو نیچے کے اور پھر ان کی کروٹوں میں جو چار دانت ہوتے ہیں دو، اوپر دائیں بائیں، اسی طرح دو نیچے دائیں بائیں ان چاروں میں دائیں طرف کے نیچے والے دانت کا ریزہ ہوگیا یعنی اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا (حاشیہ بخاری بحوالہ المجمع) اور چہرۂ مبارک مجروح ہوگیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ ایسی قوم کو کیسے فلاح ہوگی جس نے اپنے نبی کے

ساتھ ایسا کیا، حالانکہ وہ نبی ان کو اللہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (لباب النقول عن احمد ومسلم عن انس) اور بخاری نے ایک قصہ اور بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے بعض کفار کے لئے بددعا فرمائی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور وہ سب مسلمان ہو گئے، یہ دونوں قصے تو احد کے واقعہ سے متعلق ہوئے اور ایک روایت مسلم نے نقل کی ہے کہ آپ کفار کے قبائل رعل وذکوان اور عصیہ کے لئے بددعا فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر اس میں یہ اشکال کیا ہے کہ رعل اور ذکوان کا واقعہ احد کے بعد پیش آیا، اس لئے تطبیق نہیں ہو سکتی، پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ اس روایت میں اتنا مضمون الگ سے بعد میں کسی نے شامل کیا ہے کہ "یہ آیت نازل ہوئی" اس لئے روایتیں صحیح ہیں، لیکن یہ بہر حال باقی رہا کہ پھر آپ نے بددعا کیوں فرمائی؟ اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ نے ضمیر کی تخصیص کے قرینہ سے اس حکم کو احد والوں کے ساتھ خاص سمجھا ہو، خاص طور سے ﴿يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ سے ان کے ایمان کے احتمال کا اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ رعل اور ذکوان میں بظاہر یہ مواقع نہیں تھے، اس لئے یہ بددعا فرمادی ہو اور وہی آیت دوبارہ وحی کے ذریعہ یاد دلائی گئی ہو تاکہ آیت کے حکم کا عام ہونا آپ کو معلوم ہو جائے، علت کے اشتراک کی وجہ سے یعنی ایمان کا احتمال اگرچہ دلیل سے پیدا ہونے والا نہ ہو۔ اور جاننا چاہئے کہ آپ کا بددعا فرمانا یا اس کا قصد وارادہ کرنا اجتہاد سے تھا، وحی سے نہ حکم ثابت تھا نہ اس کی ممانعت۔ اب آپ کی عصمت سے متعلق کوئی اشکال لازم نہیں آتا۔

احد کے قصہ کی طرف رجوع:

(اے محمد! ﷺ) آپ کو (کسی کے مسلمان ہونے یا کافر رہنے سے متعلق خود) کوئی دخل نہیں (خواہ علم کا دخل ہو یا قدرت کا، بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم اور قبضہ میں ہے۔ اس لئے آپ کو صبر کرنا چاہئے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان پر یا تو (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائیں (یعنی انہیں اسلام کی توفیق دیدیں تو اس صورت میں صبر کا بدلہ فرحت وسرور کی شکل میں مل جائے گا) اور یا ان کو (دنیا ہی میں) کوئی سزا دیدیں (تو اس وقت صبر کا بدلہ دل کی تسلی کی شکل میں مل جائے گا اور انہیں سزا دینا کچھ بیجا بھی نہ ہوگا) کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں (ظلم سے مراد کفر اور شرک ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے (لقمان ۱۳) آگے اس مضمون کی تاکید ہے) اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں بخش دیں (یعنی اسلام نصیب کر دیں جس سے مغفرت ہوتی ہے) اور جس کو چاہیں عذاب دیں (یعنی اسلام نصیب نہ ہو اور اس وجہ سے عذاب ہمیشہ کا مقدر ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے (اور) بڑے رحمت کرنے والے ہیں (تو بخشنے پر تو ذرا بھی تعجب نہیں، کیونکہ رحمت تو ان کی مقدم ہے ہی، اس لئے عذاب دینے کی وجہ اوپر بیان فرمائی ﴿فَإِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ کہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں جس پر عذاب کے مستحق بن رہے ہیں)

تفسیر: صبر کی حد اور انتہا دو چیزوں کو فرمایا، ان کا مسلمان ہو جانا یا کسی ہلاکت و وبال میں مبتلا ہو جانا کیونکہ دونوں حالتوں میں صبر ختم ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر ناگوار حالت پر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں طبیعت کے مطابق ہیں، اور دخل کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے علم دیئے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے مسلمان ہونے کا احتمال رہا، پھر بددعا کب مناسب ہے؟ چنانچہ بعض مسلمان ہوئے، اور مشیتِ الٰہی کے بغیر تدبیر میں اثر نہیں ہوتا، اس لئے اس کی فکر بھی نہیں کرنی چاہئے، اور اصلاح کی اس فکر ہی سے غصہ اور غم پیدا ہو جاتا تھا (پس وہ بھی پیدا نہیں ہوگا)

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! سود مت کھاؤ کئی حصے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور خوشی سے کہنا مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا، امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے۔

ربط: آیت ﴿ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ غزوۂ احد میں تقویٰ میں خلل کے سبب مدد نہیں ہوئی، ایک خلل واقعہ سے پہلے اور دوسرا عین واقعہ میں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعض اوقات پچھلی خطائیں بعد میں دوسری خطاؤں کے صادر ہونے اور بعض طاعتوں میں خلل واقع ہو جانے کا سبب بن جاتی ہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں بھی آیت ﴿ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ ﴾ کے تحت اس کی تصریح ہے اور یہ تجربہ بھی ہے، اس لئے آگے تقویٰ کی تاکید اور اس کی بعض اہم ترین فروع کی تصریح اور بعض بڑے معاصی سود وغیرہ سے اجتناب کا حکم فرماتے ہیں تاکہ حدودِ شرعیہ کے پابند رہیں تو آئندہ پھر کسی موقع پر کوئی مضرت پیش نہ آئے۔

تقویٰ کے بعض شعبوں کا حکم اور بعض معاصی کی ممانعت:

اے ایمان والو! کئی گنا زیادہ (کرکے) سود مت کھاؤ (یعنی بالکل ہی مت لو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ امید ہے کہ تم کامیاب ہو (یعنی جنت نصیب ہو اور دوزخ سے نجات ہو) اور اس آگ سے بچو جو (اصل میں) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (یعنی سود کھانے جیسے گناہ مت کرو، جو دوزخ میں لے جانے والے ہیں) اور خوشی سے کہنا مانو اللہ کا (اور اس کے) رسول (ﷺ) کا، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا (یعنی قیامت میں)

تفسیر: یہ جو فرمایا کہ "اصل سے کئی گنا زیادہ کرکے" تو یہ سود کے حرام ہونے کی قید نہیں ہے کیونکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے، بلکہ اس زمانہ کا دستور اسی طرح تھا۔ چنانچہ شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے جو لباب النقول میں فریابی کی تخریج سے مجاہد سے مروی ہے کہ لوگ آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ ایک معین میعاد پر رقم دینے کے وعدے سے کیا کرتے تھے، جب وہ میعاد معین آجاتی تو اور رقم ادا نہ ہوتی رقم بڑھا کر اور مہلت دیدیا کرتے تھے۔ اور مذکورہ بالا سند سے عطا سے

مروی ہے کہ دور جاہلیت میں قبیلہ بنوثقیف کے لوگ بنونضیر سے لین دین کا معاملہ کیا کرتے تھے، جب مقررہ میعاد آ جاتی تو کہتے کہ ہم تمہیں رقم بڑھا کر دیدیں گے تم اور مہلت دیدو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ غرض اسی طرح بار بار کرتے تھے، چنانچہ روح المعانی میں یہ لفظ بھی ہے: وھکذا عند کل اجلٍ: یعنی ہر مقررہ میعاد پر اس طرح کرتے تھے، اس لئے اس آیت میں اس کا بیان کر دیا۔ اور دوسری آیت میں بغیر کسی قید کے مطلقاً حرام فرما دیا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ﴿ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ گذر چکی ہے۔ اس طرح دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ یہ صورت بھی حرام ہے اور دوسری صورتیں جو اس کے علاوہ ہوں وہ بھی حرام ہیں، خوب سمجھ لو۔

آج کل بعض ہوس پرست اس قید کے ذریعہ جو کہ واقعی ہے، احترازی نہیں، عام مسلمانوں کو دھوکہ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور آیت کے ترجمہ کے ذیل میں لفظ ''اصل میں'' اس لئے کہا کہ گناہوں کی وجہ سے بعض مسلمان بھی آگ میں جائیں گے، لیکن وہ ان کا اصل یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سزا کے بعد آخر میں ایمان کی برکت سے نکل آئیں گے۔

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور دوڑو طرف مغفرت کے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہو اور طرف جنت کے جس کی وسعت ایسی ہے جیسے آسمان اور زمین۔ وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ایسے لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں۔ ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں کہ ان کے نیچے سے نہریں چلتی ہونگی ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہونگے۔ اور اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا۔

ربط: اب بھی پچھلے مضمون کا تتمہ ہے، جس میں تقوی کے شعبوں کے حصوں کی، تقوی کے ثمرہ کے وعدہ سمیت ترغیب

ہے جو کہ مغفرت اور جنت ہے۔ اس طرح اوپر دوزخ سے بچنے کے لئے فرمایا تھا، یہاں جنت لینے کے لئے فرمارہے ہیں۔

تقویٰ کے شعبوں کا حکم اور اس کی جزاء کا وعدہ:

اور مغفرت کی طرف دوڑو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے (نصیب) ہو۔ اور جنت کی طرف دوڑو۔ مطلب یہ کہ ایسے نیک کام کرو جن سے پروردگار تمہاری مغفرت کردیں۔ اور تمہیں جنت عنایت ہو (اور وہ جنت ایسی ہے) جس کی وسعت ایسی (تو) ہے (ہی) جیسے سارے آسمان اور زمین (اور زیادہ کی نفی نہیں۔ چنانچہ واقعی طور پر اس کا بہت زیادہ ہونا ثابت ہے۔ اور) وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کے لئے جن میں ایک تو اعلیٰ درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) جو کہ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں (ہر حال میں) فراغت میں (بھی) اور تنگی میں (بھی) اور غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگذر کرنے والے۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کو (یعنی جن میں یہ صفات اکمل طور پر ہوں) محبوب رکھتا ہے اور (ایک ان مذکورہ لوگوں کے اعتبار سے دوسرے درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) کہ جب کوئی ایسا کام کرگذرتے ہیں جس میں (دوسروں پر) زیادتی ہو یا (کوئی گناہ کرکے خاص) اپنا نقصان کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ (کی عظمت اور عذاب) کو یاد کرلیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں (یعنی اس طریقہ سے جو معافی کے لئے مقرر ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے میں ان اہل حقوق سے بھی معاف کرائے اور خاص اپنی ذات سے متعلق گناہ میں اس کی ضرورت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرانا دونوں میں مشترک ہے) اور (واقعی) اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہو (رہا اہل حقوق کا معاف کرنا تو وہ لوگ اس کا اختیار تو نہیں رکھتے کہ عذاب سے بچالیں۔ اور حقیقی بخشش اسی کا نام ہے) اور وہ لوگ اپنے فعل (بد) پر اصرار (اور ضد وھٹ دھرمی) نہیں کرتے اور وہ (ان باتوں کو) جانتے (بھی) ہیں (کہ ہم نے فلاں کام گناہ کا کیا اور یہ کہ توبہ ضروری ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ غفار یعنی بہت زیادہ بخشش ومغفرت کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کی بھی اصلاح کرلیتے ہیں اور عقائد بھی درست رکھتے ہیں) اور ان لوگوں کی جزا ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے۔ اور (جنت کے) ایسے باغ ہیں کہ ان کے (درختوں اور مکانوں کے) نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (اور اسی مغفرت اور جنت کے حاصل کرنے کا شروع آیتوں میں حکم تھا، بیچ میں اس کا طریقہ بتایا اور ختم پر اس کا وعدہ فرمایا) اور (یہ) ان کام کرنے والوں کی خدمت کا اچھا بدلہ ہے (وہ کام استغفار اور صحیح عقیدہ ہے اور استغفار کو مکمل کرنے والی آئندہ طاعتوں کی پابندی ہے، جس پر اصرار کا نہ ہونا دلالت کرتا ہے)

فائدہ: ان آیتوں میں دو درجوں کے مسلمان کا بیان ہے: ایک اعلیٰ درجہ کے، دوسرے ان سے کم۔ اور اللہ سے ڈرنے والوں میں سب آگئے، کیونکہ توبہ بھی اللہ کے ڈر سے ہی ہوتی ہے اور ﴿ یُحِبُّ ﴾ کے ترجمہ میں ''مکمل طور پر'' کی قید اس

لئے لگائی کہ خود محبوبیت تمام اہل اسلام میں مشترک ہے۔البتہ اعلی درجہ کے لوگوں کے لئے اکمل درجہ کی محبوبیت خاص ہے، باقی ضروری قیدیں اور فائدے خود ترجمہ کی تقریر سے واضح ہیں۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝﴾

ترجمہ: بالتحقیق تم سے قبل مختلف طرق گزر چکے ہیں تو تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھ لو کہ اخیر انجام تکذیب کرنے والوں کا کیسا ہوا۔ یہ بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے اور ہدیت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔ اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے۔

ربط: اب پھر غزوۂ احد کے قصہ کی طرف مسلمانوں کو تسلی دینے کے طور پر رجوع ہے کہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ چلا آیا ہے کہ انجام کار کفار ہی ناکام اور نقصان اٹھانے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگرچہ تم اس وقت اپنی بدعنوانی سے مغلوب ہو گئے، لیکن اگر اپنے ایمان کے تقاضوں یعنی صبر اور تقوی پر قائم رہے تو آخر کار کفار مغلوب ہوں گے۔

احد کے قصہ کی طرف واپسی اور مسلمانوں کو تسلی:

یقینی طور پر تم سے پہلے (زمانوں میں) مختلف طریقوں (کے لوگ) گذر چکے ہیں (ان میں مسلمان بھی تھے، کفار بھی تھے اور ان میں اختلاف اور مقابلہ اور قتل وقتال بھی ہوا، لیکن انجام کار کفار ہی ہلاک ہوئے، چنانچہ اگر تم آثار کا مشاہدہ کرنا چاہو) تو روئے زمین پر چلو پھرو۔ اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا آخری انجام کیسا ہوا؟ (یعنی وہ ہلاک اور برباد ہوئے، چنانچہ ان کی تباہی اور ہلاکت کے آثار اس وقت تک بھی باقی تھے، جن کے بارے میں دوسری آیتوں میں فرمایا: ﴿فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً﴾ الخ ﴿فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ﴾ الخ ﴿وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ﴾ الخ یہ (مذکورہ مضمون کا) بیان تمام لوگوں کے لئے کافی ہے (کہ اگر اس میں غور کریں تو عبرت حاصل کر سکتے ہیں) اور ہدایت اور نصیحت خاص اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہے (یعنی لوگ ہدایت اور نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں۔ ہدایت یہ کہ حق اور باطل کو سمجھیں اور نصیحت یہ کہ اس کے مطابق عمل کریں) اور تم (اگر اس وقت مغلوب ہو گئے، تو کیا ہوا؟) ہمت مت ہارو اور نہ رنج کرو اور (آخر کار) تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم پورے مؤمن رہے (یعنی اس کے تقاضے ثابت قدمی اور پابندی کے ساتھ پورے کرتے رہے)

ملحوظہ: مضمون کی باقی تقریر آیت کے ربط میں میں لکھی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔

﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ۝﴾

ترجمہ: اگر تم کو زخم پہنچ جاوے تو اس قوم کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور ہم ان ایام کو ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں اور تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں اور تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے۔ اور تا کہ میل کچیل سے صاف کردے ایمان والوں کو اور مٹا دیوے کافروں کو۔

ربط: اس آیت میں بھی دوسرے طریقہ سے تسلی ہے جو ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گی۔

مسلمانوں کی تسلی کی دوسری تقریر:

اگر تمہیں کوئی چوٹ (صدمہ) پہونچ جائے (جیسا کہ احد میں ہوا) تو (کوئی گھبرانے کی بات نہیں، کیونکہ اس میں چند حکمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ) اس قوم کو بھی (جو کہ تمہارے مقابلہ میں تھی، یعنی کفار) ایسی ہی چوٹ (وصدمہ) پہونچ چکی ہے (چنانچہ گذشتہ سال بدر میں وہ صدمہ اٹھا چکے ہیں، اور ہمارا معمول ہے کہ) ہم ان دنوں کو (یعنی غالب اور مغلوب ہونے کے زمانہ کو) ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب اور دوسروں کو مغلوب کر دیا کبھی اس کے برعکس کر دیا، اس طرح اس معمول کے مطابق گذشتہ سال وہ مغلوب ہوئے تھے، اب کی بار تم مغلوب ہو گئے، ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (دوسری حکمت یہ ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر ہی) جان لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور منافق کا امتحان ہو جاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ ہے کہ) تم میں سے بعض کو شہید بنانا تھا (باقی حکمتیں آگے آتی ہیں، درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ظلم (یعنی کفر وشرک) کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (اس لئے اس کا احتمال نہ کیا جائے کہ شاید ان کو محبوب ہونے کی وجہ سے غالب فرمادیا ہو، ہرگز نہیں) اور (چوتھی حکمت یہ ہے) تا کہ ایمان والوں کو (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کردے (کیونکہ مصیبت سے اخلاق واعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (پانچویں حکمت یہ ہے کہ) کافروں کو مٹادے (یہ دو طریقوں سے ہے کہ غالب آجانے سے جرأت بڑھے گی پھر مقابلہ میں آئیں گے اور ہلاک ہوں گے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے اللہ تعالیٰ کے قہر میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے)

فائدہ: اس اخیری وجہ کا مضمون اس شعر میں خوب ادا کیا گیا ہے:

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را ❁ چندان امان نداد کہ شب را سحر کند

تم نے دیکھا کہ پروانہ کے ناحق خون نے شمع کو اتنی مہلت وامان نہیں دی کہ رات کی صبح ہو جائے

اور پہلی حکمت جو تداول یعنی دنوں کے ادلنے بدلنے کو فرمایا، خود اس تداول یعنی دنوں کے ادلنے بدلنے میں بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں، جن میں سے ایک بڑی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس عالم میں مکلف کی آزمائش باقی رہے۔ اور اگر ہمیشہ مسلمان ہی غالب رہتے تو ایمان لانا کچھ بھی کمال اور بصیرت پر مبنی نہ ہوتا۔ اور اس کے برعکس صورت میں بھی ضعیف لوگ شدید فتنہ میں پڑ جاتے جیسا کہ ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ ﴾ الی قولہ ﴿ وَزُخْرُفًا ﴾ (سورۃ الزخرف ۳۳ تا ۳۵) اور لیعلم کے ترجمہ میں جو "ظاہری طور پر" کی قید لگائی اس کی توضیح سورۂ بقرۃ آیت ۱۴۲ کے فائدہ میں گذر چکی ہے۔

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

ترجمہ: ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہ ان کو دیکھا جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں گذشتہ مصائب کے سلسلہ میں تسلی تھی۔ اب مؤمنوں کے دلوں کو آنے والی مشقتوں کے بارے میں تقویت عطا فرماتے ہیں۔

مشقتوں وسختیوں پر دلوں کو تقویت:

ہاں! (اور سنو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں (خصوصیت کے ساتھ یوں ہی) جا (کر) داخل ہو (جاؤ) گے۔ حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو (ظاہری طور پر) دیکھا ہی نہیں، جنھوں نے تم میں سے (خوب) جہاد کیا ہو، اور نہ ان کو دیکھا جو (جہاد میں) ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

فائدہ: "ظاہری طور پر" کی قید کے بیان کا موقع تو ابھی اوپر والی آیت کے فائدہ میں بیان ہو چکا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شروع ہی سے چلا جائے اور درجات عالیہ پر بھی پہونچ جائے تو ایسا بغیر مشقت برداشت کئے نہیں ہوتا، جیسا کہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ رہا نفس داخلہ تو یہ بعض مؤمنوں کے لئے محض اللہ کے فضل وکرم سے بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ سے اہل حق نے سمجھا ہے۔ اور 'جہاد میں خوب' کی قید اس لئے لگائی کہ تھوڑا بہت تو جہاد ہوا ہی تھا، اور ناقص ہی سہی ثابت قدمی بھی رہی، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تم سے زیادہ جہاد اور صبر وثابت قدمی واقع نہیں ہوئی۔ اور خصوصیت کے ساتھ جنت میں جانا اس پر موقوف ہے، چنانچہ آئندہ اس کے لئے کوشش کرنا ضروری ہے۔

﴿ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ ع

ترجمہ: اور تم تو مرنے کی تمنا کر رہے تھے، موت کے سامنے آنے سے پہلے سے، سو اس کو تو کھلی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔

ربط: اوپر نصیحت تھی، اب شکست پر ایک طرح کی ملامت ہے۔

شکست پر ملامت:

اور تم تو موت کے سامنے آنے سے پہلے سے (شہید ہو کر) مرنے کی (بڑی) تمنا کر رہے تھے تو (تمنا کے بعد) اس (کے سامان) کو تم نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا (پھر اس کو دیکھ کر کیوں بھاگنے لگے اور وہ تمنا کہاں بھول گئے)

شانِ نزول: اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جو صحابہ گذشتہ سال غزوۂ بدر میں شہید ہوئے اور ان کے بڑے فضائل معلوم ہوئے تو بعض صحابہ نے تمنا کی کہ کاش ہمیں بھی کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ شہادت کی اس دولت وسعادت کا شرف ہمیں بھی ملے اور جب یہ احد کا غزوہ واقع ہوا تو پاؤں اکھڑ گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (لباب النقول ابن عباس کی روایت اور ابن ابی حاتم کی سند سے)

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور محمد نِرے رسول ہی تو ہیں، آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گذر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ شہید ہی ہو جاویں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔ اور خدا تعالیٰ جلدی ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو۔ اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدوں حکم خدا کے اس طور سے کہ اس کی میعاد لکھی ہوئی رہتی ہے۔ اور جو شخص دنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا حصہ دیں گے۔ اور ہم بہت جلد عوض دیں گے حق شناسوں کو۔

ربط: جب اس غزوۂ احد میں جناب رسول اللہ ﷺ کا دندانِ مبارک شہید ہوا اور سر مبارک زخمی ہوا۔ اس وقت کسی دشمن نے شور مچا دیا کہ محمد (ﷺ) قتل کر دیئے گئے، مسلمان جنگ کا نقشہ بگڑ جانے سے پہلے ہی بدحواس اور منتشر ہو رہے تھے، اس بات سے اور بھی ہمت ٹوٹ گئی، کسی نے تو یہ طے کر لیا کہ اب کفار سے امن وامان کی بات کر لینی چاہئے، بعض ہمت ہار کر بیٹھ رہے، اور ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے، اور بعض میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعض منافقوں نے کہہ دیا کہ اگر محمد ﷺ نہیں رہے تو اپنا پہلا ہی دین کیوں نہ اختیار کر لیا جائے، بعض نے کہا کہ اگر نبی ہوتے تو قتل کیوں ہوتے، اور بعض نے کہا کہ اگر آپ ہی نہیں رہے تو ہم ہی زندہ رہ کر دنیا میں کیا کریں گے، جس پر آپ نے جان دی، اس

پر ہمیں بھی جان دیدینی چاہئے، اور اگر آپ قتل ہوگئے تو کیا ہوا اللہ تعالیٰ تو قتل نہیں ہوئے، اس پریشان حالی میں سب سے پہلے آپ کو حضرت کعب بن مالک نے دیکھ کر پہچانا، انھوں نے فوراً ہی پکار کر کہا کہ اے مسلمانو! محمد ﷺ یہاں زندہ سلامت موجود ہیں۔ غرض اس وقت مسلمان پھر جمع ہوئے تو آپ نے انہیں ملامت فرمائی، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ خبر سن کر ہمارے اوپر وحشت اور ہول دلی طاری ہوگئی، اس لئے ہمارے پاؤں اکھڑ گئے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (روح المعانی ولباب النقول عن ابن ابی حاتم وغیرہ)

شکست پر ملامت کا تتمہ:

اور محمد (ﷺ) صرف رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں جسے موت نہیں آسکتی، یا جو قتل نہیں کیا جاسکتا) آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں (اسی طرح آخر ایک روز آپ بھی گذر ہی جائیں گے) تو اگر آپ کا انتقال ہوجائے یا آپ شہید ہی ہوجائیں تو کیا تم لوگ (جہاد سے یا اسلام سے) الٹے پھر جاؤ گے؟ (چنانچہ اس واقعہ میں بعض مسلمان میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور منافق لوگ مرتد ہونے کی ترغیب دینے لگے تھے) اور جو شخص (جہاد سے یا اسلام سے) الٹا پھر بھی جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کرے گا (بلکہ اپنا ہی کچھ کھوئے گا) اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حق شناس لوگوں کو بدلہ دے گا (جو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد رکھ کر اس کی اطاعت پر قائم اور ثابت قدم رہتے ہیں، اور قیامت کا ملنا جلد ہی ہوگا، کیونکہ وہ روزانہ قریب ہی آرہی ہے) اور (کسی کے مرنے پر اتنا گھبرانا بھی فضول ہے، کیونکہ اول تو) کسی شخص کو اللہ کے حکم کے بغیر موت آنا ممکن نہیں (چاہے طبعی موت ہو یا قتل سے، پھر جب اللہ ہی کے حکم سے ہے تو اس پر راضی رہنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ جس کی موت آتی بھی ہے تو) اس طرح کہ اس کی مقررہ میعاد لکھی ہوئی رہتی ہے (جو آگے پیچھے نہیں ہوسکتی، تو پھر ارمان اور حسرت سب بے کار ہے، وہ تو اپنے وقت پر ضرور آئے گی، اور وقت سے پہلے ہرگز نہیں آئے گی) اور (پھر یہ کہ اس وحشت کی حالت میں بھاگنے کا آخر فائدہ کیا؟ سوائے اس کے کہ یہ ایک ناکافی تدبیر ہے، دنیا میں چند دن جی لینے کی، تو اس کا اثر سن لو کہ) جو شخص (اپنے اعمال اور تدبیروں میں) دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ (اپنی مشیت کے مطابق) دیتے ہیں (اور آخرت میں اس کے لئے کچھ حصہ نہیں) اور جو شخص (اپنے اعمال وتدبیروں میں) آخرت کا نتیجہ چاہتا ہے (مثلاً جہاد میں اس لئے ثابت قدم رہا کہ یہ آخرت کے ثواب کی تدبیر ہے) تو ہم اس کو آخرت کا حصہ (وعدہ اور ذمہ کرکے) دیں گے اور ہم بہت جلد حق شناس لوگوں کو (جو اپنے اعمال میں آخرت کی نعمت چاہیں جو کہ اللہ کی رضا اور اس سے ملاقات ہے نیک) بدلہ دیں گے۔

فائدہ: پہلی جگہ (آیت ۱۴۳ میں) نیک اعمال پر قائم رہنے کو شکر کہا تھا۔ یہاں ان اعمال میں آخرت کی نیت کرنے کو شکر کہا۔ اس لئے کلام میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

فائدہ: ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتقال پر استدلال کرنا بالکل باطل ہے، کیونکہ آسمان پر زندہ اٹھایا جانا بھی دنیا سے گذر جانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگر اس طرح بھی اٹھ جاتے تب بھی صحابہ کو موت ہی جیسا صدمہ ہوتا، اس لئے تسلی میں اس کو پورا دخل ہے۔

﴿ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾ ع

ترجمہ: اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت اللہ والے لڑے ہیں سو نہ ہمت ہاری انھوں نے ان مصائب کی وجہ سے جوان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے، اور ان کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دیجئے اور ہم کو ثابت قدم رکھئے اور ہم کو کافروں پر غالب کیجئے۔ سو ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی بدلا دیا اور آخرت کا بھی عمدہ بدلا۔ اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نکوکاروں سے محبت ہے۔

ربط: اس میں بھی سابق مخلص امتوں کا حال یاد دلا کر ملامت کا تتمہ ہے کہ دیکھو وہ کیسے ثابت قدم رہے، تمہیں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔

سابق مخلص امتوں کی ثابت قدمی کا تذکرہ:

اور بہت سارے نبی گذر چکے ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت بہت سارے اللہ والے (کفار سے) لڑے ہیں، تو نہ تو انھوں نے ان مصائب کی وجہ سے جوان پر اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) واقع ہوئے (کام سے) ہمت ہاری اور نہ ان (کے دل یا بدن) کا زور گھٹا اور نہ (وہ دشمن کے سامنے) دباؤ میں آئے (کہ ان سے عاجزی اور خوشامد کی باتیں کرنے لگے ہوں) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاج لوگوں سے محبت ہے (جو دین کے کام میں ایسے ثابت قدم رہیں، اور افعال میں تو ان کی لغزش کیا ہوتی) ان کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا، کہ انھوں نے (جناب باری میں) عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں اور ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دیجئے۔ اور ہمیں (کفار کے مقابلہ میں) ثابت قدم رکھئے، اور ہمیں کافر لوگوں پر غالب کیجئے، تو (اس استقلال اور دعا کی برکت سے) ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی بدلہ دیا (یعنی فتح و ظفر) اور آخرت کا بھی عمدہ بدلا (دیا یعنی ثواب اور جنت) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیک کام کرنے والوں سے محبت ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اس بات کی تعلیم ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے تو ظاہری تدبیر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، کہ اکثر مصیبت کا سبب گناہ ہوتا ہے۔

غم چوں بینی زود استغفار کن ❁ غم بامر خالق آمد کارکن

(جب کوئی رنج وغم کا معاملہ دیکھو تو جلدی سے استغفار کرو، کیونکہ غم اللہ کے حکم سے کام کرتا ہے)

اور اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ احد میں جو مصیبت آئی تھی وہ نافرمانی وحکم عدولی کی وجہ سے آئی تھی، اور اگر کسی کو یہ اشکال ہو کہ وہ لوگ تو اللہ والے تھے پھر ان کے گناہ کیا ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ گناہ تو انسان سے ہو ہی جاتا ہے اور ایسی اتفاقی باتوں سے اللہ والا ہونے میں خلل نہیں پڑتا۔ خاص طور سے اس وجہ سے کہ وہ فوراً معذرت کر لیتے ہیں۔ اور فتح وظفر کو ثابت قدمی اور دعا کا اثر ونتیجہ قرار دینا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امور اصل میں اس کے اسباب ہیں، اور کسی خاص سبب سے اس کے خلاف ہو جانا اس کے سبب ہونے کے منافی نہیں، خوب سمجھ لو۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو الٹا پھیر دیں گے پھر تم ناکام ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔

ربط: چونکہ (احد میں) جنگ کا نقشہ بگڑنے پر بعض منافق لوگ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ جب آپ ہی نہ رہے تو اپنا پہلا ہی دین کیوں نہ اختیار کر لیا جائے، اور اس سے ان منافقوں کی خباثت اور ان کا بدخواہ ہونا ظاہر ہے، اس لئے اب اس آیت میں مسلمانوں کو کسی بھی معاملہ میں ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے ڈرایا گیا ہے، جیسا کہ اوپر مخلص لوگوں کی اتباع کی ترغیب تھی۔

مؤمنوں کو منافقوں اور کفار کا مشورہ قبول کرنے سے ڈرانا:

اے ایمان والو! اگر تم کافروں کا کہنا مانو گے تو وہ تمہیں (کفر کی طرف) الٹا پھیر دیں گے (یعنی ان کا اصل مقصد یہی ہے، اس لئے وہ کبھی کھل کر اس کی طرف بلاتے ہیں اور کبھی ظاہر میں کوئی خیر خواہی کی بات سمجھاتے ہیں، لیکن اس سے بھی ایسا داؤ کھیلتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس کی تمہید ہو جائے) پھر تم (ہر طرح) ناکام ہو جاؤ گے (غرض یہ کہ وہ کسی بھی طرح تمہارے دوست، ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے (اس لئے اس کی دوستی پر اکتفا کرو اور اسی کو مددگار سمجھو، دوسرا مخالف اگر نصرت اور امداد کی بھی تدبیر بتائے تو بھی اللہ کے حکم کے خلاف عمل نہ کرو)

﴿ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾

ترجمہ: ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہول کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ایسی چیز کو ٹھیرالیا ہے جس پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی اور ان کی جگہ جہنم ہے۔ اور وہ بری جگہ ہے بے انصافوں کی۔

ربط: اوپر اللہ تعالیٰ کے مولیٰ اور ناصر و مددگار ہونے کا ذکر تھا۔ اب ایک واقعہ کے ذریعہ اس کو ثابت کیا ہے۔

اللہ کی نصرت کا ثبوت:

ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب اور دہشت ڈالے دیتے ہیں، کیونکہ انھوں نے ایسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیا ہے جس کے (شریک ہونے کے قابل ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، نہ الفاظ کی شکل میں نہ معنی کے لحاظ سے) اور ان (کافروں) کی جگہ جہنم ہے اور وہ (ایسے) ناانصافی کرنے والوں کے لئے بری جگہ ہے (جو اللہ کے معبود ہونے کا حق کسی دوسرے کے لئے قرار دیں)

تفسیر: چنانچہ اس رعب ڈالنے کا ظہور اس طرح ہوا کہ اول تو مسلمانوں کے شکست کھانے کے باوجود مشرک کسی ظاہری سبب کے بغیر مکہ کو لوٹ گئے (بیضاوی) پھر جب کچھ راستہ طے کر چکے تو اپنے اس طرح لوٹ جانے پر بہت افسوس کیا کہ جب مسلمانوں میں بالکل دم نہیں رہا تھا، اس وقت اس طرح بھاگ کر چلے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر مدینہ کے لئے واپسی کا ارادہ کیا مگر کچھ ایسا رعب چھایا کہ پھر واپس نہ آسکے، اور راستہ میں کوئی اعرابی مل گیا تو اس سے کہا کہ ہم تجھے اتنا مال دیں گے تو مسلمانوں کو ڈرا دینا، لیکن یہاں وحی کے ذریعہ حقیقت معلوم ہوگئی تو آپ ان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہونچے۔ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی بہ روایت ابن جریر عن السدی) اور (شرک کی) دلیل کا لفظی ہونا تو ظاہر ہے اور معنی کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے اس دلیل کے صحیح ہونے کا اعتبار کیا ہو، اس میں دلیل عقلی قطعی داخل ہوگئی۔

﴿ وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾

ترجمہ: اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا تھا جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے

تھے یہاں تک کہ جب تم خود ہی کمزور ہو گئے اور باہم حکم میں اختلاف کرنے لگے، اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھلا دی تھی، تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے بھی نصرت کو بند کر لیا، پھر تم کو ان کفار سے ہٹا دیا تا کہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمایش فرماوے، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں پر۔

ربط: آگے اُس غزوہ میں مغلوب ہو جانے کی وجہ بیان فرماتے ہیں۔

احد میں مؤمنوں کے مغلوب ہو جانے کا سبب:

اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے (نصرت و امداد کے) وعدہ کو سچا کر دکھایا تھا، جس وقت کہ تم (قتال کے شروع میں) ان کفار کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے (اور تمہارا یہ غلبہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا) یہاں تک کہ جب تم خود ہی (اپنی رائے میں) کمزور ہو گئے اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بات تجویز فرمائی تھی کہ مورچہ پر پچاس آدمی اور ایک افسر برابر بیٹھے رہیں، لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اس کے خلاف رائے دی کہ اب ہمیں بھی کفار کا تعاقب کرنا چاہئے۔ جیسا کہ اوپر قصہ کے شروع میں گذر چکا ہے) اور آپس میں (رسول اللہ ﷺ کے) حکم میں اختلاف کرنے لگے (کہ بعض تو اسی پر قائم رہے اور بعض دوسری رائے تجویز کرنے لگے اور انکار و ملامت اس جزء پر ہے) اور تم (رسول اللہ ﷺ کے) کہنے پر نہ چلے، جبکہ تمہیں تمہاری من پسند بات دکھا دی تھی (یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھا دیا تھا اور تمہاری اس وقت یہ حالت تھی کہ بعض) تم میں سے وہ تھے جو دنیا (کا حصہ لینا) چاہتے تھے (یعنی کفار کا تعاقب کر کے مالِ غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو صرف) آخرت کے طلب گار تھے (اور چونکہ بعض سے رائے کی کمزوری اور رسول کے حکم کے خلاف دوسری تجویز ہوئی، اور آپ کے کہنے پر نہ چلنا اور دنیا کی طلب جیسے امور صادر ہوئے) اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت روک لی اور پھر تمہیں ان کفار پر غالب آنے سے ہٹا دیا (اور باوجودیکہ یہ مغلوبیت تمہارے فعل کا نتیجہ تھی، مگر پھر بھی یہ سب سزا کے طور پر نہیں ہوا بلکہ اس مصلحت سے) تا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری (ایمان کی) آزمائش فرمائے (چنانچہ اس وقت منافقوں کا نفاق کھل گیا، اور مخلصوں کی قدر بڑھ گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا (اب آخرت میں پکڑ نہ ہوگی) اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حال پر بڑے فضل فرمانے والے ہیں۔

تفسیر: اس آیت سے صحابہ کے حال پر اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت معلوم ہوئی کہ عتاب میں بھی طرح طرح کی تسلیاں فرمائیں، ایک یہ کہ یہ سزا نہ تھی، بلکہ اس میں بھی تمہاری مصلحت تھی، پھر آخرت کی فکر و مؤاخذہ سے بے فکر کر دیا، چونکہ ظاہر ہے کہ ایسے حضرات جو ایسی عنایت کے مستحق ہوں وہ دنیا طلب کرنے والے نہیں ہو سکتے، اس لئے ﴿ یُرِیْدُ

الدُّنیَا ﴾ میں دنیا کا بالذات ہونا مراد نہیں ہوسکتا اوراس پر عقل قرینہ بھی ہے کہ اگر یہ حضرات غنائم کو جمع نہ بھی کرتے تب بھی شریعت کے قانون کی رو سے یقیناً غنیمت کے مستحق اوراس میں شریک تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اس سے بھی آخرت ہی مقصود تھی کہ مورچہ کی حفاظت کا ثواب حاصل کرکے اب کفار کو خوفزدہ کرنے اور انہیں تباہ کرنے کا ثواب بھی لیں، اس لئے بعض قطب حضرات نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ فرمایا: یرید الدنیا للآخرة ومنکم من یرید الآخرة الصرفة: کہ دنیا آخرت کے لئے چاہتے ہیں اور بعض تم میں سے صرف آخرت چاہتے ہیں، مگر چونکہ ثواب کا طریقہ ارشادِ نبوی کے خلاف تھا اس لئے محمود یعنی پسندیدہ نہ ہوا، اگرچہ خطا کے اجتہادی ہونے کی وجہ سے نص کی مخالفت کے مجرم نہیں کہے جائیں گے اور آزمانے کے معنی کی تحقیق سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴ میں دیکھ لی جائے۔

﴿ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۵۳ ﴾

ترجمہ: وہ وقت یاد کرو کہ جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی تو نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے، سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جاوے اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے، اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی۔

ربط: اب بھی اسی مغلوبیت کے قصہ کا بیان ہے۔

مغلوبیت کے قصہ کا تتمہ:

(وہ وقت یاد کرو کہ) جب تم (جنگل کو بھاگنے میں) چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول اللہ (ﷺ) تمہارے پیچھے کی جانب سے تمہیں پکار رہے تھے (کہ ادھر آؤ، ادھر آؤ، مگر تم نے سنا ہی نہیں) تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم دیا (تمہارے) غم دینے کے سبب سے (رسول اللہ ﷺ کو) تاکہ (اسی بدلہ اور مصیبت کی وجہ سے تمہارے اندر صبر واستقلال کے معاملہ میں پختگی پیدا ہو جائے، جس سے پھر) تم رنجیدہ نہ ہوا کرو، نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی خبر رکھتے ہیں (اس لئے جیسا کام کرتے ہو اس کے مناسب بدلہ تجویز فرماتے ہیں)

فائدہ: آیت ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ﴾ کی تمہید میں گذر چکا ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے پکارا تو مسلمان جمع ہو گئے اور یہاں رسول اللہ ﷺ کے پکارنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے اور اس سے مسلمانوں کا نہ سننا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا صاحب روح المعانی نے بہت اچھا جواب دیا ہے کہ پہلے رسول اللہ ﷺ نے پکارا، اس وقت صحابہ نے آپ

کی آواز کو نہ سنا اور دور نکلے چلے گئے، پھر حضرت کعب نے پکارا تب ان کی آواز سن کر سب جمع ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ گھبراہٹ کی اصل وجہ رسول اللہ ﷺ کے قتل ہو جانے کی خبر تھی، اس لئے آپ کے پکارنے میں اس خبر سے کوئی تعرض نہیں تھا، پھر اس افراتفری اور گھبراہٹ کی حالت میں صحابہ نے آپ کی آواز کو پہچانا ہی نہیں ہوگا۔ حضرت کعب کے پکارنے میں اس خبر کی تکذیب تھی کہ آپ کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ آپ یہاں موجود ہیں، جس سے صحابہ کو تسلی ہوگئی اور سب آپ کے پاس جمع ہو گئے۔

یہاں آپ کے پکارنے سے صحابہ کے نہ آنے پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اس لئے ہوسکتا ہے کہ اگر استقلال کے ساتھ آواز پر دھیان دیتے تو آواز کو پہچان سکتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اس صورتِ حال سے یقیناً غم ہوا ہوگا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو غم دیدیا، لیکن یہاں بھی ﴿ لِيَبْتَلِيَكُمْ ﴾ میں صحابہ کے حال پر عنایت ظاہر ہوئی ہے، اس عتاب سے مقصود اخلاق کی تربیت تھی تا کہ ایسے مصائب کے عادی ہونے سے صبر و استقلال اور ثابت قدمی پیدا ہو، اور خاص بندوں پر جو مصائب: دکھ تکلیف، رنج و غم اور حادثے آتے ہیں، ان میں یہی حکمتیں ہوتی ہیں۔ ع: ایں بلائے دوست تطہیر شماست (دوست کی طرف سے یہ بلا و آزمائش تمہیں پاک وصاف کرنے کا ذریعہ ہے)

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں ❁ تازہ باش و چیں میفگن برجبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو ❁ آں صلاحِ تست آیس دل مشو

(جب کوئی تنگی پیش آئے تو اس میں کشادگی تلاش کرو، تازہ ہمت ہو جاؤ اور پیشانی پر شکن نہ ڈالو۔ اے مسافر! جب کوئی تنگی پیش آتی ہے تو وہ تمہاری صلاح و فائدہ کے لئے ہوتی ہے، اس لئے مایوس مت ہو)

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۞ ﴾ ع

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین بھیجی یعنی اونگھ کہ تم میں سے ایک جماعت پر تو اس کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلاف واقع خیالات کر رہے تھے جو

کہ محض حماقت کا خیال تھا۔ وہ یوں کہہ رہے تھے: کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا ہے۔ وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا تو ہم مقتول نہ ہوتے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف نکل پڑتے جہاں وہ گرے ہیں اور یہ جو کچھ ہوا اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تا کہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔ یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی، جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دیدی ان کے بعض اعمال کے سبب سے، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے ہیں بڑے حلم والے ہیں۔

ربط: اوپر غم کا بیان تھا۔ اب اس کے ازالہ کا بیان ہے۔ ظاہری طور پر بھی نعاس یعنی اونگھ سے جسمانی راحت حاصل ہوئی اور باطنی طور پر بھی معافی کی بشارت سے روحانی راحت حاصل ہوئی۔ اور اس کے ضمن میں منافقوں کی بدحالی اور اس بدحالی کی وجہ سے راحتوں سے محروم ہونے کا بیان ہے۔

مؤمنوں کے لئے معافی اور عافیت:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد (جس کا اوپر ذکر ہوا) تم پر سکون (اور راحت) بھیجا یعنی اونگھ (جب کفار میدان سے واپس ہو گئے اس وقت غیب سے مسلمانوں پر اونگھ طاری ہوئی جس سے سب غم غلط) یعنی دور ہو گیا کہ تم میں سے ایک جماعت پر (یعنی مسلمانوں پر) تو اس کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی (یعنی منافق) کہ انہیں اپنی جانوں ہی کی فکر پڑ رہی تھی (کہ دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جاتے ہیں یا یہاں ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں) وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں خلاف واقعہ خیالات (تجویز) کر رہے تھے جو کہ محض احمقانہ خیالات تھے (وہ خیال آگے ان کے قول سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا حماقت کی وجہ سے پیدا ہونا اس قول کے جواب سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس قول کا بیان یہ ہے کہ) وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے (یعنی کچھ نہیں چلتا۔ اس اختیار سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ قتال سے پہلے جہاد سے جی چراتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی روکتے تھے) مطلب یہ ہے کہ ہماری بات کسی نے نہیں سنی، خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسے) آپ فرما دیجئے کہ اختیار تو اللہ ہی کا (چلتا) ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر عمل بھی ہوتا تب بھی قضائے الٰہی اللہ کا فیصلہ ہی غالب رہتا اور جو مصیبت، یعنی دکھ، تکلیف اور رنج و غم، آنے والی تھی، وہ ہر حال میں آکر رہتی۔ چنانچہ آگے ان کے قول کا اور اس کے جواب کا مطلب تفصیل کے ساتھ آتا ہے) وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جسے آپ کے سامنے (صراحت کے ساتھ) ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ ظاہر میں تو ان کے اس قول کا مطلب کہ کیا ہمارا کچھ

اختیار چلتا ہے؟ یہ ہوسکتا ہے کہ تقدیر الٰہی کے سامنے بندہ کی تدبیر نہیں چلتی، یہ تو عین ایمان اور پختہ عقیدہ کی بات ہے۔ اور جواب بھی ایسا لطیف ہے کہ اس میں اس معنی کی تصدیق ہے کہ واقعی اختیار اللہ ہی کا غالب ہے، مگر ان کا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ وہ اس معنی میں) کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا (یعنی ہماری رائے پر عمل ہوتا) تو ہم (میں سے جو لوگ قتل ہوئے وہ) یہاں قتل نہ ہوتے (چونکہ ان کے کہنے کا اصل مطلب یہی تھا، آگے ان کے اس قول اور مطلب کے جواب کی تفصیل ہے، جس سے ان کے قول کی تکذیب ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا، وہ لوگ ان مقامات کے لئے نکل پڑتے جہاں وہ (قتل ہو ہو کر) گرے (غرض جس قدر بہ ظاہر نقصان ہوا وہ تو ٹلنے والا نہیں تھا) اور (اس میں زبردست منافع تھے کیونکہ) یہ جو کچھ ہوا تو اس لئے ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن (یعنی ایمان) کی آزمائش کرے (کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقوں کا نفاق کھل گیا اور مؤمنوں کا ایمان اور زیادہ موکد اور محقق ہو گیا) اور تاکہ تمہارے دلوں (یعنی اسی ایمان) کو (شکوک وشبہات اور وسوسوں سے) صاف کر دے (کیونکہ مصیبت سے مؤمن، اللہ کے سوا دوسروں کی طرف توجہ سے پاک ہو جاتا ہے اور اس سے ایمان وعقیدہ کا تصفیہ ہونا ظاہر ہے) اور (یوں) اللہ تعالیٰ باطن کی تمام باتوں کو خوب جانتے ہیں، یقیناً تم میں سے جن لوگوں نے (جنگ کے میدان سے اس روز) پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور کفار کی) ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں (یعنی احد کے دن) اور اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوئی کہ ان کے بعض (گذشتہ) اعمال کے سبب سے انہیں شیطان نے لغزش دیدی (یعنی ان سے کچھ غلطیاں اور خطائیں ایسی ہو گئی تھیں جس سے شیطان کو ان سے اور بھی معصیت سرزد کرا لینے کی امید ہو گئی اور اتفاق سے اس کی وہ امید پوری بھی ہو گئی) اور یقین رکھو کہ (اب) اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے ہیں کہ آخر میں بخش دیا) بڑے حلم والے ہیں (کہ غلطی سرزد ہونے کے وقت بھی کوئی عقوبت یعنی سزا نہیں دی)

تین خلجان کے جواب:

اس موقع پر چند امور کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ ابتلا وآزمائش اور عفو کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور یہاں پھر ذکر کیا گیا، تو اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ اوپر تو مسلمانوں کو تسلی دینا مقصود تھا اور یہاں منافقوں کے اس خیال کو باطل قرار دیا گیا ہے کہ ہماری رائے پر عمل نہ کرنے سے کیسے نقصان اٹھائے؟ تو بتا دیا کہ اس نقصان میں بھی یہ منافع تھے، اس لئے اصلا وہ نقصان ہی نہیں تھے، اور جو حقیقی نقصان تھا یعنی گناہ تو وہ معاف ہو گیا۔ اس طرح غرض اور مقصد کے اختلاف کی وجہ سے تکرار نہیں رہی۔

دوسرے یہ کہ ﴿ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ ﴾ (تاکہ اللہ آزمائش کرے) کے فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت کی وجہ یہ امور

تھے اور ﴿ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ ﴾ (شیطان نے انہیں لغزش دیدی) سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ (ان کے بعض گذشتہ اعمال) وجہ تھی؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ تو میدان سے بھاگنے کا سبب ہے اور وہ امور مصائب کی حکمتیں ہیں۔ اس طرح سبب بدل گیا۔

اور اگر کہا جائے کہ فرار یعنی میدان سے بھاگنا مصائب کا سبب تھا اور سبب کا سبب یہاں اصل سبب ہے تو ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ مصائب کا بھی سبب ہوا، تو جواب یہ ہے کہ مصائب کا سبب ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ ہو۔ اور حکمت وہ امور ہوں۔ اس طرح کوئی تعارض ٹکراؤ نہیں ہے، کیونکہ سبب اپنے وجود کے اعتبار سے پہلے ہوتا ہے اور حکمت وجود کے لحاظ سے بعد میں ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ حلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ عقوبت یعنی سزا نہیں ہوئی، حالانکہ ﴿ اَصَابَكُمْ ﴾ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بدلہ ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ قہر وغضب والی عقوبت نہیں ہوئی، اصلاحی پاداش ہوئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مہمل اعتراض:

صحابہ کرام سے عناد رکھنے والے بعض لوگوں نے اس واقعہ سے صحابہ خاص طور سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کی ہے اور اس کو ان کے اندر خلافت کی صلاحیت کے نہ ہونے کا نتیجہ قرار دیا ہے، لیکن یہ محض مہمل بات ہے، جب اللہ تعالیٰ نے معافی کا اعلان کر دیا تو دوسرے کسی کو بھی لب کشائی کا حق نہیں رہا۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی ایک شخص کو یہی جواب دیا تھا (بخاری) جہاں تک خلافت کا سوال ہے تو اہل حق کے نزدیک خلافت کے لئے عصمت شرط نہیں ہے، اس سے یہ شبہ بھی ساقط ہے۔

فائدہ: اور ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گناہ سے دوسرا گناہ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق بڑھتی جاتی ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو کہ کافر ہیں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کی نسبت جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا وہ لوگ غازی بنتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، تا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب میں موجب حسرت کر دیں۔ اور مارتا جلاتا تو اللہ ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو

کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کرر ہے ہیں۔اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔

ربط:اوپر منافقوں کا قول نقل کیا تھا ﴿ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ﴾: اگر ہمارا اختیار چلتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔اس کا حاصل وہی تھا جس کو اس عبارت سے نقل کیا ہے ﴿ لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ﴾: ”اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے“ چونکہ ایسے اقوال کے سننے سے یہ احتمال تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اس قسم کے وسوسے پیدا ہونے لگیں، اس لئے حق تعالیٰ ان آیات میں مسلمانوں کو ایسے اقوال اور ایسے احوال سے ممانعت فرماتے ہیں۔

مؤمنوں کو منافقوں کے اقوال کی تقلید کی ممانعت:

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا (یعنی ان لوگوں کی سی بات مت کرنا) جو کہ (حقیقت میں) کافر ہیں (اگر چہ ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہوں یعنی منافق ہیں) اور اپنے (نسب یا مشرب والے) بھائیوں کے بارے میں جب وہ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں (اور وہاں اتفاق سے مر جاتے ہیں) یا وہ لوگ کہیں (اللہ کی راہ کے) غازی بنتے ہیں (اور اس میں قضا آجانے پر قتل ہو جاتے ہیں تو وہ منافق) کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے (اور سفر اور غزوہ میں نہ جاتے) تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (یہ بات ان کے دل میں اور ان کی زبانوں پر اس لئے آتی ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو (اس خیال کی بنیاد پر جس سے یہ بات ان کی زبان پر آئی) ان کے دلوں میں حسرت کا باعث کر دیں (یعنی اس کا نتیجہ حسرت کے سوا کچھ نہیں) اور اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے (خواہ سفر ہو یا گھر، خواہ لڑائی ہو یا امن) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں (تو اگر تم بھی ایسی باتیں کرو گے یا دل میں سمجھو گے تو (اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہ رہے گا) اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ (اللہ کی راہ میں) مر جاؤ تو (خوب نفع میں رہو گے، کیونکہ) لازمی طور پر اللہ تعالیٰ کے پاس والی مغفرت اور (دنیا کی) رحمت ان چیزوں سے (بدرجہا) بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کرر ہے ہیں (اور اسی کے لالچ میں زندگی کو محبوب رکھتے ہیں) اور اگر تم (ویسے بھی) مر گئے یا مارے گئے (تب بھی) لازمی طور پر اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (اس طرح اول تو قضا نہیں ٹلتی۔دوسرے اللہ کے پاس جانے سے کسی حال میں بچتے نہیں اور دین کی راہ میں مر جانا یا مارا جانا مغفرت و رحمت کا موجب ہے تو ویسے مرنے سے تو دین کی راہ میں جان دینا ہی بہتر قرار پایا۔پھر ایسے اقوال بالکل بے کار ہیں کہ اس دنیا میں حسرت وافسوس کا باعث بنتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا باعث ہوں گے)

تفسیر:اس مقام پر ان کے دو جواب ہیں:اول ﴿ وَاللّٰهُ يُحْيٖ ﴾ یعنی اللہ ہی جلاتے اور مارتے ہیں اور دوسرا

﴿ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ ﴾ یعنی اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ۔ اور یہ جو فرمایا کہ جب وہ سفر کرتے ہیں، میرے نزدیک اس سفر سے دینی کام کے لئے سفر کرنا مراد ہے، جیسا کہ جواب میں یہ فرمانے سے معلوم ہوتا ہے۔ ﴿ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ مر جاؤ، کیونکہ اگر وہاں مطلق سفر مراد لیا جائے تو اس جواب میں ان کے قول کے ایک جزء سے تعرض نہ ہوگا، اگرچہ پہلے جواب یعنی ﴿ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ میں اس سے تعرض ہے۔ لیکن اس دوسرے جواب میں بھی دونوں جزوں سے تعرض ہو تو زیادہ بلیغ ہوگا۔

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ جواب میں مطلق ﴿ مُتُّمْ ﴾ فرمایا ہے، اس میں ﴿ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کی قید نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت و رحمت کا حاصل ہونا اس قید کا قرینہ ہے، چنانچہ جب موت میں فی سبیل اللہ کی قید ہونا اور دونوں جوابوں میں دونوں جزوں سے مناسب تعرض ہونا ثابت ہوگیا تو معلوم ہوا کہ سفر سے دینی سفر مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ﴿ لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ کے ترجمہ میں جو اپنے نسب یا مشرب والے بھائی سب کو عام کیا گیا ہے، اس میں مشرب والوں سے مراد منافق ہیں اور نسب والوں میں مسلمان بھی تھے۔ اس لئے اگر دوسرے والے مراد ہیں تو ان کا دینی سفر اور ان کا غزوہ اور ان کے لئے مغفرت و رحمت کا وعدہ سب ظاہر ہے۔

لیکن یہ بات قابل تحقیق ہے کہ ان کے مرنے یا مارے جانے سے منافقوں کو کیا حسرت ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ یا تو حسرت اس لئے ہوئی کہ آخر قرابت داری سے کچھ اضطراری تعلق تو ہوتا ہی ہے اور یا یوں کہا جائے کہ مؤمنوں کی موت یا قتل سے حسرت نہ ہوئی ہو، لیکن اس قول اور اس قول کے منشا یعنی فاسد عقیدہ سے یہ امر یقینی ہوگیا کہ وہ فطری اسباب کو کچھ حقیقی مؤثر سمجھتے ہیں تو ایسے شخص کو اگر کسی وجہ سے ایک واقعہ میں نہیں تو دوسرے بہت سے واقعات میں ہمیشہ حسرت رہا کرے گی۔ اور حدیث میں اس درجہ کے عقیدہ کی تاثیر کی وجہ سے تو ایسا کہنے کی ممانعت آئی ہے، اور اگر مراد اول ہے تو حسرت کی توجیہ بہت ظاہر ہے۔

لیکن دوسرے امور قابل تحقیق ہوں گے، چنانچہ تفسیر کبیر میں کہا ہے کہ شاید اتفاق ہی سے کوئی منافق قتل ہوا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اس طرح اتفاق ہی سے کوئی منافق کسی دباؤ کے تحت دینی سفر میں چلا گیا ہوگا، اور مغفرت و رحمت کی تقریر یوں ہوگی کہ ان اقوال کو چھوڑ کر اگر ایمان و اعتقاد درست کرلیں تو ان کے کام بھی فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستہ میں ہونے کی وجہ سے مغفرت و رحمت کا باعث ہونے لگیں گے۔

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے، سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے، پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

ربط: اوپر بعض مسلمانوں کی اس لغزش کا ذکر آچکا ہے جو احد کے دن صادر ہوگئی تھی کہ میدان سے بھاگ گئے اور رسول اللہ ﷺ نے جہاں بٹھا دیا تھا، وہاں بیٹھے نہ رہے۔ چونکہ اس قصہ سے رسول اللہ ﷺ کو کوفت اور غم ہوا جیسا کہ ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ کی جو تفسیر بیان کی گئی، اس سے ظاہر ہے۔ اگرچہ آپ اپنے وسعت اخلاق کی وجہ سے اور ان کی دل شکنی کے خیال کی وجہ سے ان حضرات کے ساتھ سختی و ملامت سے پیش نہیں آئے، لیکن خود اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ ان حضرات کی طرف سے حضور اقدس ﷺ کے قلب مبارک میں بھی کوئی تنگی اور انقباض نہ رہے اور خود ان حضرات کے دلوں سے بھی اس کلفت و ندامت کا احساس دور ہو جائے، اس لئے پہلے گذشتہ آیتوں میں انہیں اپنی طرف سے معافی کی بشارت سنا کر ان آیات میں حضور ﷺ کو چند ایسے امور کا حکم فرماتے ہیں، جن سے مذکورہ بالا غرض حاصل ہو جائے۔

صحابہ کی معافی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب:

اس کے بعد (کہ ان حضرات سے ایسی لغزش صادر ہوئی، آپ کو ان پر ملامت کرنے کا حق حاصل تھا) اللہ ہی کی رحمت کی وجہ سے (جو کہ آپ پر ہے) آپ ان کے ساتھ نرم رہے (اخلاق و مزاج کی اس نرمی کو رحمت کے سبب اس لئے فرمایا کہ خوش اخلاقی عبادت ہے اور عبادت کی توفیق اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوتی ہے) اور اگر آپ (خدانخواستہ) تند خو، سخت طبیعت والے ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر انہیں یہ فیوض و برکات کیسے میسر ہوتے) تو (جب آپ نے انہیں فیض پہونچانے کے لئے ان کے ساتھ برتاؤ میں ایسی نرمی اختیار فرمائی تو آپ کے حکم میں ان سے جو کوتاہی ہوئی اس پر) آپ (دل سے بھی) ان کو معاف کر دیجئے۔ اور (جو کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی ہوگئی اس میں) آپ ان کے لئے (حق تعالیٰ سے) استغفار کر دیجئے (گو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف فرما دیا ہے، مگر آپ کا استغفار آپ کی زیادہ شفقت کی علامت ہوگی، جس سے ان کو اور زیادہ تسلی ہوگی) اور ان سے (بدستور) خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے (تا کہ اس سے ان کا اور بھی زیادہ دل خوش ہو جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپ کی رائے (ایک جانب) پختہ ہو جائے (خواہ وہ ان کے مشورہ کے مطابق ہو یا مخالف) تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر ڈالا کیجئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ایسے بھروسہ کرنے والوں سے (جو اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھیں) محبت فرماتے ہیں۔

فائدہ: یہ جو کہا گیا ہے کہ خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے، ان سے وہ امور مراد ہیں جن میں آپ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ ورنہ وحی کے بعد مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

صحابہ سے نبیؐ کے مشورہ کا فائدے:

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس سے ان کا دل اور بھی زیادہ دل خوش ہو جائے، یہ مشورہ کے فائدوں میں سے اس مقام کے مناسب ایک حکمت ہے۔ ابن جریر نے اس کو قتادہ سے نقل کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہیں، مثلاً یہ کہ آپ کی امت کے لئے یہ سنت قرار پائے، اس کو بیہقی نے حسن سے نقل کیا ہے اور اس کی تائید میں ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور رسول کو تو اس طرح کے مشوروں کی ضرورت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے، یا یہ کہ کسی امر میں ممکن ہے کہ مشورہ سے رائے کی تقویت بھی حاصل ہو جائے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اگر تم دونوں کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اس کے خلاف عمل نہیں کروں گا (امام احمد نے عن عبدالرحمٰن بن غنم روایت کیا، یہ تمام روایتیں روح المعانی میں مذکور ہیں) اور یہ حکمتیں مشورہ کی ضرورت نہ ہونے کی قوی غرض کے منافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ حاجت کا نہ ہونا اکثر لوگوں کے اعتبار سے ہو، اور یہ تقویت بعض خواص کے اعتبار سے ہو۔

کثرت رائے کے اعتبار کا باطل ہونا:

اور یہ جو فرمایا کہ "خواہ وہ ان کے مشورہ کے مطابق ہو یا اس کے خلاف ہو" اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی، اور اس سے معلوم ہوا کہ رائے اور مشورہ سے متعلق انتظامی امور میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے، ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف ہو۔ اور مشورہ اور عزم کے بعد جو توکل کا حکم فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ تدبیر، توکل کے منافی نہیں، کیونکہ مشورہ اور عزم کا تدبیر میں داخل ہونا ظاہر ہے۔

توکل کے درجات اور احکام:

اور جاننا چاہئے کہ توکل کا ایک مرتبہ یہ ہے کہ تدبیر کے باوجود اعتقاد کے طور پر اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ رکھے۔ اور یہ ہر مسلمان کے ذمہ فرض ہے، اور جو توکل تدبیر کو ترک کرنے کے معنی میں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ تدبیر دینی ہے تو اس کا ترک کرنا قابل مذمت ہے اور اگر ایسی دنیوی ہے کہ فطری اور عام معمول و روایت کے مطابق یقینی ہے تو اس کو ترک کرنا بھی ناجائز ہے اور اگر یقینی نہیں ظنی ہے تو جس شخص کا قلب قوی ہو اس کے لئے اس کا ترک کرنا اور اختیار کرنا دونوں

جائز اور اگر وہ شخص وہی ہے تو اس کو ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ فقط

﴿اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾

ترجمہ: اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہئے۔

ربط: اوپر ان حضرات کی تسلی کے لئے حضور اکرم ﷺ کو چند امور کا حکم ہوا تھا جس سے رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی کا اندیشہ تو دور ہو گیا، لیکن چونکہ ان حضرات کو مغلوبیت کے اس واقعہ سے ندامت و پشیمانی بھی تھی، اس لئے اس آیت میں ان کی اس پشیمانی کو دل سے نکالتے ہیں۔

صحابہ کے دلوں سے مغلوبیت کی پشیمانی دور کرنا:

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے (اور تمہیں غالب کردے) اور ایمان والوں کو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

تفسیر: حسرت و پشیمانی کے ازالہ کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کو غالب یا مغلوب کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، مثلاً غزوۂ بدر میں اپنی رحمت سے مسلمانوں کو غالب کر دیا جبکہ غزوۂ احد میں اپنی حکمت سے مغلوب کر دیا، تو جب یہ امر پوری طرح تمہاری قدرت میں نہیں ہے تو اس کے پیچھے اپنے آپ کو اس قدر نہ ڈالو، جو ہو گیا، سو ہو گیا، اس میں جو آفت معصیت کی وجہ سے پیش آئی، اس سے توبہ کرلو، آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھو، یعنی اس سے توفیق مانگو کہ معصیت سے محفوظ رکھیں، اور پھر جو مصیبت نازل ہو، اس کو اس کارساز کی طرف سے خیر و بھلائی اور مصلحت سمجھو۔ فقط

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ يَّغۡلُلۡ يَاۡتِ بِمَا غَلَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ۞ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ كَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰٮهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۞ هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ۞﴾

ترجمہ: اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ حالانکہ جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا، پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا۔ سو ایسا شخص جو کہ رضائے حق کا تابع ہو، کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جاوے گا جو کہ غضب الٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو۔ اور وہ جانے کی بری جگہ ہے۔ یہ مذکورین درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں ان

کے اعمال کو۔

ربط: اس آیت کا شانِ نزول اگرچہ ترمذی کی روایت کے مطابق خاص ہے کہ بدر کے روز مالِ غنیمت میں سے ایک چادر گم ہوگئی، بعض (کم سمجھ یا منافق) لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے لے لی ہو، (اگر یہ قول منافقوں کا تھا تو یہ ان کی بیہودگی تھی اور اگر ایسی بات کسی مسلمان نے کہہ دی تھی تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ حضور ﷺ کو اس تصرف کا اختیار حاصل تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ معاملہ حقیقت میں یا اپنی صورت کے اعتبار سے خیانت ہے، نبی کی شان اس سے پاک اور اعلیٰ و برتر ہے، لیکن چونکہ لفظ غلول عام خیانت کے معنی میں ہے، خواہ حقیقت کے لحاظ سے ہو یا عموم مجاز کے طور پر، تو قاموس میں دونوں قولوں کے لحاظ سے صحیح ہوا۔ اس لئے اس میں ہر قسم کی خیانت شامل ہے، معنی کے اس عموم کے اعتبار سے ربط کی وجہ ظاہر ہے کہ اوپر رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کا قابل ندامت اور وبال کا باعث ہونا بیان فرمایا تھا۔ اس آیت میں آپ کا کامل امین ہونا بیان فرمایا تا کہ ثابت ہو جائے کہ آپ جو حکم فرماتے ہیں اس میں آپ کی کوئی ذاتی نفسانی غرض نہیں ہوتی، کیونکہ بہرحال یہ ایک قسم کی خیانت ہے اور آپ اس سے پاک ہیں، لہٰذا ایسے حکم کی مخالفت لازمی طور پر وبال اور قابل مذمت ہوگی۔ آیات کی ترتیب میں اس ربط سے جو توفیقی ہے، اس آیت کا اس موقع پر لایا جانا مناسب ہوا۔

حضرت نبی ﷺ کے امین ہونے کا ثبوت:

اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) خیانت کرے، حالانکہ (خیانت کرنے والا تو قیامت میں ذلیل اور رسوا ہوگا، کیونکہ) جو شخص خیانت کرے گا وہ اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن (حشر کے میدان میں) خود اپنے ساتھ لے کر آئے گا (تا کہ تمام مخلوقات کو پتہ چلے، اور اس کی سب کے سامنے فضیحت ہو) پھر (قیامت کے میدان کے بعد) ہر شخص کو (ان خیانت کرنے والوں میں سے) اس کے کئے کا (دوزخ میں) پورا بدلہ ملے گا اور ان پر بالکل بھی ظلم نہیں ہوگا (کہ جرم سے زیادہ سزا ہونے لگے۔ غرض خیانت کرنے والا تو اللہ کے غضب اور جہنم کے عذاب کا مستحق ہوگا، اور انبیاء علیہم السلام حق کی رضا کی تلاش کی کوشش کی وجہ سے قیامت میں سربلند ہوں گے، تو پھر دونوں امر جمع کس طرح ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ ارشاد ہے: تو جو شخص رضائے حق کا تابع ہو (جیسے نبی) کیا وہ اس شخص کی طرح ہو جائے گا جو غضب الٰہی کا مستحق ہوا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو، اور وہ جانے کی بری جگہ ہے (ہرگز دونوں برابر نہیں ہوں گے بلکہ) جن لوگوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے (یعنی رضائے حق کی اتباع کرنے والے اور غضب کے مستحق لوگ) وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات میں مختلف ہوں گے (کہ اتباع کرنے والے محبوب اور جنتی اور مغضوب یعنی غضب کے مستحق لوگ دوزخی ہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں، اس لئے ہر ایک کے حال کے مطابق معاملہ فرمائیں گے)

تفسیر: یہاں انبیاء علیہم السلام کا امین، امانت دار ہونا دلیل سے ثابت کیا گیا، استدلال کی تفصیل خود ترجمہ سے ظاہر ہے، اور یہ جو فرمایا کہ خیانت کی چیز کو قیامت کے دن خود اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے، چنانچہ صحیحین یعنی صحیح بخاری شریف اور صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو قیامت کے دن میں کسی کو اس حال میں نہ دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو اور وہ بولتا ہو اور مجھ سے آکر امداد کا طلبگار ہو اور میں صاف جواب دیدوں کہ میں اب کچھ نہیں کر سکتا، میں حکم پہونچا چکا تھا، اور ایسا ہی مضمون گھوڑے اور کپڑے اور رقم کے بارے میں فرمایا۔ اور روح المعانی میں ابن ابی حاتم سے منقول ہے کہ کسی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بہت دور کی بات قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر کسی نے سو اونٹ چرائے ہوں گے تو وہ سب کو گردن پر کیسے لائے گا، آپ نے جواب دیا کہ جس شخص کی ڈاڑھ احد پہاڑ کے برابر ہو اور ربذہ سے مدینہ تک کے برابر بیٹھنے کی جگہ تو کیا وہ اتنی چیز کو نہیں اٹھا سکتا۔ آج کل جن لوگوں کو ایسے شبہات واقع ہوتے ہیں وہ اس جواب سے اطمینان کر لیں۔ اور قدرت الٰہی کے نزدیک بدن کے بڑے ہونے کی بھی ضرورت نہیں اور کوئی عقلی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ اگر وہ خیانت کی چیز جسم کی شکل سے نہ ہو تو اس کا لانا دو طرح ممکن ہے یا تو محض اظہار و اعلان کے لئے لانا کہا جائے، جیسے بولتے ہیں کیا خبر لائے، کہ خبر کوئی جسم نہیں رکھتی، اور یا اس عالم میں معانی جسم کی شکل میں لائے جائیں جیسا کہ بہت سی حدیثوں سے پتہ چلتا ہے، مثلاً موت کو دنبہ کی شکل میں لا کر ذبح کر دیا جائے گا۔ اور نیک عمل حسین آدمی کی شکل میں آئے گا، اس توجیہ کے مطابق اگر خیانت کا مال و سامان بھی گردن پر لدا ہوا ہو تو کوئی بعید نہیں ہے۔ واللہ اعلم

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

ربط: اوپر جناب رسول اللہ ﷺ کی امانت کی منقبت یعنی تعریف و ستائش کا اور چادر لینے کے خیال کے غلط ہونے کا بیان تھا، آگے حضور ﷺ کے وجود باجود کا نعمت عظمیٰ ہونا اور آپ کی بعثت کا نعمت کبریٰ ہونا بیان فرماتے ہیں تاکہ اس نعمت کی قدر کریں اور آپ کی تعظیم کریں اور دوبارہ کسی ایسے امر کا وسوسہ دل میں نہ لائیں، جو حضور اقدس کی شان بلند و بالا کے مناسب نہ ہو۔

حضور پرنور ﷺ کی بعثت کا مؤمنوں پر احسان عظیم ہونا:

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا) احسان کیا جبکہ انہی کی جنس میں سے ایک ایسے (عظیم الشان) پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں (اور احکام) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (جہالت کے خیالات اور رسوم سے) ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب الٰہی اور فہم وسمجھ کی باتیں بتاتے رہتے ہیں اور یقیناً یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی غلطی (یعنی کفر وشرک) میں (مبتلا) تھے۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ مجموعی طور پر اس آیت میں ایک تو اسرار کے علم کا اثبات ہے اور ساتھ ہی سلوک کے بعض طریقوں کی تعلیم بھی ہے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے کہ تلاوت سے مراد توحید اور نبوت سے متعلق آیتوں کی تبلیغ ہے اور تزکیہ سے مراد کلمہ طیبہ کی طرف بلانا ہے جو توحید اور رسالت پر دلالت کرتا ہے (کہ وہ شرک سے پاک ہونے کا سبب ہے) اور کتاب کی تعلیم سے مراد قرآن کے الفاظ کی تعلیم ہے اور حکمت کی تعلیم سے مراد قرآنی اسرار سے واقف کرنا ہے۔ اس طرح سب سے پہلے تلاوت ہے، کیونکہ وہ تمہید ہے پھر تزکیہ، جس کے ساتھ مؤمن سب سے پہلے موصوف ہوتا ہے پھر تعلیم جس کی ضرورت ایمان کے بعد ہوگی، اس طرح تخلیہ کا (تزکیہ اس کا ایک فرد ہے) تحلیہ پر (کہ تعلیم اس کی ایک فرد ہے) مقدم ہونا معلوم ہوا۔ اب یہ بات رہ گئی کہ سورہ بقرۃ کی آیت میں تزکیہ پر تعلیم کو مقدم کیوں فرمادیا، تو شاید اس میں تحلیہ کے اعلیٰ واشرف درجہ پر تنبیہ مقصود ہو۔ اور احقر کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہو کہ کبھی کسی تقاضہ کے سبب سے تحلیہ کو تخلیہ پر مقدم کردیا جاتا ہے، اور قوم میں دونوں طریقوں پر عمل پایا جاتا ہے۔

فائدہ: اس آیت کے اکثر الفاظ اس سے پہلے دو آیتوں میں آچکے ہیں: ایک سورۃ بقرۃ کی آیت ۱۲۹ میں، دوسری آیت ۱۵۱ میں، وہاں ان کی تفسیر ملاحظہ فرمالی جائے۔ اور یہ جو فرمایا: ''انہی کی جنس سے'' اس سلسلے میں مفسرین کے کئی قول ہیں: بعض نے کہا ہے کہ ان کے ''نسب سے'' یعنی قریشی، اس تفسیر پر اس صفت کا فائدہ احقر سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۹ میں لکھ چکا ہے، بعض نے کہا کہ ''عرب سے'' اس تفسیر پر اس صفت کا فائدہ بھی تفسیر اول ہی کے قریب ہے، ملاحظہ فرمانے سے واضح ہوگا۔ بعض نے کہا ''بنی آدم سے'' اور یہی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس جگہ لفظ ''مؤمنین'' عام ہے اور ﴿ اَنْفُسِهِمْ ﴾ کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے، اس لئے عام صفت کے ساتھ تفسیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اس تفسیر پر روح المعانی کی تقریر کے مطابق اس صفت کا یہ فائدہ ہوگا کہ آدمی کو آدمی سے فرشتے اور جنات کے مقابلہ میں زیادہ انس ہوتا ہے تو علم کا فیض حاصل کرنے میں زیادہ سہولت ہوئی، اور خلاف جنس ہونے میں وحشت کا احتمال تھا۔ اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ پھر جنات کو فیض لینے میں دشواری ہوگی، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان جامع ترین مخلوق

ہے، اس لئے اس کو جنات سے بھی مناسبت ہے، اس لئے انسان جنات کو سہولت کے ساتھ فیض پہونچا سکتا ہے بخلاف جنات کے کہ وہ جامع نہیں ہے، اس لئے وہ انسان کو سہولت کے ساتھ فیض نہیں پہونچا سکتا، اور یہ مناسبت[1] انسان کے جنات سے استفادہ میں اس لئے کافی نہیں کہ مفیض یعنی فیض پہونچانے والا مستفیض یعنی فیض حاصل کرنے والے کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہونا چاہئے۔ دوسرے اگر سہولت سے قطع نظر کی جائے تب بھی انسانوں کی مصلحتوں کو جنات کی مصلحتوں پر مقدم رکھنے میں کوئی مصلحت وحکمت ہوگی، اس لئے اس صورت میں مؤمنین کو مؤمن انسانوں کے ساتھ خاص کہنا ہوگا، جیسا کہ اکثر جگہ بنی آدم کو خطاب ہے، اور یہ امر بعثت کے عام ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ اس پر دوسرے دلائل قائم ہیں، اور اگر مؤمنین کو تمام مکلفوں کے لئے عام کیا جائے تو جو لفظ جنس ﴿مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے ترجمہ میں ہے اس سے منطقی طور پر قریب والی جنس مراد لے لی جائے گی۔ چنانچہ انسان اور جنات دونوں حیوان کے تحت داخل ہیں برخلاف ملائکہ کے کہ ملائکہ ان کی طرح مکلّف ہی نہیں، خواہ حیوان میں داخل ہوں یا نامی کی قید کے ذریعہ خارج ہوں، کیونکہ ان کی نشو ونما ثابت نہیں۔

اور روح المعانی میں ہے کہ آیت ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (سورۃ الانبیاء ۱۰۷) سے ثابت ہے کہ آپ کی تشریف آوری رحمت عامہ ہے، جس سے دنیا میں کفار بھی فیض یاب ہیں، چنانچہ گذشتہ امتوں جیسے عذاب نہیں آتے، جواب یہ ہے کہ چونکہ زیادہ فائدہ مؤمنوں نے حاصل کیا اور وہ نفع آخرت کا ہے، اس لئے اس آیت میں مؤمنوں کی تخصیص کی گئی، جیسا کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کہا گیا ہے حالانکہ ہدی للناس ہونا بھی ثابت ہے۔ فقط

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ھُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْھُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِھِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

ترجمہ: اور جب تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو حصے تم جیت چکے تھے تو کیا ایسے وقت میں تم یوں کہتے ہو کہ یہ کدھر

(۱) یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال کی تقریر یہ ہے کہ انسان اور جنات کے درمیان جو مناسبت، جنات سے انسان کو فائدہ پہونچانے کے لئے کافی ہے، وہی مناسبت جن سے انسان کے فائدہ حاصل کرنے کے لئے بھی کافی ہوسکتی ہے، اس لئے اگر جن کو انسان کی طرف نبی بنا کر بھیجا جائے تو کیا حرج ہے۔ جواب کی تقریر ظاہر ہے۔

سے ہوئی، آپ فرمادیجئے کہ یہ ہار خاص تمہاری طرف سے ہوئی، بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے سو خدا تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی اور تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنھوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے یوں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمنوں کا دفعیہ بن جانا۔ وہ بولے کہ اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ یہ منافقین اس روز کفر سے نزدیک تر ہو گئے بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ ایمان سے نزدیک تھے، یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں، جو ان کے دل میں نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنے بھائیوں کی نسبت بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کئے جاتے۔ آپ فرمادیجئے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم سچے ہو۔

ربط: اوپر کئی موقعوں پر مؤمنوں کی شکست کی علت اور حکمت بیان ہو چکی ہے، مثلاً: ﴿ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ ﴾ (سورۂ آلِ عمران آیت ۱۴۰) ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ﴾ (آیت ۱۵۲) ﴿ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ ﴾ (۱۵۴ و ۱۵۵) چونکہ مؤمنوں کو شکست کا سخت رنج تھا، اس لئے ان آیات میں دوسرے انداز سے پھر اس مضمون کی تاکید و تقریر فرماتے ہیں اور اس کے ضمن میں منافقوں کی برائی بھی، اگرچہ پہلے بھی ان کی مذمت ہو چکی ہے، لیکن یہاں دوسرے انداز میں ہے۔

احد کی شکست کی علت و حکمت اور منافقوں کی مذمت:

اور جب (احد میں) تمہاری ایسی شکست ہوئی جس کے دو حصے تم (بدر میں) جیت چکے تھے (یعنی دوگنی جنگ جیت چکے تھے، کیونکہ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے اور بدر میں ستر کافروں کو قتل اور ستر کو گرفتار و قید کیا تھا) تو کیا ایسے وقت میں تم (تعجب سے نہ کہ اعتراض کے طور پر) یوں کہتے ہو کہ (ہمارے مسلمان ہونے کے باوجود) یہ (شکست، ہار) کدھر سے ہوئی؟ (کیوں ہوئی؟) آپ فرمادیجئے کہ یہ ہار خاص تمہاری طرف سے ہوئی (نہ حضور ﷺ کی رائے کے خلاف کرتے اور نہ ہارتے، کیونکہ اس قید کے ساتھ نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا) بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (جب تم نے طاعت کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تمہیں غالب کر دیا اور جب آپ کی رائے کی خلاف ورزی کی تو اللہ نے اپنی قدرت سے تمہیں مغلوب کر دیا) اور جو مصیبت تم پر پڑی اس دن جب دونوں گروہ (مسلمان اور کفار) آپس میں (قتل و قتال کے لئے) مقابلہ میں آئے (یعنی احد کے دن) تو (وہ مصیبت) اللہ تعالیٰ کی مشیت سے آئی (چونکہ اس میں طرح طرح کی حکمتیں تھیں، جن کا بیان اوپر بھی آچکا ہے) اور (ان میں سے ایک حکمت یہ تھی) تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو بھی دیکھ لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت اخلاص وغیر اخلاص ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ گذر بھی چکا ہے) اور ان لوگوں کو بھی

دیکھ لیں جنھوں نے نفاق سے کام لیا، اور ان سے (جنگ شروع ہونے سے پہلے جب ان میں سے تین سو آدمیوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) یوں کہا گیا کہ (جنگ کے میدان میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی پوری کر کے) دشمنوں کو دفع کرنا (کیونکہ بہت ساری بھیڑ دیکھ کر کچھ تو ان پر رعب ہوگا اور اس سے شاید وہ ہٹ جائیں) وہ بولے اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنا زیادہ ہیں، پھر ان کے پاس سامان بھی زیادہ ہے، ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا ہے، لڑائی اس کو نہیں کہتے، حق تعالیٰ اس پر ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ منافق (لوگ) اس دن (جب ایسا خشک جواب دیا تھا) کفر سے (ظاہری طور پر بھی) قریب تر ہو گئے، اس حالت میں کہ وہ (پہلے سے ظاہری طور پر) ایمان سے (کسی قدر) قریب تھے (کیونکہ پہلے سے اگرچہ وہ دل سے تو مؤمن نہیں تھے، مگر مسلمانوں کے ساتھ موافقت کی باتیں بناتے رہتے تھے، اس روز ایسی طوطا چشمی یعنی بے وفائی غالب ہوئی کہ کھلم کھلا ان کے منہ سے مخالفت کی باتیں نکلنے لگیں، اس طرح وہ پہلی ایمان سے قرب والی حالت بھی کفر سے قریب والی حالت میں تبدیلی ہو گئی، اور یہ قرب اس قرب سے زیادہ اس لئے ہے کہ موافقت کی باتیں دل سے نہ تھیں، اس لئے زوردار نہ تھیں اور یہ دل سے تھیں، اس لئے عبارت بھی زوردار تھی) یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں (یعنی دل میں تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیں، اگرچہ لڑائی ڈھنگ کی ہی کیوں نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں (اس لئے ان کے اس قول ﴿نَعۡلَمُ قِتَالًا﴾ کا غلط ہونا اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے) یہ ایسے لوگ ہیں کہ (خود تو جہاد میں شریک نہ ہوئے اور) اپنے (نسب والے) بھائیوں کے سلسلہ میں (جو کہ قتل ہو گئے، گھروں میں بیٹھے ہوئے) باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے (یعنی جب ہم نے منع کیا تو ہماری بات مانتے اور لڑنے کے لئے نہ جاتے) تو (بے فائدہ) قتل نہ کئے جاتے۔ آپ فرما دیجئے کہ اچھا اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو (کہ میدان میں جانے سے ہی ہلاکت ہوتی ہے) تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ کیونکہ قتل سے بچنا تو موت ہی سے نکلنے کے لئے مقصود ہوتا ہے، جب مقررہ اور مقدر وقت پر موت گھر بیٹھے بھی آ جاتی ہے تو قتل بھی مقدر اور مقررہ وقت سے نہیں ٹل سکتا۔

تفسیر: شکست و ہزیمت کے اس واقعہ میں عتاب کے بعد صحابہ کو جو تسلی دی گئی، اس سے نافرمانی کرنے والے دھوکہ نہ کھائیں کہ ہم سے جو گناہ ہوتے ہیں اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت ہوتی ہے، اس لئے غم یا ڈر کی کوئی بات نہیں۔

بات یہ ہے کہ اول تو صحابہ نے یہ عمل جان بوجھ کر نہیں کیا، اجتہادی غلطی کی وجہ سے ان سے ایسا ہو گیا، ان کا مقصد رسول اللہ کے حکم کی مخالفت کرنے کا نہیں تھا، دوسرے یہ کہ بعد میں ان کے اوپر ندامت اور غم کا بے انتہا غلبہ ہوا، جو توبہ کا اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے ان کی تسلی کی گئی، اس کے برعکس جو شخص قصداً گناہ کرے اور پھر اس پر جرأت اور جسارت بیجا کا مظاہرہ کرے تو وہ تسلی کا بھی مستحق نہیں، بلکہ وہ سخت وعید اور ڈر و خوف کا مستحق ہوگا، خوب سمجھ لو۔

اور ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے ترجمہ میں جو کہا گیا کہ "اس قید کے ساتھ نصرت اور مدد کا وعدہ ہو چکا تھا" اس میں قید سے مراد طاعت پر استقلال اور ثابت قدم رہنا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے: وقد وعدهم الفتح إن صبروا: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر کی شرط کے ساتھ فتح کا وعدہ کیا، جیسا کہ اس آیت کے تحت روح المعانی میں ہے۔ اور میں نے اس کی تصریح اس لئے کی تا کہ یہ شبہ نہ رہے کہ جب فتح کا وعدہ تھا تو پھر شکست کیوں ہوئی؟ اور یہ شبہ بھی نہ رہے کہ بعض جگہ استقلال وثابت قدمی اور احکام کی تعمیل واطاعت کے باوجود مسلمان مغلوب ہو جاتے ہیں، یہ شبہ اس لئے دور ہو گیا کہ جن لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا وہ خاص لوگ تھے، اس خاص وعدہ کا عام اور کلیہ ہونا لازم نہیں آتا۔

اور اس مقام پر مسلمانوں کے یہ کہنے کے انی هذا یہ کہاں سے یا کدھر سے یا کیوں ہوئی؟ کئی جواب دیئے اور کئی طریقوں سے تسلی فرمائی، ایک ﴿ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ﴾ کی قید بڑھائی، اس میں اشارہ ہے کہ جس شخص کی دوگنی جیت ہو چکی ہو اگر ایک آدھ بار ہار ہو جائے تو تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ ہار جیت تو انقلاب کے لوازم میں سے ہے۔ یہ مضمون اس آیت کے قریب ہی ہے ﴿ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ دوسرا جواب ﴿ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ میں ہے جو ﴿ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ ﴾ اور ﴿ اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ ﴾ کا حاصل ہے۔ تیسرا جواب ﴿ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ میں ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں حکمت تھی، اس لئے مشیت متعلق ہوئی جس میں بعد میں ایک حکمت کا بیان بھی فرمادیا ﴿ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ﴿ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ﴾ جو ﴿ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ﴾ کا حاصل تھا۔ اور بعض حکمتوں کو مجمل چھوڑ دیا، جن میں سے بعض کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مثلاً ﴿ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ﴾ ﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ ﴿ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾

اور جاننا چاہئے کہ اس آیت میں جو ﴿ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ﴿ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ﴾ آیا ہے، اس کے معنیٰ کی تحقیق سورۃ بقرۃ آیت ۱۴۳ کے ذیل میں اور سورۃ آلِ عمران آیت ۱۴۰ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اور ﴿ لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ کے ترجمہ میں جو صرف نسب والے بھائی کہا گیا، سابق کے برخلاف کہ وہاں عام قرار دیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ﴿ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً ﴾ ہم مشرب بھائیوں کے مراد لینے کے لئے تجویز کیا ہوا قرینہ تھا، جیسا کہ وہاں اس کا بیان گذر چکا۔ بخلاف یہاں کے کہ بعد والی آیت جس میں شہداء کی فضیلت کا ذکر ہے، اس مذکورہ احتمال سے ممانعت والا قرینہ ہے، تو اس صورت میں منافقوں کا یہ کہنا ﴿ لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ﴾ افسوس کے اظہار کے لئے نہیں ہوگا بلکہ مقتولوں کو احمق وبیوقوف قرار دینے اور ان کے نقصان پر ان کا مذاق بنانے کی غرض سے ہوگا، اس لئے اگلی آیت میں ان کی اعلیٰ درجہ کی کامیابی بیان کر کے جواب دیا جاتا ہے اور جن حضرات نے ﴿ لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ میں عام معنیٰ مراد لئے ہیں، وہ اگلی آیت کو اس پر محمول کریں گے کہ منافقوں کے مقتول اگرچہ شہید نہیں تھے، لیکن چونکہ ان کے قول سے یہ بھی لازم آتا تھا کہ شہدا خسارہ میں پڑے ہیں، اس لئے اس آیت میں اس کو باطل قرار دیا گیا۔ اور اس اشارہ

کے لئے بھی مفید ہے کہ ان کے ہم مشرب بھائی اللہ کے راستہ میں مقتول نہیں ہوئے اگر ایسا ہوتا تو انہیں یہ فضائل نصیب ہوتے۔ واللہ اعلم

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ ع

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں، ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہونگے۔ وہ خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت و فضل خداوندی کے اور بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں منافقوں کے اس قول سے ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾ دو امر معلوم ہوئے تھے: ایک یہ کہ گھروں میں بیٹھا رہنا ہلاکت سے نجات کا سبب ہے، اس کا جواب تو ﴿فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ میں ارشاد فرمایا گیا۔ دوسرا امر یہ کہ وہ ان شہداء کی موت کو ناکامی اور زندگی اور لذتوں سے محرومی بتاتے تھے اور اس کے جواب کے لئے ان آیات میں ان حضرات کی اعلیٰ درجہ کی کامیابی اور حقیقی زندگی اور باقی چیزوں سے استفادہ کا اثبات قرار دیتے ہیں۔

شہدا کی حیات اور لذت کا اثبات:

اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے گئے ان کو (دوسرے مُردوں کی طرح) مُردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات، سب سے جدا نرالی زندگی کے ساتھ) زندہ ہیں (اور) اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول) ہیں، ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی (مثلاً قرب وغیرہ کے درجات یعنی حسی رزق بھی ملتا ہے اور معنوی رزق یعنی مسرت بھی) اور (جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں، اسی طرح) جو لوگ (ابھی دنیا میں زندہ ہیں اور اس وجہ سے) ان کے پاس نہیں پہونچے (بلکہ) ان سے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں۔ ان کی بھی اس حالت پر وہ (شہداء) خوش ہوتے ہیں، کہ (اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو ہماری طرح) ان پر بھی کسی طرح کا خوف (ناک سانحہ) واقع ہونے والا نہیں، اور نہ وہ (کسی طرح) مغموم ہوں گے (غرض انہیں دو خوشیاں ہیں، اپنی بھی اور اپنے تعلق والوں کی بھی، آگے ان دونوں خوشیوں کا سبب بتاتے

ہیں) وہ (اپنی حالت پر تو) اللہ کے فضل کی وجہ سے اور اس وجہ سے خوش ہوتے ہیں (جس سے انہیں نوازا گیا ہے) اور دوسروں کی حالت پر) خوش ہوتے ہیں، اس وجہ سے کہ (وہاں جا کر آنکھوں سے دیکھ لیا کہ) اللہ تعالیٰ اہل ایمان (کے اعمال) کا اجر ضائع نہیں فرماتے (بلکہ جس درجہ کا عمل ہوتا ہے، اس درجہ کا اجر دیتے ہیں، پس شہادت جو کہ تمام اعمال میں افضل ہے، اس پر سب سے افضل اجر ملے گا، جس کے لوازم میں سے یہ ہے کہ خوف وحزن بالکل نہ ہو)

فائدہ: شہداء کی زندگی تحقیق سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۴ کے تحت گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔ اور رزق ملنے کی کیفیت صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ان کی روحیں عرش کے نیچے قندیلوں میں رہتی ہیں اور جنت کی نہروں سے پانی پیتی ہیں، اور اس کے پھل کھاتی ہیں (مسند احمد، ابوداؤد وحاکم عن ابن عباس مرفوعاً جیسا کہ لباب النقول میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نہروں اور پھلوں کا یہ حصہ کسی ایسے مقام سے مل جاتا ہوگا جو جنت سے متعلق ہوگا، اس طرح یہ اشکال لازم نہیں آتا کہ جنت میں جانے کے بعد پھر حشر کے وقت کیسے نکالے جائیں گے؟

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ ﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے اللہ ورسول کے کہنے کو قبول کر لیا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا، ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے ثوابِ عظیم ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ ان لوگوں نے تمہارے لئے سامان جمع کیا ہے، سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے۔ پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگواری ذرا پیش نہیں آئی اور وہ لوگ رضائے حق کے تابع رہے اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل والا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے کہ اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

ربط: اوپر غزوۂ احد کا قصہ بیان ہو چکا، آگے اسی سے متعلق ایک دوسرے غزوہ کا ذکر ہے جو غزوۂ حمراء الاسد کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے ابتدائی جز کی طرف سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۵۱ میں ارشاد ہوا تھا، وہ یہ کہ جب کفار میدان احد سے مکہ کے لئے واپس ہوئے تو راستہ میں جا کر اس پر افسوس کیا کہ ہم غالب آ جانے کے بعد ناحق لوٹ آئے، اس لئے اب پھر چل کر سب کا صفایا کر دینا چاہئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، اور پھر وہ مکہ ہی کی طرف روانہ

ہو گئے، لیکن راستہ میں ملنے والے کچھ لوگوں سے کہتے گئے کہ کسی تدبیر سے مسلمانوں کے دلوں میں ہمارا رعب جما دیا جائے، آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی، اور آپ ان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہونچے (ابن جریر عن السدی جیسا کہ روح المعانی میں ہے)

اس کا بقیہ قصہ یہ ہے کہ حمراء الاسد نامی مقام مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں آپ نے تین روز ۱۷ تا ۱۹ شوال دوشنبہ تا چہار شنبہ یعنی پیر تا بدھ قیام فرمایا۔ ادھر مکہ کے کفار کو راستہ میں پہلے معبد خزاعی مسلمانوں کی قیام گاہ کی طرف جاتے ہوئے روحاء کے مقام پر ملے۔ معبد اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کے خیر خواہ تھے، مکہ کے کفار نے ان سے مسلمانوں کے بارے میں معلوم کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی خداداد شان وشوکت کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا، اس سے کفار کے حوصلے بالکل پست ہو گئے، اور بدستور مکہ ہی جانے کے فیصلہ پر قائم رہے۔

پھر اتفاق سے انہیں ایک قافلہ قبیلہ عبد القیس کا مل گیا، جو مدینہ کی طرف آ رہا تھا، ان لوگوں سے کفار مکہ نے کہا کہ تم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں سے مل کر ان لوگوں کے دلوں میں ہمارا خوف اور رعب بٹھا دینا اور ان سے کہہ دینا کہ مکہ والوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے بہت سارا سامان جمع کر لیا ہے، اور جلدی ہی آ کر ان کا کام تمام کر دیں گے۔

چنانچہ جس وقت ان لوگوں نے یہ خبر مسلمانوں کو پہنچائی تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر نہایت صبر واستقلال کے ساتھ کہا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ یعنی ہمیں ان کے سامان اور جمعیت سے کوئی اندیشہ نہیں، ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، پھر خیریت کے ساتھ مدینہ آ گئے (روح المعانی عن ابن اسحاق)

اور اتفاق سے اس مقام سے تاجروں کا ایک قافلہ گذرا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے تجارت کا مال خرید فرما لیا اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت زیادہ نفع دیا، حضور ﷺ نے وہ نفع ساتھی مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا (بیہقی عن ابن عباس روح المعانی) ان آیتوں میں اس قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ ﴿اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ میں ان ساتھیوں کے اس غزوہ میں زخمی ہونے اور تکلیف اٹھانے کی طرف، اور ﴿قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ میں عبد القیس کے ڈرانے کی طرف، اور ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ میں کفار مکہ کے تجویز کئے ہوئے مضمون کی طرف اور ﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ میں مسلمانوں کے صبر واستقلال اور ثابت قدمی کی طرف، اور ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ﴾ میں ثواب اور تجارت میں ہونے والے نفع کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے ان آیتوں کے متعلق دوسرا قصہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ احد کے میدان سے لوٹتے وقت مکہ کے کفار یہ کہہ گئے تھے کہ اگلے سال پھر بدر کے مقام پر جنگ ہوگی، جہاں گذشتہ سال بھی ہو چکی تھی، لیکن پھر ان کی ہمت نہ ہوئی۔ انھوں نے ایک اعرابی کو کچھ رقم دینی طے کی تو مسلمانوں کو ڈرا دینا تا کہ وہ ڈر کی وجہ سے نہ آئیں اور اس طرح الزام ان کے سر رہے، لیکن مسلمان ڈرے نہیں اور وقت پر پہونچ گئے۔ جبکہ کفار نہیں آئے، وہاں ایک بڑا بازار لگتا

تھا، مسلمانوں نے خوب خرید وفروخت کی جس میں خوب نفع بھی ملا، پھر صحیح سلامت اپنے گھروں کو واپس آگئے۔ اس غزوہ کا نام بدر صغریٰ مشہور ہے اور بعض نے اس بدر صغریٰ کے قصہ کو غزوۂ احد کے ایک ماہ بعد ہونا بیان کیا ہے، باقی حصہ اسی طرح بیان کیا ہے، لیکن احقر نے پہلے قصہ کو اس لئے اختیار کیا کہ اس کو روح المعانی میں بیان کیا گیا ہے اور اکثر مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسرے ﴿ مِنۢ بَعۡدِ مَآ أَصَابَهُمُ ٱلۡقَرۡحُ ﴾ سے پیدا ہونے والے زخموں کی تکلیف کا اس وقت تک باقی رہنا ہے، اگرچہ دوسری تفسیر کے مطابق یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ باوجودیکہ گذشتہ سال تکلیف اٹھائی تھی جس سے خوفزدہ ہوجانے کا احتمال تھا۔ واللہ اعلم۔ اور اس تفسیر کے اختیار کرنے والے بدر صغریٰ کا انکار نہیں کرتے، لیکن اس کو قرآنی آیات کا مدلول نہیں کہیں گے۔

غزوۂ حمراء الاسد کا قصہ:

جن لوگوں نے اللہ ورسول کے کہنے کو (جب ان سے کفار کا تعاقب کرنے کے لئے کہا گیا) قبول کرلیا، اس کے بعد کہ ان کو (ابھی جنگ میں تازہ) زخم لگا تھا، ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں (اور واقع میں سب ایسے ہی ہیں) ان کے لئے (آخرت میں) ثواب عظیم ہے، یہ ایسے (مخلص) لوگ ہیں کہ (بعض) لوگوں نے (یعنی عبدالقیس والوں نے جو) ان سے (آکر) کہا کہ ان لوگوں (یعنی اہل مکہ) نے تمہارے (مقابلہ کے) لئے بہت زیادہ سامان جمع کیا ہے، اس لئے تمہیں ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس (خبر) نے ان کے ایمان (کے جوش) کو اور زیادہ کردیا اور (نہایت استقلال کے ساتھ یہ) کہہ (کر بات کو ختم کردی) کہ ہمیں حق تعالیٰ (تمام مہمات میں) کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے (یہی سپرد کرنا توکل ہے) چنانچہ یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل سے (یعنی ثواب اور تجارت کے نفع سے) بھرے ہوئے واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری ذرا بھی پیش نہیں آئی، اور وہ لوگ (اس واقعہ میں) حق تعالیٰ کی رضا کے تابع رہے (اسی کی بدولت تمام نعمتوں سے سرفراز ہوئے) اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل والا ہے (مسلمانو!) اس سے زیادہ (اندیشہ کے قابل) کوئی بات نہیں کہ یہ (خبر دینے والا) شیطان ہے کہ اپنے (مذہب والے) دوستوں سے (تمہیں) ڈرانا (چاہتا) ہے تو تم ان سے (کبھی) مت ڈرنا اور (صرف) مجھ ہی سے ڈرنا۔ اگر تم ایمان والے ہو۔

فائدہ: مضمون کی شرح ربط کی تقریر میں گذر چکی ہے، اور یہ جو فرمایا کہ "اللہ اور رسول کے کہنے کو" حالانکہ بظاہر صرف رسول اللہ ﷺ نے تعاقب کے لئے فرمایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا فرمانا اللہ کے فرمانے سے ہوتا تھا، اس لئے اللہ اور رسول کی طرف نسبت صحیح ہوئی، اور یہ جو فرمایا کہ ان میں جو نیک اور متقی ہیں حالانکہ نصوص اور خبروں سے ان سب حضرات کا اس صفت کے ساتھ موصوف ہونا یقینی ہے اور خود آیت میں بھی جب ان کے لئے قبولیت ثابت کی تو ان کے نیک اور متقی ہونے میں کیا شبہ رہا، اس لئے اس ارشاد سے مقصود قید لگانا نہیں، بلکہ ان کی مدح وستائش اور ان کے لئے گئے

صفتوں کا ثابت کرنا اور اجر عظیم کی علت بیان کرنا ہے کہ یہ مقبول حضرات جو اجر عظیم کے مستحق ہوئے، اس کی علت ان کا نیک، محسن و متقی ہونا ہے، کیونکہ مقبولیت واستجابت بھی احسان اور تقوی کا اثر ہے۔ خوب سمجھ لو۔

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝﴾

ترجمہ: اور آپ کے لئے وہ لوگ موجب غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ آخرت میں سے ان کو اصلاً بہرہ نہ دے اور ان لوگوں کو سزائے عظیم ہوگی۔ یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

ربط: اوپر منافقوں کی بے وفائی اور بدخواہی کا ذکر ہو چکا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کو ان کی حرکتوں سے رنج ہوا ہوگا، حق تعالیٰ ان آیات میں آپ کو تسلی دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ ضمنی طور پر اور ان کو تابع قرار دے کر تمام کفار کے معاملہ سے متعلق خواہ کوئی بھی ہو، آپ کی تسلی فرماتے ہیں کہ آپ کے قلب مبارک پر اب یا آئندہ ان کی طرف سے اور دوسروں کی طرف سے کبھی صدمہ غالب نہ ہو۔

منافقوں اور کافروں کے معاملہ میں رسول مقبول ﷺ کو تسلی:

اور آپ کے لئے وہ لوگ غم کا باعث نہیں ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر (کی باتوں میں) جا پڑتے ہیں (جیسے منافق کہ ذرا مسلمانوں کا پلہ ہلکا دیکھا تو فوراً کھلم کھلا کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں جیسا کہ ان کے مذکورہ بالا اقوال واحوال سے معلوم ہوا) یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرا بھی ضرر نقصان نہیں پہونچا سکتے (اور آپ کو زیادہ رنج اس سے ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت سے دین اسلام کی قوت وترقی میں کچھ ضعف وخلل نہ آجائے تو جب یقیناً یہ معلوم ہو گیا کہ دین کو اس سے کچھ ضرر نہیں ہو سکتا، پھر آپ کیوں رنج کریں اور اگر رنج کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ دین کو نقصان نہیں مگر خود ان کا تو نقصان ہے پھر یہ ایسے کام کیوں کرتے ہیں جس سے ان کی عاقبت برباد ہو، تب بھی رنج نہ کیجئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو تکوینی طور پر یہ منظور ہے کہ آخرت میں سے انہیں کوئی حصہ نہ دے (جب یہ امر مقدر ہو چکا تو پھر ان سے موافقت کی امید کرنا بے کار ہے، اور رنج خلاف امید امر سے ہوتا ہے، اگر ان سے امید ہی نہ رکھی جائے گی، تو پھر رنج بھی نہیں ہوگا) اور (صرف یہی نہیں کہ آخرت میں خالی نعمتوں ہی سے محروم رہیں اور کوئی سزا نہ ہو، بلکہ محرومی کے ساتھ) ان لوگوں کو عذاب عظیم (بھی) ہوگا (اور جس طرح یہ گروہ خاص دین اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہونچا سکتا، اسی طرح) یقیناً جتنے لوگوں نے

ایمان (کو چھوڑ کر اس) کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے (خواہ منافق ہوں خواہ کھلے کافر ہوں چاہے پاس کے ہوں یا دور کے ہوں) یہ لوگ (بھی) اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہونچا سکتے (اس لئے آپ کو کسی کی طرف سے فکر و رنج نہیں کرنا چاہئے) اور ان (سب) کو (پہلے والوں کی طرح) دردناک عذاب ہوگا۔

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴾

ترجمہ: اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہیں کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے۔ ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں جس میں جرم میں ان کو اور ترقی ہو جاوے اور ان کو توہین آمیز سزا ہوگی۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں اہل کفر کو عذاب عظیم والیم کا مستحق دیا ہے چونکہ وہ لوگ اس کے منکر تھے اور یہ استدلال کیا کرتے تھے کہ جب ہم یہاں آرام و آسائشوں میں ہیں تو معلوم ہوا کہ ہم سے اللہ تعالیٰ ناخوش نہیں ہیں، تو وہاں بھی اگر آخرت کوئی چیز ہے تو ہم آرام ہی میں رہیں گے ورنہ یہاں عذاب سے کیوں چھوڑ دیئے جاتے، جیسا کہ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے: الانعام ۱۴۷، النحل ۳۵، حم السجدہ ۵۰، الانفال ۳۲ وغیرہ، حق تعالیٰ اس آیت میں اس خیال کا باطل ہونا ثابت فرما رہے ہیں۔

دنیا میں عذاب سے بچ جانے کے بارے میں اہل کفر کے زعم کا باطل ہونا:

اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں، وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہمارا ان کو (عذاب سے) مہلت دینا (کچھ) ان کے حق میں بہتر (اور مفید) ہے (ہرگز نہیں) بلکہ ہم انہیں صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں تاکہ (عمر کی زیادتی کی وجہ سے ان کے جرم (کفر) میں اور زیادتی ہو جائے (تاکہ یکبارگی پوری سزا ملے) اور (اگر دنیا میں سزا نہ ہوئی تو کیا ہے آخرت میں ضرور) انہیں توہین آمیز سزا ہوگی۔

فائدہ: اس آیت سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسی لئے مہلت دی ہے کہ اور زیادہ جرم کریں تو پھر زیادہ جرم کرنے سے عذاب کیوں ہوگا؟ اصل میں یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی لڑکا مکتب میں بیٹھا کھیلتا رہے اور استاذ کے بار بار سمجھانے سے بھی نہ مانے تو استاذ غصہ میں آکر خاموش ہو جائے کہ جب سبق سننے کا وقت آئے گا یا جب امتحان کا وقت آئے گا اس وقت اکٹھا ہی سمجھوں گا اور اس پر وہ نادان لڑکا فخر سے کہے کہ استاذ مجھے اس لئے نہیں مارتا کہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے اور اس وقت اس لڑکے سے کہا جائے کہ نہ مارنا اس لئے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ تو خوب بیٹھا کھیلتا رہے اور جب وقت پر سبق یاد نہ نکلے تو خوب پیٹا جائے یا امتحان میں فیل کر دیا جائے تو اس وقت سزا نہ دینے کا اصل سبب تو آخر میں سخت سزا دینا ہے مگر نہ پڑھنا جو کہ سبب کا مسبب ہے کلام میں سبب کے قائم مقام کر دیا گیا، اسی طرح مہلت دینے کا

اصل سبب زیادہ سزا دینے کا ارادہ ہے، لیکن اسی سبب کے سبب یعنی گناہ کی زیادتی کو جو بندہ کے اختیار میں ہے، سبب کے قائم مقام کلام کی بلوغت کے فائدہ کی غرض سے کر دیا گیا۔

اور جاننا چاہئے کہ مہلت کے نفع بخش نہ ہونے میں جو کفار کی تخصیص کی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو جس قدر عمر زیادہ ملتی ہے اس میں اسلام کے تقاضہ کے مطابق یہ فائدہ ہے کہ زیادہ طاعت کرے اور زیادہ درجات کا مستحق ہو، البتہ اگر کوئی اسلام کے اس تقاضہ ہی پر عمل نہ کرے تو اور بات ہے، مؤمن کو ایمان کی حیثیت سے فائدہ ہے، بخلاف کافر کے کہ اس کو کفر کی حیثیت سے نقصان ہے، البتہ اگر کفر کے اس تقاضہ پر عمل نہ کرے اور توبہ و ایمان سے مشرف ہو جائے تو اور بات ہے۔

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

ترجمہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتے جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے متمیز نہ فرما دے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے امور غیبیہ پر تم کو مطلع نہیں کرتے، لیکن ہاں جس کو خود چاہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو منتخب فرماتے ہیں پس اب اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ، اور اگر تم ایمان لے آؤ اور پرہیز رکھو تو پھر تم کو اجر عظیم ملے گا۔

ربط: جس طرح اہل کفر پر عذاب نہ آنے سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ مردود نہ ہوں گے، ورنہ عذاب آ جاتا، اور اوپر کی آیت میں اس شبہ کو دور فرما دیا۔ اسی طرح مسلمانوں پر بعض سختیاں آنے سے جیسا کہ احد میں آئیں، وسوسہ ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ اللہ کے یہاں مقبول ہوتے تو ان پر سختیاں کیوں آتیں، اس آیت میں ان سختیوں کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کر کے اس وسوسہ کو دور فرماتے ہیں۔

بعض اوقات مؤمنوں پر سختیوں کی حکمت:

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت (منافقوں اور مخلص لوگوں کے درمیان خلط ملط رہنے اور کوئی امتیاز نہ ہونے) پر رکھنا نہیں چاہتے، جس پر تم (سب) اب (موجود) ہو (بلکہ واقعات اور سختیوں کا نازل ہونا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مؤمن مخلص) سے چھانٹ کر الگ نہ کر دے (اور یہ امتیاز سختیوں سے خوب ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ کئی بار اس کی تقریر گذر چکی ہے) اور اگر تمہیں یہ وسوسہ ہو کہ سختیوں کے نزول کے بغیر بھی رسول کی طرف وحی کے نزول سے یہ تمیز سہل ہے کہ بتا دیا جاتا فلاں فلاں منافق ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (حکمت کے

تقاضہ کے مطابق) ایسے غیبی امور پر تمہیں (حوادث وغیرہ کے وقوع کے واسطہ کے بغیر) مطلع نہیں کرتے، سوائے اس کے جس کو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں اور ایسے (حضرات) اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، ان کو (اس طرح مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرما لیتے ہیں (اور تم پیغمبر نہیں ہو تو تمہیں ہم اس طرح ایسے امور کی اطلاع کیوں دیدیں؟ البتہ واقعات ایسے پیش آتے ہیں جن کے واسطہ سے استدلال کے طور پر یہ تمیز ہو جائے، اور جب کفار پر دنیا میں عذاب نازل ہونے کی اور مؤمنوں پر بعض سختیاں نازل ہونے کی حکمت معلوم ہوگئی اور ثابت ہو گیا کہ یہ امور ردو قبول کی دلیل نہیں ہیں) تو اب (اے باطل پرستی سے کام لینے والو! ایمان کے پسندیدہ اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ مت کرو۔ بلکہ) اللہ پر اور اس کے رسولوں پر (اخلاص کے ساتھ) ایمان لے آؤ، اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تمہارے لئے (بجائے عذاب عظیم والیم کے جس کا اوپر کفر پر وعدہ کیا گیا تھا، ایمان اور تقوی کی ہدایت اور آخرت میں) اجر عظیم ملے۔

فائدہ: ﴿لِيُطْلِعَكُمْ﴾ کے ترجمہ میں جو کہا گیا ہے "حکمت کے تقاضہ کے مطابق" تو اگرچہ حکمتیں بے شمار ہیں اور ان کے سلسلہ کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں، لیکن ظاہری طور پر یہ حکمت بھی معلوم ہوتی ہے کہ صرف وحی کے ذریعہ معلوم ہونے پر ظاہری اختلاط تو رہتا اور غیر جنسوں کا اختلاط اکثر ظاہری مفاسد کا سبب ہوتا ہے اور اگر مسلمان ان کو جدا کرنا چاہتے تو ان کے لئے کوئی دلیل و حجت نہ ہوتی تو وہ کہتے کہ ہم تو مخلص ہیں، اس کے برخلاف ایسے واقعات پیش آئے اور وہ کم ہمتی دکھا کر نکل بھاگے، تو خود ہی ان کا منہ نہ رہا کہ اخلاص کا دعوی کریں اور اس طرح اختلاط کے مفاسد سے نجات مل گئی۔

اور اس آیت سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ جو علم غیب باری تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہے، اس میں رسول کی شرکت ہوگئی، کیونکہ باری تعالیٰ کے خواص میں دو امر ہیں، اس علم کا ذاتی ہونا اور اس کا سب کو گھیرنے والا ہونا، یہاں ذاتی اس لئے نہیں کہ وحی سے ہے اور محیط یعنی سب کو گھیرنے والا اس لئے نہیں کہ صرف بعض خاص امور مراد ہیں، اس لئے یہ عام معنی میں غیب ہے نہ کہ خاص معنی میں خوب سمجھ لو۔

اور آخر میں جو یہ فرمایا کہ "سب رسولوں پر ایمان لاؤ" حالانکہ موقع و محل کا تقاضا محمد ﷺ پر ایمان کے ذکر کا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پر بھی ایمان اسی صورت میں تسلیم کیا جائے گا جب سب کو مانا جائے، کیونکہ ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝﴾

ترجمہ: اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے۔ وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنادیئے جاویں گے اس کا جس میں انھوں نے بخل کیا تھا اور اخیر میں آسمان وزمین اللہ ہی کا رہ جاوے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر قصہ کے ختم پر اس سے متعلق باتوں کا بیان ہو چکا، جن کے تعلق کی وجہ آیت ۱۷۶ تا ۱۷۹ کے ربط کے عنوانات میں بیان ہوئی ہے، اب پھر اس مضمون کی طرف رجوع ہے جو اس قصہ سے پہلے بیان ہو رہا تھا یعنی اہل کتاب خاص طور سے یہود کی بری اور مذموم باتوں، حرکتوں اور اعمال کا جو کفار سے بحث وحجت کے مضمون کی وجہ سے لایا گیا تھا اور جو اس سورت کا خلاصہ ہے، تو ان کی دیگر برائیوں میں سے ایک امر یہ تھا کہ قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب کے لئے جو آیتیں ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ جیسی نازل ہوئیں تو بعض یہود خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر بکنے لگے کہ (نعوذ باللہ) آپ کا رب مفلس ہو گیا کہ اپنے بندوں سے قرض مانگنے لگا، ان کی اس بیہودگی پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بعد والی آیت ۱۸۱ یعنی ﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ ﴾ نازل فرمائیں جیسا کہ لباب النقول میں ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اصل مقصود تو وہ آیت ہے اور یہ آیت یعنی ﴿ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ ﴾ جس پر اب گفتگو ہو رہی ہے، اس مقصود کی تمہید ہے، اس لئے ان کی اس بیہودگی کے سبب کا ایک جز ان کا بخل بھی تھا، جیسا کہ دوسرا جز ان لوگوں کا بے ادبی اور بغض وعناد کی عادت بھی تھا، اس لئے پہلی آیت میں بخل کی مذمت بیان فرماتے ہیں، جس میں ایسے لوگوں کے گلے میں بخل کر کے جمع کی ہوئی دولت کا طوق بنا کر ڈالنے کی وعید بھی شامل ہے اور دوسری آیت میں ان کی گستاخی کا اظہار فرماتے ہیں جس میں جلا ڈالنے والی آگ کے عذاب کی وعید بھی ہے۔

بخل کی مذمت:

اور ایسے لوگ جو (ضروری موقعوں پر) ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے، ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے (کیونکہ اس بخل کا انجام یہ ہوگا کہ) ان لوگوں کو قیامت کے دن طوق پہنادیئے جائیں گے، اس (مال) کے (سانپ بنا کر) جس میں انھوں نے بخل کیا تھا اور (بخل کرنا بڑی حماقت ہے کیونکہ) آخر میں (جب سب مرجائیں گے) آسمان اور زمین اور جو کائنات ان کے اندر ہیں سب اللہ ہی کا رہ جائے گا (لیکن وہ تمہارے اختیار کے بغیر ہوگا، جس میں اجر نہیں، اس لئے اگر خود اپنے اختیار ہی سے دیدو تو اجر بھی مل جائے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال (کے باطن

تک) کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کچھ خرچ کرو خلوص دل کے ساتھ خرچ کرنا)

تفسیر: اس طوق کے پہنائے جانے کی کیفیت بخاری کی حدیث میں آئی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ مال دے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس کا وہ مال قیامت کے دن ایک زہریلے سانپ کی شکل بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ اور وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور نے یہ آیت پڑھی۔

یہ احقر کہتا ہے کہ ترجمہ میں جو یہ قید لگائی گئی کہ ''ضروری موقعوں پر'' ان سے ایسے ہی واجب حقوق زکوٰۃ وغیرہ مراد ہیں تو حدیث میں زکوٰۃ کی تخصیص مثال کے طور پر ہے، حصر کے طور پر نہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ایسی ہی وعید ذی رحم یعنی خاندان کے قریبی لوگوں کو نہ دینے پر آئی ہے، کیونکہ وسعت رکھنے والے پر مجبور ذی رحم کی اعانت بھی واجب ہے۔

اور یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگرچہ آیت میں اس کے الفاظ کے عموم کی وجہ سے یہود شامل ہو سکتے ہیں، لیکن کفار کا فروع کا مکلّف نہ ہونا ممانعت کا قرینہ ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جو علماء اس کے قائل ہیں، ان کے قول پر یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہود کے اس بخل سے آیات کا کفر اور جزائے وعدہ کی تکذیب ہوتی ہے، چنانچہ معنی کے لحاظ سے یہ وعید کفر پر ہے، جس کو ترک کرنے کے وہ مکلّف ہیں، خوب سمجھ لو۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۱۸۲﴾﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے سن لیا ہے ان لوگوں کا قول جنھوں نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم ان کے کہے ہوئے کو لکھ کر رہیں گے اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے کہ چکھو آگ کا عذاب، یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔

ربط: تمہید کے بعد اب اس موقع کے مقصود کا بیان ہے۔

یہود کی گستاخی کا بیان:

بیشک اللہ تعالیٰ نے ان (گستاخ) لوگوں کا قول سن لیا ہے جنھوں نے (مذاق اڑاتے ہوئے) یوں کہا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ فقیر و مفلس ہے اور ہم غنی و مالدار ہیں (اور صرف سننے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے گا بلکہ) ہم ان کی کہی ہوئی بات کو (ان کے نامۂ اعمال میں) لکھ کر رہیں گے اور (اسی طرح) ان کا (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنا بھی

(ان کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا) اور ہم (ان پر سزا جاری کرنے کے وقت جتانے کے طور پر) کہیں گے کہ (لو) آگ کا عذاب چکھو (اور انہیں روحانی اذیت پہونچانے کے لئے ان سے اس وقت یہ بھی کہا جائے گا کہ) یہ (عذاب) ان (کفریہ) اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے سمیٹے ہیں اور یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں ہیں (چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر کسی جرم کے سزا نہیں دی ہے)

تفسیر: ظاہر یہی ہے کہ یہود کا اس قول کے مطابق اپنا عقیدہ تو نہیں ہوگا، اس لئے انھوں نے یہ بات مذاق اڑانے کی نیت سے کہی، اور اس سے مقصود قرآنی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب تھی، چنانچہ آگے آیت ﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ ﴾ سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، اس لئے ان کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ان آیتوں کا مضمون صحیح ہو تو اس سے خالق یعنی اللہ تعالیٰ کا فقیر اور مخلوق کا غنی ہونا لازم آتا ہے، اور یہ لازم باطل ہے اس لئے ان آیتوں کا مضمون صحیح نہیں، خود قرآن کو اس طرح جھٹلانا بھی کفر ہے، پھر اس کو مذاق اڑانے کے انداز میں بیان کرنا یہ کفر سے بھی بڑھ کر کفر ہے، کیونکہ بغیر جھٹلائے بھی مذاق اڑانا کفر ہوتا ہے، اور دونوں کا جمع ہونا تو اور بھی شدید سخت ہو گیا۔

اور اگرچہ اہل حق کے کلام میں بھی ایسی باتوں کے لازم آنے کو باطل قرار دے کر ملزوم کو باطل ثابت کیا جاتا ہے، لیکن وہاں تکذیب یعنی جھٹلانے کا استہزاء یعنی مذاق اڑانے کا تعلق باطل امر سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ممانعت کی ضرورت نہیں، اور یہاں تکذیب اور استہزاء امر حق کا ہے، اس لئے یہ وعید کا باعث ہوا۔ خوب سمجھ لو۔

اور نامۂ اعمال میں درج کرا دینے میں یہ حکمت ہے کہ اس سے مجرم کے خلاف حجت قوی ہو جاتی ہے، ورنہ حق تعالیٰ کو اس کی حاجت نہیں تو ایسے امور کا انکار یا تاویل کرنا محض کفر یا بدعت ہے۔ اور اس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے قتل کی بات کا ذکر فرمانا اس امر کے بتانے کے لئے ہے کہ اس قول میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تو صرف تکذیب ہی کی ہے، ورنہ یہ تو جرائم میں ایسے جری اور بے باک ہیں کہ تکذیب سے بڑھ کر انبیاء کو قتل تک کر چکے ہیں، تو ایسے لوگوں سے محض تکذیب یا استہزاء کا صادر ہونا کونسی تعجب کی بات ہے۔

اور یہ شبہ کہ قتل تو ان کے بڑوں نے کیا تھا انھوں نے تو نہیں کیا، پھر اس کو ان سے جوڑنے کا کیا مطلب؟ اس کا جواب سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۵ کے تحت انیسویں معاملہ کے عنوان کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

اور بغیر جرم کے سزا دینا اگرچہ حق تعالیٰ کے مالک و مختار ہونے کے لحاظ سے واقع میں ظلم نہیں ہے، لیکن اس کے ارحم الراحمین ہونے کے لحاظ سے ظلم کی صورت بھی منفی ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ اس مقام پر ان کی گستاخی پر صرف وعید فرمائی ہے اور ان کے اعتراض کے مقدمات کے جواب کی تصریح نہیں فرمائی گئی، کیونکہ ان مقدمات کا باطل ہونا واضح ہے، اور وہ اعتراض محض ظاہری فساد کا مغالطہ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا انفاق کی ترغیب فرمانا ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے نہ اپنے نفع کے لئے کہ اس کو عام معنی میں سوال کہا جائے اور اس کو قرض وغیرہ کہہ دینا محض مجاز کے طور پر ہے، جزاء

میں مبالغہ کے لئے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: وہ ایسے لوگ ہیں کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم فرمادیا تھا کہ ہم کسی پیغمبر پر اعتقاد نہ لاویں جب تک کہ ہمارے سامنے معجزہ نذر ونیاز خداوندی کا ظاہر نہ کرے کہ اس کو آگ کھا جاوے، آپ فرمادیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت دلائل لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا اگر تم سچے ہو۔

ربط: اوپر کی آیت میں یہود کی بداعمالیوں میں سے ایک برائی کا ذکر تھا، دوسرا امر انہی بداعمالیوں میں سے اب بیان کیا جاتا ہے۔

یہود کا افتراء:

وہ (یہود) ایسے لوگ ہیں کہ (بالکل جھوٹ گھڑ کر) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں (سابق انبیاء کے واسطہ سے) حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی نبوت (کے مدعی) پر عقیدہ و یقین نہ کریں جب تک کہ وہ ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کی نذر ونیاز کا (خاص) معجزہ ظاہر نہ کرے کہ اس کو (آسمانی) آگ کھا جائے (پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھایا ہے کہ کوئی جاندار یا غیر جاندار چیز اللہ کے نام کی نکال کر کسی میدان میں یا پہاڑ پر رکھ دی، غیب سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اس چیز کو جلا دیا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے یہ معجزہ ظاہر نہیں فرمایا، اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، حق تعالیٰ اس کا جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ فرمادیجئے کہ یقینی طور پر بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سی دلیلیں (معجزات وغیرہ) لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہو، پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا تھا اگر تم (اس امر میں) سچے ہو؟ (جو کہ تمہارے اس قول کا مطلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے)

تفسیر: یہود کے اس دعوی کے دو جزء ہیں: ایک واضح طور پر یہ کہنا کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم فرمایا تھا، دوسرے ان کے اس قول سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر آپ یہ معجزہ ظاہر فرماتے تو ہم آپ پر ضرور ایمان لے آتے، چنانچہ پہلے جزء کا جواب تو یہ ہے کہ تم مدعی ہو اور مدعی یعنی دعوی کرنے والے پر اپنے دعوی کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بغیر ثبوت و دلیل کے دعوی قابل قبول نہیں ہوتا، اور یہود کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تھی کہ انہیں تمام انبیاء کے سلسلہ میں ایسا کوئی حکم دیا گیا، اس کا دعوی ان کا محض افتراء تھا۔

البتہ بعض انبیاء سے یہ معجزہ ظاہر ضرور ہوا ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ تمام انبیاء پر ایمان لانے کے لئے یہ

شرط بھی ہو، البتہ مطلق معجزہ یا کسی نبی کی نبوت کے ثبوت کی علامت کا مصداق ہونا واقعی شرط ہو تو حضور اقدس ﷺ کی ذات مبارک میں یہ دونوں امر کمال اور وضاحت کے درجہ میں جمع تھے۔ لیکن یہ جواب اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ یہ بہت واضح اور ظاہر تھا، اس لئے صرف دوسرے جزء پر اکتفا کیا گیا جس کی تقریر اگلی آیت میں موجود ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم اس معاملہ میں سچے ہو تو جن انبیاء نے یہ معجزہ ظاہر کیا ان پر کیوں ایمان نہیں لائے، کہ ایمان تو کیا لاتے ان کی تکذیب سے بھی آگے بڑھ کر انہیں قتل تک کر دیا۔ خاص طور سے ایسی حالت میں کہ انھوں نے اور معجزے بھی دکھائے، جن سے ایمان کے وجوب کا تقاضہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

اور یہ شبہ کہ قتل ان کے بڑوں نے کیا تھا، اس کا جواب اوپر کی آیت کے ذیل میں دیکھ لیا جائے۔ اور یہ شبہ کہ پھر حضور ﷺ کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ظاہر ہو جاتا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درخواست محض عناد کے طور پر تھی، دل سے ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ ایسا ہونے سے ایمان لے آئیں گے، دوسرے مدعی کے ذمہ مطلق دلیل ہے، خاص دلیل نہیں ہے، اس بارہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۸ و ۱۰۹ کے تحت معاملہ ۳۳ و ۳۴ دیکھ لینے سے اس کی مزید توضیح ہو سکتی ہے۔ فقط

﴿ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ﴾

ترجمہ: سو اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گذرے ہیں تکذیب کی جا چکی ہے جو معجزات لے کر آئے تھے اور صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر۔

ربط: اوپر یہود کے جو دو قول بیان کئے گئے ہیں: ایک اللہ فقیر و مفلس ہے اور دوسرے اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔ چونکہ ان دونوں سے ان کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنا تھا، جس سے فطری بات ہے آپ کو رنج ہوتا تھا اور کفار بھی اس تکذیب میں شریک تھے، جس سے رنج مزید بڑھ جاتا تھا، اس لئے اس آیت میں جناب رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں۔

کفار کی تکذیب کے معاملہ میں رسول اللہ کو تسلی:

تو اگر یہ (کفار) لوگ آپ کو جھٹلائیں تو (غم نہ کیجئے، کیونکہ) بہت سے پیغمبروں کو جو آپ سے پہلے گذرے ہیں، جھٹلایا جا چکا ہے، جو معجزات اور (چھوٹے چھوٹے) صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے (جب دوسروں کو بھی جھٹلایا جا چکا ہے تو آپ کی تکذیب کوئی نئی بات نہیں ہے، پھر غم کیا)

فائدہ: بعض انبیاء صرف معجزے لائے، بعض چھوٹی کتابیں اور بعض بڑی کتاب جیسے تورات و انجیل، اور چونکہ کتاب سے بڑی کتاب مراد ہے اور بڑی کتاب شان اور مضامین میں زیادہ ہوگی، اس لئے اس کی صفت میں لفظ منیر یعنی روشن بڑھایا کہ اس میں شان اور مضامین دونوں کے اعتبار سے ظہور کے معنی زیادہ ہوں گے۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝﴾

ترجمہ: ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور تم کو تمہاری پوری پاداش قیامت ہی کے روز ملے گی تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا۔ اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے۔

ربط: اوپر جھٹلانے والوں کا بیان تھا، اب جھٹلانے والوں کے لئے وعید ایک خاص انداز میں بیان کی گئی ہے، جس میں تصدیق کرنے والوں کے لئے بشارت بھی آگئی۔

جھٹلانے والوں کے لئے وعید اور تصدیق کرنے والوں کے لئے وعدہ:

(تم میں سے) ہر جاندار کو موت کا مزہ (ضرور) چکھنا ہے اور تمہیں (مرنے کے بعد) تمہارا پورا بدلہ (تمہاری بھلائی اور برائی کا) قیامت ہی کے دن ملے گا (تو اگر دنیا میں اس کا ظہور نہ ہوا تو جھٹلانے والا بے فکر نہ ہو اور تصدیق کرنے والا مایوس نہ ہو۔ آگے اس بدلہ کی تفصیل ہے) تو (قیامت کے دن) جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ پوری طرح کامیاب ہوا (اس طرح جو جنت سے محروم رہا اور جہنم میں ڈال دیا گیا وہ پوری طرح ناکام ہوا) اور دنیاوی زندگی تو دھوکے کے سودے کے سوا کچھ بھی نہیں (جس کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر خریدار دھوکا کھاجاتا اور پھنس جاتا ہے، اور پھر بعد میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے، اسی طرح دنیا کی چمک دمک سے دھوکہ کھا کر آخرت سے غافل نہیں ہونا چاہئے)

فائدہ: آیت کا مطلب ظاہر ہے، البتہ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا، اس سے مراد عام ہے، خواہ ابتدا ہی میں بچالیا جائے یا سزا کے بعد، اس میں تمام مسلمان آگئے، اور ان کے پورے کامیاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہمیشہ کے لئے ہر طرح کی نعمتیں پائیں گے، اس بنا پر اس مقابلہ میں جو واقع ہے کہ جو جنت سے محروم رہا، اس سے مراد یہ ہوگی کہ ہمیشہ کے لئے محروم رہا تو یہ کفار کے ساتھ خاص ہوگا اور اس کا پوری طرح ناکام ہونا اس لئے ہے کہ کبھی تکلیف سے نجات نہ ہوگی اور کبھی راحت نصیب نہیں ہوگی۔

اور دھوکے کا سودا جو فرمایا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیوی زندگی سب کے لئے نقصان دہ ہے۔ تشبیہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیا اصلی مقصود بنانے کے قابل نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی شریف آدمی جان بوجھ کر یہ سودا اونچے داموں میں خریدنے لگے تو اس سودے سے محبت نہ کرے، بلکہ مناسب موقع دیکھ کر فروخت کر ڈالے۔ چنانچہ اہل حق اس زندگی اور اس کے فوائد و منافع کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے اعمالِ صالحہ اور جنت میں اعلیٰ درجے لے لیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبہ ۱۱۱)

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ١٨٦ ﴾

ترجمہ: البتہ آگے اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں میں اور اپنی جانوں میں اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دلآزاری کی ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں۔ اور اگر صبر کرو گے اور پرہیز رکھو گے تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے۔

ربط: اوپر یہود کی گستاخی کا بیان تھا، جس کا قصہ آیت ۱۸۰ کے ربط کی تقریر میں بیان ہوا۔ اس قصہ میں یہ بھی ہے کہ یہی گفتگو فنحاص یہودی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کی تھی، جس پر آپ کو بہت غصہ آیا اور آپ نے اس کے ایک طمانچہ بھی مارا، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں خبر دی گئی کہ ایسی ایسی اور بھی باتیں سننے کو ملیں گی، ان پر مسلمانوں کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے (لباب النقول بروایت ابن ابی حاتم و ابن المنذر عن ابن عباس)

اور لباب ہی میں ایک اور بھی شانِ نزول بیان ہوا ہے کہ کعب بن اشرف یہودی جناب رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں ہجو کے اشعار کہا کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (عبدالرزاق عن عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک)

میں کہتا ہوں کہ دونوں قصوں میں مشترک بات ایک ہی ہے کہ آیت میں یہود کی بداعمالیوں کا بیان ہے، اور مسلمانوں کو صبر کی تعلیم دی گئی ہے اور چونکہ یہود کے ساتھ مشرک بھی مسلمانوں کو ایذا پہنچانے میں شریک تھے، اس لئے ساتھ میں ان کا بھی ذکر بڑھا دیا، اور چونکہ صبر اور ثابت قدمی کا تعلق صرف ایذا ہی سے نہیں ہے بلکہ تمام حوادث میں اس کا حکم ہے، اس لئے اموال و انفس یعنی جان و مال کا ذکر بھی ملا دیا اور اس میں خاص طور سے اس لئے لطافت اور بڑھ گئی کہ احد کے واقعہ میں جس پر سورت کا بڑا حصہ مشتمل ہے، مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان بہت زیادہ پہنچا تھا، وہ قتل بھی ہوئے، زخمی بھی ہوئے اور غنیمتیں بھی فوت ہوئیں۔

یہود کی ایذا رسانی پر مسلمانوں کو صبر کی تعلیم:

(ابھی کیا ہے) البتہ آگے (آگے) اپنے مالوں (کے نقصان میں) اور اپنی جانوں (کے نقصان) میں اور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً آگے دل آزاری کی باتیں اور سنو گے۔ ان لوگوں سے (بھی) جن کو تم سے پہلے (آسمانی کتاب دی گئی ہے، یعنی اہل کتاب سے) اور ان لوگوں سے (بھی) جو مشرک ہیں، اور اگر (ان مواقع پر) صبر کرو گے اور (خلاف شرع امور سے) پرہیز رکھو گے تو (تمہارے لئے اچھا ہوگا، کیونکہ) یہ (صبر و تقوی) تاکیدی احکام میں سے ہیں (اور تاکیدی احکام پر عمل کرنا ہی اچھا ہے)

تفسیر: آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے حوادث وقتاً فوقتاً تمہیں پیش آتے رہیں گے، اس کو مجازاً آزمانا کہہ دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ آزمانے کے حقیقی معنی سے پاک ہے، کیونکہ وہ عالم الغیب ہے، اور صبر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی تدبیر نہ کرو، یا انتقام کے مواقع میں بھی انتقام نہ لو یا قتال کے مواقع میں قتال نہ کرو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حوادث سے دل تنگ نہ ہو، کیونکہ اس میں تمہارے لئے منافع اور مصالح ہیں، اور تقویٰ یہ ہے کہ خلافِ شرع امور سے بچو، تاہم تدبیر بھی کی جائے، اس طرح آیاتِ صبر، آیاتِ قتال سے ٹکرانے والی نہیں ہیں کہ منسوخ قرار دینے کی ضرورت پڑے، اس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غصہ اور ادب سکھانا بھی خلافِ صبر نہیں تھا، اور ان حوادث کی پہلے سے اس لئے خبر دیدی تا کہ پہلے سے آمادہ رہیں اور وقت پر پریشان نہ ہوں۔ فقط

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ اس کتاب کو عام لوگوں کے روبرو ظاہر کر دینا اور اس کو پوشیدہ مت کرنا، سو ان لوگوں نے اس کو اپنی پشت کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے مقابلہ میں کم حیثیت معاوضہ لے لیا، سو بری چیز ہے جس کو وہ لوگ لے رہے ہیں۔

ربط: جیسا کہ اوپر کی آیت میں یہود کی بداعمالیوں کا بیان تھا۔ اس آیت میں بھی ان کی ایک گھناؤنی خصلت کا ذکر ہے اور وہ احکام کے اظہار کا اور حق کو نہ چھپانے کے معاہدہ کا توڑنا ہے۔

حق کو چھپانے کے سلسلہ میں اہل کتاب کی مذمت:

اور (یہ حالت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (سابقہ کتابوں میں) اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا (یعنی انہیں حکم فرمایا اور انھوں نے قبول کرلیا) کہ اس کتاب (کے تمام مضامین) کو عام لوگوں کے سامنے ظاہر کر دینا اور اس (کے کسی مضمون) کو (دنیاوی غرض سے) چھپا کر مت رکھنا تو ان لوگوں نے اس (عہد) کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا (یعنی اس پر عمل نہیں کیا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کا) معمولی سا معاوضہ لے لیا، تو بری چیز ہے جس کو وہ لوگ لے رہے ہیں (کیونکہ اس کا انجام جہنم کا عذاب ہے)

فائدہ: سورۃ البقرۃ کی آیت ۴۰ میں اس عہد کا اور ان لوگوں کے دنیا اختیار کرنے کا مضمون بیان ہو چکا ہے اور دنیوی غرض کی قید اس لئے لگائی گئی کہ اگر کسی مشکل مسئلہ کو کسی دینی مصلحت کے تحت کسی بدفہم کے سامنے بیان نہ کیا جائے کہ کہیں اس کے لئے فتنہ کا باعث نہ ہو جائے اور اس وقت اس کی ضرورت بھی نہ ہو تو یہ جائز بلکہ ضروری ہے اور جن مضامین کو یہ اہل کتاب چھپاتے تھے، ان میں سے بڑا امر رسول اللہ ﷺ سے متعلق پیشین گوئی تھی، چونکہ خود انہیں ایمان لانا منظور

نہیں تھا، اس لئے اس کو دوسروں سے بھی چھپاتے تھے۔

﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

ترجمہ: جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ خاص طور کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

ربط: اوپر یہود کے کتمان حق یعنی حق کو چھپانے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کوششوں کا بیان تھا، چونکہ ان لوگوں کو اس گھناؤنی حرکت پر شرمندگی اور پشیمانی کی بجائے الٹا اس پر فخر تھا، اس لئے اس آیت میں اس پر وعید بیان کی گئی ہے۔

معصیت پر خوشی پر وعید:

(اے مخاطب) جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنی بدکرداریوں پر خوش ہوتے ہیں اور جو (نیک) کام نہیں کیا اس پر تعریف چاہتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ (دنیا میں) خاص قسم کے عذاب سے بچاؤ (اور حفاظت) میں رہیں گے (ہرگز نہیں بلکہ دنیا میں بھی کچھ سزا ہوگی) اور (آخرت میں بھی) انہیں دردناک سزا ہوگی۔

تفسیر: بدکرداری یہی ہے کہ صحیح احکام کو چھپاتے تھے اور جو نیک کام نہیں کیا اس سے حق کا اظہار مراد ہے جس کو وہ نہیں کرتے تھے، لیکن دوسروں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ہم اظہار حق کرتے ہیں تاکہ ان کا مکروفریب ظاہر نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ کے روبرو بھی یہ حرکت کی (بخاری) اور یہود میں جو منافق تھے، وہ بھی اکثر غزوات کے موقعوں پر جھوٹے عذر کر کے ایسا ہی فریب دینے کی کوشش کرتے تھے (بخاری ومسلم) یہ آیت ان سب افعال سے متعلق نازل ہوئی اور آیت کے اپنے الفاظ کے عموم کی وجہ سے اس میں دوسرے بھی شامل ہیں جو ایسی حرکت کریں، لیکن اس خوشی سے مراد معصیت پر خوش ہونا اور تعریف چاہنے سے مراد تعریف کا اہتمام ہے اور اگر اچھے کاموں پر خوش ہونا بھی اہتمام کے ساتھ ہو تو شرعی قواعد کی رو سے وہ بھی مذموم ہے۔ البتہ اچھے کاموں پر جو خوشی، طبعی وفطری ہو، اسی طرح جو کام نہیں کیا اس پر تعریف چاہنا طبعی طور پر ہو تو وہ معصیت نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ ان یہود کو دنیا کی سزا یہ ہوئی کہ بعض قتل ہوئے، بعض جلاوطن ہوئے اور منافقوں کو یہ سزا ہوئی کہ وہ رسوا اور ذلیل ہوئے۔

﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ ع ۱۹ / ۱۰

ترجمہ: اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر اہل کفر کی سزا کا ذکر تھا، چونکہ سزا دینے کے لئے اختیار اور قدرت لازمی ہے، اس لئے اس آیت میں اس کو

ثابت کیا ہے۔

اللہ کی قدرت وسلطنت کا اثبات:

اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے (خاص) ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

فائدہ: چونکہ وہ سلطان حقیقی ہیں سب کو ان کا حکم ماننا ضروری ہے، اور نافرمانی جرم ہے، اور چونکہ وہ قادر ہیں، اس لئے جرم کی سزا دے سکتے ہیں، اور چونکہ انھوں نے اس سزا کی خبر دی ہے اس لئے ضرور سزا دیں گے اور چونکہ یہ صفات ان کے ساتھ خاص ہیں، اس لئے وہ جس کو سزا دیں اسے کوئی بچا نہیں سکتا، اس طرح ان مقدمات سے اوپر کے مضمون کی تاکید ہوگئی۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۝﴾

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا، ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں، سو ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے۔ اے ہمارے پروردگار! بے شبہ آپ جس کو دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا اور ایسے بے انصافوں کا کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان لانے کے واسطے اعلان کر رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے پروردگار! پھر ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کر دیجئے اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجئے۔ اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو وہ چیز بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے اور ہم کو قیامت کے روز رسوا نہ کیجئے، یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔

ربط: چونکہ اوپر والی آیت سے خاص طور پر توحید معلوم ہوئی، اس لئے اب ان آیات میں توحید پر دلیل پیش فرماتے ہیں، اور اس کے ساتھ توحید کے کامل تقاضوں پر عمل کرنے والوں کی فضیلت بیان فرماتے ہیں، جس میں دوسروں کو بھی ان

تقاضوں پر عمل کرنے کی ترغیب ہے بطور اشارہ، اور اوپر جو کفار سے ایذائیں پہنچنے کا مضمون تھا، اس آیت میں اس سے بھی مناسبت ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ سے بطور عناد یہ درخواست کی کہ صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حق کے دلائل تو بہت ہیں ان میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے (لباب النقول بروایت الطبرانی وابن ابی حاتم عن ابن عباس) سورۂ بقرہ کا معاملہ ۳۳ و ۴۰ بھی ملاحظہ کرلیا جائے، اس سے یہ شبہ دور ہوجائے گا کہ پھر ان کی یہ درخواست کیوں نہ پوری کردی گئی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ درخواست حق کی تحقیق کے لئے نہیں تھی، بلکہ عناد کے طور پر تھی جس کی وجہ سے درخواست پوری ہونے پر بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ فقط

توحید کی دلیل اور کامل موحدوں کی فضیلت:

بیشک آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل ودانش کے (استدلال کے) لئے (توحید کی) دلیلیں (موجود) ہیں، جن کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور یہی حالت ان کے عاقل ہونے کی علامت بھی ہے، کیونکہ عقل کا تقاضا مضرت کو دور کرنا اور منفعت کا حاصل کرنا ہے اور اس حالت کا مجموعہ اس پر دلالت کرتا ہے، وہ حالت یہ ہے) کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی عقل کی قوت سے) غور کرتے ہیں (اور غور وفکر کا جو نتیجہ ہوتا ہے یعنی ایمان کا حدوث یا تجدید وتقویت اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی، بے کار پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں۔ جن میں ایک بڑی نعمت یہ بھی ہے کہ اس مخلوق سے، خالق تعالیٰ کے وجود اور توحید پر استدلال کیا جائے) ہم آپ کو (لایعنی پیدا کرنے سے) پاک ومنزہ سمجھتے ہیں (اس لئے ہم نے استدلال کیا اور توحید کے قائل ہوگئے) سو آپ ہمیں (توحید پرست اور مؤمن ہونے کی وجہ سے) دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے (جیسا کہ شرعی طور پر اس کا یہ تقاضا ہے، اگرچہ کسی وجہ سے یہ تقاضا کمزور ضعیف ہوجائے اور کچھ عذاب ہونے لگے) ان لوگوں کی ایک درخواست یہ بھی تھی۔ اور وہ ایمان کے اس مضمون کے مناسب دوسری معروضات بھی کرتے ہیں جو آگے آتی ہیں۔

دوسری درخواست:

اے ہمارے پروردگار! (ہم دوزخ کے عذاب سے اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ) بیشک آپ جس کو (اصل جزا کے طور پر) جہنم میں داخل کریں، اس کو واقعی رسوا ہی کردیا (اس سے کافر مراد ہیں) اور ایسے ناانصافی کرنے والوں کا (جن کی اصلی جزا جہنم تجویز کی جائے) کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں (اور آپ کا وعدہ ہے اہل ایمان کے لئے رسوا نہ کرنے کا بھی اور نصرت کرنے کا بھی، جیسا کہ سورۃ التحریم آیت ۸ اور سورۃ المؤمن آیت ۵۱ میں ہے) اس لئے ہماری آپ سے درخواست

ہے کہ ہمیں کفر کی اصلی جزا سے بچائیے ایمان کا جو اصلی تقاضا جہنم سے نجات ہے وہ مرتب فرمائیے۔ اور اس تقاضہ کی جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنے کی چوتھی درخواست آگے آتی ہے۔

تیسری درخواست:

اے ہمارے پروردگار! ہم نے (جس طرح بنی ہوئی چیزوں کی دلالت سے عقلی استدلال کیا، اسی طرح ہم نے) ایک پکارنے والے کو (اس سے مراد محمد ﷺ ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ) سنا کہ وہ ایمان لانے کے واسطے بلا رہے ہیں کہ (اے لوگو!) تم اپنے پروردگار (کی ذات وصفات پر) ایمان لے آؤ تو ہم (اس دلیل نقلی سے بھی استدلال کرکے) ایمان لے آئے (اس درخواست کے مضمون میں اب ہر ایمان کے ساتھ ضمناً رسول پر ایمان بھی آ گیا، اس طرح ایمان کے دونوں جزء یعنی توحید کا عقیدہ اور رسالت کا عقیدہ کامل ہوگئے)

چوتھی درخواست:

اے ہمارے پروردگار! (اس کے بعد ہماری یہ درخواست ہے کہ) ہمارے (بڑے) گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے اور ہماری (چھوٹی) برائیوں کو بھی ہم سے (معاف کرکے) دور کر دیجئے۔ اور (ہمارا انجام بھی جس پر مدار ہے درست کیجئے، اس طرح کہ) ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ (شامل رکھ کر) موت دیجئے (یعنی نیکی پر خاتمہ فرمائیے)

پانچویں درخواست:

اے ہمارے پروردگار! اور (جس طرح ہم نے اپنی مضرتوں سے محفوظ رہنے کے لئے عرض کیا ہے، جیسے جہنم کی رسوائی سے اور گناہوں اور برائیوں سے، اسی طرح ہم اپنے منافع کی دعا کرتے ہیں کہ) ہمیں وہ چیز (یعنی ثواب اور جنت) بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے (کہ مؤمنوں اور نیک لوگوں کو اجر عظیم ملے گا) اور (یہ ثواب اور جنت ہمیں اس طرح دیجئے کہ ثواب ملنے سے پہلے بھی) ہمیں قیامت کے روز رسوا نہ کیجئے (جیسا کہ بعض کو پہلے سزا ہوگی پھر جنت میں جائیں گے، مطلب یہ کہ ابتدا ہی سے جنت میں داخل کر دیجئے اور) یقیناً آپ (تو) وعدہ خلافی نہیں کرتے (لیکن ہمیں یہ خوف ہے کہ جن کے لئے وعدہ ہے یعنی مؤمن اور ابرار یعنی نیک لوگ، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ ہم ان صفات کے حامل نہ رہیں جن پر وعدہ ہے، اس لئے ہم آپ سے یہ التجائیں کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے وعدہ کی چیزیں دیجئے یعنی ہمیں ایسا کر دیجئے اور ایسا ہی رکھئے جس سے ہم وعدہ کے مخاطب اور محل ہو جائیں)

فائدہ: سموت اور ارض وغیرہ سے توحید پر استدلال کی تقریر سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ لکھی جا چکی ہے، اور سمعنا کے ترجمہ میں جو احقر نے بالواسطہ یا بلاواسطہ بڑھا دیا ہے، وہ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ

کی پکار کو صحابہ نے تو بلاواسطہ سنا اور ہم نے بالواسطہ۔ اور دعا کا مضمون تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے، اس لئے سننے کو عام کر دیا گیا اور یہ جو فرمایا کہ ''پیغمبروں کی معرفت'' حالانکہ صرف یہ کافی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی معرفت، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وعدہ میں تمام انبیاء کا مضمون ایک ہی ہے، اور اس سے وعدہ کی تاکید ہوگئی، یعنی بار بار ہر زمانہ میں اس وعدہ کی تجدید ہوتی رہی۔

ان دعاؤں میں تمام مقاصد جو طلب کئے جاتے ہیں، آگئے کیونکہ مقاصد کا منتہی دو امر ہیں ایک جنت ملنا اور دوسرے دوزخ سے بچنا اور دونوں کے لئے دو شرطیں ہیں: ایک طاعات کا وجود اور دوسرے معاصی کا نہ ہونا، اس طرح کل چار چیزیں ہوئیں، چنانچہ ﴿ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ میں امر نمبر دو اور ﴿ فَاغْفِرْ لَنَا ﴾ میں امر نمبر چار اور ﴿ وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا ﴾ میں امر نمبر ایک اور تین کی درخواست ہے۔

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾

ترجمہ: سو منظور کیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو، سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں اور جہاد کیا اور شہید ہو گئے ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی، یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

ربط: اوپر ان لوگوں کی دعاؤں کا بیان تھا جو عقلی و نقلی دلائل میں غور و فکر کر کے ایمان لے آئے، اب ان کی دعاؤں کا قبول ہونا ﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ ﴾ میں اور اس قبول کی علت ﴿ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ ﴾ میں پھر اس علم پر کہ حقیقت میں ایک قاعدہ کلیہ ہے، اس سورت کے مضمون کے مناسب ایک تفریع مقصود ہے جو کہ کفار کی ایذا رسانی اور جہاد پر صبر و بحث وجحت ہے: بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا دعاؤں کی قبولیت، علت اور علت پر تفریع:

سو ان کے رب نے ان کی درخواست منظور کر لی، اس وجہ سے کہ (میری مستقل عادت ہے کہ) میں کسی شخص کے

(نیک) کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہو، ضائع نہیں کرتا (کہ اس کا صلہ نہ دوں) خواہ وہ (کام کرنے والا) مرد ہو یا عورت ہو (دونوں کے لئے یکساں قانون ہے، کیونکہ) تم (دونوں) آپس میں ایک دوسرے کے جزء ہو (اس لئے حکم بھی دونوں کا ایک ہی جیسا ہے، تو جب ان لوگوں نے ایمان کو جو کہ ایک نیک عمل ہے، قبول کر کے اس کے ثمرات کی درخواست کی تو میں نے اپنی مستقل عادت کے مطابق اس کو قبول کر لیا، اور چونکہ ہم ایمان پر اس کے اصل تقاضہ کے مطابق ایسے ثمرات عطا فرماتے ہیں) تو جن لوگوں نے (ایمان کے ساتھ دوسرے مشقت و دشواریوں والے کام ہجرت وغیرہ بھی کئے ہیں) ترک وطن کیا اور (وہ بھی ہنسی خوشی سیر و سیاحت کے لئے نہیں، بلکہ اس طرح کہ) اپنے گھروں سے (تنگ کر کے) نکالے گئے (یعنی وطن میں کفار نے پریشان کیا، بیچارے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر پردیس کو نکل کھڑے ہوئے) اور جن لوگوں کو (اس کے سوا دوسری بھی طرح طرح کی) تکلیفیں میری راہ میں دی گئیں (یعنی یہ سب باتیں ہجرت اور وطن سے نکالا جانا اور ایذا رسانی ان کو میرے دین کے سبب پیش آئیں اور ان سب کو انھوں نے برداشت کیا) اور (اس سے بڑھ کر) انھوں نے (یہ کام کیا کہ) جہاد (بھی) کیا اور (بہت سے ان میں) شہید (بھی) ہو گئے (اور آخر تک جہاد سے نہ ہٹے تو ایسے اعمال پر تو ثمرات کیوں نہ دوں گا) ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں (جو میرے حقوق سے متعلق ہو گئی ہیں) معاف کر دوں گا اور انہیں لازمی طور پر (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی (ان کو) یہ بدلہ اللہ کے پاس سے ملے گا، اور اللہ ہی کے پاس (یعنی ان کے قبضۂ قدرت میں) اچھا بدلہ ہے (وہ اچھا بدلہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دیں گے)

فائدہ: "تمام خطائیں" اس لئے کہا گیا کہ یہاں ہجرت اور جہاد و شہادت کی فضیلت کا بیان ہے اور حدیثوں سے ان اعمال کا تمام پچھلے گناہوں کا کفارہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور دعا کی آیتوں میں کفارہ بنانے کو جس سے دعا کی استجابیت یعنی مقبولیت معلوم ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق اسلام سے جوڑا جائے، کہ اس کا بھی مطلق طور پر کفارہ ثابت ہے اور خواہ کفارہ سے متعلق اس دعا کو استغفار کا صلہ کہا جائے، توبہ کے کفارہ ہونے میں تو شک ہی نہیں ہے، اور "میرے حقوق کے متعلق" کی قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں قرض کا استثناء آیا ہے۔

﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ۝ ﴾

ترجمہ: تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے۔ چند روزہ بہار رہے گی پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔ لیکن جو لوگ خدا سے ڈریں ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری

ہونگی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے۔ اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں، یہ نیک بندوں کے لئے بدرجہا بہتر ہیں۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں مسلمانوں کی تکلیفوں کا بیان اور ان کے نیک انجام کا ذکر تھا، اب کافروں کے عیش وآرام اور ان کی بدانجامی کا ذکر ہے، تاکہ مسلمانوں کو اپنے نیک کاموں کی خوشخبری سے جو تسلی ہوئی تھی اپنے دشمنوں کی بدانجامی کے بارے میں سن کر مزید تسلی ہو اور ان کے عیش وآرام کی طرف حرص کے طور پر یا محض زبانی یا غیظ وغضب کی شکل میں کوئی التفات نہ کریں، پھر اس انجام بد کے معلوم ہونے پر اگر ان میں سے کسی کو توبہ کی توفیق ہو اور کفر ومعاصی سے باز آجائے تو اس انجام بد سے محفوظ رہنا اور اس کو بھی نیک انجام کا نصیب ہو جانا ساتھ کے ساتھ بیان فرمادیا۔

کفار کا انجام بد اور کفر سے توبہ کرنے والوں کا استثناء:

(اے حق کے طلب گار) تجھے ان کافروں کا (دنیا کے فائدوں کے لئے) شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے (کہ اس حالت کی اپنے دل میں کچھ وقعت سمجھنے لگے، یہ) چند روز کی بہار ہے (کیونکہ مرتے ہی اس کا نام ونشان بھی نہ رہے گا) پھر (انجام یہ ہوگا کہ) ان کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ برا ٹھکانا ہے، لیکن (ان میں سے بھی) جو لوگ اللہ سے ڈریں (اور مسلمان ومطیع، فرماں بردار ہوجائیں) ان کے لئے (جنت کے) باغات ہیں، جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے (ان کی) مہمانی ہوگی، اور جو چیزیں اللہ کے پاس ہیں (جن کا ابھی ذکر ہوا یعنی جنتیں اور نہریں وغیرہ) یہ اللہ کے نیک بندوں کے لئے (کفار کے دنیاوی عیش وآرام کے مقابلہ میں) بدرجہا بہتر ہیں (مقدار وتعداد کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے لحاظ سے بھی)

﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ ﴾

ترجمہ: اور بالیقین بعضے لوگ اہل کتاب میں ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کتاب کے ساتھ بھی جو تمہارے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب کے ساتھ بھی جو ان کے پاس بھیجی گئی، اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلہ میں کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے۔ ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا، ان کے پروردگار کے پاس۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب کردیں گے۔

ربط: دعا کی آیتوں سے پہلے اور ان سے متصل اہل کتاب کی بداعمالیوں کا بیان تھا، چونکہ ان میں سے بعض جو مسلمان

ہوگئے تھے، اچھے بھی تھے، اس لئے قرآن کی عادت کے مطابق ان کی بداعمالیوں کے بعد اب ان کی خوبیاں اور مدح وستائش بیان فرماتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے آیت ۱۱۳ آئی تھی، اور چونکہ شانِ نزول کی سب سے مشہور روایتوں کی رو سے وہ آیت نومسلم یہودیوں کے بارے میں تھی، اس کے مقابلہ میں یہ آیت نومسلم نصاری کے بارے میں ہے، اس لئے تکرار بھی لازم نہیں آئی اور اہل کتاب کے لفظ میں یہود و نصاری دونوں شامل ہیں، اور سورت میں دونوں سے بحث وحجت کا سلسلہ تھا، اور اگر دونوں آیتوں کا مصداق ایک ہی مذہب کے نومسلم ہوں تو بھی عنوان کے اختلاف کی وجہ سے تکرار نہیں رہی یا تکرار سے تاکید ہوگئی۔

اہل کتاب مؤمنوں کی مدح:

اور یقینی طور پر اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان ویقین رکھتے ہیں اور اس کتاب پر بھی (ایمان ویقین رکھتے ہیں) جو تمہارے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب کے ساتھ بھی (ایمان ویقین رکھتے ہیں) جو ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی تورات اور انجیل۔ اور اللہ پر جو ایمان رکھتے ہیں تو) اس طرح کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے (بھی) ہیں (اس لئے اس اعتقاد میں شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرتے اور توریت پر جو ایمان رکھتے ہیں تو اس طرح کہ) اللہ تعالیٰ کی آیات (واحکام) کے مقابلہ میں (دنیا کا) معمولی قسم کا معاوضہ نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو ان کا نیک بدلہ ان کے پروردگار کے پاس ملے گا (اور اس میں کچھ دیر بھی نہیں لگے گی، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب (کتاب) کردیں گے (اور حساب کتاب کرتے ہی سب کا لینا دینا بے باق کردیں گے)

تفسیر: ''خاشعین یعنی خشوع کرنے والوں یا اللہ سے ڈرنے والوں'' کی قید لگانے سے احقر کے ترجمہ کی تقریر کی بنا پر یہ سوال واقع نہیں ہوتا کہ اللہ کو اور توریت وانجیل کو تو تمام اہل کتاب مانتے تھے، پھر اس میں اسلام قبول کرنے والوں کی تخصیص کیوں کی؟ واقع نہ ہونے کی وجہ ان قیود سے معلوم ہوگئی، کیونکہ دوسرے اہل کتاب کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغیر خشوع کے تھا، اسی سبب سے اس میں شرعی حدود سے تجاوز کرتے تھے، مثلاً اللہ تعالیٰ پر اولاد کی تہمت لگاتے تھے، کہیں احکام میں افتراپردازی سے کام لیتے تھے، اسی طرح توریت اور انجیل کے ساتھ اعتقاد ان کی آیتوں اور احکام دنیا کی معمولی دگھٹیا قیمت کے بدلہ بیچ دیتے یعنی بدل دیتے تھے، اس لئے تخصیص کی گئی۔ اور قرآن پر چونکہ دوسرے اہل کتاب کا ایمان وعقیدہ مطلق نہیں تھا، اس لئے اس میں کوئی قید نہیں لگائی کہ نفس اعتقاد ہی دونوں میں امتیاز کرتا ہے، اور یہ جو فرمایا کہ جلدی ہی حساب کردیں گے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان لوگوں کا بھی ضرور حساب ہوگا، کیونکہ بہت سے مقبولین کے بلاحساب جنت میں آنے کی بشارت احادیث میں آئی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر جو جلدی حساب کتاب کردیتا ہے، وہ جلدی ہی مزدوری بھی دیدیتا ہے اور اللہ تعالیٰ حساب جلدی کردیں گے تو سمجھ لو کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا بدلہ بھی جلدی ہی

دیدیں گے، خاص طور سے اس لئے کہ قیامت قریب ہے، اس طرح یہ کلام بطور کنایہ ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۟﴾ ع

ترجمہ: اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو۔

ربط: سورت ختم ہو رہی ہے، چونکہ سورت کا اصل مضمون کفار سے بحث و حجت ہے، زبان سے بھی اور ہتھیاروں سے بھی اور اس کے ضمن میں کفار کے ایسے بہت سے قول و فعل بیان ہوئے جن سے مسلمانوں کو اذیت ہوتی تھی، ایسے مواقع میں چند حالتیں پیش آتی ہیں، ایک قتل و قتال، ایک مصالحت اور ایک یہ کہ نہ صلح کا عہد ہوا ہو اور نہ بالفعل قتل و قتال ہو، لیکن احتمال اور اندیشہ ہو۔ پھر مصالحت کی حالت میں اس وجہ سے کہ کفار کو عناد تھا، وہ خاموش نہ رہتے تھے بلکہ مختلف پہلوؤں سے قول و عمل سے مسلمانوں کو ایذائیں پہونچاتے رہتے تھے، جن میں بعض امور تو مباحثہ کے قابل تھے، ان میں تو بحث و حجت زبان سے ہوسکتی تھی، اور بعض امور محض اذیت رسانی اور دل آزاری کی غرض سے ہی کئے جاتے تھے، اس طرح یہ کل چار قسم کے امور ہوئے، ایک مقاتلہ یا قتل و قتال، دوسرے احتمال مقاتلہ، تیسرے مباحثہ اور چوتھے محض ایذا رسانی۔ چوتھے امر میں بطور خود صبر و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اور پہلے امر میں مصابرت یعنی دوسرے کے مقابلہ میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے، دوسرے امر میں مرابطت یعنی مقابلہ کے لئے مستعد و تیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور تیسرے امر میں تقوی کی حاجت ہے، تاکہ جوش اور غصہ میں دشمن کے ساتھ شدت یا کسی بڑے کی شان میں بے ادبی نہ ہو جائے، جیسا کہ اکثر بحث و مباحثوں میں دیکھا جاتا ہے اور تقوی کی صرف تیسرے امر کے ساتھ ہی خصوصیت نہیں، بلکہ اس کی ضرورت چاروں امور میں ہے، تاکہ کسی بھی حالت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو جائے، اس لئے خاتمہ پر ان چاروں امور کا حکم اور اس حکم کی تعمیل کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں۔

باہمت رہنے کا، مقابلہ میں ڈٹ جانے کا، مقابلہ کے لئے

مستعد رہنے کا اور اللہ سے ڈرنے کا حکم اور اس کا فائدہ:

اے ایمان والو! (تکلیفوں پر) خود صبر کرو اور (جب کفار سے قتل و قتال ہو تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (قتل و قتال کے احتمال کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد و تیار رہو، اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، (اور شریعت کی حدود سے نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں تو ضرور اور اکثر اوقات دنیا میں بھی)

فائدہ: قاموس میں مرابطت اور رباط کے دو معنی لکھے ہیں: ایک ملازمت ثغر العدو یعنی دار الکفر اور دار الاسلام کے درمیان واقع سرحد پر قیام کرنا تاکہ کفار سے دار الاسلام کی حفاظت رہے، احقر نے یہی معنی اختیار کئے ہیں۔ دوسرے معنی مواظبت علی الامر یعنی مطلق احکام کی پابندی کرنا۔ بیضاوی نے یہ معنی بھی لئے ہیں اور حدیث میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کو رباط فرمایا ہے، اس میں دونوں معنی کا احتمال ہے، یا تو پہلے معنی کے اعتبار سے بطور تشبیہ اس کو رباط فرمادیا کہ یہ بھی نفس اور شیطان کے مقابلہ میں مستعد رہنا ہے یا دوسرے معنی کے اعتبار سے بطور حقیقت فرمادیا کہ یہ انتظار خود دوام کی علامت ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

﴿الحمد للہ! آج بتاریخ ۲۴؍شوال ۱۳۲۲ھ یوم پنج شنبہ، وقت چاشت، قیام تھانہ بھون میں سورۂ آلِ عمران کی تفسیر پوری ہوئی، آگے ان شاء اللہ سورۃ النساء کی تفسیر ہے، اور دونوں سورتوں کا ربط بہت ظاہر ہے، کیونکہ یہ سورت تقوی کے حکم پر ختم ہوئی ہے، اور وہ اسی سے شروع ہوئی ہے۔ باقی مفصل تقریر (ربط کی) ان شاء اللہ اپنی جگہ (اگلی سورت کے شروع میں) آجائے گی۔ اللّٰھم! ربنا! لک الحمد، یا ذا الجلال والإکرام، وعلی رسولک الصلوٰۃ والسلام إلی یوم القیامۃ﴾

(۴) سُوْرَةُ النِّسَاۗءِ مَدَنِيَّةٌ (۹۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو۔ بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

دو سورتوں میں ربط: گذشتہ سورت تقوی کے مضمون پر ختم ہوئی ہے۔ اس سورت کو اسی مضمون سے شروع کیا گیا ہے، لیکن گذشتہ سورت میں تقوی کے سلسلہ میں زیادہ تر ان معاملات کا ذکر ہوا تھا جو مخالفوں کے ساتھ واقع ہوئے تھے، جیسا کہ واضح طور پر اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اور اس سورت میں ایک تو وہی معاملات ہیں، دوسرے آپسی معاملات ہیں اور تیسرے اللہ اور بندہ کے درمیان کے معاملات ہیں، یعنی دیانات۔

اس طرح اس سورت میں تین قسم کے مضامین ہیں:

(۱) آپسی معاملات جیسے: یتیموں، بیویوں، میراث، سیاسیات اور محرمات کی تفصیل اور حدود اور حقوق اور میاں بیوی اور والدین اور یتیموں اور مسکینوں، پڑوسیوں، رشتہ داروں، ساتھیوں اور مسافروں اور غلاموں اور امانتوں کی ادائیگی کے احکام اور اسلامی حکام کی اطاعت اور حکم میں عدل اور سلام کے احکام اور شفاعت اور ان کے مانند امور۔

(۲) دیانات جیسے توبہ، نماز، جنابت، طہارت، تیمم اور ہجرت کے بعض احکام۔

(۳) مخالفین کے ساتھ معاملات، جیسے جہاد کے احکام اور منافقوں اور اہل کتاب کے احوال اور مشرکوں کے عقائد کا ابطال۔

اور یہ سب مضامین اس وجہ سے کہ ہر ایک حکم میں دوسرے احکام پر نظر رکھنا تشریع کے تقاضوں میں سے ہے، اس لئے ملے جلے طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اور اکثر ایک مضمون کے ضمن میں بار بار دوسرے مضامین آگئے ہیں، جیسے احکام الجہاد میں صلوٰۃ الخوف وغیرہ اور خود اکثر ایک ایک حکم بھی کئی کئی حکموں پر مشتمل ہے جیسے میراث اور محرمات وغیرہ میں، کتنی کتنی صورتیں ہیں۔ چنانچہ غور وفکر کرنے سے یہ سارے مضامین اس ہیئت سے پوری سورت میں ملیں گے، اب سب سے پہلے

تقوی یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت لائے ہیں یعنی ﴿الَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾ جس میں تقوی کے ساتھ ہی اکثر آپسی حقوق اور انسانی تعلقات کی رعایتوں کی طرف اشارہ ہو جائے، پھر اس اشارہ کے بعد ارحام کی رعایت کی صراحت کردی گئی ہے۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ۝﴾

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو۔ بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

تقوی اور اس کے ضمن میں آپسی حقوق کی حفاظت کا حکم:

اے لوگو! اپنے رب (کی مخالفت) سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کیونکہ سارے آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی بیوی حوا کو) پیدا کیا اور (پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلائیں اور (تم سے مکرر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو (جس مطالبہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور میرا حق دیدو تو جب دوسروں کو اللہ کی مخالفت سے ڈرنے کے لئے کہتے ہو تو معلوم ہوا کہ تم اس ڈرنے کو ضروری سمجھتے ہو تو خود تم بھی ڈرو) اور (اول تو احکام الٰہی میں مخالفت سے بچنا اور ڈرنا ضروری ہے، لیکن اس موقع پر ایک حکم خصوصیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ) قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم سب کے حالات کی خبر رکھتے ہیں (اگر مخالفت کروگے تو سزا کے مستحق ہوگے)

پیدائش کی تین صورتیں:

اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے، ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا، کیونکہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، دوسرے جاندار کا جاندار سے توالد و تناسل کے معروف طریقہ کے بغیر پیدا ہونا، کیونکہ حضرت حوا، حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، جیسا کہ بخاری اور مسلم وغیرہ کی حدیثوں میں ہے: إنهن خلقن من ضلع وأن أعوج شيء في الضلع أعلاه: یعنی وہ (عورتیں) پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی ان میں سب سے اوپر والی ہوتی ہے۔ اور تیسرے جاندار کا جاندار سے توالد و تناسل کے معروف طریقہ سے پیدا ہونا جیسا

کہ دوسرے آدمی آدم اور حواء سے اس وقت تک پیدا ہوتے آرہے ہیں اور خود اپنے آپ میں عجیب ہونے میں اور اللہ کی قدرت کے سامنے عجیب نہ ہونے میں تین صورتیں برابر ہیں، اس لئے کسی صورت کا دلیل کے ساتھ ثابت ہونے کے بعد محض توہم پرستی کی بنا پر انکار کرنا جیسا کہ بعض لوگ دوسری صورت کے منکر ہیں نہایت ہی ظلم ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس صورت کے اختیار کرنے سے کیا فائدہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم فوائد اور اسرار کی تعیین کا دعویٰ نہیں کرتے نہ اس کی کچھ ضرورت ہے، دوسرے ممکن ہے کہ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ کا سب طرح کی پیدائش پر قادر ہونا متحقق ہو جائے۔ تیسرے ہم یہ پوچھ سکتے ہیں جو صورت اس وقت معروف ہے، اس میں کیا اسرار اور فوائد ہیں؟ جب یہ معلوم نہیں تو وہ بھی نہ سہی۔

اور یہ شبہ کہ پھر آدم علیہ السلام کی وہ پسلی بدن سے غائب ہوگئی ہوگی، تو اول تو یہ ضروری نہیں، کیا یہ کہنے سے کہ کوئی چیز مٹی سے بنی کسی بھی سمجھ دار کے نزدیک یہ لازم آتا ہے کہ پھر مٹی دنیا سے غائب ہوگئی ہوگی، بلکہ ہر شخص کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز مٹی کے بعض اجزاء سے بنائی گئی۔ اس لئے اگر یہاں بھی یہ کہا جائے کہ کسی خاص جزء سے ایک انتہائی تھوڑی سی مقدار لے کر اس کو اصل قرار دیا، پھر اس کو اپنی قدرت سے بڑھا کر ایک خاص صورت بنا دی تو اس میں کیا اشکال ہے۔ دوسرے اگر کوئی اس لازم کو بغیر دلیل کے مان لے تو اس میں کونسا محال لازم آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بدن میں ایک ہڈی کم ہوگئی ہو۔ رہا یہ کہ اس کے نکالنے سے انہیں کوئی تکلیف ہوئی ہوگی، محض بچکانہ خیال ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور رحم سے تعلق رکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت کا حکم خاص طور سے اس لئے بیان کیا گیا کہ آگے اس قسم کے احکام آتے ہیں، گویا یہ تمہید کے طور پر ہوگیا۔

﴿وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا ۝﴾

ترجمہ: اور جن بچوں کا باپ مرجاوے ان کے مال ان ہی کو پہنچاتے رہو اور تم اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں تک ایسی کارروائی کرنا بڑا گناہ ہے۔

ربط: اوپر تقویٰ کا حکم تھا اور اس کے ضمن میں انسانی اور قرابت سے متعلق حقوق کی رعایتوں کا بیان تھا۔ اب اس تقویٰ کے مواقع کا جو کہ مذکورہ حقوق ہیں تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔ اور وہ چند احکام ہیں۔

پہلا حکم یتیموں کو ضرر نہ پہونچانا:

اور جن بچوں کا باپ مرجائے ان (کی ملکیت) کے مال انہی کو پہونچاتے رہو (یعنی انہی کی ضرورتوں میں خرچ

کرتے رہو) اور (جب تک تمہارے قبضہ میں ہیں) تم (ان کے مال میں شامل کرنے کے لئے ان کی) اچھی چیز سے بری چیز کومت بدلو (یعنی ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی چیز تو نکال لی جائے اور بری چیز ان کے مال میں ملادی جائے) اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں (کے رہنے) تک (البتہ جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے تو حق الخدمت کے بقدر اپنے گذارے کے لئے ان کے مال سے لینا درست ہے، جیسا کہ آگے آئے گا ﴿ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا ﴾ ایسی کارروائی کرنا (کہ بری چیز ان کے مال میں شامل کردی یا بلاضرورت ان کے مال سے فائدہ اٹھایا) بڑا گناہ ہے (جس کی وعید آگے آئے گی) ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ﴾۔

فائدہ: ایسے بچوں کو شریعت میں یتیم کہتے ہیں، دور جاہلیت میں یتیموں کے حقوق بالکل ضائع اور تلف کردیئے جاتے تھے، بعض ان کی اچھی چیزیں نکال کر بری چیزیں ان کے مال میں ڈال دیتے، بعض ویسے ہی کھا لیتے، ان سب کی ممانعت کی گئی۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾

ترجمہ: اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے۔

ربط: اوپر یتیموں کو ضرر پہونچانے کے بعض طریقوں سے منع فرمادیا۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے امور بھی تھے جن میں یتیموں کا نقصان تھا، مثلاً ایک یہ کہ کسی شخص کی پرورش میں کوئی یتیم مالدار لڑکی ہوتی اور وہ صورت شکل کی بھی اچھی ہوتی تو اس کے مال و جمال کی وجہ سے وہ شخص چاہتا کہ میں خود ہی اس سے نکاح کرلوں، لیکن چونکہ ہر طرح اپنے قابو اور کنٹرول میں ہوتی تھی اور کوئی دوسرا شخص اس کے حقوق کے بارے میں کچھ کہنے سننے والا نہ ہوتا تھا تو اس کو اتنا مہر نہ دیتے تھے جتنا دوسرا شخص دیتا، اللہ تعالیٰ اس حکم میں اس امر کا انتظام فرماتے ہیں (شیخین یعنی بخاری و مسلم عن عائشہ رضی اللہ عنہا) انتظام کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم سے ان کا مہر پورا اور مناسب نہ دیا جائے تو تم دوسری عورتوں سے نکاح کرلو، ان سے مت کرو۔

دوسرا حکم: یتیموں کے مہر میں کمی کرنے کی صورت میں غیر یتیموں سے نکاح کرنا:

اور اگر تمہیں اس بات کا احتمال بھی ہو (اور یقین میں تو بدرجہ اولیٰ) کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں (ان کے مہر کے سلسلہ میں) انصاف (کی رعایت) نہ کرسکو گے تو (ان سے نکاح مت کرو، بلکہ) دوسری (حلال یعنی جو محرمات میں شامل نہیں ہیں) عورتوں سے جو تم کو (اپنی کسی مصلحت کے اعتبار سے پسند ہوں نکاح کرلو (کیونکہ وہ مجبور نہیں، آزادی کے ساتھ اپنی مرضی ظاہر کرسکتی ہیں اور یہ نکاح اس قید کے ساتھ ہو کہ جو ایک عورت سے زیادہ کرنا چاہے تو ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو۔ ایک صورت یہ کہ ایک ایک مرد) دو دو عورتوں سے (نکاح کرلے) اور (دوسری صورت یہ ہے کہ ایک

ایک مرد (تین تین عورتوں سے نکاح کرلے) اور تیسری صورت یہ ہے کہ ایک ایک مرد چار چار عورتوں سے (نکاح کرلے)

فائدہ: ﴿ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ﴾ نحوی ترکیب سے ﴿ مَا طَابَ ﴾ سے حال ہے۔ اور حال کلام میں قید ہوتا ہے اور اپنے مفہوم میں معنی کی تکرار کی وجہ سے انقسام کے لئے موضوع ہے، اس طرح دونوں امروں کا مجموعہ ان اقسام کے حکم کے لئے قید کے طور پر اطلاق کی وجہ سے مفید ہوا، اور ﴿ فَانْكِحُوْا ﴾ کا حکم جو عامل ہے وہ حال کی اباحت کے لئے ہے، اس طرح اس اباحت (یعنی اس کا مباح ہونا) مفید ہوگیا، ان قسموں کے ساتھ جب یہ قید نہ ہوگی مثلاً چار سے زیادہ ہو تو اباحت بھی نہ ہوگی، کیونکہ جہاں قید کا کوئی فائدہ نہ ہو وہ احترازی ہوتی ہے۔

اور بعض کا یہ کہنا کہ ﴿ رُبٰعَ ﴾ تک کہنا اس لئے ہے کہ اس سے آگے استعمال نہیں ہوتا یہ بات صحیح نہیں اس وجہ سے کہ متنبی کے قصیدوں میں ہے: آحاد أم سداس في آحاد: اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ایک عورت سے نکاح کرنا ان اقسام کے علاوہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے پیچھے سے دیکھنے سے مجموعی طور پر اس قید سے کم سے کم کی نفی مقصود نہیں، کیونکہ یہ وسعت کا مقام ہے، تاکہ یتیموں سے نکاح سے بے نیازی ثابت ہوجائے، جو ایک بیوی رکھنے میں بھی حاصل ہے، اس طرح ایک کی نفی سے اس میں کوئی تعلق نہیں۔

البتہ اس وسعت سے یہ شبہ صحیح نہیں کہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنا بھی جائز ہوگا، اس لئے اس وسعت سے جو غرض ہے کہ یتیموں سے نکاح سے بے نیازی حاصل ہوجائے تو وہ وسعت اس صورت میں بھی حاصل ہے کہ اس کو چار کے اندر اندر محدود رکھا جائے بخلاف سورۂ فاطر کی آیت ایک کے جس میں فرشتوں کے بارے میں ﴿ اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ فرمایا گیا ہے کہ وہاں قید لگانے کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک جماعت کو روٹیاں دے کر کہا جائے کہ سارے آدمی تین تین چار چار روٹیاں بانٹ لو، اس معاملہ میں جو شخص چار سے زیادہ مانگے یقیناً اس کو زیادہ کے لئے الگ سے اجازت کی ضرورت ہوگی۔ اور اس اعلان سے زیادہ روٹیاں لینے کی نفی سمجھی جائے گی، برخلاف اس کے کہ کسی سے کہا جائے کہ بازار جاؤ، مدرسہ جاؤ، باغ میں جاؤ جہاں چاہو جاؤ، اس میں ماسواء یعنی اس کے علاوہ کی نفی اس لئے نہیں ہے کہ یہ بات تقسیم کے لئے نہیں کہی گئی ہے، خوب سمجھ لو۔

اور حدیثوں میں اس بات کی صراحت ہے کہ بعض نو مسلموں کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں اور حضور ﷺ نے چار سے زیادہ کو الگ کرادیا۔ اور امت حقہ کا اس پر اجماع بھی ہے، اور جن لوگوں سے اس کے خلاف نقل کیا گیا ہے تو اول تو وہ اجماع ان اختلاف کرنے والوں کے قول سے پہلے ہو چکا تھا، ایسی صورت میں ایسا اختلاف اس اجماع کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، دوسرے اختلاف کرنے والوں کے پاس کوئی معقول و مستند دلیل نہیں، اور صحیح دلیل کے بغیر محض دعویٰ سے اجماع میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور حضور ﷺ کا چار سے زیادہ نکاح فرمانا یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے (اس بحث کا اکثر حصہ میں نے روح المعانی سے لیا ہے۔ اگر کسی کو مزید تفصیل چاہئے تو اس سے رجوع کرلیں کہ انہوں

نے امام رازی کے شبہات کا بھی جواب دیا ہے)

مسئلہ(۱): چار تک بیویاں رکھنے کا یہ حکم آزاد افراد کے لئے ہے، جس کا قرینہ آیت میں بھی ہے ﴿ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ﴾۔ کیونکہ اس حکم میں بھی اور پچھلے مخاطب بھی ایک ہی ہیں اور غلام مالک نہیں ہوتا اور جو شریعت کے مطابق غلام ہو اس کے لئے دو تک جائز ہیں۔

مسئلہ(۲): یتیم لڑکی کا نکاح بالغ ہونے سے پہلے ولی کی اجازت سے جائز ہے، آیت میں یتیموں کے نکاح کے احکام بیان کرنا اس کا قرینہ بھی ہے۔

﴿ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ ﴾

ترجمہ: پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو وہی سہی۔ اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔

ربط: آیت کے شروع میں تعدد ازدواج (چار بیویاں تک) کی اجازت دی ہے، جس کی وجہ یہی تھی کہ یتیموں کے حق میں عدل وانصاف کے خلاف نہ ہو، چونکہ مطلق عدل ہر معاملہ میں واجب ہے، اس لئے اب اس صورت کا حکم بیان فرماتے ہیں جب تعدادِ ازدواج میں ناانصافی کا اندیشہ ہو۔

بیویوں کے درمیان ناانصافی کے خوف کی صورت میں ایک بیوی یا باندی پر اکتفا کرنا:

اور اگر تمہیں (غالب) اندیشہ ہو کہ (کئی بیویاں کر کے) عدل قائم نہ رکھ سکو گے (بلکہ کسی بیوی کے واجب حقوق ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا (اگر دیکھو کہ ایک بیوی کے حقوق بھی ادا نہ ہوں گے تو) جو لونڈی باندی (شرعی قاعدہ کے مطابق) تمہاری ملکیت میں ہو، وہی سہی۔ اس معاملہ میں (یعنی ایک بیوی کے رکھنے یا صرف لونڈی باندی پر اکتفا کرنے میں) زیادتی (اور ناانصافی) نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے (کیونکہ ایک صورت میں تو تعدد نہیں ہے جس میں برابری کرنی پڑے اور دوسری صورت میں بیوی کے حقوق سے بھی کم حقوق ہیں۔ مثلاً مہر نہیں (باندی کو) صحبت کا حق نہیں، اس لئے اندیشہ اور بھی کم ہے۔

مسئلہ(۱): اگر عدل نہ ہو سکنے کا غالب اندیشہ ہو تو کئی بیویوں سے نکاح کرنا اس لئے منع ہے کہ اگر یہ شخص ایسا کرے گا تو گنہگار ہوگا، اس لئے نہیں نکاح صحیح نہ ہوگا، یقیناً نکاح ہو جائے گا۔

مسئلہ(۲): جو لونڈیاں اور باندیاں برصغیر میں پائی جاتی ہیں، وہ شریعت کے مطابق لونڈی باندی نہیں ہیں، ان سے بغیر نکاح کے صحبت حرام ہے، اسی طرح زبردستی کوئی خدمت لینا اور خرید وفروخت سب حرام ہے۔

تنبیہ: بعض نفس پرستوں نے دنیاوی غرض سے اللہ کی آیتوں کے مضمون میں تحریف کی ہے، اور کہا ہے کہ ''یہ آیت

ایک سے زیادہ نکاح کی بالکل نفی کر رہی ہے، اس طرح کہ یہاں فرمایا کہ جب عدل نہ ہو سکے تو ایک ہی پر اکتفا کرو اور دوسری آیت میں فرما دیا کہ ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ﴾ "تم عورتوں کے درمیان عدل کر ہی نہ سکو گے" (سورۃ النساء ۱۲۹) ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھنا جائز نہیں۔

مگر یہ محض باطل مغالطہ ہے، کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل کا مفہوم جدا جدا ہے، اس آیت میں تو عدل حقوق واجبہ میں مراد ہے جیسا کہ احقر نے تصریح بھی کر دی ہے اور یہ اختیار و قدرت میں ہے اور اسی کے اعتبار سے ایک اور زیادہ بیویاں اختیار کرنے میں تفصیل بیان فرمائی ہے، جبکہ آیت ۱۲۹ میں محبت میں عدل کرنا مراد ہے اور وہ عام طور سے اختیار میں نہیں ہوتا، اس لئے اس کی نفی فرمائی، اس نفس پرست کے دعوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ خود اس آیت میں عدل کی نفی کے بعد ارشاد ہے ﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ﴾ جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ محبت کے معاملہ میں عدل نہ ہو سکے گا، بلکہ دل کا ایک طرف کچھ زیادہ میلان رہے گا اور اس میلان پر ملامت نہیں، لیکن پوری طرح جھکاؤ نہ ہو کہ دل سے بھی اور معاملات و حقوق میں بھی، اس طرح دونوں آیتوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ محبت میں عدل واجب نہیں، لیکن معاملات میں عدل واجب ہے۔

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝﴾

ترجمہ: اور تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوشدلی سے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جز تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔

ربط: اوپر نکاح کا بیان تھا، چونکہ نکاح کے شرعی لوازم میں سے ایک مہر بھی ہے اور اس کی ادائیگی اکثر طبیعتوں پر گراں گذرتی ہے، اس لئے تیسرے حکم میں اس کا انتظام فرماتے ہیں۔

تیسرا حکم مہر کی ادائیگی:

اور تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ دیدیا کرو، ہاں اگر وہ بیویاں تمہارے لئے اس مہر کا کچھ حصہ خوش دلی کے ساتھ چھوڑ دیں (اور یہی حکم سارے مہر کا بھی ہے) تو (اس حالت میں) تم اس کو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوش گوار سمجھ کر (۱)

مسئلہ (۱): اگر مہر لے کر واپس کر دیں تو یہ ہبہ ہے، اور اگر بغیر لئے معاف کریں تو ابراء ہے اور دونوں جائز ہیں اور

(۱) مطلب یہ کہ اگر چہ یہاں سیاق و سباق سے خطاب شوہروں کو ہے مگر الفاظ کے عموم اور علت کے عموم سے دوسرے لوگوں کو بھی جن میں عورت کے اقارب بھی داخل ہو گئے، یہ حکم ہے کہ عورتوں کے مہر عورتوں ہی کو دیا کریں۔ ان کی اجازت کے بغیر خود ان میں تصرف نہ کیا کریں۔

آیت میں دونوں شامل ہیں۔

مسئلہ (۲): جو کسی سے زبردستی کر کے معاف کرایا جائے تو وہ معاف نہیں ہوتا۔

مسئلہ (۳): الفاظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے رشتہ دار بھی اس کی مرضی کے بغیر مہر میں تصرف نہیں کر سکتے۔

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ﴾

ترجمہ: اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جن کو خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے مایۂ زندگانی بنایا ہے اور ان مالوں میں ان کو کھلاتے رہو، پہناتے رہو، اور ان سے معقول بات کہتے رہو۔ اور تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کو پہنچ جاویں پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے اموال ان کے حوالہ کر دو۔

ربط: اوپر پہلے حکم میں یتیموں کے مال کی حفاظت کا ذکر تھا۔ اب چوتھے حکم میں یہ بتاتے ہیں کہ ان کے وہ مال انہیں کب سپرد کر دیئے جائیں۔

چوتھا حکم: یتیموں کو مال سپرد کرنے کی تفصیل:

اور (اگر یتیم بالغ ہو جائیں جس کا تقاضا مال کا سپرد کر دینا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، لیکن وہ کم عقل ہوں تو) تم (ان) کم عقلوں کو اپنے (یعنی ان کے) وہ مال مت دو، جن کو اللہ تعالیٰ نے (ایسے کام کا پیدا کیا ہے کہ ان کو) تمہارے (سب کے) لئے سرمایۂ زندگی بنایا ہے (مطلب یہ ہے کہ مال قدر کرنے کی چیز ہے، اسے ان کو ابھی مت دو کہ ناقدری کر کے اڑا ڈالیں گے) اور ان مالوں میں (سے) ان کو کھلاتے رہو، پہناتے رہو، اور ان سے معقول بات کہتے رہو (یعنی ان کی تسلی کرتے رہو کہ مال تمہارا ہے، تمہاری ہی خیر خواہی کی وجہ سے ابھی تمہارے ہاتھوں میں نہیں دیا جا رہا ہے۔ ذرا سمجھ دار ہو جاؤ گے تو تمہیں ہی دیدیا جائے گا) اور (جب مال سپرد کرنے کے لئے ہوشیاری کا دیکھنا ضروری ہے تو) تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری اور تمیز داری کی باتوں میں) آزما لیا کرو (کیونکہ بالغ ہونے کا وقت تو مال کی سپردگی کا وقت ہے تو آزمائش پہلے سے کی جانی چاہئے، مثلاً تھوڑا تھوڑا سودا سلف ان سے منگا لیا، اور دیکھ لیا کہ کیسے سلیقہ کے ساتھ خرید کر لائے ہیں، یا کوئی چیز فروخت کے لئے دیدی اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا ہے) یہاں تک (انہیں آزمایا جائے) کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں (یعنی بالغ ہو جائیں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر (بالغ ہونے اور آزمائش کے بعد) اگر ان میں ایک حد تک تمیز دیکھو (یعنی مال کی حفاظت و رعایت کا سلیقہ اور انتظام کی

صلاحیت ان میں پاؤ) تو ان کے مال واسباب ان کے حوالہ کر دو (اور اگر ابھی سلیقہ یا انتظامی صلاحیت معلوم نہ ہو تو کچھ (دن) اور حوالہ نہ کیا جائے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

مسئلہ (۱): بالغ ہونے سے پہلے آزمائش کا جو طریقہ بتایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر نابالغ بچہ اپنے ولی کی اجازت سے خرید و فروخت کرے تو جائز ہے۔

مسئلہ (۲): ایک حد تک تمیز کی جو تفسیر کی گئی ہے، اس تمیز کے نہ ہونے کو سفہ کہتے ہیں، جو مال سپرد کرنے میں مانع ہے خواہ سلیقہ نہ ہو یا ہو مگر اس سلیقہ سے کام نہ لیتا ہو، یعنی انتظام نہ کرتا ہو۔ بلکہ مال کو اڑاتا ہو، دونوں صورتوں میں مال ابھی نہیں دیا جائے گا۔ اور اوپر جو ذرا سمجھ دار کہا ہے اس "ذرا" سے بھی یہی خاص تمیز مراد ہے۔

مسئلہ (۳): یہ جو کہا ہے کہ کچھ دن اور حوالہ نہ کیا جائے، اس سے مراد پچیس سال کی عمر سے کم ہی ہے، اور جب پچیس سال کا پورا ہو جائے تو خواہ یہی حالت رہے اس کا مال اس کو دیدیں گے۔

مسئلہ (۴): سفیہ یا نادان کے ایسے تصرفات باطل ہیں جن میں یہ ضرورت ہے کہ دوسرے کے ہاتھ میں چیز دیدی جائے، جیسے ہبہ وصدقہ وغیرہ، اور جو تصرفات زبانی نافذ ہو جاتے ہیں، جیسے بیع ونکاح وطلاق وغیرہ یہ سب صحیح ہیں اور ولی یعنی جس کے قبضہ میں مال ہے، اس کو ان تصرفات کی تکمیل کا مثلاً مبیع کا سپرد کرنا، ثمن کا وصول کرنا اور مہر وغیرہ کی تکمیل کا حکم کیا جائے۔

مسئلہ (۵): بالغ ہونے کی علامت انزال اور حیض ہے، اور یہ نہ ہو تو مرد کی عمر ۱۸ سال اور عورت کی ۱۷ سال اور بعض علماء کے مطابق دونوں میں پندرہ سال مفتی بہ قول ہے۔ اور یہی صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب ہے اور ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے۔

مسئلہ (۶): البتہ اگر اس کے دماغ میں فتور ہو جس کو جنون یا عتہ کہتے ہیں، اس کا حکم ساری عمر نابالغ کی طرح رہے گا، یہ سب مسائل ہدایہ میں ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

امام صاحب کے بیان کئے ہوئے اس مسئلہ پر کہ پچیس سال کے بعد اس کا مال دیدیا جائے، یہ شبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رشد کو معیار قرار دیا ہے اور ابھی رشد نہیں ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں رشد سفہ کے مقابلہ میں ہے اور سفہ سے مراد مطلق سفہ نہیں، بلکہ وہ سفہ ہے جو صبی ہونے یعنی طفولیت کا اثر ہے، چنانچہ نابالغوں کا ذکر اس کا قرینہ ہے اور احقر نے سفہاء کے ترجمہ میں لفظ ان سے اس طرف اشارہ کر دیا ہے، اس طرح بلوغ کے شروع میں تو اس کو سابقہ عمر کا باقی اثر سمجھیں گے، اور جب پچیس سال کی عمر ہو گئی جس میں آدمی دادا بن سکتا ہے تو اب طفولیت کا اثر قطعاً نہیں رہا، اس وقت کی بے عقلی

دوسری قسم کی ہے، اب وہ سفہ یعنی نادان نہ رہا تو اس کا مقابل یعنی رشد آ گیا جس کو ﴿ رُشْدًا ﴾ نکرہ ہونے کی وجہ سے ایک حد تک رشد سے تعبیر کیا گیا ہے اور رشد پر مال کی تفویض کا حکم نص سے ثابت ہے، اس لئے مال دیدیا جائے گا۔ اور ایک شبہ اس مسئلہ پر ہے کہ اس کے بعض تصرفات نافذ ہو جائیں گے، شبہ یہ ہے کہ پھر مال نہ دینے سے کیا فائدہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اکثر مال نفلی عبادتوں میں تلف ہوتا ہے اور وہ نافذ نہیں ہوتے، یہ فائدہ کافی ہے، یہ ساری تقریر ہدایہ سے ماخوذ ہے۔

﴿ تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَھُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور ان اموال کو ضرورت سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جاویں گے، جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو۔ اور جو شخص مستغنی ہو سو وہ تو اپنے آپ کو بالکل بچائے اور جو شخص حاجت مند ہو تو وہ مناسب مقدار سے کھا لے، پھر جب ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ بھی کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والے کافی ہیں۔

ربط: اوپر ارشاد فرمایا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد رشد کی شرط پوری ہونے پر یتیموں کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ اب ان مالوں کے کھانے سے جو کہ مذکورہ طریقہ پر سپرد کرنے میں مخل ہو، روکتے ہیں۔ اور بعض ضرورت سے کھانے کی اجازت کو مستثنیٰ کرتے ہیں، یہ پانچواں حکم ہے اور حوالہ کرنے کا ایک مستحب طریقہ بھی بتاتے ہیں۔

چوتھے حکم کا تتمہ، اور تتمہ کے درمیان پانچویں حکم کا آغاز:

اور (یتیموں کے) ان مالوں کو ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جائیں گے (پھر ان کو حوالہ کرنا پڑے گا) جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو اور (اگر اس طرح نہ اڑائیں بلکہ تھوڑا کھانا چاہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ) جو شخص (اس مال سے) مستغنی ہو (یعنی خود اس کے پاس بھی اپنا مال کفایت کی مقدار میں موجود ہو خواہ وہ صاحب نصاب نہ ہو) تو وہ تو خود کو بالکل (تھوڑا کھانے سے بھی) بچائے، اور جو شخص ضرورت مند ہو تو وہ مناسب مقدار میں (یعنی جس سے ضروری حاجتیں رفع ہو جائیں) کھا لے (اور برت لے) پھر جب (شرائط کے پائے جانے کے بعد یعنی مذکورہ بالا بلوغ اور رشد کے بعد) ان کے مال ان کے حوالہ کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان کے مال انہیں دیدینے پر گواہ بھی کر لیا کرو (شاید کسی وقت اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آئیں) اور (یوں تو) اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے کے لئے کافی ہیں (اگر خیانت نہ کی ہو تو گواہوں کے نہ ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ اصل حساب جن سے متعلق ہے، وہ تو اس کی صفائی جانتے ہیں اور اگر خیانت کی ہے تو گواہوں کا ہونا کوئی نفع نہیں دے گا، کیونکہ جن کا حساب سے واسطہ ہے، وہ اس کا ملوث ہونا جانتے ہیں، صرف ظاہری انتظام کے لئے گواہوں کا ہونا مصلحت ہے)

مسئلہ(۱): یتیموں کی کفالت میں مصروف ایسے کارکنوں کو جو ضرورت مند ہوں اپنی ضروری حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے اوپر ان کے مال میں سے صرف کرنا اپنے حق الخدمت کے طور پر جائز ہے (ہدایہ)

مسئلہ(۲): یتیموں کو ان کے سن رشد کو پہونچنے پر ان کے مال واسباب واپس کرتے وقت گواہ کر لینا مذکورہ بالا مصلحت کے تحت مستحب ہے۔

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ ﴾

ترجمہ: مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ قطعی۔

ربط: اوپر یتیموں کو نقصان پہونچانے سے منع فرمایا ہے، دور جاہلیت میں یتیموں کو ایک ضرر یہ بھی پہونچایا جاتا تھا کہ انہیں میراث میں مستحق نہیں سمجھتے تھے، اس لئے اب چھٹے حکم میں ایک قاعدہ کلیہ کے ذریعہ اس رواج کو باطل قرار دیتے ہیں۔

چھٹا حکم: ترکہ میں وارثوں کے حقوق کو ثابت کرنا:

مردوں کے لئے بھی (خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرر) ہے، اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (مرتے وقت) چھوڑ جائیں اور (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان عورتوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جائیں خواہ وہ (چھوڑی ہوئی چیز) کم ہو یا زیادہ (سب میں ملے گا اور) حصہ (بھی ایسا جو) طے شدہ قطعی (ضروری اور لازمی) ہے۔

تفسیر: یہاں صرف میراث کے حصہ کا استحقاق اجمال کے طور پر بتایا ہے، تھوڑی دور آگے وارثوں کے حصوں کی تفصیل آرہی ہے، اور نزدیک کے رشتہ کا مطلب یہ ہے کہ وارثوں کی جو ترتیب شریعت میں مقرر اور ثابت ہے، اس ترتیب میں نزدیک ہو۔ اور ظاہر ہے کہ نزدیکی دونوں جانب سے ہوتی ہے، اس لئے اس سے لازم آگیا کہ جو رشتہ دار زیادہ قریب ہوگا وہ میراث پائے گا۔ پھر جہاں شریعت نے سب کو زیادہ قرابت دار قرار دیا ہے خواہ قریب ہونے کی وجوہ میں فرق ہو، وہاں سب کو وارث بنایا ہے اور جہاں ایک کو زیادہ قریب اور ایک کو زیادہ دور قرار دیا ہے، وہاں زیادہ قریب کو وارث قرار دیا ہے زیادہ دور کو نہیں، اس قاعدہ کے عموم میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام جو حنفیہ کے نزدیک وارث ہیں، سب آگئے۔ البتہ عصبات میں وراثت کا مقرر ہونا اور ذوی الارحام میں اس کا قطعی ہونا جیسا کہ ترجمہ سے سمجھ

میں آتا ہے، شاید کسی قدر خلجان کا باعث ہو، لیکن 'مقرر' سے مراد یہ لیا جائے کہ اس کا دار و مدار مورث کی رائے پر نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے شریعت نے قواعد مقرر کر دیئے ہیں، اور 'قطعی' سے مراد یہ لیا جائے کہ جو عمل میں قطعی کی طرح ہو، جس کو فرض عملی کہتے ہیں، اب کچھ خلجان نہیں رہا۔

﴿ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور جب تقسیم ہونے کے وقت آ موجود ہوں رشتہ دار اور یتیم اور غریب لوگ تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دو اور ان کے ساتھ خوبی سے بات کرو۔

ربط: اوپر ترکہ کے مستحق ورثاء کا بیان تھا، اب اس ساتویں حکم میں ان لوگوں کے ساتھ جو ترکہ کے مستحق نہیں ہیں: کسی درجہ رعایت کا استحبابی حکم ہے۔

ساتواں حکم: غیر وارثوں کے ساتھ رعایت کرنا:

اور جب (وارثوں میں ترکہ کی) تقسیم کے وقت یہ لوگ یعنی دور کے رشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ آ جائیں (اس امید پر کہ شاید ہمیں بھی کچھ مل جائے، رشتہ دار تو ممکن ہے استحقاق کے گمان سے اور دوسرے خیر خیرات کی امید پر) تو انہیں بھی اس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے، اس میں) سے کچھ دیدو۔ اور ان سے بھلائی (نرمی) کے ساتھ بات کرو (وہ بات رشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ سمجھا دو کہ شریعت کی رو سے اس میں تمہارا حصہ نہیں ہے، ہم معذور ہیں اور دوسروں سے یہ کہ دے کر احسان نہ جتاؤ)

مسئلہ (۱): یہ حکم واجب نہیں، مستحب ہے اور اگر شروع میں واجب ہوا ہو تو وجوب منسوخ ہے۔

مسئلہ (۲): اور بالغوں کی قید اس لئے لگائی کہ نابالغوں کے حصہ میں سے خیر خیرات یا کسی کی رعایت بالکل جائز نہیں۔

﴿ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۚ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ ﴾ ع ۱۲

ترجمہ: اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جائیں تو ان کی ان کو فکر ہو۔ سو ان لوگوں کو چاہئے کہ خدا تعالیٰ سے ڈریں اور موقع کی بات کہیں۔ بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں اور کچھ

نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جلتی آگ میں داخل ہونگے۔

ربط: یہاں تک اصل مضمون یتیموں کو ضرر نہ پہونچانے کا تھا۔اور دوسرے مضامین کا اسی مناسبت سے ذکر ہوا ہے۔ اب اسی اصل مضمون کی تاکید کے لئے ایک دنیاوی واقعہ فرض کرتے ہیں جس سے یتیموں کی ہمدردی پیدا ہو۔اور آخرت کے ایک واقعہ کا دل میں یقین بٹھاتے ہیں تا کہ خوف پیدا ہو اور دونوں واقعوں میں غور وفکر کرنے کے بعد یتیموں کو ضرر پہونچانے کی جرأت نہ کریں۔

یتیموں کے حق کی رعایت کی تاکید:

اور (یتیموں کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ لوگ اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ (کر مر) جائیں تو ان (بچوں) کی ان (لوگوں) کو فکر ہو (کہ دیکھئے کہیں انہیں کوئی ضرر نہ پہونچائے تو ایسا ہی دوسرے بچوں کے لئے بھی خیال رکھنا چاہئے، کہ ہم انہیں ضرر نہ پہونچائیں) تو (اس بات کو سوچ کر) ان لوگوں کو چاہئے کہ (یتیموں کے معاملہ میں) اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے ڈریں (یعنی عملاً آزار وضرر نہ پہونچائیں) اور (زبان سے بھی ان سے) موقع ومحل سے (مناسب) بات کہیں (اس میں تسلی اور دل جوئی کی بات بھی آگئی، اور تعلیم وتادیب کی بھی۔غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اصلاح کریں) بیشک جو لوگ یتیموں کا مال بغیر استحقاق کے کھاتے (برتتے) ہیں وہ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں (دوزخ کی) آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی اس کھانے کا انجام یہ ہونے والا ہے) اور (اس انجام کے مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کیونکہ) جلد ہی (دوزخ کی جلتی ہوئی) آگ میں داخل ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)

تفسیر: پہلے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ اپنے لئے پسند نہیں کرتے، اسے دوسروں کے لئے بھی پسند مت کرو، اور ﴿ قَوْلًا سَدِيدًا ﴾ کی جو تفسیر کی گئی ہے، اس میں اس کی تہذیب کے متعلق اگر ضرورت کے مطابق کچھ تشدد کرنا پڑے تو وہ بھی داخل ہو گیا۔ایسی نرمی کا حکم نہیں کہ جس سے وہ بگڑ جائے، مطلب یہ کہ ہر امر میں اس کی مصلحت کی رعایت ہو، اپنی مصلحت پر نظر نہ ہو، اس طرح تادیب میں بھی اپنے غیظ وغضب کی تسکین مقصود نہیں ہونی چاہئے اور بغیر استحقاق کی جو قید لگائی گئی ہے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ استحقاق کی شکل میں کھانے کی اجازت ہے جس کا بیان ابھی پانچویں حکم میں ﴿ مَنْ كَانَ فَقِيرًا ﴾ کی تفسیر میں گذر چکا ہے، دیکھ لیا جائے۔

مسئلہ: جس طرح یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے، اسی طرح کسی کو کھلا دینا بھی خواہ خیر خیرات کے طور پر ہی کیوں نہ ہو، حرام ہے، اس لئے ترجمہ میں لفظ ''برتتے'' کا ظاہر کر دیا گیا ہے۔اور ہر نابالغ کا حکم یہی ہے، چاہے وہ یتیم نہ ہو، اچھی طرح یاد رکھو، اس میں بہت لاپروائی کی جاتی ہے۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ ﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں: لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔

ربط: چھٹے حکم میں وارثوں کے حصوں کے اجمال کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ اب یہاں ان کے حصوں کی کچھ تفصیل کا بیان ہے۔ اور کچھ بیان سورۃ کے ختم پر ہوگا اور ان احکام کی پوری تفصیل دوسرے شرعی دلائل سے اخذ کر کے علم الفرائض کی کتابوں میں موجود ہے اور اس تفصیل میں کئی قسم کے وارثوں کا حصہ بیان فرمایا ہے۔ اور ان وارثوں کے ذکر کی تخصیص کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضور ﷺ سے اولاد اور بھائی بہن کے متعلق سوال کیا گیا تھا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جن کے شروع میں اولاد کے حصوں کا ذکر ہے، اور آخر میں بھائی بہن کے حصوں کا۔ اور پھر اس دوسرے مضمون کا تمہ سورۃ کے ختم پر ذکر کیا ہے، اور درمیان میں ماں باپ اور میاں بیوی کے حصے اس لئے آ گئے ہیں کہ ماں باپ اور میاں بیوی کے ہونے نہ ہونے سے اولاد کے حصے بدل جاتے ہیں، چنانچہ اصل مقصود انہی دو سوالوں کا جواب ہے۔ اور اگر یہ دیکھا جائے کہ پہلے استفتاء میں اولاد کے ساتھ بیوی بھی تھی تو بیوی کے ذکر سے ربط اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

اولاد کا حصہ:

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے (وراثت میں حصہ پانے) کے بارے میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے (یعنی اگر لڑکا لڑکی ایک یا کئی ملے جلے ہوں تو ان کے حصوں میں آپس میں یہ نسبت ہوگی کہ ہر لڑکے کو دو حصے اور ہر لڑکی کو ایک حصہ ملے گا) اور (اگر اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں، اگر چہ دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا، اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے۔ (اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے، کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے کم نہ ہوتا، تو جب دوسری بھی لڑکی ہے تب تو تہائی سے بھی اسی طرح کم نہیں ہو سکتا، اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں، اس لئے اس کا بھی ایک تہائی ہوگا، اس طرح دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین لڑکیوں میں یہ شبہ کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی میت کا سارا ترکہ مل جائے، اس لئے فرما دیا کہ اگر چہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں مگر ان کا حصہ دو تہائی سے زیادہ نہ ہوگا) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو (کل ترکہ کا) نصف ملے گا (اور پہلی صورت میں ایک تہائی بچا ہوا اور دوسری صورت میں ایک نصف بچا ہوا، دوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر اسی کو دے دیا جائے گا، جیسا کہ علم الفرائض کی کتابوں میں بیان ہوا ہے)

مسئلہ(۱): اوپر یہ سب تقسیم تجہیز و تکفین اور قرضوں کی ادائیگی اور ایک تہائی میں وصیت نافذ کرنے کے بعد ہوگی، جیسا کہ جلد ہی واضح ہوگا۔

مسئلہ(۲): آیت سے اولاد کے وارث ہونے کی چار صورتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی، دوسرے یہ کہ صرف ایک لڑکی ہو، تیسرے یہ کہ دو لڑکیاں ہوں اور چوتھے یہ کہ دو لڑکیوں سے زیادہ ہوں۔

فائدہ: حدیث اور اہل حق کے اجماع کے مطابق اس آیت کا حکم انبیاء علیہم السلام کے لئے نہیں ہے، اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک وغیرہ کو میراث میں تقسیم نہیں فرمایا، اور اگر اس حدیث کو خبر واحد قرار دیا جائے تب بھی چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود آپ سے بلاواسطہ سنا تھا، ان کے اعتبار سے قرآن کی طرح قطعی ہے، یا یہ کہا جائے کہ اس حدیث کی روشنی میں انبیاء کے مال کا وقف ہونا ثابت ہے، اور وقف خبر واحد سے بھی ثابت ہو جاتا ہے، اور وقف میں میراث لاگو نہیں ہوتی، اس پر سب کا اجماع ہے۔

﴿ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ‌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ﴾

ترجمہ: اور ماں باپ کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ہے۔ اگر میت کے کچھ اولاد ہو اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

والدین کا حصہ:

اور ماں باپ (کی میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں: ایک صورت میں تو ان) کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ (مقرر) ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہو (خواہ مذکر ہو یا مؤنث، خواہ ایک ہو یا زیادہ اور بقیہ میراث اولاد اور دوسرے خاص خاص وارثوں کو ملے گی، اور پھر بھی بچ جائے تو پھر سب کو دی جائے گی) اور اگر میت کے کوئی اولاد نہ ہو اور (صرف) اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں (یہ دوسری صورت ہے، اور "صرف" اس لئے کہا کہ اگر بھائی بہن بھی نہ ہوں جیسا کہ آگے آتا ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور باقی دو تہائی باپ کا اور چونکہ جو صورت فرض کی گئی تھی، اس میں یہ ظاہر تھا اس لئے تصریح کی کوئی ضرورت نہیں رہی) اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن (کسی بھی قسم کے) ہوں (خواہ ماں باپ دونوں میں شریک ہو جس کو عینی کہتے ہیں، خواہ صرف باپ ایک اور ماں الگ الگ ہو جس کو علاتی کہتے ہیں، خواہ صرف ماں ایک اور باپ الگ الگ ہو جس کو اخیافی کہتے ہیں، غرض یہ کہ کسی بھی طرح بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور یہ تیسری صورت ہے)

تو (اس صورت میں اس کی ماں کو (ترکہ کا) چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا)

فائدہ: تیسری صورت میں ان بھائی بہنوں کی وجہ سے ماں کا حصہ دوسری صورت کے مقابلہ میں کم ہو گیا، لیکن باپ کی وجہ سے بھائی بہنوں کو بھی نہ ملے گا۔

﴿ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ﴾

ترجمہ: وصیت نکالنے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا دین کے بعد۔

میراث سے مقدم حقوق:

(یہ سب حصے) وصیت (کی مقدار کے مطابق مال) نکال لینے کے بعد کہ میت جس کی وصیت کر جائے یا قرض (اگر ہو تو اس کے بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے)

مسئلہ (۱): اور ان دونوں سے بھی پہلے تجہیز و تکفین یعنی کفن دفن کا انتظام ضروری ہے۔

مسئلہ (۲): اور وصیت وہ مراد ہے جو شریعت کے مطابق ہو، مثلاً وارث کو وصیت میں کچھ نہ دے اور کفن دفن کے انتظامات اور قرض کی ادائیگی کے بعد جو مال بچے اس کے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ کرے، ورنہ وہ وصیت میراث سے مقدم نہ ہوگی۔ اور جاننا چاہئے کہ قرض اور وصیت میں قرض مقدم ہے، اگر چہ قرآن کے الفاظ میں پہلے وصیت کا ذکر ہے، جس میں نکتہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ قرض کے تو مطالبہ کرنے والے آدمی ہیں، وہ خود ہی وصول کر لیں گے، اس میں کوتاہی کا احتمال کم ہے، البتہ وصیت چونکہ اصل میں تبرع یعنی نفلی و مستحب عمل ہے، اس لئے اس میں کوتاہی کا احتمال زیادہ ہے، اس لئے اہتمام اور تاکید کی غرض سے ذکر میں اس کو پہلے لے آئے۔

﴿ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۞ ﴾

ترجمہ: تمہارے اصول و فروع جو ہیں تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کونسا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔ یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا۔ بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں۔

ربط: آگے اس کی حکمت بتاتے ہیں کہ میراث کا قضیہ میت کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ حق تعالیٰ نے خود سارے قواعد مقرر فرما دیئے۔

مال کی تقسیم مورث کے اختیار پر نہ چھوڑنے کی حکمت:

تمہارے جو اصول و فروع ہیں تم (ان کے متعلق) پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں سے کونسا شخص تمہیں

(دنیاوی یا اخروی) نفع پہونچانے میں (باعتبار توقع کے) نزدیک تر ہے (یعنی اگر یہ قضیہ تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو زیادہ تر تم لوگ تقسیم میں ترجیح وتفضیل کا دارومدار اس شخص کی نفع رسانی پر رکھتے اور اس دارومدار کی یقینی حالت کا خود کوئی بھی طریقہ کسی کے پاس نہیں ہے، اس لئے اس دارومدار کا تجویز قرار دینا صحیح نہ تھا، لہٰذا جب نفع میں دارومدار بننے کی قابلیت نہ تھی اس لئے دوسری مصلحتوں اور رازوں کو خواہ وہ تمہارے ذہنوں میں نہ آئیں اس حکم کی بنیاد اور دارومدار قرار دے کر) یہ حکم اللہ کی جانب سے مقرر کردیا گیا۔ (اور یہ امر) یقینی طور پر (مسلم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں، چنانچہ جن حکمتوں کی انھوں نے اس میں اپنے علم سے رعایت رکھی ہے، وہی قابل اعتبار ہیں، اس لئے ان کا دارومدار تمہاری رائے پر نہیں رکھا)

تفسیر: دنیاوی نفع مثلاً یہ کہ فلاں وارث ہماری خوب خدمت کرے گا، اکثر حالات میں وہ دغا دے جاتا ہے اور دوسرا مخلص محض اللہ کے واسطے یا محبت کی وجہ سے زیادہ خدمت کردیتا ہے، اور اخروی نفع یہ کہ ہمیں یہ ثواب بخشا کرے گا یا آخرت میں شفاعت کرے گا، اس لئے اس کو زیادہ دینا چاہئے، جبکہ بسا اوقات اس کے خلاف ہوجاتا ہے۔

بعض بددینوں نے میراث کے مسئلہ میں کچھ دنیاوی مضرتوں کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ اول تو ابھی خود وہ مضرتیں ہی ثابت نہیں ہوئیں، پھر ان مضرتوں کے مقابلہ میں اہل علم ودانش نے ان سے زیادہ منفعتیں اور میراث نہ ملنے میں ان سے زیادہ مضرتیں ثابت کرکے دکھادی ہیں چنانچہ رسائل وجرائد، خطبات اور اخبارات میں ناظرین نے دیکھا ہوگا اور ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے خود قرآن مجید کا یہ مضمون اس شبہ کے جواب کے لئے کافی ہے، اس لئے ہم کہیں گے کہ ہمیں تمام مضرتیں تسلیم، مگر اس کا دارومدار نفع ونقصان پر نہیں ہے، کسی اور حکمت پر ہے جس کے نہ تو ہم جاننے کا دعویٰ کریں، اور نہ ہی بتانے کی ذمہ داری لیں، اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ اگر طبیب حاذق مریض کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرے اور تجویز کی وجہ بنیاد نہ بتائے اور بظاہر مریض کو اس سے تکلیف بھی ہو تو کیا اس کا صرف حاذق ہونا اس کے لئے کافی نہ ہوگا، کہ اس مریض کے لئے اس کے بتائے ہوئے طریق علاج کے استعمال کو واجب کہا جائے گا۔

اور بعض اہل علم نے آیت کے اس جزء کی ایک اور توجیہ کی ہے کہ تم مردہ کی وصیت کو اپنے لئے مضر اور اس مردہ کو ضرر رساں نہ سمجھو کہ ہمارا حصہ وصیت کی وجہ سے گھٹ گیا۔ اور یہ سوچ کر وصیت کو نافذ کرنے میں کوتاہی نہ کرو، کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ کونسا شخص زیادہ نفع پہنچانے والا ہے، یعنی اگر وہ وصیت نہ کرتا تو دنیا کے اعتبار سے وہ زیادہ نفع دینے والا تھا، لیکن اب وہ وصیت کرنے والا آخرت کے اعتبار سے تمہارے لئے زیادہ فائدہ پہونچانے والا بن گیا کہ تم اس کو جاری کرکے ثواب لوگے۔

اور اسلام کی ابتدا میں جب میراث کے قوانین نہیں آئے تھے، سب کا حصہ مورث کی رائے پر مبنی ہوتا تھا، اس وقت یہی امر حکمت سے قریب ترین اور اس کے مطابق تھا، اور ممکن ہے کہ اصل مقصود تو یہی میراث کا قانون ہو، لیکن وحشت

زدگی سے بچانے کے لئے دھیرے دھیرے اس کا حکم کیا گیا ہو، پہلے وصیت کرنے والے کی رائے پر ایک حکمت کے تحت رکھ دیا ہو۔

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ ﴾

ترجمہ: اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جاویں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہو تو تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا وصیت نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جاویں یا دین کے بعد۔ اور ان بیبیوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ اگر تمہاری کچھ اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری کچھ اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا وصیت نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین کے بعد۔

میاں بیوی کا حصہ:

اور تمہیں اس ترکہ کا آدھا حصہ ملے گا، جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ ایک نہ زیادہ) اور اگر ان بیویوں کی کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو (اس صورت میں) تمہیں ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا (یہ کل دو دو صورتیں) ہوئیں، اور دونوں صورتوں میں باقی دوسرے وارثوں کو ملے گا، لیکن ہر صورت میں یہ میراث) وصیت (کے مطابق مال) نکالنے کے بعد کہ وہ جس کی وصیت کر جائیں یا قرض کے بعد، اور ان بیویوں کو چوتھائی حصہ ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ، خواہ وہ ایک ہوں یا کئی ہوں، وہ چوتھائی حصہ سب میں برابر بٹ جائے گا، اگر تمہاری کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث، نہ ایک نہ زیادہ) اور اگر تمہاری کچھ اولاد ہو (خواہ ان بیویوں سے یا دوسری عورت سے) تو ان کو (خواہ وہ ایک ہوں یا کئی) تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا، یہ بھی دو صورتیں ہوئیں، اور دونوں صورتوں میں باقی دوسرے وارثوں کو ملے گا، لیکن یہ میراث نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا قرض (اگر ہو تو اس کے بھی نکالنے) کے بعد ملے گی۔

﴿ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ ﴾

ترجمہ: اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں

نہ فروع ہوں اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہونگے وصیت نکالنے کے بعد جس کی وصیت کردی جاوے یا دَین کے بعد، بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہنچاوے۔ یہ حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے حلیم ہیں۔

اخیافی بہن بھائی کا حصہ:

اور اگر کوئی میت ایسی ہو جس کی میراث دوسروں کو ملے گی، خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت جس کے نہ اصول ہوں (یعنی باپ دادا) نہ فروع (یعنی اولاد اور بیٹے کی اولاد) اور اس (میت) کے ایک بھائی یا ایک بہن (اخیافی) ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے زیادہ ہوں مثلاً دو ہوں یا اور زیادہ) تو وہ سب تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے (اور ان میں مذکر ومؤنث کا حصہ برابر ہے اور باقی میراث دوسرے وارثوں کو اور اگر کوئی اور نہ ہو تو پھر انہی کو دی جائے گی۔ یہ دو صورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں یہ میراث) وصیت (کے مطابق مال) نکالنے کے بعد جس کی وصیت کردی جائے، یا اگر قرض (ہو اس کو بھی نکالنے) کے بعد (ملے گی) بشرطیکہ (وصیت کرنے والا) کسی (وارث) کو ضرر نہ پہونچائے (نہ ظاہر میں، نہ ارادہ کر کے، ظاہر میں یہ کہ مثلاً ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرے تو وہ وصیت میراث پر مقدم نہ ہوگی، اور ارادہ کر کے یہ کہ رہے تو ایک تہائی کے اندر لیکن نیت یہ ہو کہ اصل وارث کو کم ملے، اگر چہ یہ وصیت ظاہر میں تو نافذ ہو جائے گی، لیکن گناہ ہوگا) یہ (جتنا کچھ یہاں تک بیان کیا گیا) حکم اللہ کی طرف سے کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا اور وہ ماننے والوں کو جو فوراً سزا نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) حلیم (بھی) ہیں۔

فائدہ: اخیافی کی قید پر اجماع ہے حتیٰ کہ سعد بن ابی وقاصؓ اور ابیؓ أخ أو اخت کے ساتھ من الأم بھی پڑھتے تھے (روح المعانی) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے یہ قید انھوں نے بطور تفسیر کے سنی ہوگی، اور خود اس مقام پر غور کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ان بھائیوں اور بہنوں کو سدس یعنی چھٹے حصہ کا اور ثلث یعنی تہائی حصہ کا مستحق ٹھہرایا ہے، اور یہی دو حصے اوپر ماں کے بیان میں ذکر ہوئے ہیں، اس مناسبت سے یہ بھائی بہن وہی معلوم ہوتے جو ماں میں شریک ہیں، اور عینی اور علاتی یعنی حقیقی اور باپ شریک (بھائی) بہنوں کا حکم اس سورت کے ختم پر آئے گا، اور یہ امر بالاتفاق قطعی ہے، اس سے بھی ثابت ہوا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ کسی اور قسم کے بھائی بہن کا ذکر ہے۔ اور یہاں شاید سدس اور ثلث کے قرینہ سے من الام کی قید چھوڑ دی ہو، اور وہاں ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾ کے قرینہ سے من الأبوین یا من الاب کی قید چھوڑ دی ہو، کیونکہ اس قید سے معلوم ہوا کہ کسی ایسے کا ذکر ہے جو خود ذاتی طور پر یا کسی دوسرے کی وجہ سے عصبہ بن جاتا ہے، اور اخیافی کبھی بھی عصبہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔ اور اصول کی تفسیر جو باپ دادا

کی شکل میں کی گئی ہے تو یہ امام (ابوحنیفہ) صاحب کا مذہب ہے۔ چنانچہ دادا سے سب طرح کے بھائی بہن ساقط ہو جاتے ہیں، لیکن دوسرے علماء اور ائمہ کے نزدیک ساقط نہیں ہوتے، اور اس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان بھی اختلاف تھا۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ﴾

ترجمہ: یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کردیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا اس کو آگ میں داخل کریں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

ربط: مذکورہ احکام کو بیان کرکے اب ان کو اعتقاداً و عملاً ماننے کی تاکید اور فضیلت بیان کرتے ہیں اور نہ ماننے پر وعید ہے۔

مذکورہ احکام کی اطاعت کی تاکید:

یہ سب احکام جن کا ذکر ہوا (جو میراث سے متعلق ہیں یا یتیموں کے احکام سمیت) اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا (یعنی ان ضابطوں کی پابندی کرے گا) اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جنتوں میں (فوراً) داخل کردیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا (یعنی پابندی کے ضروری ہونے کا عقیدہ بھی نہ رکھے گا، جو کہ کفر کی حالت ہے) اس کو جہنم کی آگ میں داخل کریں گے، اس طرح کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

فائدہ: ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ ﴾ اور ﴿ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ ﴾ کی جو تفسیر کی گئی ہے، اس کی بنا پر اس آیت میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، ایک مطیع کامل، دوسرے عاصی یعنی گنہ گار کامل۔ اور اس میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے جو اعتقاد کے طور پر مطیع ہو، مگر عمل کے لحاظ سے تقصیر میں مبتلا ہو۔ اس کا حکم دوسری آیتوں میں موجود ہے کہ وہ سزا کا مستحق ہے، لیکن آخر میں نجات پا جائے گا اور خود یہاں بھی غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جب اس کی حالت درمیانی ہے تو جزا بھی درمیانی ہوگی یعنی کچھ عذاب اور کچھ ثواب، اور ظاہر ہے کہ ثواب کا پہلے اور عذاب کا بعد میں ہونا تو احتمال باطل

ہے، لہٰذا اس کے برعکس متعین ہوگیا یعنی عذاب پہلے ہوجائے اور ثواب بعد میں، اس طرح آخر میں نجات ثابت ہوئی۔ اور 'فوراً' کے معنی یہ ہیں کہ بغیر عذاب کے سیدھا جنت میں جائے گا اور بالکل نکل جانا کفر کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ اعتقاد رکھنا بھی تو ایک ضابطہ ہے، اس لئے جس کا عقیدہ وہ اس سے کلی طور پر خارج نہیں ہے، اور یہ احتمال باطل ہے کہ کوئی عمل کرے اور عقیدہ نہ رکھے، کیونکہ عمل کی قبولیت کے لئے عقیدہ شرط ہے، اس لئے وہ عمل بھی منفی رہے گا وہ بھی بالکل خارج رہا۔

﴿ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیبیوں میں سے سو تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں میں سے گواہ کرلو سو اگر وہ گواہی دیدیں تو تم ان کو گھروں کے اندر مقید رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرمادیں۔ اور جونسے دو شخص بھی وہ بے حیائی کا کام کریں تم میں سے تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں۔

ربط: دور جاہلیت میں جس طرح یتیموں اور وارثوں کے معاملہ میں بہت سی بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں جن کی اصلاح اوپر کی آیتوں میں بیان کی گئی، اسی طرح عورتوں کے معاملہ میں بھی طرح طرح کی قبیح رسمیں اور بدعنوانیاں پھیلی ہوئی تھیں، مثلاً انہیں طرح طرح سے ایذائیں پہونچاتے تھے، انہیں تنگ کرتے تھے، جن سے نکاح حرام ہے، ان سے نکاح کرلیا کرتے تھے وغیرہ۔ اب ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ ﴾ تک ان معاملات کی اصلاح فرماتے ہیں، اور جو خطا وقصور شریعت کے مطابق معتبر ہو اس پر تادیب کی اجازت دیتے ہیں، اور یہ مضمون تادیب ہی سے شروع ہوا ہے اور تادیب واصلاح ہی پر ختم ہوا ہے۔

آٹھواں حکم زانیہ کی سیاست:

اور تمہاری (منکوحہ) بیویوں میں سے جو عورتیں بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تو تم لوگ ان عورتوں (کے اس فعل) پر اپنے آدمیوں میں سے (یعنی آزاد، عاقل، بالغ، مذکر) چار گواہ بنالو (تاکہ ان کی گواہی پر حکام آئندہ کی سزا جاری کریں) تو اگر وہ گواہی دیدیں تو (ان کی سزا یہ ہے کہ) تم انہیں (حاکم کے حکم سے سیاست یعنی سزا کے طور پر) گھروں کے اندر قید رکھو، یہاں تک کہ (یا تو) موت ان کا خاتمہ کردے (اور) یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ (یعنی دوسرا حکم)

تجویز فرمادیں (چنانچہ بعد میں جو دوسرا حکم تجویز ہوا وہ فائدہ میں آئے گا) اور (زنا کی سزا میں نکاح کی ہوئی عورت کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ) تم میں سے (یعنی عاقل و بالغ مسلمانوں میں سے) جو بھی دو فرد (وہ بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تو ان دونوں کو اذیت پہونچاؤ پھر (اذیت پہونچانے کے بعد) اگر وہ دونوں (گذشتہ عمل سے) توبہ کرلیں اور (آئندہ کے لئے اپنی) اصلاح کرلیں (یعنی پھر ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہو) تو ان دونوں سے کوئی تعرض نہ کرو (کیونکہ) بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی خطا معاف کردی، پھر تمہیں بھی ان کے پیچھے نہیں پڑا رہنا چاہئے۔

فائدہ: یہ جو کہا گیا ﴿وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا﴾ یعنی "جو بھی دو فرد" اس میں نکاح والی اور بے نکاح والی عورت اور نکاح والا مرد اور بے نکاح والا مرد (دورِ حاضر کے مروجہ اردو الفاظ میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ) سب آگئے، اس لئے ان چاروں کا حکم بیان کردیا گیا، ان کا یہ حکم ابتدا میں تھا کہ اذیت تو سب کو پہونچائی جائے، جس کا طریقہ صرف منکوحہ یعنی نکاح والی عورت کے لئے تو بیان فرمایا کہ ان کو قید کر کے رکھو، اور باقی کے لئے طریقہ بیان نہیں فرمایا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ عمل اسلامی حاکموں کی رائے پر تھا کہ جس طریقہ سے تنبیہ اور سزا کی مصلحت پوری ہو، خواہ زبان سے یا ہاتھ سے، پھر وہ دوسرا حکم بعد میں نازل ہوا جس کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ طریقہ بیان فرمادیا ہے تو تم لوگ سمجھ لو اور یاد کرلو کہ غیر شادی شدہ کے لئے سو درے اور شادی شدہ کے لئے سنگساری۔ جیسا کہ صحاح یعنی صحیح حدیثوں کی تمام کتابوں میں آیا ہے، اسی طرح اس آیت کا حکم منسوخ ہے۔

مسئلہ (۱): زنا کی سزا کے لئے گواہ چار مرد مسلمان عاقل بالغ آزاد شرط ہیں، اور منکم میں اس طرف اشارہ بھی ہے، کیونکہ مخاطب ایسے ہی لوگ ہیں۔

مسئلہ (۲): حاکموں کے سوا کوئی بھی دوسرا شخص یہ سزائیں نہیں دے سکتا، یہ دونوں مسئلے ہدایہ سے لکھے گئے ہیں۔

اور لفظ سیاست کو سزا سے واضح کردینے سے یہ شبہ دور ہوگیا کہ گھروں میں محفوظ رکھنا تو شوہر کی ذمہ داری اور اس کا حق ہے، پھر یہ سزا کیا ہوئی، جواب یہ ہے کہ شوہر کا رکھنا حفاظت کے لئے ہے اور یہ مقید رکھنا سزا کے لئے ہے۔

اور توبہ کے بعد جو فرمایا کہ تعرض نہ کرو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سزا نہ دو کیونکہ یہ توبہ، سزا کے بعد بیان ہوئی ہے، جیسا کہ اس پر فا دلالت کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ سزا کے بعد پھر ملامت مت کرو اور زیادہ سزا مت دو، بخلاف توبہ نہ کرنے والے کے اس پر ملامت کرنا درست ہے، جیسا کہ اس گناہ کا دوبارہ ارتکاب کرنے والے کو دوبارہ سزا دی جاتی ہے۔

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا

حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

ترجمہ: توبہ، جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔ سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں حکمت والے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی جن کو حالتِ کفر پر موت آ جاتی ہے، ان لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

ربط: اوپر کی آیت میں توبہ کا ذکر تھا، اب اس توبہ کے قبول ہونے اور قبول نہ ہونے کی صورتوں کا بیان ہے۔

توبہ کی قبولیت کی شرط:

جس توبہ کا قبول کرنا (وعدہ کے مطابق) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو انہی لوگوں کی ہے جو حماقت کی وجہ سے کوئی گناہ (صغیرہ ہو یا کبیرہ) کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی (یعنی موت کے سامنے آنے سے پہلے جس کے معنی آگے آتے ہیں) توبہ کر لیتے ہیں، تو ایسے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ (توبہ قبول کرنے کے ساتھ ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول کر لیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں (کہ کس نے دل سے توبہ کی) حکمت والے ہیں (کہ دل سے توبہ نہ کرنے والے کی فضیحت نہیں کرتے) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو (برابر) گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی (حضور موت یا موت کے سامنے آ کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں) تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں (تو نہ تو ایسے لوگوں کی توبہ مقبول ہے) اور نہ ان لوگوں کی (توبہ) جنہیں کفر کی حالت پر موت آ جاتی ہے (یعنی ایسے ہی ان لوگوں کا ایسے وقت کا ایمان مقبول نہیں ہے) ان (کافر) لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا (یعنی جہنم کا عذاب) تیار کر رکھی ہے۔

فائدہ: برابر گناہ کرتے رہتے ہیں کا یہ مطلب نہیں کہ بار بار کرتے رہتے ہیں، بلکہ اگر ایک بار بھی گناہ کر کے اس سے توبہ نہ کی تو اس وجہ سے یہ اصرار ہے اور اصرار پھر کرنے کے حکم میں ہے، اس لئے اس کو بھی بار بار کرنے کی طرح کہا جائے گا، یہ مطلب ہے برابر کرنے کا۔

اور جاننا چاہئے کہ موت کے قریب ہونے کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ زندگی سے ناامید ہو جائے، لیکن ابھی اس عالم کے احوال اور ہولناک حالات نظر نہیں آئے تو اس حالت کو 'یاس' (یا کے ساتھ) کہنا مناسب ہے اور دوسرے یہ کہ اس عالم کے احوال بھی نظر آنے لگیں تو اس حالت کو 'باس' (باء کے ساتھ) کہنا مناسب ہے، اس طرح پہلی حالت یعنی یاس میں تو

کافر کا ایمان لانا اور گنہ گار کا توبہ کرنا دونوں مقبول ہیں اور دوسری حالت یعنی یاس میں دونوں غیر مقبول، محققین کا یہی مذہب ہے اور قرآن سے پہلے والا مفہوم ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے اور جن کے دوسرے اقوال ہیں، وہ آیت کی توجیہ دوسرے طریقہ سے کرلیں گے۔ واللہ اعلم۔

اور جاننا چاہئے کہ یہ جو فرمایا کہ حماقت سے الخ یہ قید واقعہ کے طور پر ہے احتراز یا شرط کے طور پر نہیں، کیونکہ گناہ تو ہمیشہ حماقت ہی سے ہوتا ہے، جس کو اپنے نفع ونقصان کی پروانہ ہو، اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی، اور جاننا چاہئے کہ سوء اور سیئات میں دونوں جگہ عام ہونے کی وجہ سے ہر عمل بد حتی کہ کفر بھی شامل ہے اور قانون کلی سے ایمان کا مقبول یا نا مقبول ہونا معلوم ہو گیا تھا، لیکن یاس کے وقت کفار کے ایمان کا نا قابل قبول ہونا پھر صراحت کے ساتھ شاید اس لئے بیان فرمایا ہو کہ اہل کفر کی تاخیر کا قبیح ہونا اچھی طرح واضح ہو جائے۔ واللہ اعلم

اور گنہ گار کے حق میں جو فرمایا کہ حضور موت یا موت کے سامنے آ کھڑی ہونے کے وقت کی توبہ قبول نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مغفرت کا وعدہ اس سے متعلق نہیں، ویسے اگر مشیت سے اللہ کا فضل ہو جائے تو اس کے لئے کوئی امر مانع نہیں، اللہ تعالیٰ کو سب کچھ اختیار ہے، اور بعض محققین نے ﴿ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ ﴾ کی دوسری تقریر کی ہے کہ جو شخص ساری عمر کفر پر قائم رہا حتی کہ اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا اور وہ عمر کے کسی حصہ میں دوسرے گناہوں سے توبہ کرلے لیکن مسلمان نہ ہو تو اس کی وہ توبہ جو اس نے گناہوں سے کی قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ ایمان توبہ کی قبولیت کی شرائط میں سے ہے، جیسا کہ موت کے سامنے آ کھڑی ہونے سے پہلے جلدی توبہ کرنا بھی شرط ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ۔ اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ وصول کرلو مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شئے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔

ربط: آٹھویں حکم سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہاں سے ان قبیح رسوم کو باطل قرار دیا گیا ہے جو عورتوں کے سلسلہ میں پائی جارہی تھیں، ان رسموں میں سے ایک یہ تھی کہ جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کا وارث جس طرح اس کی وراثت کا مال لیتا اسی طرح اس کی بیوی کو بھی اپنی میراث اور ملکیت سمجھتا، کہ اگر دل چاہتا تو اس سے زبردستی خود نکاح کرلیتا اور اگر چاہتا تو

اپنی مرضی سے کسی دوسرے سے جس سے چاہتا نکاح کر دیتا، اور کبھی بے رغبتی کی وجہ سے نہ خود نکاح کرتا اور نہ اسے دوسرے سے اس لئے نکاح کرنے دیتا کہ وہ اپنا مال و دولت اپنے ساتھ لے جائے گی اور اس طرح اس کو یوں ہی محبوس رکھتا کہ یا تو وہ اپنا مال و متاع اس کو دیدیتی تب اس کی جان چھوٹتی یا وہ اس کے گھر مرجاتی تو اس کے مرنے کے بعد اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لیتا۔ اور میت کے مال میں سے بھی عورت کو وراثت کا حصہ نہ دیتے، یہ کارروائی تو وارث کرتے تھے، اور کبھی خود شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس کے کسی قصور کے بغیر بدعنوانی کرتا تھا، کہ نہ تو اس کے حقوق زوجیت ادا کرتا تھا اور نہ اس کو طلاق دیتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ نکاح کر کے سکون کی زندگی گذارنے لگے، بلکہ اس کو اس امر پر مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کو اس کی مرضی کے مطابق کچھ مال دے جب یہ اس کو چھوڑے، چنانچہ اس کو ایسا کرنا پڑتا تھا، بلکہ کبھی طلاق دینے کے بعد بھی اس کو نکاح نہیں کرنے دیتا تھا، جب تک کہ وہ اس کو کچھ مال نہ دیدیتی، اس آیت میں ﴿ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ تک عام الفاظ ہیں جن میں یہ سب امور آجائیں گے، ان رسموں کی ممانعت فرماتے ہیں، پھر ﴿ عَاشِرُوهُنَّ ﴾ سے صرف شوہروں کو بیویوں کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں خطاب فرماتے ہیں۔

نواں حکم: عورتوں پر ظلم سے روکنا:

اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ عورتوں کے (مال یا جان کے) زبردستی مالک بن جاؤ (مال کا مالک بن جانا تین طرح سے ہے ایک یہ کہ اس عورت کا جو حق شرعی میراث میں ہے، اس کو خود لے لیا جائے، اس کو نہ دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے، یہاں تک کہ وہ یہاں ہی مرجائے، پھر اس کا مال لے لیں، یا وہ خود اپنے ہاتھ سے کچھ دے، تیسرے یہ کہ خاوند اسے بغیر کسی وجہ کے مجبور کرے تا کہ وہ اس کو کچھ مال دے، تب یہ اس کو چھوڑے، پہلی اور تیسری صورت میں زبردستی کی قید سے یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ معاملات بالکل عورت کی خوشی سے ہوں تو جائز اور حلال ہیں اور دوسری صورت میں یہ زبردستی اصلاً نکاح سے روکنے میں ہیں جس کا مقصد مال لینا تھا، اس لئے الفاظ میں اس سے استثناء کر دیا، اس سے بھی وہی فائدہ ہوا، یعنی اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح نہ کرے تو ان لوگوں کو گناہ نہیں۔

اور جان کا مالک ہونا یہ تھا کہ مرنے والی کی بیوہ کو میت کے ترکہ کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، اس صورت میں زبردستی کی قید واقعہ کے طور پر ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت اگر راضی ہو تو وہ حقیقت میں میراث اور ملکیت ہو جائے گی۔

اور ان عورتوں کو اس غرض سے قید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے (یعنی خود تم نے یا تمہارے مرنے والے عزیز نے) ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ (بھی ان سے) وصول کر لو (اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں: ایک یہ کہ میت کا وارث اس میت کی بیوہ کو نکاح نہ کرنے دیتا تا کہ یہ انہیں کچھ دے، دوسرے یہ کہ خاوند اس کو مجبور کرتا کہ اسے کچھ دے تب

چھوڑے، تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی بغیر کچھ لئے اس کو نکاح نہ کرنے دیتا، یہاں کی پہلی صورت اوپر کی دوسری صورت کا ایک جز ہے، اور یہاں کی دوسری صورت اوپر کی تیسری صورت ہے اور اوپر کی پہلی صورت اور یہاں کی تیسری صورت الگ الگ ہیں) مگر (بعض صورتوں میں ان سے مال لینا یا ان کو روک کر رکھنا جائز ہے وہ) یہ کہ وہ عورتیں کوئی کھلی ناشائستہ حرکت کریں (اس میں بھی تین صورتیں آگئیں: ایک یہ کہ ناشائستہ حرکت شوہر کی نافرمانی اور بداخلاقی ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ اس کو بغیر مال لئے ہوئے جو مہر سے زیادہ نہ ہو، اس کو نہ چھوڑے، دوسرے یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو اسلام کے شروع میں حدود کے نازل ہونے سے پہلے خاوند کو جائز تھا کہ اس جرمانہ میں اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے لے، اور اس کو نکال دے، لیکن اب یہ حکم منسوخ ہے کہ زنا سے مہر کا واجب ہونا ساقط نہیں ہوتا۔ ان دو صورتوں میں تو مال لیا جائے گا اور تیسری صورت یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو خاوند کو اور دوسرے وارثوں کو جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا، سزا کے طور پر حاکم کے حکم سے عورتوں کو گھر کے اندر قید رکھنا جائز تھا، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، لہٰذا یہ مقید رکھنا بطور سزا کے ہوگا، مال وصول کرنے کی غرض سے نہ ہوگا، اس طرح استثنا مطلق دوسرا نکاح کرنے سے باز رکھنے سے ہوگا، نہ کہ آنے جانے سے روکنے کی غرض سے قید کرنے سے۔ آگے خاص شوہروں کو حکم ہے) اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی اور بھلائی یعنی خوش اخلاقی اور نان ونفقہ کی خبر گیری وغیرہ کے ساتھ زندگی گزارا کرو۔ اور اگر (طبیعت کے تقاضہ کے مطابق) وہ تمہیں ناپسند ہوں (اور ان کی طرف سے ناپسندیدگی کا باعث کوئی امر واقع نہ ہو) تو (تم عقل کے تقاضہ سے یہ سمجھ کر برداشت کرو کہ) ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر خیر کثیر (کوئی بڑی منفعت دنیاوی یا دینی) رکھ دیں (مثلاً وہ تمہاری خدمت گذار، آرام وسکون پہنچانے والی ہمدرد ہو، یہ دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہو کر بچپن میں مرجائے جو ذخیرۂ آخرت ہوجائے یا زندہ رہے اور صالح ہو اور صدقۂ جاریہ بن جائے، یا کم سے کم درجہ، ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنے کی فضیلت تو ضرور ہی ملے گی)

﴿ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱ ﴾

ترجمہ: اور اگر تم بجائے ایک بیوی کے دوسری بیوی کرنا چاہو اور تم اس ایک کو انبار کا انبار مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ مت لو، کیا تم اس کو لیتے ہو بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر۔ اور تم اس کو کیسے لیتے ہو، حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار لے چکی ہیں۔

ربط: اوپر کی آیت میں ﴿ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ ﴾ کے استثناء کے عام اور مطلق ہونے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اگر عورت کی جانب سے کوئی خرابی ہو تو اس کو چھوڑنے، طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال لینا جو کہ مہر کی رقم سے زیادہ نہ ہو جائز ہے، اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں درست نہیں، ان میں ایک حالت یہ تھی کہ پہلی بیوی سے رغبت نہ رہی، کسی دوسری عورت سے رغبت ہوئی، اس سے نکاح کرنا چاہا اور اس کا مہر دینے کی یہ تجویز سوچی کہ پہلی بیوی سے دیا ہوا مال کسی طرح وصول کر کے یا اگر نہ دیا ہو تو اس سے معاف کرا کر وہی اس دوسری کو دیدے تاکہ مقصد حاصل ہو جائے اور اپنے پاس سے مہر نہ دینا پڑے، یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے کبھی تو پہلی بیوی پر کچھ بہتان، تہمت لگا دیتے تاکہ اس سے مال لینے میں اپنے اوپر کوئی الزام نہ آئے اور کبھی ایسے ہی پریشان کرتے رہتے تاکہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے اس کو مہر کی رقم معاف کردے۔ اس آیت میں اس کی ممانعت ہے، اس طرح اس کا مضمون گویا پہلے والے مضمون کا تتمہ ہے۔

بیوی کی نافرمانی کے بغیر مہر واپس طلب نہ کرنا:

اور اگر تم (خود اپنی رغبت کی وجہ سے) ایک بیوی (یعنی پہلی) کی بجائے دوسری بیوی کرنا چاہو (اور پہلی بیوی کا کوئی قصور نہ ہو) اور تم اس (پہلی) کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو (خواہ ہاتھ میں یا خاص مہر میں دینے کا وعدہ کیا ہو) تو تم اس (دیئے ہوئے یا معاہدہ کئے ہوئے) میں سے (عورت کو تنگ کر کے) کچھ بھی مت لو (اور معاف کرانا بھی واپس لینے کے ہی حکم میں ہے) کیا تم اس کو (اس کی ذات پر نافرمانی یا بدکاری کا) بہتان رکھ کر اور (اس کے مال میں) صریح گناہ (یعنی ظلم) کے مرتکب ہو کر (واپس) لو گے؟ (خواہ بہتان کھلا ہوا ہو یا کہ اس سے اشارہ ہوتا ہو، اوپر صرف نافرمانی اور بدکرداری کی صورت میں اس سے مال لینے کی اجازت تھی، پھر جب اس سے مال لیا تو گویا دوسروں کے ذہنوں میں اس کے نافرمان و بدکردار ہونے کا تصور بٹھایا اور ظاہر ہے کہ مال ظلم کی وجہ سے لیا کہ عورت نے بغیر خوشی کے مال دیا اور ہبہ کی صورت میں ظلم یہی ہے کہ زوجیت جو ہبہ سے رجوع کے موانع میں سے ہے اور بہتان بھی اس سے لازم آتا ہے، کیونکہ واپس لینا گویا یہ کہنا ہے کہ یہ میری زوجہ نہ تھی، اس کا بہتان ہونا ظاہر ہے کہ اس کو زوجیت کے دعوی میں جھوٹی اور معاشرت میں فاسق ٹھہراتا ہے) اور تم اس (دیئے ہوئے) کو (درحقیقت یا حکماً) کیسے لیتے ہو؟ حالانکہ (ظلم اور بہتان کے علاوہ اس طرح لینے سے دوامر اور بھی مانع ہیں: ایک یہ کہ) تم آپس میں ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو (یعنی صحبت ہو چکی ہے یا خلوت صحیحہ کہ وہ بھی صحبت کے حکم میں ہے۔ بہرحال انھوں نے اپنے آپ کو تمہارے فائدہ اٹھانے اور لذت حاصل کرنے کے لئے تمہارے حوالہ کردیا ہے اور مہر اس سپردگی کا بدل ہے، اس طرح جو کچھ بدلہ میں دیا گیا اس کو حاصل کرنے کے بعد بدل کو واپس لینا یا کہ بدل نہ دینا عقل سلیم کے بالکل خلاف ہے، اور اگر وہ مال ہبہ کیا ہوا تھا تو یہ زوجیت کے اثر تک پہونچنے کی وجہ سے مانع ہے اور اصل مانع زوجیت ہے) اور (دوسرا مانع یہ کہ) وہ عورتیں تم

سے ایک پختہ اور مستحکم عہد لے چکی ہیں (وہ عہد یہ ہے کہ تم نے نکاح کے وقت مہر اپنے ذمہ رکھا تھا اور عہد کر کے اس کی خلاف ورزی کرنا یہ بھی عقل کے نزدیک قابل مذمت ہے اور اگر وہ شے ہبہ کی ہوئی ہے تو افضا کی طرح یہ عہد بھی زوجیت کا اثر ہونے کی وجہ سے مانع ہے۔ غرض چار موانع کے ہوتے ہوئے واپسی انتہائی قابل مذمت ہے)

مسئلہ (۱): اگر عورت کی جانب سے کوئی بدمزاجی وغیرہ واقع ہو تو اس کو مہر کی واپسی پر مجبور کرنا اس طرح کہ مہر کی واپسی کے بغیر اسے نہ چھوڑے، جائز ہے اور اگر مرد کی جانب سے عدم موافقت ہو تو مجبور کرنا جائز نہیں، ﴿ اَرَدْتُّمُ ﴾ کی تفسیر سے دوسرا حکم اور پہلے مانع کی تقریر سے پہلا حکم معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ (۲): اگر کسی طرف سے کوئی بدعنوانی نہیں ہوئی محض آئندہ کی احتیاط کی وجہ سے کہ قرائن سے موافقت کی امید معلوم نہیں ہوتی، خلع کرنا چاہیں اور عورت اپنی خوشی سے مہر واپس کر دے تو جائز ہے، دوسرے مانع کی تقریر سے یہ حکم معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ (۳): اگر نکاح کے بعد نہ صحبت ہوئی نہ خلوت صحیحہ ہوئی تو پورا مہر لازم نہیں ہوا، تو اگر ایسی حالت میں طلاق واقع ہو تو نصف مہر دینا پڑے گا، اور نصف ساقط ہو جائے گا، اور یہ حکم تیسرے مانع سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ افضا کو مہر کی واپسی کا مانع فرمایا ہے کہ اس مانع کے ہوتے ہوئے کوئی جز واپس نہ لو، اور جب یہ مانع نہیں پایا گیا تو یہ حکم بھی نہ ہوگا، اس طرح بعض جز واپس ہو سکے گا۔ اور خلع، طلاق کے حکم میں ہے، تو اگر اس حالت میں خلع ہوا تو نصف مہر تو دخول سے پہلے طلاق کی وجہ سے ساقط اور نصف خلع سے۔

مسئلہ (۴): اگر نکاح کے وقت مہر بالکل مقرر نہیں ہوا تو اس صورت میں مہر مثل لازم آتا ہے، لیکن صرف نکاح سے اس کے کسی جز کی تاکید نہیں ہوتی، چنانچہ اگر اس حالت میں طلاق ہو تو اصلاً مہر نہ دینا پڑے گا، البتہ ایک جوڑا دینا پڑتا ہے، جس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۲۳۶ کے تحت تینیسویں حکم میں گذر چکی ہے، یہ واجب نہ ہونا چوتھے مانع سے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ (۵): اور زوجہ کو کوئی بھی چیز ہبہ کرنے اور قبضہ میں دینے کے بعد کسی حال میں واپس نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہاں چاروں موانع میں قدر مشترک زوجیت ہے اور وہ دور ہونے والی نہیں ہے فقط۔

اور خلوت صحیحہ کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں بیان کردی گئی ہے۔ اور ﴿ تَاْخُذُوْنَهٗ ﴾ کی تفسیر میں جو حقیقۃً یا حکماً کہا گیا ہے، اس میں حقیقت سے مراد حسی واپسی ہے اور حکم سے مراد معاف کرانا ہے۔

شبہ کا ازالہ:

اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں مہر کم مقرر کرنے کی تاکید آئی ہے اور اس آیت سے زیادہ کا جواز معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سے معلوم ہونے والا یہ جواز صحت اور نفاذ کے معنی میں ہے، اور حدیث میں جواز مطلق اباحت کے

معنی میں ہے اور عدم کراہت کی نفی ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ میں زیادہ مہر کے جواز کو مان لینا اس لئے تھا کہ سننے والے اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں، چنانچہ اس سے عدم کراہت ثابت نہیں ہوتی، اور نہ ہی حضرت عمر پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾﴾ ع ۳

ترجمہ: اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو، مگر جو بات گزر گئی، گزر گئی۔ بیشک یہ بڑی بے حیائی اور نہایت نفرت کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔

ربط: دورِ جاہلیت کی قبیح رسموں میں سے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے ایک رسم یہ تھی کہ بعض حرام کی ہوئی عورتوں سے نکاح کر لیا کرتے تھے، مثلاً سوتیلی ماں یعنی اپنی ماں کے علاوہ باپ کی دوسری بیوی سے یا ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے۔ اور بعض حلال عورتوں کو حرام سمجھتے تھے، جیسے گود لئے ہوئے بیٹے کی بیوی، اب دسویں حکم میں اس کو باطل قرار دیتے ہیں، اور موقع و محل کی مناسبت سے دوسری محرمات کی تفصیل بھی بیان فرماتے ہیں، اور بعض حلال عورتوں کی حلت میں مسلمانوں کو شبہ ہوا تھا جیسے شرعی طور پر مملوکہ عورت جس کا پہلا شوہر حربی دار الحرب میں ہو، ان کی حلت کا بیان بھی فرما دیا۔ اور نکاح کے بعض شرائط اور اس کے دوسرے متعلقات مہر وغیرہ کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

دسواں حکم: محرمات کی تفصیل، اور نکاح سے متعلق دوسرے احکام:

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (یا دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو مگر جو بات گذر گئی سو گذر گئی (آئندہ کبھی ایسا نہ ہو) بیشک یہ (بات عقل کے لحاظ سے بھی) بڑی بے حیائی ہے، اور (فطرت سلیمہ والوں کے عرف میں بھی) نہایت نفرت کی بات ہے، اور (شرعاً بھی) بہت برا طریقہ ہے۔

فائدہ: گذر گئی کا مطلب یہ ہے کہ دور جاہلیت میں بعض لوگ ایسا کرتے تھے مگر شائستہ لوگ اس زمانہ میں بھی اس کو برا سمجھتے تھے، اور اس کو نکاح مقت کہتے تھے، اور ایسے نکاح سے جو اولاد ہوتی تھی اس کو مقتی کہا کرتے تھے جیسا کہ تفسیر کشاف میں بیان کیا گیا ہے، اس لئے احقر نے اس میں لفظ عرف بڑھا دیا ہے، کیونکہ ان کے عرف میں اس کا لقب مقت مشہور تھا، اور عقلاً بے حیائی اور شرعاً اس سے روکے جانے کی وجہ سے اس کا برا طریقہ ہونا ظاہر ہے، حتی کہ اگر کوئی ایجاب وقبول کر لے تب بھی وہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، کہ یہ باطل محض ہے، یہی حکم آگے حرام کی گئی عورتوں یعنی نساء محرمات کا ہے، اس کے قبیح ہونے کے اعلیٰ درجہ کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی مذمت کی وجوہ ارشاد فرمائیں۔

مسئلہ: نکاح شرعاً وطی کے حکم میں ہے، جب ایسی عورت سے نکاح حرام ہے جو باپ کی وطی کی ہوئی عورت کے حکم

میں ہے تو جس عورت سے حقیقت میں باپ نے وطی کی ہو اس سے بدرجۂ اولیٰ نکاح حرام ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے کہ جس عورت سے باپ نے زنا کیا ہو اس سے بیٹا نکاح نہیں کرسکتا، اس طرح جہاں جہاں نکاح سے دائمی طور پر حرام کا حکم ہوجاتا ہے، وہاں زنا سے بھی یہ حکم ہوجاتا ہے۔

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۝ ﴾

ترجمہ: تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے (یعنی انّا) اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں، ان بیبیوں سے کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو اور اگر تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیبیاں جو کہ تمہاری نسل سے ہوں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھو، لیکن جو پہلے ہوچکا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر جو کہ تمہاری مملوک ہوجاویں اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تم پر فرض کردیا ہے۔

دسویں حکم کا تتمہ:

تمہارے اوپر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں (یعنی ان سے نکاح کرنا حرام اور باطل ہے اور ان کی کئی قسمیں ہیں:

پہلی قسم نسبی محرمات: وہ یہ ہیں: تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں (اور ان میں سب اصول وفروع بالواسطہ اور بلاواسطہ سب داخل ہیں) اور تمہاری بہنیں (خواہ عینی ہوں یا علاتی یا اخیافی) اور تمہاری پھوپھیاں (اس میں باپ کی تینوں قسم کی بہنیں اور دوسرے تمام مذکر اصول کی تینوں قسم کی بہنیں آگئیں) اور تمہاری خالائیں (اس میں ماں کی تینوں قسم کی بہنیں اور تمام مؤنث اصول کی تینوں قسم کی بہنیں آگئیں) اور بھتیجیاں (اس میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد بالواسطہ اور بلاواسطہ سب آگئیں) اور بھانجیاں (اس میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد بالواسطہ اور بلاواسطہ سب آگئیں)

اور (دوسری قسم رضاعی یعنی دودھ کے رشتہ کی محرمات: وہ یہ ہیں) تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے

(یعنی انّا) اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں (یعنی تم نے ان کی حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے یا اس نے تمہاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے، خواہ الگ الگ وقت میں پیا ہو)

اور تیسری قسم مصاہرہ یعنی سسرالی رشتہ کی محرمات، وہ یہ ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں (اس میں بیوی کے سب مؤنث اصول آگئے) اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں (اس میں بیوی کے سب مؤنث فروع آگئے) جو کہ (عام طور سے) تمہاری پرورش میں رہتی ہیں (مگر اس میں ایک قید بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لڑکیاں) ان بیویوں سے (ہوں) کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو (یعنی کسی عورت کے ساتھ صرف نکاح کرنے سے اس کی لڑکی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب اس عورت سے صحبت بھی ہو جائے، تب لڑکی حرام ہوتی ہے، اور اگر (ابھی) تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو (خواہ نکاح ہو چکا ہو) تو (ایسی بیوی کی لڑکی سے نکاح کرنے میں) تمہیں کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمہاری نسل سے ہوں (اس میں سب مذکر فروع کی بیویاں آگئیں اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے، لے پالک جس کو متبنیٰ کہتے ہیں، اس کی بیوی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو، لیکن جو (اس حکم سے) پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے، بڑے رحمت والے ہیں (کہ رحمت سے گناہ معاف کر دیتے ہیں)

اور چوتھی قسم وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں، مگر (اس قسم میں وہ مستثنیٰ ہیں) جو کہ (شرعی طریقہ پر) تمہاری ملکیت میں آجائیں (اور تمہاری مملوک، باندی، لونڈی ہو جائیں، اگر چہ ان کے شوہر دارالحرب میں موجود ہوں۔ ایسی عورتیں ایک حیض آجانے کے بعد یا وضع حمل یعنی اگر حاملہ ہوں تو بچہ پیدا ہو جانے کے بعد حلال ہیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے) اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تمہارے اوپر فرض کر دیا ہے۔

فائدہ: محرمات کی زیادہ تفصیل جن میں سے اکثر تو انہی مذکورہ عورتوں کے عموم میں داخل ہیں، جن کے مندرجہ بالا محرمات میں داخل ہونے کی وضاحت پیچیدہ اور عام لوگوں کی سمجھ کے لئے مشکل ہونے کی وجہ سے نہیں کی گئی اور ان میں سے بعض کا احادیث میں اور آثار میں ذکر ہے اور بعض کے سلسلے میں امت کا اجماع ہے اور اسی طرح مملوک عورتوں یعنی باندیوں لونڈیوں کے حلال ہونے کی شرطیں یہ سب فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، بات زیادہ لمبی ہو جانے کے خیال سے یہاں بیان نہیں کیا، تاہم اس وضاحت سے ایک اشکال بھی دور ہو گیا وہ یہ کہ آگے جو ان مذکورہ عورتوں کے علاوہ کو حلال فرمایا ہے تو یہاں تو صرف چند صورتوں کا ہی ذکر ہوا ہے، جن کے علاوہ اور بھی حرام صورتیں ہیں، پھر یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ان کے سوا سب حلال ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حرام صورتوں میں سے بہت سی تو ان مندرجہ بالا صورتوں کے عموم ہی میں لغت کے لحاظ سے یا عرف عام کے لحاظ سے داخل ہیں، وہ تو ''ان کے علاوہ'' میں داخل ہی نہیں جیسا کہ احقر نے ابھی لکھا ہے اور بعض صورتیں

جو ان مندرجہ بالا کے عموم میں بھی داخل نہیں، وہ واقعی ان کے علاوہ میں داخل ہوں گی، لیکن چونکہ فقرہ "ان کے علاوہ" دوسرے شرعی دلائل مثلاً احادیث اور اجماع اور پھر آثار وقیاس کی وجہ سے اپنے عموم پر باقی نہیں، اس لئے باقی محرمات اس "علاوہ" سے مستثنیٰ ومخصوص ہو جائیں گی، یعنی لفظ میں داخل ہونے کے بعد حلال ہونے کے حکم سے نکل جائیں گی، اس طرح کوئی اشکال باقی نہیں رہا، اور حرام کو حلال کرنا یا حلال کو حرام کرنا لازم نہیں آتا۔

﴿وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾

ترجمہ: اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے چاہو اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو۔ پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے متمتع ہوئے ہو سو ان کو ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں۔ اور مقرر ہوئے بعد بھی جس پر تم باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں۔

ربط: یہاں تک محرمات یعنی حرام کی ہوئی عورتوں کا بیان تھا۔ اس کے بعد ان کے علاوہ سے نکاح حلال ہونے کی بعض شرطوں کا بیان ہے۔

سابق مضمون کا تتمہ:

اور ان عورتوں کے علاوہ دوسری (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں، یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے (یعنی مہر کے ذریعہ نکاح میں لانا) چاہو (یعنی نکاح میں مہر ہونا ضروری ہے، اور) اس طرح کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (جس کی شرطیں شریعت میں مشہور ہیں، مثلاً گواہ بھی ہوں، وہ نکاح کسی خاص وقت کے لئے نہ ہو، وغیرہ) صرف مستی ہی نکالنا (مقصود) نہ ہو (اس کے عموم میں زنا اور متعہ سب داخل ہو گئے، اگرچہ ان میں بھی مال خرچ کیا جاتا ہے) پھر (نکاح ہو جانے کے بعد) جس طریقہ سے (شریعت کے معتبر طریقوں میں سے) تم نے ان عورتوں سے فائدہ اٹھایا ہے، اس لئے ان کو (اس کے بدلہ میں) ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں اور (یہ نہ سمجھو کہ اس مقررہ مہر میں نماز، روزہ کی طرح کسی طرح کی کمی زیادتی ممکن نہ ہو بلکہ) مقرر ہونے کے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بیوی) آپس میں رضامند ہو جاؤ، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں (مثلاً خاوند نے مہر اور بڑھا دیا یا عورت نے کم کر دیا یا بالکل معاف ہی کر دیا، ہر طرح درست ہے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں (تمہاری مصلحتوں کو خوب جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (ان مصلحتوں کی رعایت سے احکام مقرر فرماتے ہیں، خواہ کہیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں)

فائدہ: یہاں مقرر شدہ مہر کی ادائیگی کے واجب ہونے کی دو شرطیں بیان فرمائیں: ایک اس کا ﴿ مِنۢ بَعۡدِ ٱلۡفَرِيضَةِۚ ﴾ مقرر ہونا، دوسرے ﴿ ٱسۡتَمۡتَعۡتُم ﴾ میں صحبت سے یا خلوت صحیحہ سے استمتاع یعنی فائدہ اٹھانا، لہٰذا اگر ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو یہ حکم لازم نہیں آئے گا، مثلاً مہر مقرر ہو، لیکن استمتاع نہ ہوا اور طلاق ہو جائے تو نصف مہر لازم ہے اور مثلاً مہر مقرر نہ ہو اور استمتاع ہوا ہو یعنی ان سے فائدہ اٹھایا کہ خلوت صحیحہ ہوئی ہو تو مہر مثل لازم ہے، اور اگر نہ مہر مقرر ہو نہ استمتاع ہو اور طلاق ہو جائے تو ایک جوڑا جس کا بیان سورۂ بقرہ آیت ۲۳۶ کے تحت تینتیسویں حکم میں آچکا ہے۔ دینا پڑے گا۔ اور مہر کی کمی زیادتی میں جو فرمایا کہ گناہ نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کم ہونے یا معاف ہونے میں مرد کو شبہ ہوسکتا ہے کہ پرایا مال قبول کرنا شاید اچھا نہ ہو اور زیادہ ہونے میں یہی شبہ عورت کو ہوسکتا تھا، اس لئے ایسا فرمایا۔

اور اس آیت میں لفظ ﴿ مُسَٰفِحِينَۚ ﴾ کی تفسیر سے متعہ کا حرام ہونا بھی معلوم ہو گیا اور حدیثوں میں اس کی پوری تصریح موجود ہے، خاص طور پر صحیح مسلم میں قیامت تک ہمیشہ کی حرمت کی نص موجود ہے۔ البتہ اس ہمیشہ کی حرمت کے حکم سے پہلے حضور ﷺ کے عہد مبارک میں جنگ خیبر سے پہلے یہ حلال تھا، پھر جنگ خیبر میں حرام ہو گیا، پھر فتح مکہ کے زمانہ میں یوم اوطاس کو حلال کیا گیا، پھر تین روز کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام ہو گیا۔

اور بعض سلف سے جو اس کا حلال ہونا منقول ہے تو ان کے ایسا کہنے سے پہلے ان تک منسوخ ہونے کی خبر نہیں پہونچی ہوگی۔ اور بعض سے جو اس آیت میں ﴿ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى ﴾ کا فقرہ منقول ہے وہ تفسیر کے طور پر ہے جس کو انھوں نے نسخ کی خبر پہونچنے سے پہلے کہہ دیا۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف جو اس کا حرام قرار دینا منسوب ہے، وہ اس کی حرمت کے اظہار و اعلان کے معنی میں ہے، نہ کہ حرمت کے اثبات کے معنی میں، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو منقول ہے اول تو وہ قول اضطرار کی قید کے ساتھ تھا، پھر ترمذی نے خود ان سے ہی مطلقاً حرمت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے بھی رجوع فرما لیا، پس اب اہل حق کا اجماع ہے۔

﴿ وَمَن لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنكُمۡ طَوۡلًا أَن يَنكِحَ ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ فَمِن مَّا مَلَكَتۡ أَيۡمَٰنُكُم مِّن فَتَيَٰتِكُمُ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِۚ وَٱللَّهُ أَعۡلَمُ بِإِيمَٰنِكُمۚ بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٖۚ فَٱنكِحُوهُنَّ بِإِذۡنِ أَهۡلِهِنَّ وَءَاتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِ مُحۡصَنَٰتٍ غَيۡرَ مُسَٰفِحَٰتٖ وَلَا مُتَّخِذَٰتِ أَخۡدَانٖۚ ﴾

ترجمہ: اور جو شخص تم میں پوری وسعت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں نکاح کرلے۔ اور تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، سو ان سے نکاح کرلیا کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر قاعدہ کے موافق دے دیا کرو اس طور پر کہ وہ منکوحہ بنائی جاویں، نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے

والی ہوں۔

ربط: اوپر سے نکاح کے احکام کا بیان چلا آرہا ہے، اب شریعت کی رو سے باندی، کنیز قرار دی گئی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کا بیان ہے۔

کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم:

تم میں سے جو شخص آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری استطاعت اور گنجائش نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے آپس (والوں) کی مسلمان کنیزوں باندیوں سے جو کہ (شرعی طور پر) تم لوگوں کی ملکیت میں ہیں، نکاح کرلے (کیونکہ اکثر باندیوں کا مہر وغیرہ کم ہوتا ہے، اور ان کو غریبوں کے نکاح میں دینے میں عار بھی محسوس نہیں کی جاتی) اور (باندی سے نکاح کرنے میں شرم محسوس نہ کرے، کیونکہ دین کے لحاظ سے تو ممکن ہے کہ وہ تم سے بھی افضل ہو، کیونکہ دین کا مدار فضیلت ایمان اور تقوی ہے، اور) تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے (کہ اس میں کون اعلی ہے اور کون ادنی ہے، کیونکہ وہ دل سے متعلق ہے، جس کی پوری خبر صرف اللہ ہی کو ہے، اور دنیا کے لحاظ سے شرم وحیا کی زیادہ وجہ نسب کا فرق ہے، تو اس میں نسب کی جو اصل بنیاد ہے یعنی حضرت آدم اور حوا علیہما السلام اس میں شریک ہونے کے اعتبار سے) تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو (پھر شرم کی کیا وجہ؟) تو (جب شرم نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوگئی تو مذکورہ ضرورت کے وقت) ان سے نکاح کرلیا کرو (مگر شرط یہ بھی ہے کہ) ان کے مالکوں کی اجازت سے (ہو) اور ان (کے ان مالکوں) کو ان کے مہر (شرعی) قاعدہ کے مطابق دیدیا کرو (اور یہ مہر کی ادائیگی اس طرح (ہو) کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں (یعنی وہ مہر نکاح کے مقابلہ میں ہو، زنا کی اجرت کے طور پر دینے سے وہ حلال نہ ہوگی)

فائدہ: باندی یا کنیز کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے دو شرطیں لگائیں: ایک یہ کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح نہ کرسکے جس میں دو صفتیں پائی جاتی ہوں: ایک حریت یعنی آزادی اور دوسرے ایمان۔ دوسری قید یہ ہے کہ وہ کنیز مسلمان ہو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان قیود کی رعایت اولی ہے اور اگر ان قیود کی رعایت کے بغیر کنیز سے نکاح کیا تو نکاح ہوجائے گا، لیکن کراہت ہوگی (روح المعانی، بدائع کے حوالہ سے) اور کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بلاضرورت اپنی اولاد کو غلام بنانا ہے، کیونکہ آزادی اور غلامی میں اولاد ماں کے تابع ہے، دوسرے یہ بھی ہے کہ باندی دوسرے کی ملکیت ہے اور بالکل اسی کے قبضہ کی ہے، چنانچہ ممکن ہے کسی وقت شوہر اسے اپنے پاس رکھنا چاہے اور اس وقت اس کا مالک اس سے خدمت لینا چاہے تو لازمی طور پر بدمزگی ہوگی، یا وہ کسی پردیسی کے ہاتھ فروخت کرڈالے تو اور زیادہ مصیبت ہے، تیسرے یہ کہ اس سے پورے پردہ کا نباہ نہیں ہوسکتا، غیور آدمی کو اس کی بھی کوفت ہوگی، پھر عام طور سے اس کو نہ

خانہ داری کا زیادہ سلیقہ ہوتا ہے اور نہ ہی شوہر کے گھر اور چیز سے ہمدردی ہوتی ہے، ان مصلحتوں کو کراہت میں شرعی طور پر دخل ہوسکتا ہے اور آگے ﴿ فَإِذَآ أُحْصِنَّ ﴾ اور ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ ﴾ سے بھی اسی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ عنقریب اس کی تقریر ان اجزاء سے متعلق فائدہ کے ذیل میں آتی ہے، لہٰذا عرفی کراہت یعنی عار وغیرت کی وجہ سے اجتناب کرنے کی تو ممانعت ہے اور شرعی کراہت کا لحاظ رکھ کر جس کا ابھی بیان ہوا بغیر ضرورت نکاح نہ کرنا اولیٰ ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ان دو قیدوں کو احترازی قرار دیا ہے، لیکن پہلی قید کی دوسری صفت کو احترازی نہیں کہا، چنانچہ انھوں نے غیر مؤمن آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت رکھنے والے کو بھی کنیز سے نکاح کی اجازت نہیں دی، احناف کہتے ہیں کہ آپ کے نزدیک جیسی یہ ایک صفت ہے، ایسے ہمارے نزدیک تینوں امر ہیں، اور یہ جو فرمایا کہ قاعدہ کے مطابق یعنی جو دین کا عام حکم ہے کہ وسعت کے وقت ٹالے نہیں، پریشان نہ کرے، وعدہ خلافی نہ کرے اس کی تصریح مہر کے قرض کے وجوب کے لئے مفید ہوگئی، کیونکہ اس کو ہلکا سمجھنے کی اور اس سے لاپروائی برتنے کی عام عادت ہے، اس لئے ادا بھی کم بلکہ شاذ ونادر ہی کیا جاتا ہے، اس میں بھی اکثر جبکہ حکومت کی طرف سے کوئی زور دباؤ پڑے۔

مسئلہ: کنیز کا نکاح مالک کی اجازت کے صحیح نہیں۔

﴿ فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ، ﴾

ترجمہ: پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنالی جاویں، پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام کریں تو ان پر اس سزا سے نصف سزا ہوگی جو کہ آزاد عورتوں پر ہوتی ہے۔

ربط: اوپر کنیزوں سے نکاح کرنے کا ذکر تھا، اب ان باندیوں سے متعلق سیاست اور سزا کے بارے میں ایک حکم ارشاد فرماتے ہیں اور باوجودیکہ وہ حکم غلام کے لئے بھی اور بغیر نکاح والی باندی کے لئے بھی عام ہے، لیکن اس مقام پر ذکر میں باندیوں کی تخصیص پھر ان میں سے بھی نکاح والیوں کی تخصیص اس نادان (حکیم الامت) کے ذوق کے مطابق جیسا کہ ابھی حق تعالیٰ نے دل میں بات ڈالی وللہ الحمد یہ ہے کہ کنیزوں کے ساتھ نکاح کے مباح ہونے کے باوجود اس موقع پر اس میں قید لگانے کا مقصد بعض اسباب کے تحت بلاضرورت اس کا مکروہ ہونا بتانا تھا، اس مقصود کی تاکید کے لئے اس جملہ میں ان کی زنا کی حد کی تصریح فرمادی، تاکہ اس کے قریبی اسباب کے جمع ہونے کی وجہ سے مثلاً اپنے مالک کی خدمت کی غرض سے اکثر اس کے بازار وغیرہ میں آمد ورفت کی وجہ سے عام طور سے پردہ میں نہ رہ پانے کے سبب اس فعل کے وقوع کا احتمال سننے والے کے پیش نظر رہے۔ اور ایک طرح کی ایسی بے رغبتی پیدا ہوجائے کہ بلاضرورت اس کا ارتکاب نہ کرے، نکاح والی کنیزوں کے ذکر کی تخصیص کی یہ وجہ ہے، یعنی نکاح کے بغیر بھی ان سے اس امر کا ارتکاب اتنا محال نہیں جتنا کہ آزاد خواتین سے ہے۔

گیارہواں حکم کنیزوں کے زنا کی حد:

پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنائی جائیں، پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (یعنی زنا کریں) تو (ثبوت کے بعد بشرطیکہ وہ مسلمان ہوں) ان پر اس سزا سے نصف سزا (جاری) ہوگی جو کہ (غیر منکوحہ) آزاد عورتوں پر ہوتی ہے (جیسا کہ نکاح سے پہلے بھی باندیوں کی یہی سزا تھی اور اسی طرح غلاموں کی بھی)

فائدہ: وہ سزا یہ ہے کہ ان کے پچاس درّے لگائے جائیں گے، کیونکہ بغیر نکاح والی آزاد عورت کو اور اس طرح بغیر نکاح والے آزاد مرد کو سو درّے لگائے جاتے ہیں، جیسا کہ سورۂ نور میں ہے کہ وہاں بغیر نکاح والا مرد اور بغیر نکاح والی عورت ہی مراد ہے، اور جب آزاد مرد و عورت کا نکاح ہو چکے اور کچھ دوسری بھی شرطیں ہیں تو اس وقت اس فعل کی سزا سنگساری کرنا ہے، جیسا کہ متواتر احادیث میں ہے اور صحیحین کی حدیث میں زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بغیر نکاح والی کنیز کی حد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے تازیانے (کوڑے) فرمائے اور غلام کی حد پر جمہور ائمہ کا اجماع ہے۔ اس طرح حدیث اور اجماع سے معلوم ہوا کہ یہ تخصیص بطور قید واحتراز کے نہیں ہے، اور نصف فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مملوک پر خواہ وہ مرد ہو یا عورت رجم، سنگساری کرنے کا حکم نہیں ہے، کیونکہ رجم کی انتہا روح نکلنے تک پتھر مارتے رہنا ہے، اور اس میں نصف سزا نافذ کرنا ناممکن ہے، اور چونکہ اوپر امائے محصنہ یعنی نکاح والی باندی کا ذکر تھا، اس لئے ﴿ فَاِنْ اَتَيْنَ ﴾ فرمانے سے بھی ضمیر ادھر ہی راجع ہو جاتی ہے، لیکن ﴿ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ ﴾ کی تصریح سے جس سے بات دہرانے کا فائدہ ہوا ہے، اس مذکورہ بالا نکتہ کی مزید تقویت ہوگئی۔ خوب سمجھ لو۔

﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ۧ ﴾ ع

ترجمہ: یہ اس شخص کے لئے ہے جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو اور تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں بڑی رحمت والے ہیں۔

ربط: پھر باندیوں کے نکاح کے حکم کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

کنیزوں کے ساتھ نکاح کے حکم کا تتمہ:

یہ (باندیوں سے نکاح کرنا) اس شخص کے لئے (مناسب) ہے جو تم میں (شہوت کے غلبہ اور آزاد منکوحہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے) زنا (میں مبتلا ہو جانے) کا اندیشہ رکھتا ہو (اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے مناسب نہیں) اور (اگر اس اندیشہ کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قادر ہو تو) تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (کنیز کے ساتھ نکاح کے مقابلہ میں) اور (یوں) اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں (اگر کراہت کی صورت میں بھی نکاح کر لیا تو ہم مواخذہ نہ کریں گے اور)

بڑے رحمت والے ہیں (کہ حرمت کا حکم نہیں فرمایا)

فائدہ: اس قید کی بھی وجہ وہی کراہت ہے جس کی علت آیت ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ ﴾ کے ذیل میں بیان ہوئی ہے، غرض اللہ تعالیٰ نے ہماری مصلحت کے واسطے یہ حکم بطور مشورہ فرمایا ہے۔ اس کو اصول کی اصطلاح میں امر ارشادی کہتے ہیں اور غفور کی تفسیر میں جو کہا گیا ہے، یہ اسی حکم کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر مکروہ تنزیہی کا یہی حکم ہے کہ اس میں مواخذہ نہ کرنے کا وعدہ ہے، اس لئے وہ نجات میں مانع نہیں، تاہم اہل قرب کی شان کے خلاف ہے، اور چونکہ شوافع بعض صورتوں میں کنیزوں کے نکاح کو ناجائز کہتے ہیں، اس لئے وہ غفور کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ جواز کی صورت میں اس امر پر مواخذہ نہیں فرمایا، جو اصل میں معصیت تھا۔

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ ﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم سے بیان کر دے اور تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتلا دے اور تم پر توجہ فرمادے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو تو تمہارے حال پر توجہ فرمانا منظور ہے اور جو لوگ شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

ربط: اوپر مخصوص احکام کی تفصیل تھی، اب اپنا انعام واحسان اور ان احکام میں ہمارے منافع ومصالح کی رعایت رکھنا بیان فرماتے ہیں خواہ اس کی تفصیلات کو ہم نہ سمجھیں۔ نیز اتباع کی ترغیب اور ان امور میں سرکش لوگوں کی بدخواہی پر تنبیہ فرماتے ہیں۔

فتنہ میں پڑنے سے بچنے اور احسان ونیکی کی پیروی کی ترغیب:

اللہ تعالیٰ کو (ان مذکورہ مضامین کے ارشاد فرمانے سے اس طرح دوسرے مضامین سے اپنا کوئی نفع مقصود نہیں کہ یہ عقلی طور پر محال ہے، بلکہ تمہیں نفع پہونچانے کے لئے) یہ منظور ہے کہ (احکام سے متعلق آیتوں میں تو) تم سے (تمہاری مصلحت کے احکام) بیان کر دے اور (آیات قصص میں) تم سے پہلے لوگوں کے احوال تمہیں بتادے (تاکہ تمہیں اتباع کی رغبت ہو اور اس کی مخالفت کا ڈر ہو) اور (مشترک مقصود کا خلاصہ یہ ہے کہ) تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائے (اور وہ یہی بیان فرمانا اور بتانا ہے جس میں سراسر بندوں ہی کا نفع ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (کہ بندوں کی مصلحت جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (کہ بغیر وجوب کے ان مصلحتوں کی رعایت فرماتے ہیں)

اور اللہ تعالیٰ کو تو (احکام اور قصص کے بیان سے جیسا کہ ابھی بیان ہوا) تمہارے حال پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمانا منظور ہے، اور (کفار و فجار میں سے) جو لوگ شہوت پرست ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم (راہِ راست سے) بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ (اور انہی جیسے ہو جاؤ، چنانچہ وہ اپنے فاسد خیالات مسلمانوں کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر جس طرح تمہاری مصلحت پر ہے، اسی طرح تمہاری آسانی پر بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو (احکام میں) تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا منظور ہے۔ اور (اس کی وجہ یہ ہے کہ) آدمی (دوسری مکلف مخلوقات کی بہ نسبت بدن اور ہمت دونوں میں) کمزور پیدا کیا گیا ہے (اس لئے اس کے ضعف کے مناسب احکام مقرر فرماتے ہیں، ورنہ مصلحت کی رعایت کے اعتبار سے دشواری اور مشقت والے اعمال تجویز کرنے میں بھی مضائقہ نہ تھا، مگر ہم نے مجموعی طور پر دونوں امر کا لحاظ فرمایا۔ اور یہ بڑے علم و حکمت اور رحمت و شفقت پر مبنی ہے۔

تفسیر: شہوت پرست سے مراد ابن زید کے قول کے مطابق فاسق لوگ ہیں، اور ابن عباس کے بقول زانی اور بقول سدی یہود و نصاریٰ اور بقول بعض دیگر صرف یہودی مراد ہیں کہ ان میں سے بعض نے کہا تھا کہ علاتی بہن حلال ہے، اور بقول بعض مجوس مراد ہیں کہ وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم خالہ اور پھوپھی کی بیٹی کو تو حلال کہتے ہو اور بہن اور بھائی کی بیٹی کو حرام کہتے ہو حالانکہ ان کے اصول یعنی پھوپھی اور خالہ اور بہن کو حرام کہتے ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (روح المعانی و کبیر)

اور بڑی بھاری کجی کے دو مطلب ہیں ایک بیبا کی کے ساتھ حرام کا مرتکب ہونا۔ دوسرے حرام کو حلال سمجھ لینا، اس طرح فاسق لوگ تو پہلے امر کی کوشش کرتے ہوں گے اور کفار دوسرے امر کی، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ گمراہ اور بدکردار لوگ دوسروں کو بھی گمراہ اور بدکردار بنانا چاہتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں ہلکی کجی یہ ہے کہ آدمی گناہ کو گناہ سمجھے، مگر پھر بھی اتفاق سے برائی کا صدور ہو جائے، اس آیت میں اس غیر عظیم یعنی ہلکی کجی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ مقصود ان بدخواہوں کے حال کا بیان کرنا ہے جو بھاری کجی کی سعی کرتے ہیں۔

اور انسانوں کے سوا دوسرے مکلف جنات اور ملائکہ ہیں، اگرچہ ملائکہ کے لئے عذاب نہیں ہے، پھر بھی حکم دینے اور روکنے کا تو تعلق ان سے ہے، اگر شبہ ہو کہ جنات تو اتنے ضعیف نہیں پھر ان کے لئے یہی احکام کیوں مقرر ہیں جیسا کہ حضور ﷺ کی عام بعثت یقینی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ان احکام میں اصل رعایت انسان کی آسانی پر ہو، ان کے طفیل میں جن بھی اس آسانی سے فیضیاب ہوں گے، واللہ اعلم۔

اور جاننا چاہئے کہ یہاں شہوت پرستی کی مذمت میں مباح شہوات سے فائدہ اٹھانا داخل نہیں کہ ان کو بھی مذمت میں داخل کر لیا جائے، اس سے وہ شہوت پرستی مراد ہے جس سے خدا پرستی فوت ہو جائے اور چونکہ مباح اللہ کی اجازت سے ہے، اس لئے اس میں خدا پرستی فوت نہیں ہوتی، اور یہ شہوت پرستی نہیں ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں، اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں، اور جو شخص ایسا فعل کرے گا اس طور پر کہ حد سے گزر جاوے اور اس طور پر کہ ظلم کرے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں داخل کریں گے، اور یہ امر خدا تعالیٰ کو آسان ہے۔

ربط: یہاں تک یتیموں، وارثوں اور مہر سے متعلق اموال سے فیضیاب ہونے کے بعض طریقوں، اور عورتوں کے نفوس یعنی ان کی ذات میں تصرف کرنے کے بعض طریقوں جیسے ان پر ظلم کرنا، انہیں تنگ کرنا یا ان میں جو محرمات ہیں ان سے نکاح کرنا وغیرہ سے منع فرمایا تھا۔ اب اس مضمون کو پورا کیا جا رہا ہے کہ مالوں اور نفسوں میں مذکورہ تصرفات کی کچھ تخصیص نہیں، بلکہ کسی کے مال اور نفس میں جو غیر شرعی طریقہ سے تصرف ہو، وہ ممنوع ہے۔

بارہواں حکم: کسی کے مال یا نفس میں غیر شرعی طریقہ سے تصرف کرنے کی ممانعت:

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال، ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (اگر مباح طریقہ سے ہو، مثلاً) کوئی تجارت باہمی رضامندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرعی شرطیں ہوں) تو حرج نہیں (یہ تو مالی تصرف تھا، آگے نفس یعنی ذات میں تصرف بیان فرماتے ہیں) اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں (اس لئے نقصان پہونچانے کی صورتوں کو منع فرما دیا، خاص طور سے جبکہ اس میں یہ اثر ہو کہ دوسرا شخص پھر تمہیں ضرر پہونچائے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تمہیں بھی ضرر سے بچالیا) اور (چونکہ قتل ان دونوں امر میں زیادہ سخت ہے، اس لئے اس پر خاص طور سے وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص ایسا کام (یعنی قتل) اس طرح کرے گا کہ (شریعت کی) حد سے گذر جائے اور (وہ گذرنا بھی فعل کی غلطی یا رائے کی غلطی سے نہ ہو، بلکہ) اس طرح کہ (قصداً) ظلم کرے تو ہم عنقریب (یعنی موت کے بعد) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے، اور یہ امر (یعنی ایسی سزا دینا) اللہ تعالیٰ کے لئے (بالکل) آسان ہے (کچھ اہتمام کی حاجت نہیں جس میں اس احتمال کی گنجائش ہو کہ شاید کسی وقت اہتمام نہ ہو سکا یا سامان جمع نہ ہو سکا تو سزا ٹل جائے گی)

تفسیر: عدوان کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص حقیقت میں قتل کا مستحق نہ ہو اور اس کو قتل کیا جائے۔ اور ظلم کی تفسیر کا

حاصل یہ ہے کہ جو شخص قتل کا مستحق نہ ہو، اس کا قتل تین طرح ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ وہ کام غلطی سے ہو گیا، مثلاً گولی شکار پر چلائی اور وہ کسی آدمی کو لگ گئی، دوسرے یہ کہ قاضی یا حاکم سے اجتہادی غلطی ہو گئی یعنی مقدمہ کی تنقیح کے بعد روئداد سے معاملہ ثابت ہو گیا اور گواہوں کو اپنے نزدیک معتبر سمجھا جبکہ واقع میں وہ معتبر نہیں تھے، تیسرے یہ کہ حقیقت حال یعنی اس کا غیر مستحق ہونا معلوم ہے، پھر بھی اس کو قتل کر ڈالا، اس طرح ظلم کہنے سے پہلی دو صورتیں خارج ہو گئیں کہ اس میں یہ وعید نہیں، بلکہ دوسری میں تو کچھ بھی گناہ نہیں، پہلی صورت میں کچھ گناہ ہے جس کا کفارہ اسی سورۃ میں آگے بیان کیا گیا ہے، اور عدوان کی قید سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص واقعی قتل کا مستحق ہو، مثلاً اس پر قصاص واجب ہے، اس کا قتل کرنا ممنوع نہیں، بلکہ ولی کی درخواست پر واجب ہے، اور ولی کو جائز ہے۔

﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبٰٓئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ۝﴾

ترجمہ: جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے ان میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرما دیں گے، اور تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کریں گے۔

ربط: اوپر جن معاصی کا ذکر ہے، ان میں اکثر گناہ کبیرہ ہیں، اس لئے یہاں تک تو ان کے کرنے پر سزا سے ڈرایا جا رہا تھا، اب ان کے نہ کرنے یعنی ان سے بچنے کی ترغیب ہے، کہ اگر ان سے بچو گے تو اس بچنے میں یہ منفعت ہے کہ تمہارے ہلکے ہلکے معاصی یا کبیرہ گناہوں کا کفارہ تمہاری طاعتوں اور نیکیوں سے کر دیں گے، اور چونکہ دوسرے کبیرہ گناہ بھی مذکورہ کبیرہ گناہوں کی طرح ہیں، اس لئے آیت میں لفظ عام لائے ہیں، تاکہ مذکورہ اور غیر مذکورہ سب کو شامل ہو جائے۔

کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والے کے صغیرہ گناہوں سے درگذر:

جن کاموں میں تمہیں (شروع میں) منع کیا جاتا ہے (یعنی گناہوں کے کام) ان میں جو بھاری بھاری کام ہیں (یعنی کبیرہ یا بڑے بڑے گناہ ہیں) اگر تم ان سے بچتے رہو تو (اس بچنے پر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اعمال حسنہ کرنے کی وجہ سے جبکہ وہ قبول ہو جائیں) ہم تمہاری ہلکی برائیاں تم سے دور فرما دیں گے (چنانچہ دوزخ سے محفوظ رہو گے) اور ہم تمہیں ایک عزت والی جگہ (یعنی جنت) میں داخل کریں گے۔

کبیرہ گناہ کیا ہیں؟

گناہ کبیرہ کی تعریف میں بہت سارے اقوال ہیں: ان میں سب سے جامع قول وہ ہے جسے روح المعانی میں شیخ الاسلام بارزی سے نقل کیا ہے کہ جس گناہ پر کوئی وعید ہو یا حد ہو یا اس پر لعنت آئی ہو یا اس میں کسی ایسے ہی گناہ کے برابر یا اس سے زیادہ مفسدہ ہو جس پر وعید یا حد یا لعنت آئی ہو، یا وہ دین کی تحقیر و تذلیل کے ارادے سے کیا ہو: وہ کبیرہ گناہ ہے

اور اس کا مقابل صغیرہ ہے۔ اور حدیثوں میں جو گنتی بیان کی گئی ہے اس سے حصر مقصود نہیں ہے، بلکہ وقت کے تقاضہ کے تحت انہی کا ذکر ہوگا۔

اور صغیرہ گناہوں کے صادر ہونے کے بعد چند حالتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کبیرہ سے بچے اور ضروری طاعتوں کا پابند ہو، اس حالت میں وعدہ ہے کہ صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور آیت میں اسی صورت کا ذکر ہے، چنانچہ کبیرہ سے بچنے کی شرط کی تو خود آیت میں تصریح ہے، اور ضروری طاعتوں کی پابندی پر چند دلائل اور قوانین ہیں، ایک دلیل تو خود آیت میں ہے، کیونکہ ضروری طاعتوں کی پابندی نہ کرنا جیسے ترک نماز وغیرہ یہ خود کبیرہ ہے، تو اس صورت میں کبائر سے اجتناب صادق نہ آئے گا، اس لئے پہلی شرط دوسری کے لئے لازم ہے۔ دوسرا قرینہ آیت ﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ ہے کہ حسنات کو سیئات کے جاتے رہنے کا سبب قرار دیا۔ تیسرا قرینہ صحیح مسلم کی حدیث ہے: الصلوۃ الخمس مکفرۃ لما بینھا ما اجتنبت الکبائر: یعنی پانچ نمازیں ان کے درمیان کے اعمال کے لئے کفارہ ہوتے ہیں جب تک آدمی کبائر سے اجتناب کرتا رہے۔ اس حدیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ دخل دو امر کے مجموعہ کو ہے۔ اور اگر صرف اجتناب کافی ہوتا تو اعمال کے دخل کے کوئی معنی نہ ہوتے۔ اس طرح یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہوگی۔

اور جاننا چاہئے کہ اس مجموعہ کا مقصود ایک اثر بیان کرنا ہے نہ کہ اس اثر میں حصر بیان کرنا، تو اگر اس مجموعہ کے وجود کے وقت صغائر موجود نہ ہوں تو اس کا اثر درجات کا بلند ہونا مذکورہ بالا حکم کے منافی نہیں اور اس امر کی دلیل اس آیت میں سیئات سے مراد صغیرہ گناہ ہیں خود سیئات کا کبائر کے مقابلہ میں لانا ہے، اور اُس آیت ﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ ﴾ میں سیئات کی تفسیر صغائر سے کی جائے گی، اور حدیث میں بھی ما بینھا کو صغائر کے ساتھ خاص کیا جائے گا۔

دوسری حالت یہ کہ کبیرہ سے نہ بچے اگرچہ ضروری طاعتوں کا پابند ہو۔ تیسری حالت یہ کہ ضروری طاعتوں کا پابند نہ ہو، اگرچہ دوسرے کبائر سے بچتا ہو، پھر خواہ اس کو دوسرے کبیرہ گناہوں کے اعتبار سے کبائر سے اجتناب کرنے والا کہا جائے یا ضروری طاعتوں کے ترک کے کبیرہ ہونے کے اعتبار سے، اس کو اجتناب کرنے والا نہ کہا جائے، ان دونوں حالتوں میں صغائر کا کفارہ بنانے کا وعدہ نہیں ہے، اس لئے حدیث میں بھی اس کی قید لگائی گئی اور فضل کی دوسری بات ہے کہ وہ خود کبیرہ گناہ کے ساتھ بھی متعلق ہو سکتا ہے، اور جب وعدہ نہیں تو ممکن ہے کہ اس پر آخرت میں سزا ہو، کیونکہ اگر سزا کا احتمال نہ ہو بلکہ معافی یقینی ہو تو کبائر سے بچنا نہ بچنا دونوں برابر ہو گئے، حالانکہ قرآن سے کبائر سے اجتناب کا دخل صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے، اور اہل سنت کا یہی مذہب ہے، بعض صغیرہ گناہوں پر عذاب کا احتمال، جیسا کہ کبیرہ گناہ پر فضل کا احتمال بھی خاص اہل سنت کا مذہب ہے، واللہ اعلم۔

اور حسنات کے مقبول ہونے کی قید اس لئے لگائی کہ غیر مقبول تو نہ ہونے کے درجہ میں ہیں۔ اور چونکہ مقبول ہونا جو کہ شرط ہے یقینی نہیں۔ اس لئے مشروط یعنی کفارہ ہونا بھی یقینی نہیں، اس لئے علماء اہل سنت نے فرمایا ہے کہ کبائر سے اجتناب

کے باوجود صغیرہ گناہوں پر عتاب کا احتمال ہے، کیونکہ خود عتاب کو دور کرنے والا یعنی کفارہ ہونا غیر معلوم ہے، لہٰذا یہ قول قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۚ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: اوپر چھٹے حکم کی تفصیل میں مرد اور عورت کے حصہ میں جبکہ انہیں میت کے ساتھ یکساں قرب ہو، آدھے اور دوگنے کا فرق معلوم ہو چکا ہے، جس میں شاید یہ حکمت ہے کہ مردوں کے ذمہ خرچ زیادہ ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ اور دوسری آیتوں سے مردوں کے اور بھی خاص فضائل ثابت ہیں، اس سلسلہ میں ایک بار حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہمیں آدھی میراث ملتی ہے اور ہمارے اور مردوں کے درمیان اور بھی فلاں فلاں فرق ہیں، مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ اگر ہم بھی مرد ہوتے تو اچھا ہوتا (جلالین) اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کا سبب نزول ایک اور بھی ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا نبی اللہ! مرد کو میراث میں دوہرا حصہ ملتا ہے اور عورت کی شہادت بھی مرد کے مقابلہ میں آدھی ہے کیا اسی طرح دوسری عبادات اور اعمال میں ہمیں ثواب بھی آدھا ہی ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں دونوں کے قول کا جواب ہے یعنی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے قول کا جواب ﴿ لَا تَتَمَنَّوْا ﴾ میں اور اس عورت کے سوال کا جواب ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ ﴾ الخ میں۔ اور دونوں قصوں کے واقع ہونے کے بعد نازل ہونا بھی عجیب بات نہیں ہے کہ دونوں روایتوں کے مجموعہ سے اس کا ربط میراث کے مضمون سے بھی ہے اور اوپر کی پاس والی آیت سے بھی، جس میں اطاعت اور معصیت سے اجتناب کی فضیلت کا بھی ذکر تھا۔

تیرھواں حکم: عادی ممتنع امور کی تمنا کرنے کی ممانعت:

اور تم (سب مردوں اور عورتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے عطا کئے ہوئے فضائل میں سے) کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض (مثلاً مردوں) کو بعض (مثلاً عورتوں) پر (ان کے کسی عمل کے دخل کے بغیر فضیلت بخشی ہے (جیسے مرد ہونا یا مردوں کا دوگنا حصہ ہونا، یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیرہ، کیونکہ) مردوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے (اور قانونی طور پر نجات کی بنیاد یہی اعمال ہیں اور ان میں کسی کی تخصیص نہیں، تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال میں جو کہ کسبی فضائل ہیں، کوشش کر کے دوسرے

سے زیادہ ثواب حاصل کرلو، اس پر قادر ہونے کے باوجود مذکورہ خاص فضائل کی تمنا کرنا محض ہوس اور فضول ہے) اور (اگر عطا کیے ہوئے فضائل میں ایسے فضائل کی رغبت ہے جن میں اعمال کو بھی دخل ہے، مثلاً باطنی احوال وکمالات وغیرہ تو حرج نہیں، لیکن اس کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ خالی تمنائیں کیا کرو، بلکہ یہ چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ سے اس کے (خاص) فضل کی درخواست (یعنی دعا) کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس میں سب چیزیں آگئیں، یعنی عطا کیے ہوئے قسم اول کے فضائل کی تخصیص کی وجہ بھی اور کسبی فضائل پر ثواب دینا بھی اور عطا کیے ہوئے قسم دوم کے فضائل کی درخواست بھی، اس طرح یہ جملہ سب سے متعلق ہے)

فائدہ: ﴿ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ﴾ کے عموم میں خالی مرد بھی داخل ہیں، لہٰذا نبوت وغیرہ کی تمنا بھی اس نہی میں داخل ہے اور عطا کیے ہوئے قسم دوم کے فضائل میں اعمال کو دخل اس لئے ہے کہ اللہ کی عادت یوں ہی ہے کہ شریعت پر ثابت قدم رہنے سے ایسے کمالات جس کو چاہیں عطا فرما دیتے ہیں، ان کے حصول میں بندہ کا کوئی اختیار نہیں۔

اس طرح فضائل کی تین قسمیں ہوئیں: (۱) عطا کی ہوئی قسم اول، ان کا تو سوال بھی ممنوع ہے، (۲) ہبہ کی ہوئی قسم دوم، ان میں شرط کے وجوب یعنی اعمال کے بعد سوال کرے (۳) کسبی ان میں سعی کرے اور دعا یہاں بھی عبادت ہے، واللہ اعلم۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسبی فضائل میں دونوں برابر ہیں، حالانکہ حدیث میں عورتوں کا دین کا نقصان نماز وغیرہ کے سلسلہ میں جو کسبی فضائل ہیں، اس کی صراحت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مساوات یا برابری اس معنی میں ہے کہ عمل کرنے پر دونوں کو برابر ثواب ملتا ہے، اور دین میں فرق اس معنی میں ہے کہ بغیر کسب کے عورتوں میں ایک مانع نفس عمل سے ہے اور عمل کم ہونا اور جب عمل ہو تو ثواب برابر ہونا ان میں آپس میں کچھ تضاد نہیں ہے۔

﴿ وَلِكُلٍّ جَعَلۡنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ؕ وَالَّذِيۡنَ عَقَدَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَاٰتُوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ۝ ﴾ ع ۶

ترجمہ: اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور رشتہ دار لوگ چھوڑ جاویں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں، اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں۔

ربط: اس سے اوپر کی آیت میں مردوں کا میراث کا حصہ زائد ہونے پر ایک بے کار خیال کی ممانعت تھی، اب بھی میراث سے متعلق ایک مضمون ہے، دونوں کلاموں کے اتصال کے لئے اتنی مناسبت کافی ہے، اور اگر یوں کہا جائے کہ سورۃ کے شروع سے مختلف قسم کے احکام کا ذکر ہوتا چلا آیا ہے، جن میں میراث کے کچھ احکام کا ذکر بھی ہو چکا ہے، اس سلسلہ کا ایک مضمون یہاں بھی بیان کیا جا رہا ہے تو ربط کی یہ توجیہہ زیادہ بے تکلف ہے، بہر حال یہ چھٹے حکم کا تتمہ ہے۔

چودھواں حکم: مولی الموالات کی میراث میں ترمیم:

اور ہر ایسے مال کے لئے جسے والدین اور (دوسرے) رشتہ دار (اپنے مرنے کے بعد) چھوڑ جائیں، ہم نے وارث مقرر کردیئے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد (پہلے سے) بندھے ہوئے ہیں (اس کو مولی الموالات کہتے ہیں) ان کو (اب جبکہ شریعت کی طرف سے رشتہ دار لوگ وارث مقرر ہوگئے، ساری میراث مت دو، بلکہ صرف) ان کا حصہ (یعنی چھٹا) دیدو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہیں (لہٰذا انہیں ساری میراث نہ دینے کی حکمت اور چھٹا حصہ مقرر کردینے کی مصلحت اور یہ کہ یہ چھٹا حصہ انہیں کون دیتا ہے اور کون نہیں دیتا، ان سب کی انہیں خبر ہے)

فائدہ: جن دو افراد میں آپس میں اس طرح قول وقرار ہوجائے کہ ہم ایک دوسرے کے اس طرح مددگار رہیں گے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ کوئی دیت لازم آئے تو دوسرا اس کا متحمل ہو اور جب ایک مرجائے تو دوسرا اس کی میراث لے، یہ عہد عقد موالاۃ ہے، اور یہ دونوں شخص آپس میں مولی الموالاۃ کہلاتے ہیں، عربوں میں یہ رسم اسلام سے پہلے بھی تھی، اس میں وہ لوگ قسم بھی کھایا کرتے تھے جو اس کا حصہ نہیں ہوتا تھا، اور اس میں اس عہد کے مطابق احکام جاری کئے جاتے تھے۔ ابتداء اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمانوں کے رشتہ دار مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انصار اور مہاجرین میں باہم عقد اخوت یا بھائی چارہ کا معاہدہ کرادیا تھا، جس کا اثر اس موالاۃ کا سا تھا، اس وقت میں اسی قدیم رسم کے مطابق حکم رہا کہ انصار اور مہاجرین میں آپس میں میراث جاری ہوتی تھی، پھر جب لوگ بکثرت مسلمان ہوگئے تو اس میں پہلے وہ ترمیم ہوئی جس کا اس آیت میں ذکر ہے، یعنی چھٹا حصہ اس مولی الموالاۃ کو اور باقی دوسرے وارثوں کو دلایا جاتا تھا، پھر کچھ عرصہ بعد سورۂ احزاب کی آیت ۶ ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ ﴾ سے بالکل ہی اس مولی الموالاۃ کا حصہ منسوخ ہوگیا، شاید تدریجی طور پر منسوخ کرنے کی حکمت کے تحت پہلے چھٹا حصہ رکھا ہو، لہٰذا یہ آیت منسوخ ہے۔ بخاری اور قسطلانی اور روح المعانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور طبری کی روایت میں قتادہ سے اور ابن جریر کی روایت میں بھی قتادہ سے بالترتیب یہ آیتیں مذکور ہیں۔ جن کے مجموعہ سے یہ تقریر اخذ کی گئی ہے، یہاں تک کہ امت کے تمام ائمہ متفق ہیں کہ دوسرے وارثوں کے ہوتے ہوئے خواہ وہ ذوی الفروض نسبی ہوں یا عصبہ ہوں یا ذوی الارحام ہوں، اس مولی الموالاۃ کو کچھ میراث نہیں ملتی، لیکن جب کوئی نہ ہو اور ایسا شخص ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اسے کل میراث ملے گی، البتہ اگر اس سے پہلے کہ اس کی طرف سے دوسرا دیت ادا کرے اس عہد کو فسخ کردے تو فسخ ہوجائے گا، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ عہد ایک طرف سے ہو، دوسری طرف سے نہ ہو، اس وقت یہ احکام ایک طرف سے ہوجائیں گے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اور ابن عباس سے لفظ نصیب کی ایک تفسیر خیر خواہی یا مستحب طور پر وصیت منقول ہے، اس صورت میں یہ حصہ دینے کا حکم منسوخ نہیں ہوگا۔

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ ﴾

ترجمہ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔ سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تمہیں ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رحمت اور عظمت والے ہیں۔ اور اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بی بی میں کشاکش کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، عورت کے خاندان سے بھیجو، اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی میں اتفاق فرما دیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔

ربط: عورتوں سے متعلق جو احکام اوپر آ چکے ہیں ان میں عورتوں کی حق تلفی کی ممانعت فرمائی تھی، لیکن ﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ میں سزا و سیاست کی اجازت تھی، اب عورتوں پر جو مردوں کے حقوق ہیں، ان کے مطالبہ کی اجازت اور انہیں فوت کرنے پر بطور تادیب سزا کی اجازت کا بیان ہے، جس کے واقع ہونے پر یہ آیت نازل ہوئی، اور حقوق سے متعلق آپس میں اختلاف واقع ہونے کی صورت میں اس کے تصفیہ کا طریقہ اور اس کے ضمن میں حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت بتاتے ہیں، اور اس مضمون کے ضمن میں مردوں کی فضیلت کی صراحت ہے، ایک حد تک اس خیال کے جواب کی بھی تقویت ہے جو مردوں کی میراث کے حصہ کے دوگنا ہونے سے متعلق اوپر آ چکا، اس طرح اس کو اپنے سے پہلے والے قریب کے مضمون سے بھی خاص ربط ہے۔

پندرہواں حکم: میاں بیوی کی معاشرت (رہن سہن) سے متعلق احکام:

مرد عورتوں پر حاکم ہیں (دو وجہ سے، ایک تو) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو (یعنی مردوں کو) بعض پر (یعنی عورتوں پر قدرتی طور پر) فضیلت عطا کی ہے (یہ تو اللہ کی عطا کا معاملہ ہے) اور (دوسرے) اس لئے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں، نان و نفقہ میں) خرچ کئے ہیں (اور خرچ کرنے والا ہاتھ اس ہاتھ سے اونچا اور

بہتر ہوتا ہے جس پر خرچ کیا جائے، اور یہ امر اختیاری کا ہے) تو جو عورتیں نیک ہیں (وہ مرد کے ان فضائل وحقوق کی وجہ سے) اطاعت کرتی ہیں (اور) مرد کی عدم موجودگی میں (بھی) بحفاظت (وتوفیق) الٰہی (اس کی آبرو اور مال کی) نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں (اس صفت کی نہ ہوں بلکہ) ایسی ہوں کہ تمہیں (قرائن سے) ان کی بددماغی کا اندیشہ (قوی) ہو تو ان کو (پہلے) زبانی نصیحت کرو، اور (نہ مانیں تو) انہیں ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی تم ان کے پاس مت لیٹو) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) انہیں (اعتدال کے ساتھ) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر (زیادتی کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈھو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں (ان کے حقوق اور قدرت اور علم سب بڑے ہیں، اگر تم ایسا کرو گے تو پھر وہ بھی تم پر اپنے حقوق کے متعلق ہزاروں الزام قائم کرسکتے ہیں) اور اگر (قرائن سے) تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ آپس میں نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی ہو) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کو دور کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو غلطی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو، سمجھائیں) اگر ان دونوں آدمیوں کو (سچے دل سے) معاملہ کی (اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں (بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر عمل بھی کریں) اتفاق فرمادیں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں (جس طرح ان میں آپس میں مصالحت ہوسکتی ہے، اس کو جانتے ہیں، جب دونوں حکموں کی نیت دیکھیں گے تو وہ طریق ان کے دلوں میں ڈال دیں گے)

فائدہ: ان دونوں حکموں کا اصل کام اتنا ہی ہے، البتہ اگر میاں بیوی اپنے اپنے حَکَم کو طلاق یا خلع کا اختیار بھی دیدیں تو وکیل کے طور پر وہ اس کے مختار بھی ہوجائیں گے، مگر اس آیت میں اس سے تعرض نہیں ہے اور بشرطیکہ الخ میں جس امر کو احقر نے شرط کہا ہے، خود آیت میں اس پر دلالت ہے، اس لئے کہ ان حکموں کی تجویز زوجین یعنی میاں بیوی کے اختیاری افعال کے متعلق ہوگی، جن کا صدور ان کے صادر کرنے پر موقوف ہے، لہٰذا دونوں حکموں کے اصلاح کے اس ارادہ اور زوجین کے صلاح کے اختیار میں آپس میں اطاعت کے فعلوں کی طرح ہوگی، لہٰذا اس اعتبار سے اس ارادہ کا تحقق زوجین کے صادر کرنے تک پہونچنے پر موقوف ہوگا، اب ان دونوں کے درمیان توفیق کا نتیجہ عادت الٰہیہ کے مطابق ضرور ہی نکلے گا کہ کسب یعنی سعی وکوشش کے ساتھ خلق یعنی کام انجام پاتا ہے، خوب سمجھ لو۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ چونکہ مال کا خرچ کرنا معاوضہ کے طور پر ہے، لہٰذا وہ فضیلت کا سبب نہیں ہوسکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ معاوضہ اس کا ہے کہ عورت ماتحت رہے گی، اس لئے یہ معاوضہ تفضیل کے منافی نہیں ہوا، بلکہ اس کی تاکید کرنے والا اور عین دلیل ہوا۔ خوب سمجھ لو۔

مسئلہ: اگر زوجین حکام سے رجوع کریں تو یہ فیصلہ واجب ہے، اور دوسروں کے لئے مستحب ہے، اور حکم کا مرد کے خاندان سے اور عورت کے خاندان سے ہونے کی قید سب کے لئے مستحب ہے۔

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝﴾

ترجمہ: اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہگیر کے ساتھ بھی، اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں، شیخی کی باتیں کرتے ہوں جو کہ بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں، اور اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر اعتقاد نہیں رکھتے اور شیطان جس کا مصاحب ہو اس کا برا مصاحب ہے۔

ربط: اوپر زوجین کے حقوق کا ذکر تھا، اور اس سے پہلے بھی سورۃ کے شروع سے یتیموں، اور عورتوں اور وارثوں کے کچھ حقوق کا بیان چلا آ رہا ہے، اب ان لوگوں کے حقوق اور ان کے ساتھ معاملہ اور معاشرت کے طریقہ کا ذکر ہوتا ہے، اور چونکہ ان حقوق کو علی سبیل الکمال یعنی مکمل طور پر وہی ادا کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اور قیامت کے ساتھ عقیدہ درست رکھتا ہو، اور بخل اور کبر وریا سے پاک ہو، ورنہ یہ امور بھی حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس لئے اس مضمون کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اور درمیان میں توحید اور قیامت کے انکار کی مذمت، اور آخر میں توحید کی ترغیب اور قیامت کے احوال سے ڈرانے کے ساتھ رسول کی نافرمانی کی مذمت بھی ارشاد فرمادی۔ اور ان مذکورہ مذموم اخلاق کی قباحت بھی بیان فرمادی، اور بخل کی مذمت میں عام لفظ سے رسالت کا انکار کرنے والوں پر بھی اشاروں میں ناگواری ظاہر فرمادی جو رسالت کے دلائل کو چھپاتے تھے۔

سولھواں حکم: مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی اور مبداؤ معاد کے عقیدہ کی تصحیح:

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو (اس میں توحید بھی آ گئی) اور اس کے ساتھ کسی چیز کو (خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان، عبادت میں یا ان کی خاص صفات کے عقیدہ میں) شریک مت کرو، اور (اپنے والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور دوسرے) اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب وغرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی (خواہ وہ مجلس ہمیشہ کی ہو، جیسے لمبے سفر کی رفاقت اور کسی مباح کام میں شرکت یا عارضی ہو جیسے تھوڑا سفر یا اتفاقی جلسہ میں شرکت) اور راہ گیر کے ساتھ بھی (خواہ وہ تمہارا خاص مہمان ہو یا نہ ہو) اور ان (غلاموں وکنیزوں) کے ساتھ بھی جو (شرعی طور پر) تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں (غرض ان سب سے اچھا معاملہ کرو جس کی تفصیل شریعت نے دوسرے مواقع پر بتادی ہے)

اور جو لوگ ان حقوق کو ادا نہیں کرتے اکثر اس کے کئی سبب ہوتے ہیں یا تو ان کے مزاج میں تکبر ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور کسی کی طرف التفات ہی نہیں کرتے اور یا ان کی طبیعت میں بخل غالب ہے کہ کسی کو دیتے دلاتے جان نکلتی ہے اور یا ان کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان وعقیدہ نہیں کہ آپ کے احکام پر عمل اور حقوق کی ادائیگی کے ثواب کو اور حق تلفی کے عذاب کو صحیح نہیں سمجھتے، ظاہر ہے کہ یہ کفر ہے یا ان کی عادت نمود ونمائش اور ریا کاری کی ہے، اس لئے جہاں نمود ونمائش اور ریا کاری ہو وہاں دیتے ہیں خواہ وہ صحیح ہو یا غلط اور جہاں نمود ونمائش اور ریا کاری نہ ہو، وہاں ہمت نہیں ہوتی، خواہ وہاں یہ عمل کتنا ہی اچھا اور صحیح وحق ہو، یا ان کا سرے سے اللہ تعالیٰ ہی پر ایمان وعقیدہ نہ ہو یا وہ قیامت کے قائل نہ ہوں، ظاہر ہے کہ یہ بھی کفر ہے، اسی ترتیب سے جو لوگ انفرادی یا اجتماعی طور پر ان امور کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کا حال بھی سن لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتے جو (دل میں) خود کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے) شیخی کی باتیں کرتے ہوں، جو بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہوں (خواہ زبان سے یا اس طرح کہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی طرح کا اثر لیتے ہوں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے (اس سے مراد یا تو مال ودولت ہے، جبکہ حفاظت کی مصلحت کے بغیر محض بخل کی وجہ سے چھپائیں کہ کہیں اہل حقوق امید قائم نہ کر بیٹھیں۔ یا علم دین مراد ہے کہ یہود رسالت کی خبروں کو چھپایا کرتے تھے، اس طرح بخل بھی عام ہو جائے گا کہ اس میں بخل کے طور پر ایسا کرنے والے اور رسالت کا انکار کرنے والے دونوں آ گئے) اور ہم نے ایسے ناشکری کرنے والوں کے لئے (جو دنیا کی مادی نعمتوں کی یا رسول اللہ کی بعثت کی نعمت کی حق شناسی نہ کریں) اہانت آمیز سزا تیار رکھی ہے اور جو لوگ اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت کے دن) پر ایمان وعقیدہ نہیں رکھتے (ان کا بھی یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں رکھتے) اور (بات یہ

ہے کہ) شیطان جس کا مصاحب ہو (جیسا کہ ان مذکورہ لوگوں کا ہوا ہے) اس کا برا مصاحب ہے (کہ ایسا مشورہ دیتا ہے جس میں انجام کے طور پر سخت ضرر ہو)

تفسیر:

۱- شرک کی دوسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ جن صفات کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص ہونا ثابت ہو چکا ہے جیسے علم محیط اور قدرت عامہ وغیرہ ان کا کسی بھی دوسرے کے لئے عقیدہ رکھنا شرک ہے۔

۲- اور یتیموں کا باوجودیکہ اوپر ذکر آ چکا ہے، لیکن اس کا مکرر ذکر لانے سے مزید اہتمام ہو گیا۔ کیونکہ دورِ جاہلیت میں ان پر بہت ظلم ہوتا تھا جیسا کہ اب بھی اکثر لوگ طرح طرح سے خاص طور سے مالی ظلم کرتے ہیں۔

۳- اور پاس والے پڑوسی کا مطلب یہ ہے کہ جس کا گھر اپنے گھر کے پاس ہو اور دور والا یعنی جس کا گھر دور فاصلہ سے ہو، مگر محلہ ایک ہو، اور حقوق کے یہ مستحق اگر کافر بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے۔ البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زیادہ ہوگا۔

۴- اور بخل کو جو عام لیا گیا اس کی وجہ اس آیت اور حکم کا کئی بار نازل ہونا ہے۔ چنانچہ لباب میں ابن ابی حاتم کی روایت سے سعید بن جبیر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ: كان علماء بني اسرائيل يبخلون بما عندهم من العلم فانزل الله الذين يبخلون: بنی اسرائیل کے علماء اپنے پاس موجود علم میں بخل کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿اَلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ﴾ نازل فرمائی۔ اور روح المعانی میں عبد بن حمید کی روایت سے قتادہ کے قول میں مزید یہ اضافہ کیا ہے: كتموا الإسلام ومحمداً صلى الله عليه وسلم إلخ: یعنی انھوں نے اسلام اور محمد ﷺ سے متعلق باتیں چھپائیں اور لباب میں ابن جریر کی روایت سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ فلاں فلاں شخص، انصار کو نیک راہ میں خرچ کرنے سے روکتے تھے اور انہیں طرح طرح سے سمجھاتے تھے، ان کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا ۞ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۞﴾

ترجمہ: اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جاوے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر ایمان لے آویں اور اللہ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے رہا کریں، اور اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔

ربط: اوپر اللہ، رسول اور قیامت پر ایمان نہ لانے، ان کا کفر و انکار کرنے اور بخل اور ریا اور کبر کی مذمت فرمائی ہے،

اب ان کے مقابل اعمال کی ترغیب دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ اپنے سے پہلے والے مضمون کا تتمہ ہے، اور اگرچہ الفاظ میں صرف اللہ اور قیامت پر ایمان اور انفاق ہی کا ذکر ہے، جو اللہ اور قیامت کے کفر و انکار اور بخل کے مد مقابل ہیں، لیکن اللہ پر ایمان کے لئے رسول پر ایمان لانا بھی لازم ہے جو کہ رسول کے کفر و انکار کا مد مقابل ہے، اور انفاق سے مراد موقع و محل کے قرینہ سے خالص اللہ کے لئے خرچ کرنا ہے، جو ریا کے مد مقابل ہے اور یہی اللہ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کا بھی علاج ہے، کیونکہ کبر میں جاہ و مرتبہ کی طلب ہوتی ہے اور وہ طلب خالص اللہ کی رضا کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، اس لئے خالص اللہ کی رضا کا طلب کرنے والا جاہ و مرتبہ کا طلب گار نہ ہوگا، اس لئے یہی کبر کا بھی مد مقابل ہوگیا، اس طرح تمام ضدوں کی ترغیب آگئی۔

گذشتہ مضمون کا تتمہ:

اور ان پر کیا مصیبت آجائے گی اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت) پر ایمان لے آئیں اور اللہ نے جو انہیں دیا ہے، اس میں سے کچھ (اخلاص کے ساتھ) خرچ کرتے رہا کریں (یعنی کچھ بھی حرج و نقصان نہیں، ہر طرح نفع ہی نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ ان (کے نیک و بد) کو خوب جانتے ہیں (لہٰذا ایمان اور انفاق پر ثواب اور کفر وغیرہ پر عذاب دیں گے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے (کہ کسی کا ثواب مارلیں یا بلاوجہ عذاب دینے لگیں، جو کہ بظاہر ظلم ہے) اور (بلکہ وہ تو ایسے رحیم ہیں کہ) اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا زیادہ کرکے (ثواب) دیں گے (جیسا کہ دوسری آیت میں وعدہ کیا گیا ہے) اور (اس وعدہ والے ثواب کے علاوہ) اپنے پاس سے (عمل کے معاوضہ کے بغیر بطور انعام) اور اجر عظیم دیں گے۔

فائدہ: ظلم میں 'بظاہر' کی قید اس لئے لگائی کہ اگر ایسا کرتے تو واقع میں تو یہ بھی ظلم نہ ہوتا، کیونکہ وہ مالک ہیں، ع: ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود (یعنی وہ مالک ہے جو بھی کرے اچھا ہی ہے) اور ''اپنے پاس سے'' فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقررہ اجر کے علاوہ ہوگا، اور پھر اس کو اجر اس لئے کہہ دیا کہ گویا مقابلہ میں نہیں، مگر بظاہر عمل کے سبب سے تو ہے، کیونکہ عام طور سے انعام بھی عمل، کرنے والے ہی کو ملتا ہے۔

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۝ ﴾ ع۶

ترجمہ: سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے حاضر کریں گے۔ اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش ہم زمین کے پیوند ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفا نہ کرسکیں گے۔

ربط: اوپر جن امور کی رغبت دلائی گئی تھی، اب ان کے نہ کرنے پر ڈرایا جارہا ہے، اس طرح یہ بھی گذشتہ مضمون کا تتمہ ہی ہوا۔

گذشتہ مضمون کا دوسرا تتمہ:

تو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر (جن کا آپ سے سابقہ پڑا ہے) گواہی دینے کے لئے لائیں گے (یعنی جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے احکام کو نہ مانا ہوگا، ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت سرکاری گواہ کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے بیانات لئے جائیں گے کہ جو معاملات ان کی موجودگی میں پیش آتے تھے وہ سب ظاہر کر دیں، اس شہادت کے بعد جب ان مخالفوں پر جرم ثابت ہو جائیں گے تو انہیں سزا دی جائے گی۔ اوپر فرمایا تھا کہ اس وقت کیا حال ہوگا، آگے اس حال کو خود بیان فرماتے ہیں کہ اس روز (یہ حال ہوگا کہ) جن لوگوں نے (دنیا میں) کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا، وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش (اس وقت) ہم زمین کے پیوند ہو جائیں (تا کہ اس رسوائی، آفت اور عذاب سے محفوظ رہیں) اور (گواہی کے علاوہ وہ خود اقراری مجرم بھی ہوں گے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو (جو ان سے دنیا میں صادر ہوئی تھی) چھپا نہیں سکیں گے (اس طرح دونوں طریقوں سے فرد قرار داد جرم ان پر لگادی جائے گی)

فائدہ: بظاہر آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں مطلق کفر اور رسول کے خلاف معصیت کا اطلاق اس پر کیا جاتا ہے، لہٰذا دوسرے معاصی گناہ بخل وریا اور کبر جن کا اوپر ذکر ہوا تھا، اگر چہ ان کے ارتکاب پر اس درجہ کی وعید نہ ہوگی، لیکن جب وعید کی علت اس سے روکنا ہے تو سمجھ دار آدمی اس سے ان کی وعید بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس درجہ کی وہ غلطی یا گناہ ہے جس سے روکا جارہا ہے، اس درجہ کی وعید ان پر بھی ہے، باقی چونکہ اس وقت ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والے بھی کفار ہی تھے، اس لئے ذکر میں کفار کی تخصیص کی گئی۔

اور جاننا چاہئے کہ قرآن میں جو یہ آیا ہے کہ کفار کہیں گے ﴿ وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ یعنی ہمارے رب! اللہ کی قسم ہم مشرک نہیں تھے، تو یہ شروع میں ہوگا، پھر جب اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر خاموشی کی مہر لگا کر ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو بولنے کی اجازت دیں گے تو وہ اپنا کیا ہوا سب کچھ بیان کر ڈالیں گے۔ یہ چھپا نہ پانا اس حالت کے اعتبار سے فرمایا، اس لئے دونوں میں کوئی تعارض وٹکراؤ نہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں حاکم کی تصحیح اور روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے بعینہٖ یہی مضمون منقول ہے اور اس کے آخر میں یہ بھی ہے فیتمنون أن تسوی بھم الأرض کہ وہ تمنا کریں گے کہ وہ زمین میں سما جائیں اور وہ ان کے اوپر برابر ہو جائے، اور جو جرائم انبیاء علیہم السلام کے غائبانہ میں اور ان کی وفات کے بعد ہوئے ہیں ان کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے طریقوں کے موجود ہوتے ہوئے اگر نبی کی شہادت نہ ہو تو اس سے

مقصود فوت نہیں ہوتا، چنانچہ سورۂ مائدہ کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے زمانہ کے مخالف لوگوں پر گواہ ہونا ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ﴾ کے بعد کی حالت کے لئے ثبوت کے دوسرے طریقہ کو ﴿ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔ اور حالتِ جنابت میں بھی باستثناء تمہارے مسافر ہونے کی حالت کے یہاں تک کہ غسل کرلو اور اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے بخشنے والے ہیں۔

ربط: سورت کے شروع میں گذر چکا ہے کہ اس سورت میں ملے جلے طور پر تین قسم کے مضامین تقوی کے موقع ومحل میں بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک قسم دیانات یعنی بندہ اور رب کے درمیان کے معاملات ہیں، اوپر اکثر آپسی معاملات کا بیان ہوا ہے، اب اس مقام پر دیانات کے بعض احکام کا بیان کیا جارہا ہے، اور خاص شان نزول کے اعتبار سے ایک مناسبت اس سے بھی زیادہ ہے کہ اوپر آیت ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ میں شرک کی ممانعت فرمائی تھی، اب اس کا انتظام فرمایا کہ بلا ارادہ بھی شرک کی صورت صادر نہ ہو، جیسا کہ اسلام کے شروع میں شراب حلال ہونے کے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک دعوت میں مہمانوں کو شراب پلائی، اس دوران مغرب کا وقت آگیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو امام بنایا گیا، انھوں نے مدہوشی میں سورۃ ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ میں اس طرح پڑھ دیا: اعبد ما تعبدون: یعنی لفظ لا چھوٹ گیا جو کہ لفظ کے لحاظ سے توحید کے خلاف تھا، لیکن یہ بلا ارادہ تھا، اس پر آئندہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے اور حقیقت میں نمازوں کے وقت نشہ لانے والی چیز استعمال کرنے سے منع فرمایا (ترمذی) اور نماز کے اس مسئلہ کے ساتھ اس سے متعلق دوسرے مسائل بھی بیان فرمادیئے۔

سترہواں حکم: طہارت صلوٰۃ سے متعلق:

اے ایمان والو! تم ایسی حالت میں نماز کے پاس بھی مت جاؤ (یعنی ایسی حالت میں نماز مت پڑھو) جب تم نشہ میں

ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہہ رہے ہو (اس وقت تک نماز مت پڑھو، مطلب یہ کہ نماز کا ادا کرنا تو اپنے وقت پر فرض ہے اور یہ حالت نماز کی ادائیگی کے منافی یعنی خلاف ہے، اس لئے اوقاتِ صلوٰۃ میں نشہ کا استعمال مت کرو کہ کہیں نماز کے دوران تمہارے منہ سے کوئی بے موقع لفظ نہ نکل جائے) اور جنابت کی حالت میں بھی (یعنی جب غسل کرنا فرض ہو) سوائے مسافر ہونے کی حالت کے (کہ اس کا حکم آگے جلد ہی آرہا ہے، نماز کے پاس مت جاؤ) یہاں تک کہ غسل کرلو (یعنی جنابت سے غسل کرنا نماز کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ہے، اور یہ حکم یعنی جنابت کے بعد غسل کے بغیر نماز نہ پڑھنا عذر نہ ہونے کی حالت میں ہے) اور اگر تم (کچھ عذر رکھتے ہو، مثلاً) بیمار ہو (اور پانی کا استعمال نقصان دیتا ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے) یا سفر کی حالت میں ہو (جس کا اوپر استثنا ہوا ہے کہ اس کا حکم آگے آئے گا، یعنی اور پانی نہیں ملتا، جیسا کہ آگے آتا ہے تو ان عذروں کی حالت میں تیمم کی اجازت آئی ہے، اور تیمم کا جواز صرف انہی مذکورہ عذروں یعنی سفر ومرض کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ خواہ تمہیں خاص یہ عذر ہوں) یا (یہ کہ خاص عذر نہ ہوں یعنی نہ تم مریض ہو نہ مسافر بلکہ ویسے ہی کسی کا وضو یا غسل ٹوٹ جائے، اس طرح کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہوکر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیویوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل کرنا لازم ہوگیا ہو اور) پھر (ان ساری صورتوں میں خواہ مرض وسفر کے عذر کی صورت ہو یا مرض نہ ہو نہ سفر، ویسے ہی وضو یا غسل کی ضرورت ہو) تمہیں پانی (کے استعمال کا موقع ملے) نہ ملے (چاہے اس وجہ سے کہ مرض میں نقصان ہوتا ہے یا اس لئے کہ وہاں پانی ہی موجود نہیں، خواہ سفر ہو یا نہ ہو) تو (ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو (یعنی اس زمین پر دوبار ہاتھ مار کر) اپنے چہروں اور ہاتھوں پر (ہاتھ) پھیر لیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے بخشنے والے ہیں (اور جس کی ایسی عادت ہوتی ہے، وہ آسان حکم دیا کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آسان حکم دیئے ہیں کہ تمہیں تکلیف وتنگی نہ ہو)

فائدہ: اس آیت کے شروع کا حکم اس وقت تھا جب شراب حلال تھی، اس کے حرام ہونے کا حکم نہیں آیا تھا، بعد میں شراب حرام ہوگئی، اب نہ وہ نماز کے وقت جائز وحلال ہے اور نہ ہی غیر نماز کے وقت، لہٰذا اس آیت کا پہلا حصہ منسوخ ہے۔

مسئلہ (۱): جس مرض میں پانی کے استعمال سے بیماری کی شدت یعنی اس کے بڑھنے یا ٹھیک ہونے کی مدت بڑھنے کا ڈر ہو، اس میں تیمم درست ہے، لفظ مرض میں دونوں صورتیں داخل ہیں۔

مسئلہ (۲): جس شخص سے پانی ایک میل شرعی یا اس سے زیادہ دور ہو، خواہ وہ شخص مسافر ہو یا غیر مسافر، اس کو تیمم درست ہے، اور شرعی میل، انگریزی میل سے تقریباً $\frac{1}{8}$ زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ انگریزی میل تین ہزار پانچ سو بیس ہاتھ کا ہوتا ہے، جبکہ شرعی میل چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے۔

مسئلہ (۳): اگر پانی دور نہیں، لیکن ڈول رسی جیسا کوئی ضروری آلہ وسامان کے نہ ہونے یا کسی آدمی یا جانور کے خوف

کی وجہ سے اس کو نہ لا سکے تو بھی تیمم جائز ہے، ﴿ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً ﴾ میں عموم مجاز کے طور پر یہ اور اس سے اوپر والے دونوں مسئلے آگئے۔

مسئلہ (۴): تیمم ہر ایسی چیز سے جائز ہے جو زمین کی جنس سے ہو، اور زمین کی جنس ہر وہ چیز ہے جو آگ سے نہ جلے، اور نہ گلے، لیکن چونا اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ اس کے باوجود کہ آگ میں جل جاتا ہے، لیکن اس سے تیمم درست ہے اور راکھ اسی طرح مستثنیٰ ہے کہ باوجودیکہ وہ بھی نہ آگ میں جلتی ہے، نہ گلتی ہے، پھر بھی اس سے تیمم جائز نہیں۔

مسئلہ (۵): تیمم وضو اور غسل دونوں کا ایک ہی طرح ہے، صرف نیت الگ الگ ہے کہ اُس میں وضو کے قائم مقام ہونے کا خیال کیا جاتا ہے اور اِس میں غسل کے قائم مقام ہونے کا۔

مسئلہ (۶): تیمم میں دو ضربیں ہیں، ایک دفعہ دونوں ہاتھ مار کر تمام چہرے پر ملا جاتا ہے، دوسری دفعہ دونوں ہاتھ مار کر کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں پر اس طرح ملا جاتا ہے کہ کوئی جگہ دانستہ طور پر ایسی نہ رہ جائے جہاں ہاتھ نہ پہنچا ہو (ہدایہ، الدرالمختار)

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۞ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۞ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا ۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ ﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک بڑا حصہ ملا ہے، وہ لوگ گمراہی کو اختیار کر رہے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ تم راہ سے بے راہ ہو جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی حامی ہیں۔ یہ لوگ جو یہودیوں میں سے ہیں۔ کلام کو اس کے مواقع سے دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ کلمات کہتے ہیں: ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ اور ﴿ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ ﴾ اور ﴿ رَاعِنَا ﴾ اس طور پر کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اور دین میں طعنہ زنی کی نیت سے۔ اور اگر یہ لوگ یہ کلمات کہتے ﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ اور ﴿ اسْمَعْ ﴾ اور ﴿ انْظُرْنَا ﴾ تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور موقع کی بات تھی مگر ان کو خدا تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب اپنی رحمت سے دور پھینک دیا، اب وہ ایمان نہ لاویں گے مگر تھوڑے سے آدمی۔

ربط: یہاں تک تقویٰ کے مواقع میں سے زیادہ تر باہمی معاملات اور بعض دیانات کا بیان ہوا ہے۔ اب مخالفین کے ساتھ معاملات کا ذکر شروع ہوتا ہے، ان میں سے یہود سے دوستی توڑنے کی غرض سے ان کے قبیح اور مکر کے احوال کا اظہار

اور مؤمنوں کو ان سے دور رہنے کا حکم ہے، جب کہ اجمالی اور ضمنی طور پر یہ مضمون آیت ﴿ وَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ﴾ میں آچکا ہے، اس سے بھی اس کا ربط ہے کہ وہاں نعمت کو چھپانے کا ذکر تھا، یہاں کتمان کے ساتھ کتاب کی تحریف اور یہود کے چھٹے بتوں کی دشمنی وعداوت کا ذکر ہے۔

یہود کے بعض قبائح کا ذکر:

(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ (یعنی دیکھنے کے قابل ہیں، دیکھو تو تعجب کرو) جن کو (اللہ کی) کتاب (یعنی توریت کے علم کا ایک بڑا حصہ ملا ہے (یعنی توریت کا علم رکھتے ہیں، اس کے باوجود) وہ لوگ گمراہی (یعنی کفر) اختیار کررہے ہیں اور (خود تو گمراہ ہوئے ہی تھے مگر) وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم (بھی سیدھے) راہ سے (علاحدہ ہوکر) بے راہ ہوجاؤ (یعنی طرح طرح کی تدبیریں اس امر کی کرتے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران میں کئی بار گذر چکا ہے) اور (اگر تمہیں اب تک ان لوگوں کے بارے میں خبر نہیں ہوئی تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) تمہارے (ان) دشمنوں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے تمہیں بتادیا، لہٰذا تم ان سے بچتے رہو) اور (ان کی مخالفت کا حال سن کر زیادہ فکر میں نہ پڑجانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تمہارا) کافی رفیق ہے (کہ تمہاری مصلحتوں کی رعایت رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ (تمہارے لئے) کافی حامی ہے (کہ ان کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت کرے گا اور) یہ لوگ (جن کا ذکر ہوچکا ہے) یہودیوں میں سے ہیں (اور ان کا گمراہی کو اختیار کرنا جو اوپر آچکا، یہ ہے کہ اللہ کے) کلام (یعنی توریت) کو اس کے مواقع (اور محل) سے (الفاظ کے اعتبار سے یا معنی کے اعتبار سے) دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور (ان کی ایک گمراہی جس میں دوسرے سادہ ذہن لوگوں کا پھنس جانا بھی ممکن ہے، یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کرتے وقت) یہ کلمات کہتے ہیں: ﴿ سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا ﴾ اور ﴿ اسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ ﴾ اور ﴿ رَاعِنَا ﴾ (ان کلمات کے دو دو معنی ہیں، ایک اچھے دوسرے برے، وہ لوگ برا مطلب لیتے تھے اور دوسروں پر ظاہر کرتے تھے کہ ہماری مراد اچھے معنی ہیں، اور اس سے کسی مسلمان کا دھوکہ میں آکر بعض ایسے ہی کلمات سے حضور ﷺ کو خطاب کرنا بعید نہ تھا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے تیسویں معاملہ میں مؤمنوں کو لفظ راعنا استعمال کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے، اس اعتبار سے یہود کا ان کلمات کو کہنا ایک طرح سے دوسروں کو گمراہ کرنا بھی ہے، خواہ محض الفاظ کے اعتبار سے ہی ہو۔ لہٰذا اس میں ﴿ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا ﴾ کا بھی بیان ہوگیا جو کہ اوپر آیا ہے۔ اور جیسا کہ ﴿ مِنَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا ﴾ کا بیان ﴿ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا ﴾ میں تھا۔ اور ﴿ یُحَرِّفُوۡنَ ﴾ میں ﴿ یَشۡتَرُوۡنَ ﴾ کا بیان تھا۔ ان کلمات میں ﴿ سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا ﴾ کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے سن لیا اور مانا نہیں۔ اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے آپ کا ارشاد سن لیا اور آپ کے کسی مخالف کا قول جو ہمیں بہکاتا تھا نہیں مانا، اور برا مطلب ظاہر ہے کہ ہم نے آپ کی بات کو سن تو لیا مگر ہم اس پر عمل نہیں کریں گے۔ اور دوسرے کلمہ ﴿ اسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ ﴾ کا لفظی

ترجمہ یہ ہے کہ تم ہماری بات سنو اور خدا کرے تمہیں کوئی بات سنائی نہ جائے اس کا اچھا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کوئی مخالف اور رنج دہ بات نہ سنائی جائے، بلکہ آپ کا ایسا اقبال رہے کہ آپ جو بات بھی فرمائیں، سب آپ کو اس کے جواب میں موافق بات ہی سنائیں اور برا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کوئی موافق اور مسرت بخش بات نہ سنائی جائے بلکہ آپ جو بات کہیں اس کا مخالف جواب ہی آپ کے کان میں پڑے یا مخالف بات ہی سننے کو ملے اور تیسرے کلمہ ﴿ رَاعِنَا ﴾ کے دونوں اچھے اور برے مطلب سورۂ بقرہ کے تیسویں معاملہ میں گذر چکے ہیں، کہ اچھے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری رعایت کیجئے اور برے معنی یہود کی لغت میں گالی ہے۔ غرض (ان کلمات کو) اس طرح (کہتے ہیں) کہ اپنی زبانوں کو (تحقیر کے لہجہ سے توقیر کے لہجہ کی طرف) پھیر کر اور (دل سے) دین میں طعنہ زنی (اور تحقیر ہی) کی نیت سے (وجہ یہ کہ نبی کے ساتھ طعن واستہزاء خود دین کے ساتھ طعن و تمسخر ہے) اور اگر یہ لوگ (دو معنی والے ان الفاظ کی بجائے) یہ الفاظ کہتے (﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ کے بجائے ﴿ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ﴾ (جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا) اور (﴿ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ ﴾ کے بجائے صرف) اسمع (جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ سن لیجئے) اور ﴿ رَاعِنَا ﴾ کے بجائے ﴿ انْظُرْنَا ﴾ (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمایئے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کے تیسویں معاملہ میں بھی اس لفظ کی تعلیم فرمائی ہے، اور یہ کلمات شرارت سے پاک ہیں تو اگر یہ کلمات کہتے) تو یہ بات ان کے لئے بہتر (اور فائدہ دینے والی بھی) ہوتی اور اپنے (آپ میں) موقع (ومحل) کے مطابق بات تھی مگر (انھوں نے تو ایسے نفع اور موقع ومحل کے مطابق بات کہی ہی نہیں، بلکہ وہی ناشائستہ بے ہودہ بات بکتے رہے، اس لئے انہیں یہ نقصان پہونچا کہ) ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب اپنی (خاص) رحمت سے دور پھینک دیا۔ اب وہ ایمان نہ لائیں گے، ہاں اگر تھوڑے سے آدمی اس وجہ سے کہ وہ ایسی حرکتوں سے دور رہے تو وہ خاص رحمت کی دوری سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ ایمان لے آئے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

فائدہ: یہ ﴿ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ انہی کے بارے میں فرمایا جو اللہ کے علم میں کفر پر مرنے والے تھے، لہٰذا نومسلموں کے ایمان لانے سے کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اور جو ایمان لے آتا ہے اگر وہ کسی وقت میں بے ادبی اور نافرمانی بھی کر چکا ہو، لیکن اس سے جب باز آگیا تو وہ کالعدم ہوگیا، اس طرح بے ادبی کا لعنت کے لئے سبب بن جانا اور لعنت کا کفر کے لئے سبب بن جانا اس میں کوئی برائی اور مخالفت لازم نہیں آتی، کیونکہ علت کے دور ہونے کے بعد معلول یعنی جس چیز کے لئے اس کو علت قرار دیا گیا، دور ہو جانا قابل اشکال نہیں۔

اور یہ جو فرمایا ہے کہ ان دوسرے کلمات کا کہنا بہتر ہوتا، اگر اس کے ساتھ ایمان لانے کا بھی اعتبار کیا جائے تب تو بہتر ہونا ظاہر ہی ہے کہ نیک اعمال پر مؤمن کو آخرت میں ثواب ملے گا، اور اگر اس کی قید نہ لگائی جائے تب بہتر ہونا یا تو دنیا کے اعتبار سے ہے کہ تہذیب اور شائستگی اچھی چیز ہے، مخلوق کے نزدیک اس کو قابل مدح وستائش اور مستحق رضا سمجھا جاتا ہے۔

اور اگر آخرت کے اعتبار سے لیا جائے تو ثواب کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ عذاب ہلکا کرنے کے اعتبار سے ہوگا کیونکہ قرآن وحدیث سے یہ امر یقینی طور پر سمجھا جاتا اور معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں کفار کے عذاب میں فرق ہوگا، چنانچہ غور وفکر کرنے والے سے پوشیدہ نہیں۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝﴾

ترجمہ: اے وہ لوگو جو کتاب دیئے گئے ہو تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے ایسی حالت پر کہ وہ سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے پہلے کہ ہم چہروں کو بالکل مٹاڈالیں اور ان کو ان کی الٹی جانب کی طرح بنادیں یا ان پر ہم ایسی لعنت کریں جیسی لعنت ان ہفتہ والوں پر کی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہی ہو کر رہتا ہے۔

ربط: اوپر کی آیت میں یہود کے کفر اور اسلام کے جھٹلانے کا بیان تھا جو کہ تحریف اور تمسخر کے لوازم سے تھا، اب انہیں خطاب کے طور پر ایمان اور تصدیق کا حکم فرماتے ہیں اور خلاف ورزی کی صورت میں ڈراتے ہیں۔

اہل کتاب کو ایمان لانے کا حکم:

اے وہ لوگو! جنہیں کتاب (توریت) دی گئی ہے تم اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ، جسے ہم نے نازل فرمایا ہے (اور تمہیں اس پر ایمان لانے سے وحشت نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ ہم نے اسے) ایسی حالت پر (نازل فرمایا ہے) کہ سچی کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی وہ تمہاری اصل کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے۔ باقی تحریف کا حصہ اس سے الگ ہے، لہٰذا تم قرآن پر) اس (امر کے واقع ہونے) سے پہلے پہلے (ایمان لے آؤ جس کے واقع ہونے کا احتمال ہے) کہ ہم (تمہارے) چہروں (کے نقش ونگار یعنی آنکھ ناک) کو بالکل مٹاڈالیں اور ان (چہروں) کو ان کی الٹی جانب (یعنی گدی) کی طرح (صفاچٹ) بنادیں یا ان (ایمان نہ لانے والوں) پر ہم ایسی (خاص قسم کی) لعنت کریں جیسی لعنت ان یوم السبت (یعنی ہفتہ، سنیچر کے دن) والوں پر کی تھی (جو یہود میں گذر چکے ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے سولہویں معاملہ میں گذر چکا ہے یعنی ان کی طرح انہیں بھی بندر کی شکل بنادیں) اور اللہ تعالیٰ کا (جو) حکم (صادر ہوجاتا ہے، وہ) پورا ہی ہو کر رہتا ہے (چنانچہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان نہ لانے پر اگر اس چہروں کو مٹانے، لعنت اور صورتیں وشکلیں مسخ کرنے کا حکم کردیں گے تو پھر یہ لازمی طور پر ہوجائے گا، اس لئے تمہیں ڈرنا چاہئے اور ایمان لے آنا چاہئے)

فائدہ: تفسیر کی کتابوں میں اس مقام پر ایک سوال کیا گیا ہے کہ یہ طمس ومسخ یعنی چہروں کے نقش ونگار کا مٹانا اور شکل وصورت کا مسخ کرنا کب ہوا ہے؟ اور پھر طمس ومسخ کی مختلف توجیہیں کرکے اور بعض نے ان کی وجہوں میں تاویل کرکے اور بعض نے دوسری قیدیں اور شرطیں لگا کر جواب دیا ہے، پھر ان جوابوں کے سلسلہ میں اندیشے ظاہر کرکے ان اندیشوں کو

دور کیا ہے۔

لیکن احقر کے نزدیک سرے سے وہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں اس پر کہیں کوئی دلالت نہیں ہے کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طمس یعنی چہروں کے نقش ونگار کا مٹنا اور مسخ یعنی شکل وصورت کا بگڑ جانا واقع ہو جائے گا، بلکہ حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ اس کا احتمال ہے، اس احتمال کا تقاضہ اس جرم کا عظیم ہونا ہے، پس رحمت کے تقاضہ کے تحت واقع نہ ہونا: کچھ اشکال کا موقع نہیں ہے اور لفظ قبل کا استعمال اس معنی میں خود قرآن میں آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ منافقون میں ہے: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ الخ (آیت ۱۰) یہاں لفظ قبل دو چیزوں سے متعلق ہے (۱) موت کا آنا اور (۲) قول خاص، حالانکہ بعض ان لوگوں کو جن کے سامنے موت اس حالت میں آ کھڑی ہو کہ جو محض بے ہوش ہو جائیں، اصلاً اس قول کی نوبت نہیں آتی، نہ زبان سے، نہ دل سے، لیکن کلام کے صحیح ہونے کے لئے احتمال کافی ہے، اسی طرح سورۂ نساء کے شروع میں ہے ﴿ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ﴾ جو لفظ قبل کا مرادف معنی ہے: أی من قبل أن يكبروا: یعنی بڑے ہونے سے پہلے، حالانکہ بعض یتیم بچے بالغ ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور حدیث میں ہے: **قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اغتنم خمساً قبل خمس: شبابک قبل هرمک وصحتک قبل سقمک وغناک قبل فقرک وفراغک قبل شغلک وحيوتک قبل موتک:** یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنے غنا کو اپنی فقیری محتاجی سے پہلے، اپنے فارغ ہونے کو اپنی مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے (ترمذی) حالانکہ پہلی چار چیزوں میں قبل کے مضاف الیہ کا صرف احتمال ہے اور جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ﴾ یعنی اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دیتا حالانکہ اجازت ہوئی ہی نہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔

ربط: اوپر کی آیت میں ایمان نہ لانے پر وعید فرمائی تھی چونکہ وعید کے بعض مستحق آخر میں بخش بھی دیئے جاتے ہیں، جس سے احتمال ہوا کہ شاید یہ مذکورہ لوگ بھی بخش دیئے جائیں، اس لئے آگے بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کی کفر کی وجہ سے بخشش نہیں ہوگی، اور اس میں یہود پر ان کے اس قول کے سلسلہ میں رد بھی ہے ﴿ سَيُغْفَرُ لَنَا ﴾ کہ وہ ہمیں جلد ہی بخش دے گا۔

شرک وکفر کا بخشا نہ جانا:

یقیناً اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) معاف نہیں کریں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ ہمیشہ کی سزا میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ یا کبیرہ) ان میں سے جس کو چاہیں گے (بغیر سزا) بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا، اب وہ ہمیشہ کی سزا بھی نہ رہے گی) اور (اس مشرک کو نہ بخشنے کی وجہ یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے، اس نے بڑے جرم کا ارتکاب کیا (جو اپنے عظیم ہونے کی وجہ سے مغفرت کے قابل نہیں)

فائدہ: قرآن وحدیث اور اجماع کے مطابق یہ مسئلہ شریعت کے لازمی اصولوں میں سے ہے کہ شرک اور کفر دونوں ناقابل معافی ہیں اور یہاں صرف شرک کا ذکر فرمایا ہے۔ حالانکہ کفر بھی قابل ذکر ہے، خاص طور سے موقع ومحل کا بھی تقاضہ ہے کیونکہ اوپر سے یہود کے کفر کا ذکر ہو رہا ہے، اس کی چند توجیہیں ہوسکتی ہیں جو کہ سب لطیف ہیں، ایک یہ کہ شرک اپنے ظاہری معنی پر رہے، جس کا ذکر آیت ۳۶ کے ذیل میں ہو چکا ہے، اور اس آیت میں صرف شرک کا ذکر ہو، دوسری آیتوں میں کفر کا ذکر قرار دیا جائے اور بعض میں دونوں کا ذکر ہو اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر آیت میں دونوں کا ذکر ہوا کرے۔ اس طرح آیتوں کے مجموعہ سے دونوں کا نہ بخشا جانا ثابت ہو جائے گا، رہا ان آیتوں کا یہود کے حال کے مناسب ہونا، تو یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ اس اعتبار سے مشرک بھی تھے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے۔

دوسری توجیہ یہ کہ شرک اپنے معنی پر رہے اور دون کے معنی ادنیٰ اور کم تر کے لئے جائیں، یعنی شرک سے کم جتنے گناہ ہیں وہ بخشے جاسکتے ہیں، اور کفر کی بعض صورتیں تو شرک ہی ہیں ان کے بارے میں تو سوال ہی نہیں ہوسکتا، اور باقی صورتیں مثلاً دنیا کو بنانے والے کا انکار وغیرہ جو شرک نہیں ہیں، وہ چونکہ شرک سے بڑھ کر ہیں، کیونکہ مشرک بنانے والے کو مانتا ہے اگرچہ دوسرے کو بھی مانتا ہے۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو کفر کی تمام صورتیں شرک سے زیادہ شدید ہیں اس لئے ان کا بخشا نہ جانا نص کی دلالت سے ثابت ہو گیا کہ جب شرک معاف نہیں ہوگا تو جو جرم اس سے بھی بڑھ کر ہو، وہ کیونکر معاف ہوگا اگر اس توجیہ کی بنیاد پر یہود کے عقیدہ کو شرک نہ بھی کہا جائے تو بھی اس وجہ سے ان کے کفر کا بخشا نہ جانا کلام کا مدلول ہو گیا، موقع ومحل کے تقاضہ کے خلاف نہ رہا۔

تیسری توجیہہ یہ کہ مشرک کے دو معنی ہوں: ایک حقیقی جس کا اوپر ذکر ہوا، دوسرے معنی مطلق کفر جس میں شرک بھی شامل ہے۔ روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے اسی تیسرے احتمال کو نقل کیا گیا ہے، اور یہ بہت آسان ہے، اس بنا پر یہود کے حال کی مطابقت بہت ہی واضح ہے۔

اور بغیر سزا کی قید اس لئے لگائی کہ سزا کے بعد مؤمن کے تمام گناہوں کے بخش دیئے جانے کا تو وعدہ ہے اور یہ یقینی

ہے، اور اس کے ساتھ مشیت کا تعلق ثابت ہو چکا ہے، پھر اس آیت میں جو تعلیق اور شرط کے طور پر فرمایا اور تعلق کو پختہ طور پر نہیں فرمایا، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ مغفرت سے مراد بغیر سزا کے ہے۔ خوب سمجھ لو۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾ ع۴

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بنادیں اور ان پر تاگے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔ دیکھ تو یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور یہی بات صریح مجرم ہونے کے لئے کافی ہے۔

ربط: اوپر یہود کے کفر اور اس پر مغفرت نہ ہونے کی وعید کا ذکر ہوا ہے، چونکہ یہود خود کو اللہ کا محبوب و مقبول اور خالص مؤمن اور بغیر سزا بخشا ہوا بتاتے تھے جیسا کہ قرآن میں بھی ان کے ایسے قول نقل کئے گئے ہیں ﴿ نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ﴾ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، اب اس کا رد فرماتے ہیں۔

یہود کے اپنے تقدس کے دعوی کا رد:

(اے مخاطب!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (وہ تعجب کے قابل ہیں) جو خود کو مقدس بتاتے ہیں (ان کے بتانے سے کچھ نہیں ہوتا) بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بنادیں (البتہ یہ امر یقیناً قابل اعتبار ہے اور اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں مؤمن کو مقدس بتا چکے ہیں، جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ میں اشقی یعنی کافر کے مقابلہ میں مؤمن کی نسبت فرمایا ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ یعنی وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے تذکیہ کا راستہ اختیار کیا، لہٰذا وہی مقدس ہوں گے نہ کہ کفر کرنے والے، جیسے یہود ہیں) اور (ان یہود کو قیامت کے دن اس جھوٹے دعوی پر جس کا مقصد کفر کو ایمان قرار دینا ہے جو سزا ہوگی اس سزا میں) ان پر دھاگے برابر بھی ظلم نہ ہوگا (یعنی وہ سزا ان کے جرم سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ایسے جرم پر ایسی ہی سزا مناسب ہے۔ ذرا) دیکھو تو (اس دعوی میں) یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں (کیونکہ جب کفر کے باوجود مقبولیت کے مدعی ہیں تو صاف طور سے کفر کو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول بتانا لازم آیا، اور یہ محض تہمت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام شریعتوں میں اس کی تصریح فرمادی ہے کہ کفر ہمارے نزدیک سخت ناپسند اور مردود ہے) اور یہی بات (کہ اللہ پر تہمت لگائی جائے) صریح مجرم ہونے کے لئے کافی ہے (پھر کیا ایسی صریح اور بڑی بری بات پر ایسی سزا کچھ ظلم وزیادتی ہے)

فائدہ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب مؤمن کو اللہ تعالیٰ نے مقدس بنایا ہے تو پھر کسی کے خود کو یا دوسرے کو حسن ظن سے مقدس کہنے کی شریعت میں ممانعت کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممانعت تین وجہ سے ہے: ایک تو اکثر اپنی مدح کا منشا کبر ہوتا ہے تو حقیقت میں یہ ممانعت کبر سے ہوئی، دوسرے خاتمہ کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے کہ تقدس پر ہوگا یا نہیں، اس لئے مطلق ایسا دعوی کرنا اس کے خوف اور تقوی کے خلاف ہے، تیسرے یہ کہ اس دعوی سے اکثر سننے والے کو وہم ہوتا ہے کہ یہ

تمام عیبوں اور نقاضوں سے بالکل پاک ہے، اور تمام وجوہ سے اللہ کے نزدیک مقبول ہے، حالانکہ عام طور سے بندہ کچھ نہ کچھ غلطیوں، خطاؤں اور بھول چوک میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اسی قدر قرب وقبول میں کمی ہوتی ہے، اس لئے یہ کذب، جھوٹ ہوا، اور کبھی اس سے دوسرے کو گھمنڈ بھی ہو جاتا ہے کہ اور اگر یہ عوارض نہ ہوں تو اللہ کی نعمتوں کے اظہار کے طور پر اجازت ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں اور وہ لوگ کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت ان مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنا دیا ہے اور خدا تعالیٰ جس کو ملعون بنا دے اس کا کوئی حامی نہ پاؤ گے۔

ربط: اوپر آیت ۴۶ سے یہود کے قبائح کا بیان چلا آ رہا ہے۔ اس آیت میں بھی ان کے بعض قبائح کا ذکر ہے کہ انھوں نے مشرکوں کے دین کے طریقہ کو مؤمنوں کے دین کے طریقہ سے احسن، زیادہ اچھا بتایا تھا، جیسا کہ لباب میں مسند احمد اور ابن ابی حاتم اور ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یہودی علماء مکہ میں آئے تو قریش نے پوچھا کہ ہمارا دین اچھا ہے یا محمد کے پیروکاروں کا؟ اور سوال میں حاجیوں اور خانہ کعبہ سے متعلق اپنی خدمات کا بھی ذکر کر دیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ تمہارا دین ان کے دین سے اچھا ہے اور تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔

مؤمنوں پر مشرکوں کو ترجیح دینے کی وجہ سے یہود کی مذمت:

(اے مخاطب!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں (اللہ کی) کتاب (یعنی توریت کے علم) کا ایک حصہ ملا ہے (پھر اس کے باوجود) وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں (کیونکہ مشرکوں کا دین بت پرستی اور شیطان کی پیروی تھا جب انھوں نے ایسے دین کو اچھا بتایا تو بت اور شیطان کی تصدیق صاف لازم آئی) اور وہ لوگ (یعنی اہل کتاب) کفار (یعنی مشرکوں) کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ان مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ راہ راست پر ہیں (چنانچہ یہ تو انھوں نے واضح طور پر ہی کہا تھا) یہ لوگ (جنھوں نے کفر کے طریقہ کو اسلامی طریقہ سے افضل بتایا) وہ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ملعون بنا دیا ہے (اسی ملعون ہونے کا اثر ہے کہ ایسے بے باک ہو کر کفر کی باتیں بک رہے ہیں) اور اللہ تعالیٰ جس کو ملعون بنا دے اس کا (عذاب کے وقت) کوئی حامی نہ پاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ اس پر انہیں آخرت میں یا ممکن ہے کہ دنیا میں بھی سزا ہوگی، چنانچہ دنیا میں بعض قتل، بعض قید، بعض جلا وطن اور بعض ذلیل رعایا ہوئے اور آخرت میں جو ہونے والا ہے وہ تو ہوگا ہی)

تفسیر: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں کے دین کو مطلق حق کہنا مقصود نہ تھا، ورنہ خود جواب کے وقت ہی سائل کو اس جواب کی صحت پر یہ شک ہو جاتا ہے کہ جب یہ اس دین کو حق بتاتے ہیں تو خود کیوں نہیں قبول کر لیتے، اس لئے اس صورت میں تو یہ جواب نہیں چل سکتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ مطلق حق تو کوئی بھی طریقہ نہیں مگر اس سے یہ اچھا ہے، لیکن اس میں بھی دو وجہ سے کفر لازم آتا ہے، ایک تو یہ کہ اسلام کو جو صحیح طریقۂ زندگی اور دین حق ہے اس کو ایک حد تک باطل سمجھا اور دوسرے یہ کہ کفر کو جو باطل طریقہ ہے اس کو ایک حد تک حق سمجھا اگرچہ کلام کے سیاق سے اور ذوق کی شہادت سے یہاں مذمت کا زیادہ مدار دوسری وجہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کہ حاجیوں اور بیت اللہ کی خدمات کے اعتبار سے قریش کے طریقہ کو اچھا کہا ہو، جس کا حاصل ان امور کو اچھا کہنا ہے تو ان کے اچھا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اگر اس تاویل کو مان بھی لیا جائے تب بھی بعض اجزا کے اچھا اور بہتر ہونے سے پورے مجموعہ کا جس میں بعض اجزاء شرک اور کفر کے بھی ہوں خیر اور اچھا ہونا لازم نہیں آتا۔ اور سائل کا مقصود پورے مجموعہ کے بارے میں سوال کرنا تھا، اور پورے سوال کے مطابق جواب کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کفر کے کلمات میں ایسی تاویل کفر کو دور کرنے والی نہیں ہو سکتی، مثلاً کوئی شخص اللہ کو مانتا ہو اور وہ کسی سے سوال کرے کہ خدا ایک ہے یا دو؟ اور جواب دینے والا کہے کہ دو ہیں اور نیت یہ کرے کہ ایک حق ہے اور ایک باطل تو کیا یہ جواب کفر کی بنیاد نہ ہوگا؟

﴿ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: ہاں کیا ان کے پاس کوئی حصہ ہے سلطنت کا؟ سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے، یا دوسرے آدمیوں سے ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں، سو ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے۔

ربط: اب بھی یہود کے بعض قبائح کا ذکر ہے جیسا کہ لباب میں ابن ابی حاتم کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ پر یہ بے ہودہ اعتراض کیا کہ آپ خود کو تو متواضع فرماتے ہیں حالانکہ آپ کے نکاح میں نو بیویاں ہیں، یہ تو اچھی خاصی سلطنت ہے، اس اعتراض کا بے ہودہ ہونا تو ظاہر ہے، کیونکہ اول تو نو بیویوں کا ہونا جو آپ کے لئے اللہ کے حکم سے حلال تھیں سلطنت کے لئے لازم نہیں، اور اگر اس لازم ہونے کو مان بھی لیا جائے تو سلطنت تواضع کے منافی نہیں، کیونکہ اگر حکومت کے باوجود کوئی متکبر نہ ہو تو کیا محال ہے؟ اور بے ہودگی کے ساتھ اس

اعتراض کا اصل منشا حسد تھا، اس لئے آیت میں اس کی بے ہودگی سے تعرض نہیں فرمایا بلکہ ان کا حاسد ہونا اور اس حسد کا دو عقلی وجہوں سے قبیح اور نامعقول ہونا بیان فرمایا ہے اور حسد کا شرعی طور پر قبیح ہونا تو معلوم ہی ہے۔

یہود کے حسد کی برائی

ہاں تو کیا ان کے پاس سلطنت کا کوئی حصہ ہے؟ تو ایسی حالت میں تو دوسرے لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے، یا دوسرے آدمیوں سے (جیسے رسول اللہ ﷺ سے) ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں۔ تو (آپ کو ایسی چیز کا مل جانا کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ) ہم نے (پہلے سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان (والوں) کو (آسمانی) کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے اور ہم نے انہیں بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (چنانچہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء گذرے ہیں، بعض انبیاء سلطان بھی ہوئے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام وحضرت داؤد علیہ السلام وحضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی کثیر بیویوں کا ہونا معلوم اور مشہور ہے اور یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں تو جب رسول اللہ ﷺ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں تو اگر آپ کو یہ نعمتیں اور عطیات مل گئے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

فائدہ: حسد کے نامعقول ہونے کی ایک وجہ تو حسد کے ذکر سے پہلے ہے اور دوسری حسد کے بعد ہے، اور انہیں الگ الگ شق کر کے تردید کے طور پر فرمایا، دونوں وجہوں کا حاصل یہ ہے کہ آخر حسد کس بات پر ہے؟ اگر اس بات پر ہے کہ تم صاحب سلطنت ہو اور اب تمہاری سلطنت ان کو ملنے لگی تو اس کی حقیقت تو صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حد کے اندر ہی رکھا کہ تمہیں سلطنت ملی ہی نہیں، ورنہ تم تو کبھی کسی کو کچھ بھی نہ دیتے، اور اگر حسد اس پر ہے کہ اگرچہ ہمارے پاس سے ان کے پاس نہیں گئی، مگر پھر بھی انہیں کیوں ملی؟ ان کا سلطنت سے کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ دیا کہ اس سلطنت کا یہ تعلق ہے کہ یہ بھی اسی شاہی خاندان سے ہیں، یہ کوئی غیر اور اجنبی نہیں ہیں، اور یہ سلطنت کسی نئی جگہ نہیں آئی ہے۔

﴿ فَمِنْهُم مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴾

ترجمہ: سو ان میں سے بعضے تو اس پر ایمان لے آئے اور بعضے ایسے تھے کہ اس سے روگرداں ہی رہے۔ اور دوزخ کی آتش سوزاں کافی ہے۔

ربط: اوپر یہود کے حسد کا ذکر تھا، چونکہ یہ فطری امر ہے کہ جس سے حسد کیا جاتا ہے، اسے رنج بھی ہوتا ہے، اس لئے اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی تسلی:

تو (ان انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی جو کہ ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے گذر چکے ہیں، جو لوگ موجود تھے)

ان میں سے بعض تو اس (کتاب اور حکمت) پر ایمان لائے اور بعض ایسے تھے کہ اس سے منہ موڑے ہی رہے (لہٰذا اگر آپ کی رسالت اور قرآن پر بھی آپ کے زمانہ کے بعض لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں، یہ کوئی رنج کی بات نہیں) اور (اگر ان کفار اور اعراض کرنے والوں کو دنیا میں سزا کم بھی ہو یا بالکل نہ ہو تو کیا ہوا، ان کے لئے آخرت میں) دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ (سزا کے لئے) کافی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝﴾

ترجمہ: بلاشک جو لوگ ہماری آیات کے منکر ہوئے ہم ان کو عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے، جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ عذاب ہی بھگتتے رہیں۔ بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہونگی، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے واسطے ان میں پاک صاف بیبیاں ہونگی، اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ میں داخل کریں گے۔

ربط: آیت بالا میں خاص مؤمنوں اور غیر مؤمنوں کا ذکر تھا، اب مطلق مؤمن اور غیر مؤمن کی جزا و سزا قاعدہ کلیہ کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں۔

کافر کی سزا اور مؤمن کی جزاء:

بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں (اور احکام) کے منکر ہوئے، ہم ان کو عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے (اور وہاں ان کی برابر یہ حالت رہے گی کہ) جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری (تازہ) کھال پیدا کر دیں گے تا کہ (ہمیشہ) عذاب ہی بھگتتے رہیں (کیونکہ پہلی کھال کے جلنے کے بعد خیال ہو سکتا تھا کہ شاید اس میں حس و ادراک نہ رہے، اس لئے شبہ دور کرنے کی غرض سے فرمادیا) یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (کہ وہ ایسی سزا دے سکتے ہیں اور) حکمت والے ہیں (اس لئے اس قدرت کے باوجود کہ جلی ہوئی کھال کے ذریعہ بھی تکلیف پہونچا سکتے ہیں پھر بھی اپنی کسی حکمت سے اس کو بدل دیا، جیسا کہ ایک حکمت کا بیان بھی ہوا ہے) اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات) کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ان کے واسطے ان (باغوں) میں پاک صاف بیویاں ہوں گی، اور ہم ان کو نہایت گنجان

سایہ (کی جگہ) میں داخل کریں گے۔

فائدہ: یعنی دنیا کے درختوں جیسا سایہ نہ ہوگا کہ خود سایہ کے اندر بھی دھوپ چھنتی ہے، وہ بالکل متصل ہوگا، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ وہاں آفتاب وغیرہ تو ہوگا نہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے ﴿ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا ﴾ یعنی وہ اس میں سورج کو نہیں دیکھیں گے، پھر سایہ کے کیا معنی؟ کیونکہ سایہ کے لئے مطلق کسی نورانی روشن جسم کا ہونا کافی ہے، اور وہاں اس کی موجودگی کوئی عجیب بات نہیں۔

رہا یہ شبہ کہ جب گرمی نہیں تو سایہ کا کیا فائدہ؟ یہ بہت ہی ضعیف شبہ ہے، اس لئے کہ فائدہ کا اس میں منحصر کر لینا خود بغیر دلیل کے ہے، ممکن ہے کسی تیز نور کو لطیف بنانا مقصود ہو، جیسے چاند پر باریک اور ہلکا سا بادل آجاتا ہے، یا خود اس سایہ کی حقیقت ہی نور ہو، جیسا کہ رات میں چراغ کی روشنی یا یوں کہا جائے کہ بغیر تاریکی کے محض سایہ ہی ہو، جیسا کہ طلوع آفتاب سے ذرا سی دیر پہلے کی حالت ہوتی ہے، چنانچہ ایک آیت میں اس کو مشہور تفسیر کے مطابق ظل یعنی سایہ سے تعبیر فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ یعنی کیا تم نے اپنے رب کی طرف دیکھا نہیں کہ سایہ کو کس طرح پھیلایا۔ اور سایہ کی معرفت دھوپ پر موقوف ہونے سے خود سایہ کا دھوپ پر موقوف ہونا لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ ﴾ ع ۵

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دیا کرو اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں، وہ بات بہت اچھی ہے۔ بلاشک اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب دیکھتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف حوالہ کر دیا کرو اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

ربط: یہود کی قبیح حرکتوں اور عقیدوں اور اعمال کا پہلے سے بیان چلا آرہا ہے جو کہ تقویٰ کا موقع و محل ہے، ان احکام میں سے پہلی قسم یعنی آپسی معاملات میں ایک حکم یہ ہے کہ حکام اپنے محکوموں کے ساتھ عدل و امانت کا معاملہ کریں اور محکوم لوگ اپنے حاکموں کے ساتھ شرعی امور میں اطاعت و فرماں برداری سے پیش آئیں اور پھر دونوں گروہوں کو اللہ اور رسول کے حکم کو اصل سمجھنے کا حکم دیا۔ اب انہی مضامین کا ذکر ہے اور اس سے متصل آگے اس امر پر منافقوں کی مذمت فرمائی کہ وہ

اللہ اور رسول کے احکام کو دل سے پسند نہیں کرتے، اور پھر یہی مضمون تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس ربط کے علاوہ یہود کے قبائح سے بھی خاص ربط اس طرح ہے کہ یہود کے عوام وخواص یعنی دینی ودنیوی رؤسا کا دین میں خیانت کرنے والا اور ہوا پرست ہونا دیگر قبائح کے ضمن میں معلوم ہو چکا ہے، اور ان میں سے منافقوں کی یہی حالت آگے آتی ہے۔ درمیان میں مؤمنوں کو اس سے روک کر عدل واطاعت کا حکم فرماتے ہیں۔

اٹھارہواں حکم: مسلم حاکم ومحکوم کے حقوق کی ادائیگی کا بیان:

(اے اہل حکومت! تمہاری حکومت تھوڑے لوگوں پر ہو یا زیادہ پر) بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہونچادیا کرو اور (تمہیں) یہ (بھی حکم دیتے ہیں) کہ جب (محکوم) لوگوں کا (ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں) تصفیہ کیا کرو تو عدل (وانصاف) کے ساتھ تصفیہ کیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں جس بات کی نصیحت کرتے ہیں، وہ بہت اچھی ہے (دنیا کے اعتبار سے بھی کہ اس میں حکومت کی بقا ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی کہ قرب وثواب کا باعث ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ (تمہاری باتوں کو جو تم امانت اور تصفیہ کے بارے میں کہتے ہو) خوب سنتے ہیں اور (تمہارے افعال واعمال کو جو اس بارے میں تم کرتے ہو) خوب دیکھتے ہیں (تو اگر تم جان بوجھ کر کوئی کمی یا کوتاہی کروگے تو تمہیں سزادیں گے۔ یہ خطاب تو حکام کو ہوا، آگے محکوم لوگوں کے لئے ارشاد ہے کہ) اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول اللہ ﷺ کا کہنا مانو (اور یہ حکم تو تمہارے اور حکام سب کے لئے عام ہے) اور تم (مسلمانوں) میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی (کہنا مانو، اور یہ حکم تم محکوموں کے ساتھ خاص ہے) پھر (اگر ان احکام کا اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہونا، محکوم اور حاکم دونوں کے معتبر اتفاق سے ثابت ہو تو خیر اس میں تو حکام کی اطاعت کروگے ہی اور) اگر (ان کے احکام میں سے) کسی امر میں تم آپس میں اختلاف کرنے لگو (کہ یہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف ہے یا نہیں) تو (رسول اللہ ﷺ کی حیات میں تو آپ سے پوچھ کر اور آپ کی وفات کے بعد ائمہ مجتہدین اور علماءِ دین سے رجوع کر کے) اس امر کو اللہ کی (کتاب) اور رسول (ﷺ کی سنت) کی طرف حوالہ کر لیا کرو (اور ان حضرات سے جیسا فتویٰ ملے حاکم اور محکوم سب اس پر عمل کیا کرو) اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ اس ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈریں، جو مخالفت کرنے والوں پر ہونے والی ہے) یہ امور (جو بیان کئے گئے یعنی اطاعت اللہ کی، رسول کی اور اولوالامر کی، تنازعوں کو کتاب وسنت کی طرف حوالہ کرنا) سب (دنیا میں بھی) بہتر ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کا انجام بہت اچھا ہے (کیونکہ دنیا میں امن وراحت اور آخرت میں نجات وسعادت ہے)

تفسیر: اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں جو روایت مشہور ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ کے

کلید بردار عثمان بن ابی طلحہ سے کعبہ کی کلید یعنی چابی لی تھی، اس وقت حضرت عباسؓ نے درخواست کی کہ اب یہ مجھے دیدی جائے، تب یہ آیت نازل ہوئی (لباب عن ابن عباس بروایت ابن مردویہ) اس دعویٰ کے منافی نہیں کہ اس کے مخاطب حکام ہیں، کیونکہ اول تو الفاظ کے عموم میں وہ خاص سبب بھی داخل ہوسکتا ہے (روح المعانی نے یہ عموم ابن عباس، ابی، ابن مسعود، البراء بن عازب، ابی جعفر اور ابی عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کیا ہے) دوسرے آسان ترین امر یہ ہے کہ اس وقت حضور ﷺ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے مخاطب ہوسکتے ہیں، اور لفظ امانات میں تمام حقوق شامل ہیں جن میں حقوق اللہ بھی آگئے، اسی لئے ﴿ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ کا مفہوم اس میں ادا ہوگیا، لہٰذا یہ شبہ نہ رہا کہ محکوم لوگوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم فرمایا اور حاکموں کو نہیں فرمایا۔

البتہ امانت کا عنوان اختیار کرنے میں یہ لطیفہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ حاکم خود بالا دست ہوتے ہیں اور ان سے کوئی اپنے حقوق کا معاملہ نہیں کرتا، اس لئے اس میں کوتاہی ہوجانے کا احتمال تھا، اس لئے اس عنوان میں اس کی زیادہ تاکید ہوگئی۔

اور کعبہ کی کلید کو جو امانت فرمایا، اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص ایسے اوقاف کا اہل حل وعقد کی رضامندی سے منتظم ہو اور وہ اس کا اہل بھی ہو تو اس سے یہ اختیار نہ لیا جائے یعنی نیک وصالح متولی کو معزول نہ کیا جائے۔

اور اتفاق میں 'معتبر' کی قید اس لئے لگائی کہ مطلق اتفاق جواز یا اطاعت کے وجوب کی بنیاد نہیں جب تک کہ شرعی قواعد کے مطابق نہ ہو، البتہ اگر کسی شرعی امر پر ایک زمانہ کے تمام اہل حق متفق ہوجائیں تو وہ اجماع ہوجاتا ہے، پھر اس کی سند کے نہ ملنے سے بھی کوئی ضرر نہیں، اور اگر کوئی حدیث اس کے خلاف ہو تو یہ اجماع اس حدیث کے منسوخ ہونے کی علامت ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ اہل اجماع کے پاس کوئی شرعی ماخذ تھا، مگر وہ ہم تک نہیں پہنچا۔

اور ﴿ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کے فقرہ کی تفسیر میں جو استفتاء کا واسطہ ذکر کیا گیا ہے، اس کی دلیل ﴿ تَنَازَعْتُمْ ﴾ ہے، کیونکہ نص سے ثابت مشہور احکام میں محکوموں کا نزاع جبکہ وہ مؤمن بھی ہوں، جیسا کہ ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ اس پر دلالت کرتا ہے، حاکموں کے ساتھ جبکہ وہ بھی مؤمن ہوں جیسا کہ ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ اور ﴿ مِنْكُمْ ﴾ اس پر دلالت کرتے ہیں عام طور سے ممتنع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو احکام اختلاف کا محل بنے ہیں، منصوص اور مشہور نہیں ہیں کہ بغیر کسی واسطہ کے براہ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع کرسکیں، لامحالہ وہ خفی اور دقیق بہت باریک ہونگے، جن کا کتاب وسنت کا مدلول ہونا اختلاف ونزاع کا محل ہوگیا، اس لئے کسی واسطہ کی ضرورت ہوگی جب تک رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف فرما تھے تب تک تو آپ ہی کا واسطہ کافی تھا، لیکن آپ کی وفات کے بعد وہ واسطہ استفتا کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

پھر جب بعض احکام خفی اور دقیق بھی ہیں تو لازمی بات ہے کہ ان کے نصوص کے مصداق ہونے کے لئے فکر

واستدلال کی ضرورت ہوگی، یہی شریعت میں قیاس کہلاتا ہے، اور ممکن ہے کہ استدلال کے بعض طریقے اختلاف کرنے والے فریقوں کی سمجھ سے بالا ہوں کیونکہ ہر حاکم اور ہر محکوم کا استدلال پر قادر ہونا یا استدلال کا علم ہونا ضروری نہیں، چنانچہ یہ بات عام مشاہدہ میں آتی ہی رہتی ہے۔ پھر سوائے اس کے کہ اختلاف کرنے والے فریق ان علماء کے فتوی دینے کے بعد دلیل کے علم کا انتظار کئے بغیر عمل کر لیں: اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اور ایسے ہی عمل کو تقلید کہتے ہیں۔ البتہ اگر حاکم خود بھی معتبر شرائط کے مطابق قیاس کی قوت رکھتا ہو تو خود اس کا قیاس واجتہاد اس واسطہ کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس طرح یہ آیت شرعی قیاس یا تقلید کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس تقریر کے مطابق اس کو ثابت کر رہی ہے۔

اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر ﴿ أُولِي الْأَمْرِ ﴾ کی تفسیر خاص حاکموں سے ہی کی جائے جیسا کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے اور اس میں علماء کو داخل نہ کیا جائے تب بھی دوسرے جز یعنی ﴿ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴾ "اسے اللہ اور رسول کے حوالہ کردو" میں علماء کے اتباع کا واجب ہونا بلکہ حکام کی اطاعت سے بھی زیادہ لازم آ گیا، کیونکہ علماء کو خود حکام کے لئے بھی قابل اتباع قرار دیا۔ اس طرح یہ متبوع المتبوع یعنی عوام کے لئے جن کی اتباع لازم ہے، ان کے لئے بھی اتباع یا واجب الاتباع ہو گئے۔

اور چونکہ آیت کا حکم ہر زمانہ کے لئے عام تھا، اس لئے ﴿ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴾ کے ترجمہ میں رسول کے ساتھ لفظ سنت کا اظہار کر دیا، کیونکہ رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی ممکن ہے، البتہ اس رد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ استدلال ہمیشہ ہر زمانہ میں تازہ ہوا کرے، بلکہ جو استدلال ترتیب دیئے جا چکے ہیں ان پر عمل کرنا بھی قرآن وحدیث کی طرف رجوع میں داخل ہے، لہٰذا اس سے اہل اجتہاد کا ہر وقت میں موجود رہنا لازم نہیں آتا۔

اور اتفاق واختلاف میں جو یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف ہونا یا نہ ہونا، اور یہ آسان عنوان اختیار نہیں کیا گیا کہ اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق ہونا یا نہ ہونا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مطابقت سے شبہ ہوتا کہ اللہ اور رسول نے بھی اس کا حکم کیا ہو تو اس سے وجوب کے معنی ظاہر ہوتے ہیں، حالانکہ حاکموں کی اطاعت اسلام کے مباح امور میں بھی ضروری ہے، اس لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا، کیونکہ مباح پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ خلاف یعنی حرام نہیں، اور موافق یا مطابق سے وجوب کا وہم ہوتا ہے۔ وہ صادق نہیں آتا۔

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ۖ

بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا ۝

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی، اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں، اور شیطان ان کو بھٹکا کر بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور رسول کی طرف تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں، پھر کیسی جان کو بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو کچھ وہ پہلے کر چکے تھے۔ پھر آپ کے پاس آتے ہیں، خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا، سوائے اس کے کہ کوئی بھلائی نکل آوے، اور باہم موافقت ہو جاوے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، سو آپ ان سے تغافل کر جایا کیجئے اور ان کو نصیحت فرماتے رہئے، اور ان سے خاص ان کی ذات کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے۔

ربط: اوپر کی آیت میں اپنے تمام معاملات میں اللہ و رسول کے احکام کی طرف رجوع کرنے کا حکم تھا۔ اب غیر شریعت کی طرف رجوع کرنے کی مذمت ہے، اور اسی میں منافقوں کی قباحت بیان کی گئی ہے کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔

شریعت کے حکم کے علاوہ کی طرف رجوع کرنے کی مذمت:

ان آیتوں میں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے ایک منافق شخص جس کا نام بشر تھا، اس کا کسی یہودی سے جھگڑا ہوا، یہودی نے کہا چل محمد کے پاس چلیں، ان سے فیصلہ کرائیں گے، منافق نے کہا کہ کعب بن اشرف کے پاس چل، یہ یہودیوں کا ایک سردار تھا، معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں یہودی حق پر ہوگا، اس نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ کسی کی رعایت نہ فرمائیں گے، وہاں برحق فیصلہ ہوگا، اگرچہ میں آپ سے مذہبی اختلاف رکھتا ہوں، منافق چونکہ باطل پر تھا اس نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ کے یہاں تو میری بات چلے گی نہیں، اگرچہ میں بظاہر مسلمان ہوں، مگر کعب بن اشرف خود کوئی حق پرست نہیں، وہاں مجھے کامیابی مل سکتی ہے، پھر آخر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ ہی کے پاس آگئے، آپ نے دونوں کی باتیں سن کر یہودی کے حق میں فیصلہ دیا، جس پر منافق راضی نہ ہوا، اس نے یہودی سے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلو، غالباً اس نے سوچا ہوگا کہ حضرت عمرؓ کفار کے خلاف بہت سخت ہیں، وہ اس یہودی پر سختی فرمائیں گے، یہودی کو اطمینان تھا کہ اگرچہ وہ سخت ہیں مگر ان کی سختی حق پرستی کی وجہ سے ہے، جب میں حق پر ہوں تو مجھے ہی غالب رکھیں گے، اس لئے اس نے انکار نہیں کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس چلنے کے لئے راضی ہو گیا، وہاں پہونچے تو یہودی نے سارا قصہ

بیان کردیا کہ اس مقدمہ کا رسول اللہ ﷺ کے اجلاس سے فیصلہ ہو چکا ہے، مگر یہ شخص (یعنی منافق) اس پر راضی نہیں ہوا، حضرت عمرؓ نے اس منافق سے پوچھا کیا یہی بات ہے؟ اس نے اقرار کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اچھا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں، آپ گھر سے تلوار لے کر آئے اور منافق کا کام تمام کر دیا اور فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو، اس کے سلسلہ میں یہی فیصلہ ہے (روح المعانی بروایت الثعلبی وابن ابی حاتم عن ابن عباس)

اور عام طور سے مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس منافق کے وارثوں نے حضرت عمرؓ پر دعوی کیا اور اس منافق کے قولی وفعلی کفر کی تاویل کی، اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں اصل حقیقت ظاہر فرمادی، اور لباب میں ابن ابی حاتم وطبرانی وابن جریر کی روایتیں ابن عباس اور شعبی سے نقل کی ہیں جن میں کاہنوں کے پاس تین مقدمات لے جانے کا ذکر ہے۔ ان سب قصوں کا واقع ہونا ممکن ہے، اور سبھی قصوں میں ممکن ہے کہ مصیبت کے وقت ایسے ہی عذر کئے گئے ہوں۔ ﴿اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا﴾ یعنی ہمارا مقصد تو صرف بھلائی تھا۔

چنانچہ تعجب کے انداز میں فرماتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (زبان سے تو) دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (یعنی توریت، کیونکہ اس میں منافقوں کا بیان ہے اور اکثر منافق یہود میں سے تھے۔ مطلب یہ کہ زبانی دعوی کرتے ہیں کہ ہم جس طرح توریت کو مانتے ہیں اسی طرح قرآن کو بھی مانتے ہیں، یعنی اسلام کے مدعی ہیں، پھر اس پر حالت یہ ہے کہ) اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شریعت کی طرف مقدمہ لے جانے کی تعلیم شیطان دیتا ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمہ لے گئے) حالانکہ (اس میں دو امر مانع اور رکاوٹ موجود ہیں، ایک یہ کہ) انہیں (شریعت کی جانب سے) یہ حکم ہوا ہے کہ اس (شیطان) کو نہ مانیں (یعنی عقیدہ کے طور پر بھی اور عملی طور پر بھی اس کی مخالفت کریں) اور (دوسرا مانع یہ کہ) شیطان (ان کا ایسا دشمن اور بدخواہ ہے کہ) انہیں (راہ حق سے) بھٹکا کر بہت دور لے جانا چاہتا ہے (چنانچہ ان دونوں امروں کے باوجود جن کا تقاضا یہ ہے کہ شیطان کے کہنے پر عمل نہ کریں، اس کی بات نہ مانیں، پھر بھی اس کی موافقت کرتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی اور رسول کی طرف آؤ، (کہ آپؐ اس حکم کے مطابق فیصلہ فرمادیں) تو آپ (اس وقت) منافقوں کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ (کے پاس آنے) سے رخ پھیرتے ہیں، پھر ان کی اس حرکت کی بدولت جو کچھ وہ پہلے کر چکے تھے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کیسی جان کو بنتی ہے؟ (اس حرکت سے مراد شریعت کو چھوڑ کر دوسری جگہ مقدمہ لے جانا ہے، اور مصیبت سے مراد جیسے قتل یا خیانت ونفاق کا کھل جانا اور باز پرس ہونا ہے یعنی اس وقت سوچتے ہیں کہ اس حرکت کی کیا تاویل کریں جس سے بے عزتی ورسوائی سے بچیں اور سرخ رو ہوں) پھر (تاویل سوچ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے) آپ کے پاس آتے ہیں کہ (ہم جو دوسری جگہ چلے گئے تھے، اس سے) ہمارا اس کے سوا کوئی

مقصد نہیں تھا کہ (معاملہ کے دونوں فریقوں کی) کوئی بھلائی (کی صورت) نکل آئے اور (ان میں) آپس میں موافقت (اور مصالحت) ہو جائے (مطلب یہ کہ قانون تو شریعت ہی کا حق ہے، ہم شریعت کو ناحق سمجھ کر دوسری جگہ نہیں گئے تھے، لیکن بات یہ ہے کہ قانونی فیصلہ میں تو حاکم: صاحب حق کو رعایت کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا، اور آپسی فیصلہ میں اکثر رعایت کرادی جاتی ہے، ہمارے دوسری جگہ جانے کی یہ وجہ تھی اور قتل کے واقعہ میں یہ تاویل اس مقتول کے فعل کی ہوگی، جس سے مقصود اپنی برأت یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عمل کا دعوی بھی ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کی اس تاویل کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) ان کے دلوں میں جو کچھ (نفاق وکفر) ہے، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے (کہ اس کفر ونفاق اور شریعت کے حکم سے راضی نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں اور معین وقت پر وہ اس کی سزا بھی پالیں گے) لہٰذا (مصلحت یہی ہے کہ) آپ (اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی پکڑ پر اکتفا فرما کر) انہیں نظر انداز کر دیا کیجئے (یعنی آپ کچھ مواخذہ نہ فرمائے) اور (ویسے رسالت کے منصب کے تقاضہ کے مطابق) انہیں نصیحت فرماتے رہئے (کہ ان حرکتوں کو چھوڑو) اور ان سے خاص ان کی ذات (کی اصلاح) کے متعلق کافی بات کہہ دیجئے (تاکہ ان پر اللہ کی حجت قائم اور تمام ہو جائے، اگر پھر بھی نہ مانیں تو وہ جانیں)

فائدہ: اس نظر انداز کرنے کے مصلحت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کفر تو مشہور نہیں تھا، ایسی حالت میں اگر ان کے ساتھ کھلے کافروں کی طرح جہاد کا معاملہ ہوتا تو دور والوں کو ان کی خفیہ شرارتوں کی تو خبر پہونچتی نہیں، اور قتل وغارت بہر حال مشہور ہی ہوتا تو اسلام سے لوگوں کو ایک طرح کی وحشت ہوتی کہ اسلام میں نہایت جبر وزیادتی اور بدنظمی ہے، اس وحشت کے پھیلنے سے اسلام کی ترقی رک جاتی، چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اشاد: دعه فإن الناس يتحدثون أن محمداً يقتل أصحابه: یعنی اسے چھوڑ دو ورنہ لوگ یہ کہیں گے کہ حضور اپنے ہی لوگوں کو قتل کر رہے ہیں، اسی مصلحت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

البتہ چونکہ اس منافق کا قتل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ہو چکا تھا اور وہ قابل احترام نہیں تھا اس لئے وہ خون ہدر یعنی ضائع ہو گیا، اس پر کوئی قصاص یا دیت واجب نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس قتل پر ضمان کا ہونا کسی روایت میں منقول نہیں۔

اور اگر یہ خیال پیدا ہو کہ اس میں بھی اسلام کی بدنامی اور اس سے وحشت کا احتمال ہو سکتا ہے تو اس کا قطعی جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ کسی عام قاعدہ میں کسی خاص واقعہ کو مخصوص کر دیں، اور اس قاعدہ کے متعلق جو حکمت تھی اس سے زیادہ اس خاص واقعہ میں حکمت رکھ دیں، چنانچہ خاص اس مقام پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ منافق ظاہر میں مسلمان تھا اور اس کا معاملہ ایک کھلے کافر کے ساتھ تھا اور اس معاملہ میں اس منافق کو یہ سزا دی گئی اور اس کا خون ہدر یعنی ضائع قرار دیا گیا، تو وہ یہودی اپنے ہم مشرب لوگوں میں بیان کرے گا تو اہل عقل وانصاف اسلام کی اعلیٰ درجہ کی حق پرستی کی داد دے سکتے ہیں کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں بھی اپنی قوم کے لوگوں کو حق بات کو قبول کرنے پر اس طرح مجبور کرتے ہیں کہ نہ ماننے

پر ان کی جان کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ واللہ اعلم باسرارہ۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جاوے۔ اور اگر جس وقت اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا رحمت کرنے والا پاتے۔

ربط: اوپر منافقوں کے نامعقول عذر کا غلط ہونا بیان فرمایا ہے، اب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس باطل تاویل کے بجائے اگر اس کی شرائط کے ساتھ استغفار اور ندامت کا راستہ اختیار کرتے تو البتہ اس جرم کی تلافی ہوجاتی۔

استغفار نہ کرنے میں منافقوں کو غلط قرار دینا:

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اس واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ اللہ کے حکم سے (جو کہ رسولوں کی اطاعت کے سلسلہ میں فرمایا ہے) ان کی اطاعت کی جائے (چنانچہ اول تو ان لوگوں پر شروع ہی سے اطاعت کرنا واجب تھا) اور (بدقسمتی سے حماقت ہو ہی گئی تھی تو) جس وقت (گناہ کر کے) وہ اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اگر اس وقت (ندامت کے ساتھ) آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، پھر (حاضر ہو کر) اللہ تعالیٰ سے (اپنے اس گناہ کی) معافی مانگتے اور رسول (ﷺ یعنی آپ) بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا، رحمت کرنے والا پاتے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی توبہ قبول فرمالیتے)

تفسیر: مطلب یہ نہیں کہ منافق رہ کر توبہ کر لینا کافی تھا، کیونکہ خود توبہ کے شرائط میں سے اہم ترین امر ایمان ہے، مقصد یہ ہے کہ نفاق چھوڑ کر ایمان لے آتے چونکہ استغفار ایمان پر موقوف تھا، اس لئے اس کا ذکر اس کے لئے لازم ہوگیا کہ اس کی صراحت کے ساتھ ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اصلاً کلام یہ ہے: ثم جاء وک فآمنوا واستغفروا: اس طرح ایک شرط تو اس توبہ کی قبولیت کی یہ ہے اور دو شرطیں اور بھی آیت میں بیان کی گئی ہیں: ایک خدمت نبوی میں حاضری اور دوسرے آپ کا بھی استغفار فرمانا، حالانکہ بظاہر توبہ کرنے یا مسلمان ہونے کے لئے بندہ کا صرف عرض معروض کر لینا کافی ہے۔ اس لئے پہلی شرط کی چند وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ ایمان کا اظہار ضروری ہے اور جو شخص آپ سے جگہ کے لحاظ سے قریب ہو اس کے اظہار کا اس وقت عام طریقہ یہی تھا کہ حضور کی خدمت میں آ کر مسلمان ہوجائے، دوسرے توبہ معصیت کے مطابق ہوتی ہے، جو امر تدارک کے قابل ہو اس کے تدارک میں بھی اور اعلان کی ضرورت ہونے اور نہ ہونے میں بھی، چنانچہ نماز ترک کرنے سے قوم کے لئے ضروری ہے کہ نماز قضا کرے اور اعلانیہ گناہ گار کے لئے توبہ کا

اعلان ضروری ہے چونکہ یہ گناہ غیر حاضری کا تھا، اس لئے اس کا تدارک حاضری سے ہوگا اور جس طرح اس کی اطلاع سب کو ہوئی تھی اس توبہ کا بھی اظہار ضروری ہے، جس کا طریقہ اس وقت آپ کی خدمت میں حاضری تھی، تیسرے غیر حاضری سے آپ کے دل کو اذیت پہونچی تھی اور رسول کو ایذا پہونچانا کفر ہے۔ حاضری سے آپ کے قلب مبارک کی وہ اذیت دور ہوگی اور آپ کو خوشی ہوگی۔ اور دوسری شرط کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آپ کا استغفار یعنی مغفرت طلب کرنا آپ کے قلب مبارک کے انشراح وخوشی سے انجام پائے گا اور اس کی ضرورت اوپر بیان ہوچکی۔ دوسرے اس سے ان توبہ کرنے والوں کے دل کی گہرائی اور ایمانداری کے ساتھ توبہ کرنے کی توفیق بڑھ جائے گی اور توبہ کا دل کی گہرائی سے ہونا ضروری ہے، لہٰذا اصل مقصود شرطیں یہ امور ہیں: (۱) ایمان (۲) تدارک کے قابل امور کا تدارک مثلاً نو مسلم کو بھی بندوں کے حقوق کی ادائیگی (۳) اعلان کے موقع پر اعلان (۴) اخلاص (۵) ندامت اور جن امور پر آیت سے دلالت ہوتی ہے ، وہ اصل مقصود کے لئے راستے وطریقے تھے، اور اصل سوال کے جواب میں یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ ان امور کا مقصود توبہ کی شرطیں بتانا نہیں بلکہ مکمل توبہ کہنا مقصود ہے یعنی اس طریقہ سے توبہ کریں تو وہ بہت اچھی اور کامل ہو، پس یہ نفس توبہ کا طریقہ نہیں بلکہ کمال توبہ کا طریقہ ہے۔

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝۶۵ ﴾

ترجمہ: پھر قسم ہے آپ کے رب کی! یہ لوگ ایمان دار نہ ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کراویں، پھر آپ کے اسی تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔

ربط: اوپر شریعت کی طرف رجوع کرنے کو واجب اور غیر شریعت کی طرف رجوع کرنے کو حرام فرمایا تھا۔ اب فرماتے ہیں کہ شریعت کی طرف صرف ظاہری طور پر رجوع کرنا کافی نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی اس پر راضی ہونا ضروری ہے، اور اس کو پوری طرح قبول اور تسلیم کرنا ایمان کے لئے شرط ہے۔

شریعت کے حکم کو ظاہری اور باطنی لحاظ سے تسلیم کرنا ضروری ہے:

پھر قسم ہے آپ کے رب کی! یہ لوگ (جو صرف زبانی طور پر ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں، اصلاً اللہ کے نزدیک) اس وقت تک ایمان والے قرار نہ پائیں گے، جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں آپ سے (اور آپ نہ ہوں تو آپ کی شریعت سے) تصفیہ کرائیں، پھر (جب آپ تصفیہ کردیں تو) آپ کے اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں (انکار کی) تنگی نہ پائیں اور اس (فیصلہ کو) پورا پورا (ظاہر سے بھی اور باطن سے بھی) تسلیم کرلیں۔

فائدہ: اگر یہ شبہ ہو کہ آپ تو حاکم ہی تھے، پھر تحکیم یعنی کسی کے حَکَم بنانے کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے جو ترجمہ کیا ہے اس کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ شرعی اصطلاح میں حکم بنانا مراد نہیں، بلکہ حکم بنانا حسی عمل یعنی مقدمہ آپ کی خدمت میں لانا مراد ہے، اور یہ انہی کے فعل پر موقوف ہے۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کسی دوسرے قانون کو باطل سمجھتے ہوئے بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، وہ مسلمان نہیں، حالانکہ حرام کا ارتکاب کرنے والا جبکہ اس کے حلال ہونے کا عقیدہ نہ رکھتا ہو نہ باغیانہ اور سرکشی کی روش ہو اور نہ اس کا عادی ہو تو وہ مؤمن ہے، اگرچہ فاسق ہے، اسی طرح اگر کسی کے دل میں شرعی فیصلہ سے تنگی پیدا ہو مگر اس فیصلہ کو حق سمجھے تو وہ بھی مسلمان نہ ہونا چاہئے۔ حالانکہ تنگی پر انسان کا اختیار نہیں ہے اور غیر اختیاری امور کا کوئی مکلف نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اس فیصلہ پر عمل نہ کرے تو یہ بھی تسلیم نہ کرنا ہے، تو وہ بھی مسلمان نہ رہے، حالانکہ عمل کے ترک سے ایمان نہیں جاتا۔

ان شبہات کا جواب یہ ہے کہ تحکیم یعنی حکم بنانے اور تنگی نہ ہونے اور تسلیم کے تین درجے ہیں: (۱) اعتقاد سے (۲) زبان سے اور (۳) عمل سے۔ اعتقاد سے یہ کہ شریعت کے قانون کو حق اور تحکیم کے لئے بنایا ہوا مانتا ہو، اور اس میں عقل کے درجہ میں تنگی محسوس نہیں کرتا، اور اس مرتبہ میں اس کو تسلیم کرتا ہے اور زبان سے یہ کہ ان امور کا اقرار کرتا ہے کہ حق اسی طرح ہے اور عمل سے یہ مقدمہ لے بھی جاتا ہے اور طبیعت میں تنگی بھی نہیں اور اس فیصلہ کے مطابق کارروائی بھی کرلی، تو پہلا مرتبہ تصدیق اور ایمان کا ہے، اس کا نہ ہونا اللہ کے نزدیک کفر ہے اور منافقوں میں خود اسی کی کمی تھی، چنانچہ تنگی کے ساتھ لفظ انکار اسی کی توضیح کے لئے ظاہر کر دیا ہے۔ اور دوسرا مرتبہ اقرار کا ہے، اس کا نہ ہونا انسانوں کے نزدیک کفر ہے یعنی ظاہر ہے جب تک ایمان کا اعلان نہ کیا جائے لوگوں کو اس کے ایمان کا علم نہ ہوگا تو دنیاوی احکام و معاملات کے سلسلہ میں اس کو مؤمن نہ مانیں گے۔ تیسرا مرتبہ تقویٰ اور صلاح کا ہے، اس کا نہ ہونا فسق ہے اور فطری و طبعی تنگی معاف ہے، اس طرح آیت میں منافقوں کے ذکر کے قرینہ سے پہلا مرتبہ مراد ہے۔ اب کوئی اشکال نہیں۔

﴿ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾ ﴾

ترجمہ: اور ہم اگر ان لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجا لاتا، اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا، اور اس حالت میں ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت

فرماتے۔اورہم ان کوسیدھاراستہ بتلادیتے۔

ربط:اوپر کامل اطاعت کا واجب ہونا بیان فرمایا۔اب اس کا بھلائی اور نفع بخش ہونا اوراس درجہ کی اطاعت کرنے والوں کا تعداد میں کم ہونا بیان فرماتے ہیں۔

کامل اطاعت کی فضیلت اور کامل اطاعت کرنے والوں کا کم ہونا:

اور اگر ہم لوگوں پر یہ بات (مقصود احکام کے طور پر) فرض کردیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہوجایا کروتو گنتی کے چندلوگوں کے سوا(جو کامل مؤمن ہوتے) اس حکم پر کوئی بھی عمل نہ کرتا (اس سے ثابت ہوا کہ کامل اطاعت کرنے والے کم ہوتے ہیں) اور جو کچھ ان کو (دل وجان سے رسول کی اطاعت کرنے کی) نصیحت کی جاتی ہے، اگر یہ (منافق) اس پرعمل کیا کرتے تو دنیا میں تو ثواب کے استحقاق کی وجہ سے) بہتر ہوتا اور (دین کی تکمیل کے اعتبار سے ان کے) ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا (کیونکہ عملاً یہی ہوتا ہے کہ دین کا کام کرنے سے خود اعتقاد ویقین کی باطنی کیفیت کو ترقی ہوتی ہے) اوراس حالت میں (جب کہ عمل سے دین کو خیر وبہتر تسلیم کرنے اوراس پر ثابت قدم ہونے کی کیفیت حاصل ہوجاتی تو آخرت میں) ہم انہیں خاص اپنے پاس سے اجرعظیم عنایت فرماتے اور ہم انہیں (جنت کا) سیدھاراستہ بتادیتے (کہ بغیر کسی روک ٹوک کے جنت میں جاکرداخل ہوجائیں جو کہ اجرعظیم ملنے کا مقام ہے)

تفسیر:اس ''گنتی کے چند'' میں تمام صحابہ اور کامل مؤمن داخل ہیں، جو کہ کفار وفجار کے مقابلہ میں تعداد میں کم ہیں، اور یہ مطلب نہیں کہ اس صورت میں مؤمنوں میں ایسے لوگ دوچار ہی ہوتے ،اس لئے کہ ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کی ضمیر کا مرجع مطلق لفظ ناس یعنی لوگوں کو قرار دیا ہے، نہ تو صحابہ کو کہ ایسا کرنا بغیر دلیل کے ہوتا اور نہ ہی منافقوں کو کہ دلیل کے خلاف ہوتا، کیونکہ ان میں تو ایسا ایک بھی نہ تھا جو کم سے کم ہے،اور جب اس میں صحابہ اور مؤمن سب داخل ہیں تو اب بنی اسرائیل کا اس امت سے افضل ہونا لازم نہیں آیا کہ سیرت کی کتابوں میں ان میں سے ستر ہزار کا مقبول ہونا منقول ہے۔

اور یہ جو قید لگائی کہ ''مقصود احکام کے طور پر'' اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد اور ہجرت جن میں قتل اور خروج یعنی وطن سے نکلنا ہے شریعت میں اب بھی ان کا حکم ہے، لیکن اس حکم کا مقصود اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور اللہ کے دشمنوں سے اسلام کی حفاظت ہے، حتی کہ اگر اللہ کے کلمہ کو بلند رکھنا اور اسلام کی حفاظت کا مقصد حاصل ہوجائے تو پھر ہجرت اور جہاد ختم ہوجاتا ہے۔

اور قتل نفس کا یہ مضمون مخلص مؤمنوں کی تعداد کم ہونے کے افادہ کے لئے جملہ معترضہ کے طور پر ہے، جس سے ایک طرح رسول اللہ ﷺ کی تسلی بھی ہوگئی کہ منافقوں کی حالت پر غم زدہ نہ ہوں اور اس مضمون کے سیاق وسباق میں یعنی آگے پیچھے منافقوں کا تذکرہ ہے۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝﴾ ع ۹

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء، اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں۔

ربط: اوپر اللہ اور رسول کی اطاعت پر خاص مخاطب لوگوں سے وعدہ تھا، اب قاعدہ کلیہ کے طور پر اللہ اور رسول کی اطاعت پر عام وعدہ ہے اور وعدہ کے خصوص وعموم سے قطع نظر جو اجر عظیم کا ذکر ہوا ہے، اب گویا اس کی تفسیر بھی ہوگئی ہے، یہ بھی مناسبت کی وجہ ہے۔

احکام کی اطاعت پر فضل عظیم کا وعدہ:

اور جو شخص (ضروری احکام میں بھی) اللہ ورسول کا کہنا مان لے گا (اگرچہ طاعتوں کی کثرت کے ذریعہ کمال حاصل نہ کرسکے) تو ایسے لوگ بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (دین اور قرب اور قبول کا کامل) انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء (علیہم السلام) اور صدیقین (جو انبیاء کی امت میں سب سے اعلیٰ درجہ والے ہوتے ہیں جن میں باطنی کمال بھی ہوتا ہے جنہیں عرف عام میں اولیاء کہا جاتا ہے) اور شہدا (جنھوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی) اور صلحاء (جو شریعت کی پوری اتباع کرنے والے ہوتے ہیں، واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی جنہیں نیک بخت ودین دار کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جس کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور اطاعت کرنے والے کے ساتھ معیت اور رفاقت ثابت ہے، چنانچہ حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کو ایسے رفیق ملے ان حضرات کے ساتھ) یہ (معیت اور رفاقت محض) اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل ہے (یعنی یہ عمل کا اجر نہیں ہے، کیونکہ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس عمل کا جو درجہ تھا، وہاں سے آگے نہ جاسکتا، لہٰذا یہ انعام کے طور پر ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک کے عمل کو اور اس کے تقاضے اور اس تقاضے سے زاید مناسب انعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس انعام میں بھی فرق ہوگا، کسی کو ان حضرات سے بار بار قرب ہوگا، کسی کو کبھی کبھی۔ واللہ اعلم)

تفسیر: ساتھ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ جنت میں ساتھ جائیں گے، کیونکہ یہ مطلب موقع ومحل کے قرینہ کے خلاف ہے جو کہ مدح وفضل کا مقام ہے، اور یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ لوگ خاص ان حضرات کے درجہ میں چلے جائیں گے، کیونکہ مختلف آیات میں جو اس طرح کے فقرے آئے ہیں ﴿ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ ان سے درجات کا فرق ثابت ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے نچلے درجوں سے ان کے اعلیٰ درجوں میں پہونچ کر ان کی زیارت اور ان کے

درجات کی برکات سے مشرف ہوا کریں گے۔

اور جاننا چاہئے کہ ضروری احکام کے مدارج بھی مختلف ہیں، پہلا درجہ وہ ہے جس سے آدمی مؤمن ہو جاتا ہے اور اس سے اعلیٰ وہ ہے جس سے عاصی یا گنہ گار کے لقب سے بچ جاتا ہے۔ اس طرح جس درجہ کے ضروری احکام میں اطاعت ہوگی اس درجہ کی معیت ہوگی۔ اور اس سے اعلیٰ یہ ہے کہ ظاہری و باطنی فرمان برداریوں کو بھی بجالائے، یہاں ﴿ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ﴾ میں یہ درجہ اس لئے مراد نہیں کہ اس سے تو صدیقیت اور شہادت اور صلاح کی صفت کے ساتھ موصوف ہوتا ہے جن کے ساتھ معیت کا ذکر ہے، ورنہ معیت کی نسبت رکھنے والے سب متحد ہو جائیں گے، حالانکہ ان کا الگ الگ اور متعدد ہونا ضروری ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی تو احتیاط رکھو پھر متفرق طور پر یا مجتمع طور پر نکلو، اور تمہارے مجمع میں بعضا بعضا شخص ایسا ہے جو ہٹتا ہے پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا تو کہتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہیں ہوا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل ہو جاتا ہے تو ایسے طور پر کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں، کہتا ہے ہائے! کیا خوب ہوتا کہ میں بھی ان لوگوں کا شریک حال ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی، تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں، اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ جان سے مارا جاوے یا غالب آجاوے ہم اس کو اجر عظیم دیں گے۔

ربط: کافی دور سے مخالفوں کے ساتھ معاملات میں جو کہ تقوی کا ایک محل ہے کفار کے قبیح امور کا ذکر چلا آرہا ہے اور مقابلہ کے لئے بیچ بیچ میں اہل فضیلت کا بھی ذکر آگیا تھا، مخالفین کے ساتھ ان معاملات میں سے جہاد کے احکام بھی ہیں، اب ان کا ذکر شروع ہوتا ہے، یہاں سے کافی دور تک اس مضمون کے متعلقات چلے گئے ہیں۔

انیسواں حکم: جہاد کا واجب ہونا اور اس کی فضیلت اور اس کو ترک کر کے بیٹھ رہنے کی مذمت:

اے ایمان والو! (کافروں کے مقابلہ میں) اپنی تو احتیاط رکھو (یعنی ان کے داؤ پیچ سے بھی ہوشیار رہو اور جنگ کے وقت مطلوب سامان، ہتھیار، ڈھال، تلوار سے بھی تیار رہو) پھر (ان سے جنگ کے لئے) متفرق طور پر یا اکٹھے ہو کر

(جیسا موقع ہو) نکلو اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعض منافق بھی شامل ہو رہے ہیں) کوئی کوئی شخص ایسا ہے (اس سے منافق مراد ہے) جو (جہاد سے) پیچھے رہتا ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تمہیں کوئی حادثہ پہونچ جائے (جیسے شکست وغیرہ) تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہو کر) کہتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں شامل) نہیں رہا (ورنہ مجھ پر بھی مصیبت آتی) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح وغنیمت) تو اس طرح (خودغرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق نہیں (مال کے فوت ہو جانے پر افسوس کرتے ہوئے) کہتا ہے کہ ہائے کیا اچھا ہوتا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھے بھی بڑی کامیابی ملتی (کہ مال و دولت لاتا اور اس کہنے سے خودغرضی اور لاتعلقی ظاہر ہے، ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے، اس کی کامیابی پر بھی خوش ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنا فائدہ نہ ہونے پر افسوس کرنے بیٹھ جائیں اور اس کی خوشی پر خوشی ظاہر نہ کریں، اللہ تعالیٰ اس شخص کے حق میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی یوں مفت میں گھر بیٹھے نہیں ملتی، اگر اس کا طالب ہے) تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی نیت سے جو ایمان واخلاص پر موقوف ہے یعنی مسلمان اور مخلص بن کر) ان (کافر) لوگوں سے لڑے جو آخرت (کو چھوڑ کر اس) کے بدلے میں دنیاوی زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی اگر اس شخص کو بڑی کامیابی کا شوق ہے تو دل کو درست کرے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، برداشت کرے، تیر، تلوار کے سامنے سینہ سپر بنے، پھر دیکھو فوز عظیم ہاتھ آتی ہے یا نہیں اور یوں کیا کوئی کھیل اور دل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی مصیبت جھیلے تو سچی کامیابی اسی کی ہے کیونکہ دنیا کی کامیابی اول تو حقیر ہے، پھر کبھی ہے، کبھی نہیں، کہ اگر غالب آئے تو دنیا کی کامیابی ہے ورنہ نہیں) اور (آخرت کی کامیابی جس کا وعدہ ایسے شخص کے لئے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ عظیم بھی ہے اور پھر ہر حالت میں ہے، کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ (مغلوب ہو جائے حتیٰ کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آجائے ہم ہر حالت میں اس کو (آخرت کا) اجر عظیم دیں گے (جو کہ فوز عظیم کہنے کے لائق ہے، جس کو وعدہ کی تاکید اور نتیجہ کے یقینی طور پر برآمد ہونے کے لئے اجر فرمادیا گیا اور دنیا کی کامیابی میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ اس کا وعدہ نہیں کیا گیا اور آخرت کی کامیابی میں اس کا وعدہ ہونا اجرت کے مشابہ ہے)

فائدہ: یہاں دو حکم فرمائے ہیں: بچاؤ کا سامان کرنا اور جہاد، اور اس موقع ومحل کا اصلی مقصود دوسرا حکم ہے جو کنایہ کے طور پر انفرادیت پر دلالت کرتا ہے، مگر پہلے حکم کو مقدم کر کے اور تصریح کے ساتھ فرمانا اللہ کی رحمت اور شفقت کی دلیل ہے کہ حفاظت کا زیادہ اہتمام فرمایا۔

﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۚ

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

ترجمہ: اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں، اور کچھ بچے ہیں۔ دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے۔ جو لوگ پکے ایمان دار ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ تو تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو واقع میں شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔

ربط: آگے پھر تکرار سے جہاد کی تاکید ہے، اور یہ تاکید اس کے ایک داعی کے بیان سے ہے اور وہ داعی کمزور مسلمانوں کا ستم رسیدہ ہونا ہے اور اشارہ سے نصرت کا وعدہ ہے، یہ سب امور جہاد کا تقاضا کر رہے ہیں، پس یہ پہلے والے مضمون کا تتمہ ہے۔

گذشتہ مضمون کا تتمہ اور تاکید:

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر جہاد نہ کرو (باوجودیکہ اس کا قوی داعیہ موجود ہے کیونکہ یہ جہاد اللہ کی راہ میں ہوتا ہے، یعنی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ہے جس کا اہتمام ضروری ہے، اور دین کی اس بلندی کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ ایمان والے کمزور لوگوں کی خاطر بھی لڑنا ضروری ہے تاکہ کفار کے ظلم وستم کے پنجہ سے رہائی پائیں) جن (بیچاروں) میں کچھ مرد اور کچھ عورتیں اور کچھ بچے ہیں جو (کفار سے تنگ و پریشان ہو ہو کر) دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں (کسی طرح) اس بستی سے (یعنی مکہ سے جو ہمارے لئے قید خانہ کی طرح ہے) باہر نکال، جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں (کہ انھوں نے ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے) اور ہمارے لئے کسی دوست کو کھڑا کیجئے، اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے (کہ ہمارے ساتھ حمایت اور دوستی کر کے ہمیں ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑا دے) جو لوگ پختہ ایمان والے ہیں وہ تو (ان احکام کو سن کر) اللہ کی راہ میں (یعنی اسلام کے غلبہ کے مقصد سے) جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں، وہ شیطان کی راہ میں (یعنی کفر کے غلبہ کے قصد سے) لڑتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں اللہ کی طرف سے نصرت ایمان والوں کو ہوگی جب ایمان والے منصور من اللہ ہیں یعنی ان سے اللہ کی مدد و نصرت کا وعدہ ہے) تو (اے ایمان والو!) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جن سے اللہ کی نصرت کا وعدہ نہیں) جہاد کرو (اور اگرچہ وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں، لیکن) واقع میں وہ شیطانی تدبیریں ہیں) کہ شیطان ان کفر والی تدبیروں کا حکم کرتا ہے اور) یقیناً شیطانی

تدبیر (خود) بہت کمزور ہوتی ہے کیونکہ اس میں غیبی امداد نہیں ہوتی، اور کبھی غلبہ ہو جانا یہ خلاف قیاس ہے تو غیبی امداد ونصرت جو مؤمنوں کے ساتھ ہے، وہ تدبیر اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔ غرض یہ کہ جہاد کا داعیہ بھی ہے اور نصرت کا وعدہ بھی ہے، پھر کیا عذر ہے؟ اس لئے مکرر تاکید کی گئی)

تفسیر: جس زمانہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں، مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو اپنی جسمانی کمزوری اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے، پھر کافروں نے بھی نہ جانے دیا اور طرح طرح سے انہیں ستاتے تھے۔ چنانچہ احادیث اور تفاسیر میں بعض کے نام بھی آئے ہیں، جیسے حضرت ابن عباسؓ اور ان کی والدہ اور سلمہ بن ہشام اور ولید بن الولید، اور ابو جندل بن سہیل۔ آخر حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور بعض کی رہائی کا تو پہلے ہی سامان ہو گیا اور پھر مکہ معظمہ فتح ہو گیا، جس سے سب کو امن اور اعزاز حاصل ہو گیا اور حضور ﷺ نے ان پر حضرت عتاب بن اسید کو عامل وحاکم مقرر فرمایا، اس طرح ولی ونصیر کا مصداق خواہ رسول اللہ ﷺ کو کہا جائے اور یہی زیادہ صحیح واچھا معلوم ہوتا ہے یا حضرت عتاب کو کہا جائے کہ انھوں نے اپنے زمانہ حکومت میں سب کو خوب آرام پہنچایا۔

اور اگر کسی کو خیال ہو کہ جب ان کی دعا کا قبول ہونا مقدر ہو چکا تھا تو پھر مسلمانوں کو یہ حکم دینے کا کیا مطلب ہے کہ تم ان کی خاطر لڑو کہ اللہ کی نصرت کے ہوتے ہوئے مخلوق کی نصرت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا تو ہم ضرور ہی قبول کریں گے اور عالم اسباب میں لازمی طور پر کسی نہ کسی سے یہ کام لے لیں گے خواہ تم یہ کام کرو یا نہ کرو، کام تو ضرور ہی ہو کر رہے گا، لیکن تمہاری خیر خواہی کی غرض سے کہتے ہیں کہ مفت کی دولت ہاتھ آتی ہے کہ اگرچہ تمہاری شرکت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن شرکت کرو گے تو تمہیں بھی ثواب مل جائے گا، ورنہ دوسری جگہ فرما ہی دیا ہے کہ ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ کہ اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئیں گے۔

اور یہاں ایمان والوں سے جو نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان والا ہونے کا یہ تقاضہ ہے اور ممکن ہے کہ کسی مانع کی وجہ سے کسی وقت تقاضا موثر نہ ہو، چاہے وہ مانع کوئی ابتلا وآزمائش ہو یا اطاعت میں خلل کی وجہ سے ہو یا دونوں ہوں جیسا کہ غزوۂ احد میں ہوا۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ ﴾

ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ ان کو یہ کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو اور نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، پھر ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو قصہ کیا ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی لوگوں سے ایسا ڈرنے لگے جیسا کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا۔ اور یوں کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض فرما دیا، ہم کو اور تھوڑی مدت مہلت دیدی ہوتی۔ آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا تمتع محض چند روزہ ہے اور آخرت ہر طرح سے بہتر ہے اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے اور تم پر تاگے برابر بھی ظلم نہ کیا جاوے گا۔

ربط: اوپر جہاد کا واجب ہونا اور اس کے فضائل بیان کر کے اس کی ترغیب تھی۔ اب دوسرے طریقہ سے اس کی ترغیب ہے، یعنی جہاد کے لئے بعض مسلمانوں کے تیار نہ ہونے پر ان کی ایک لطف آمیز شکایت ہے، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ مکہ میں کفار بہت ستاتے تھے، اس وقت بعض اصحاب نے جہاد کے لئے اصرار کر کے اجازت چاہی، مگر اس وقت عفو اور درگذر کا حکم تھا، ہجرت کے بعد جہاد کا حکم نازل ہوا تو طبعی طور پر بعض کو عملاً جہاد کرنا دشوار محسوس ہوا (لباب النقول عن النسائی) اس پر یہ شکایت فرمائی گئی، اور چونکہ دشواری کا یہ احساس انکار کے طور پر یا حکم پر اعتراض کے طور پر نہیں تھا بلکہ محض کچھ دن اور اس حکم کے نہ آنے کی تمنا تھی، اس لئے ملامت یا سرزنش نہیں ہے، محض لطف آمیز شکایت ہے اور اس تمنا کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور سے جس وقت آدمی کے اندر سے کوئی تحریک ہوتی ہے تو کام زیادہ آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ مکہ میں کافروں کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے جوش پیدا ہوا تھا، ہجرت کے بعد جب امن حاصل ہوا تو اتنا جوش نہ رہا، اب فطری مصلحتیں دماغ میں آنے لگیں، اور اس شکایت کے ساتھ دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی بقا اور موت سے کسی حال میں نہ بچ سکنے کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب مضامین ترغیب میں داخل ہیں۔

جہاد سے پیچھے ہٹنے اور دنیا کی لذتیں چاہنے کی شکایت:

(اے مخاطب!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ (جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے تو ایسا تقاضا تھا کہ) انہیں (منع کرنے کے لئے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رکھو اور (جو جو حکم تمہیں ہو چکے ہیں ان میں لگے رہو، مثلاً) نمازوں کی پابندی کرو، اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی اور یا) ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک آدمی (مخالف) لوگوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسے (کوئی) اللہ سے ڈرتا ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقل کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور قاعدہ ہے کہ فطری حالت عقلی حالت سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی ہی رحمت کی بھی تو امید ہے اور کافر دشمن سے تو نقصان کا خوف ہی خوف ہے، اور چونکہ یہ خوف طبعی تھا، اس لئے گناہ نہیں ہوا) اور (جہاد کے حکم کے کچھ مدت کے لئے التوا کی تمنا کے طور پر) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں دل میں کہی ہوئی بات، زبان سے کہی ہوئی

بات کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے (ابھی سے) ہمارے اوپر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ ہمیں (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مہلت دیدی ہوتی (ذرا بے فکری سے رہ لیتے، اور چونکہ یہ کہنا اعتراض یا انکار کے طور پر نہ تھا، اس لئے گناہ نہیں ہوا۔ آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد ﷺ) آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا ساز وسامان (جس کے لئے تم التوا کی تمنا کرتے ہو) محض چندروز کے لئے ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (یعنی باقی رہنے میں بھی اور لذت میں بھی مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے لئے آخرت کا ساز وسامان کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے ان کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو؟)

﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾

ترجمہ: تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں ہی تم کو موت آجاوے گی، اگر چہ تم قلعی چونہ کے قلعوں ہی میں ہو۔

موت سے بچنے کی تو کوئی صورت نہیں!

اور اگر جہاد نہ کیا تو کیا وقت معین پر موت سے بچ جاؤ گے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ) تم چاہے کہیں بھی ہو موت تمہیں آ کر رہے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہی (کیوں نہ) ہو، غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مر کر دنیا چھوڑنی ہی پڑے گی تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ! بلکہ ع: چندروزے جہد کن باقی بخند یعنی چند روز جدوجہد کرلو پھر ہنستے کھیلتے رہو)

فائدہ: ان اصحاب کا بطور تمنا یہ قول اگر زبان سے تھا تب تو اس کے معصیت نہ ہونے کی توجیہ معلوم ہوگئی، اور اگر دل میں وسوسہ کے طور پر تھا تو وسوسہ کا، گناہ نہ ہونا قرآن وحدیث میں واضح کر دیا گیا ہے، اس لئے کوئی تردد کی بات نہیں، اور لفظ ﴿قَالُوْا﴾ سے صدور معصیت کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے: قالوا محدثين أنفسهم یعنی انھوں نے اپنے دلوں میں کہا۔ اور مطلق قول معصیت نہیں، بلکہ جو قول زبان سے انکار کے طور پر ہو یا اعتقاد کے طور پر ہو، وہ معصیت ہے اور یہاں یہ بات ثابت نہیں، اور اس تمنا یا وسوسہ کی وجہ تمہید میں بیان کر چکا ہوں۔

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۚ ﴾

ترجمہ: اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ ہوگئی، اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کے سبب سے ہے۔ آپ فرمادیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے، تو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے۔ اے انسان! تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے، وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے۔

ربط: اوپر جہاد کی ترغیب میں یہ بیان ہوا ہے کہ وقت آنے پر موت ٹلتی نہیں خواہ جہاد میں جاؤ یا نہ جاؤ، چونکہ بعض منافق، جہاد میں جانے کو موت میں موثر اور نہ جانے کو زندہ رہنے میں مؤثر سمجھتے اور کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۶ میں ان کا یہ قول آیا ہے: ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا﴾ ”اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو مارے نہ جاتے“ اور آیت ۱۶۸ میں ہے: ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾: ”اگر وہ ہماری اطاعت کرتے تو مارے نہ جاتے“ اسی طرح جب کبھی جہاد میں قتل وموت واقع ہوتے تو رسول اللہ ﷺ پر الزام لگاتے کہ آپ ہی کے کہنے سے جہاد میں گئے اور موت کا شکار ہوئے، اس طرح جہاد کا موت میں مؤثر ہونا ثابت ہوگیا، اور اگر کبھی ظاہری اسباب کی کمی کے باوجود کافروں پر فتح حاصل ہوتی اور اس سے استدلال کیا جاتا کہ دیکھو اگر جہاد موت میں مؤثر ہے تو اب وہ اثر کہاں گیا، تو کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے محض اتفاقی بات ہے۔ غرض اگر کام بگڑتا تو الزام حضرت ﷺ پر اور اگر کام بنتا، سنورتا تو اتفاقی بات۔ اس پر اب گفتگو فرماتے ہیں: یہ اس بیان کی تفصیل ہے جو روح المعانی میں اجمالی طور پر ابن عباسؓ اور قتادہ سے بغیر کسی سند کے نقل کیا گیا ہے، لیکن قرآنِ کریم میں مذکورہ دونوں قول ربط کے لئے کافی ہیں، جیسا کہ جلد ہی آگے آتا ہے اس لئے کہ جہاد کا ذکر اس شخص تک جاتا ہے جو اس کا انکار کرتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

حادثات میں مؤثر اسباب کی تحقیق:

اور اگر انہیں (منافقوں کو) کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح وظفر) تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے (اتفاقیہ طور پر) ہے (ورنہ مسلمانوں کی بے تدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر انہیں کوئی بری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت وقتل) تو (اے محمد ﷺ نعوذ باللہ، آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ (کی اور مسلمانوں کی بے تدبیری) کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرمادیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں بلکہ) سب کچھ (نعمت وزحمت) اللہ ہی کی طرف سے ہے (اگر چہ ایک بلاواسطہ ہے اور ایک بالواسطہ، جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو ان کے فضل سے اعمال کے واسطہ کے بغیر ہے، اور زحمت وعذاب ان کے عدل کی وجہ سے بندوں کے برے اعمال کے واسطہ سے ہے، چنانچہ مصیبت میں جو تم میرا دخل سمجھتے ہو واقع میں اس کا تعلق بندوں کے برے اعمال سے ہے، جیسا کہ غزوۂ احد میں شکست

کے وجوہ گذر چکے ہیں، اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کہ اگر آدمی ذرا بھی غور کرے تو خوشحالی سے پہلے اپنا کوئی نیک عمل اس درجہ کا نہ پائے گا، محض فضل ہی ثابت ہوگا، اور بدحالی سے پہلے ضرور کوئی عمل بد پائے گا جس کی سزا اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب یہ سب کچھ ظاہر ہے) تو ان (احمق) لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟ (اور سمجھیں گے تو کیا اور اس اجمالی جواب کی تفصیل یہ ہے کہ) اے انسان! تجھے جو بھی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے (فضل) ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آئے، وہ تیرے ہی (اعمال بد کے) سبب سے ہے (لہٰذا اس بدحالی کی نسبت شرعی احکام پر عمل کی طرف یا شارع کی طرف کرنا پوری جہالت ہے، جیسا کہ منافق لوگ اس کی نسبت جہاد اور امام الجہاد کی طرف کیا کرتے تھے)

تفسیر: جاننا چاہئے کہ اس مقام کی جو وضاحت کی گئی ہے، اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں انعال کے خلق کے مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ محض فضل وعدل کا بیان کرنا مقصود ہے، اور ﴿مَا اَصَابَكَ﴾ الخ میں اس سے پہلے کا بیان ہے، اب اس پر انشاء اللہ تعالیٰ کسی قسم کا اشکال واقع نہیں ہوگا۔

اور جاننا چاہئے کہ ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور ﴿مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ میں منافقوں کے قول ﴿حَسَنَةٍ﴾ کا ﴿مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ تسلیم کرنا لازم نہیں آتا، کیونکہ ان کی مراد حمد نہیں تھی، بلکہ محاورہ کے طور پر تھا، جیسے خلاف توقع امور کی نسبت کبھی اللہ کی طرف اور کبھی تقدیر کی طرف کر دیتے ہیں، ان کا اس سے زیادہ مقصود یہ تھا کہ لیس من عندک وبرکۃ رأیک یہ نہ تمہاری طرف سے ہے اور نہ ہی تمہاری برکت سے ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ بدحالی کو جو اعمال کا ثمرہ قرار دیا یہ ہر ایک کے لئے نہیں ہے، بلکہ بدعمل آدمی کے لئے ہے۔ ورنہ نیک لوگوں کے لئے حوادث وبلیات خود رحمت وتربیت ہیں، خوب سمجھ لو۔

اور جاننا چاہئے کہ خوشحالی کے سلسلہ میں جو کہا گیا کہ کوئی ''عمل اس درجہ کا نہ پائے گا'' س کی وجہ ظاہر ہے، کیونکہ اول تو ان اعمال حسنہ سے پہلے بہت سی نعمتیں اتنی ہوں گی کہ ان اعمال کو ان کے برابر نہیں کہہ سکتے تو نئے ثمرہ کا کیا حق ہے۔ دوسرے ان اعمال میں قبولیت کے پورے شرائط نہیں پائے جاتے، اور بعض جگہ جو اچھے ثمرات کو اعمالِ حسنہ کا عوض فرما دیا گیا تھا۔ وہ محض صورت کے لحاظ سے ہے، ورنہ حقیقت میں اصلی سبب فضل ہے۔

﴿وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۚ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۝﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہیں۔

ربط: اوپر منافقوں کے اُس قول سے آنحضرت ﷺ کی رسالت کا انکار بھی لازم آتا تھا، جس میں وہ بدحالی کو نعوذ باللہ آپ کی طرف اعتراض اور بے ادبی وبدتمیزی کی غرض سے منسوب کرتے تھے۔ اب اس لازم کو باطل قرار دیا گیا ہے

جس سے ملزوم یعنی خودان کا قول بھی دوسرے طرز پر باطل ہوگیا اور رسالت کی دلیل کی طرف اشارہ کے ساتھ رسالت بھی ثابت کی گئی ہے۔

رسالت کا ثبوت اور اس کی دلیل کی طرف اشارہ:

اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اور (اگر کوئی منافق یا کافر انکار کرے تو اس کے انکار سے نبوت کی نفی کب ہوسکتی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کے) گواہ کافی ہیں (جنھوں نے قولی اور فعلی شہادت دی ہے، قولی تو مثلاً یہی جملہ: ﴿ وَ اَرْسَلْنٰكَ ﴾ کہ ہم نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اور فعلی یہ کہ معجزے جو نبوت کے اثبات کی دلیل ہیں، آپ کو عطا فرمائے ہیں)

فائدہ: تمام لوگوں میں جنات اور انسان دونوں آگئے، جیسا کہ ﴿ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴾ کو اس الناس کا بیان کہا گیا ہے جو ﴿ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴾ میں ہے۔ اس طرح اس آیت میں حضور ﷺ کی عام بعثت کا بیان ہے جو قرآن وحدیث میں دوسرے مقامات پر بھی نص کی شکل میں بیان کیا گیا ہے اور جو قطعی عقیدہ ہے۔

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ ﴾

ترجمہ: جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی اور جو شخص روگردانی کرے سو ہم نے آپ کو ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا۔

ربط: اوپر رسالت کو ثابت کیا گیا تھا، اب رسالت کے حق کا بیان فرماتے ہیں جو کہ اطاعت کا واجب ہونا ہے، اور مخالفوں کے اطاعت نہ کرنے پر آپ کی تسلی بھی فرماتے ہیں۔

اطاعت کا واجب ہونا اور رسول اللہ ﷺ کی تسلی:

جس شخص نے رسول (اللہ ﷺ) کی اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (اور جس نے آپ کی نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عقل کے لحاظ سے بھی واجب ہے لہٰذا آپ کی اطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص (آپ کی اطاعت سے) منہ پھیرے تو (آپ کچھ غم نہ کیجئے) کیونکہ (ہم نے آپ کو (ذمہ داری کے طور پر) ان کا نگراں بنا کر نہیں بھیجا (کہ آپ انہیں کفر نہ کرنے دیں، جس کی وجہ سے آپ سے باز پرس کا احتمال ہو، بلکہ آپ تو محض پیغام پہونچا کر اپنی ذمہ داری سے بری ہو جایئے۔ اس میں تسلی فرمادی گئی، کیونکہ آپ کو بہت غم ہوا کرتا تھا)

فائدہ: ''ذمہ داری کے طور پر'' کی قید اس لئے لگائی کہ بطور شفقت تو آپ خدام کی نگرانی رکھتے تھے اور ان کی روزی روٹی، رہن سہن اور انجام کی اصلاح فرماتے رہتے تھے۔

﴿ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ، وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ، فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت مشورے کرتے ہیں، ان میں کی ایک جماعت برخلاف اس کے جو کچھ کہ زبان سے کہہ چکے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں، سو آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے۔ اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں۔

ربط: اوپر رسول کی اطاعت کا واجب ہونا بیان کیا گیا تھا۔ اب بعض منافقوں کے معاملہ کا ذکر ہے جو اس واجب کو ترک کئے ہوئے تھے۔

اطاعت کے سلسلہ میں منافقوں کا معاملہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے احکام سن کر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) رات کے وقت (پوشیدہ طور پر) اس کے برخلاف مشورہ کرتی ہے جو کچھ کہ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں، اصل مشورہ وہ کرتے ہیں، باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس کے خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں (موقع پر سزا دیدیں گے) تو آپ ان کی (بے ہودگی کی) پرواہ (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے بلکہ سارا معاملہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (وہ خود مناسب طور پر اسے دور فرما دیں گے، چنانچہ ان کی شرارت سے کبھی کوئی ضرر نہیں پہونچا)

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ ، وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ ﴾

ترجمہ: کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے، اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔

ربط: اوپر رسالت کا اثبات تھا، جس کے وہ منکر تھے، اب ایک خاص اور عجیب طرز پر جو کہ موقع ومحل کے نہایت مناسب ہے، قرآن کی حقانیت کا اثبات ہے جو رسالت کے عظیم ترین دلائل میں سے ہے کہ رسالت کے انکار میں اس کا بھی انکار لازم آتا ہے، اور وہ ذاتی طور پر بھی اس کا انکار کرتے تھے۔

قرآن کی حقانیت کا اثبات:

(فصاحت وبلاغت میں اور غیب کی خبریں بتانے میں قرآن کا اعجاز دیکھ رہے ہیں) کیا پھر (بھی) قرآن میں غور

نہیں کرتے؟ (تاکہ اس کا کلام الٰہی ہونا واضح ہو جائے) اور یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس (کے مضامین) میں (ان کے کثیر ہونے کی وجہ سے واقعی امور اور اعجاز کی حد سے) بہت زیادہ فرق پاتے (کیونکہ ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف اور فرق ہوتا تو بہت سارے مضامین میں بہت سارے اختلافات ہوتے، جبکہ اس کے ایک مضمون میں بھی فرق نہیں، چنانچہ لامحالہ یہ اللہ کے سوا کسی کا کلام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے)

فائدہ: حاصل مقام یہ ہے کہ اللہ کے کلام کے اعجاز کی وجوہ میں سے اس کی فصاحت وبلاغت کا بے مثل ہونا اور اس کی خبروں کا جن پر مطلع ہونے کا رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا، بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہونا ہے، مثلاً اسی جگہ جس مشورہ کا بیان ہے کہ منافقوں کے سردار اور روسا کس طرح رازوں کو چھپاتے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ اس کی خبر دیتے تھے، اور یہی جزء ہے جس کی وجہ سے تمہید میں اس اثبات واستدلال کو "مقام کے مناسب" کہا گیا ہے، اور بھی بہت سی خبریں، حکایات اور پیشین گوئیاں کسی کتاب سے اقتباس یا اہل کتاب کے حوالہ کے نہ ہونے کے باوجود صحیح اور واقع کے مطابق ہر روز ان کے سامنے آتی رہتی تھیں، نہ ہی آپ نے کسی ایسے فن کی مشق کی تھی جس کے ذریعہ غیب کی باتوں کا اظہار وغیرہ ہو جائے، نہ ہی آپ کے زمانہ کا کوئی مخالف اس کا دعویٰ کر کے ثابت کر سکا۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت وعادت کے مطابق جہاں مکر وفریب کا احتمال ہو جھوٹی نبوت کے مدعی سے ایسے علوم وفنون میں مہارت کے باوجود ایسے خلاف عادت امور واقع بھی نہیں ہوتے، اور فصاحت وبلاغت کا اعجاز اپنے زمانہ کے تمام اہل فصاحت وبلاغت لوگوں کے عاجز ہو جانے سے ثابت ہو چکا تھا، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ خالق کائنات کا کلام ہے، منکرین میں جو مشرک تھے ان کے اعتبار سے فصاحت وبلاغت سے استدلال واضح ہے، اور جو اہل کتاب تھے ان میں منافق بھی شامل تھے، ان کے اعتبار سے غیب کی باتوں کے بارے میں خبریں دینے سے استدلال بہت ہی ظاہر ہے۔

یہ استدلال ہر ہر مضمون میں جاری ہو سکے گا، جب ہر مضمون اللہ کی جانب سے ہو تو ان تمام مضامین کا مجموعہ قرآن بھی کلام اللہ ثابت ہو گیا۔ اور اختلاف سے مراد نسخوں کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے کہ انسانی تالیفات کے لئے عام طور سے یہ امر لازم ہوتا ہے، اس کی زیادہ تفصیل سورۂ حجر کی آیت ۹ کے تحت آئے گی۔

﴿ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں، ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان

میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں۔ اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو سب کے سب شیطان کے پیرو ہوجاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے۔

ربط: اوپر منافقوں کی مذہبی بدعنوانی کا ذکر تھا، اب ان کی انتظامی بدعنوانی کا بیان ہے، جس سے اہل اسلام کو ضرر پہونچتا تھا۔

منافقوں کی انتظامی جنایت:

اور جب ان لوگوں کو کسی (نئے) امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ امر باعث) امن ہو یا (باعث) خوف (مثلاً مسلمانوں کا کوئی لشکر کسی جگہ جہاد کے لئے گیا اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی تو یہ امن کی خبر ہوئی یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر ہوئی تو یہ خوف کی خبر ہے) تو اس (خبر) کو (فوراً) مشہور کردیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط ثابت ہوتی ہے، اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور ہونا انتظامی پہلو سے خلاف مصلحت ہوتا ہے) اور اگر (بجائے خود مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول (اللہ ﷺ) کے اور جو دوسرے (حضرات اکابر صحابہ) ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت وغلط اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں (جیسا کہ ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں، پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے، ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، انہیں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا۔ آگے مذکورہ بالا احکام سنانے کے بعد جو سراسر دنیوی اور اخروی مصلحتوں پر مشتمل ہیں، بطور اظہار احسان وانعام مسلمانوں کو ارشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تمہیں قرآن دیا اور اپنا پیغمبر بھیجا، اگر یہ) نہ ہوتے تو تم سب کے سب (دنیوی اور اخروی ضرر ونقصان اختیار کرکے) شیطان کے پیروکار ہوجاتے، سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے (جو اللہ کی دی ہوئی عقل سلیم کی بدولت کہ وہ بھی ایک خاص فضل ورحمت ہے، اس سے محفوظ رہتے، ورنہ زیادہ تباہی میں پڑتے، لہٰذا تمہیں ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جن کی معرفت ایسی مصلحتوں والے احکام آتے ہیں، مذکورہ بالا منافقوں کے برخلاف غنیمت سمجھنا چاہئے اور پوری اطاعت کرنی چاہئے)

فائدہ: اس موقع پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب تھوڑے مستثنیٰ ہیں تو ان پر رسول کی بعثت اور قرآن کے نزول کی خاص رحمت سے کوئی احسان نہیں ہوا، کیونکہ وہ تو اس کے بغیر بھی شیطان کی اتباع سے محفوظ رہتے، جواب یہ ہے کہ عقل سے بعض احکام کا اجمالی طور پر ادراک ہوسکتا ہے، سعادت ونیک بختی کے ابواب کی اس قدر تفصیلات محض عقل سے معلوم نہیں ہوسکتیں، چنانچہ اول تو بعض نظری باریک امور عقل کے نزدیک مشتبہ میں خود اس اتباع کا بھی احتمال تھا، دوسرے اگر ضرر سے بچے بھی رہتے تب بھی ان منافع اور سعادتوں سے تو ضرور ہی محروم رہتے جن کا ادراک وحی پر موقوف ہے تو یہ احسان

کیا کم ہے، جس کو دوسری آیت میں صاف فرمادیا۔ ﴿ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ اللہ نے مؤمنوں پر احسان فرمایا (آل عمران آیت ۱۶۴)

اور جاننا چاہئے کہ ﴿ اُولِي الۡاَمۡرِ ﴾ اور مستنبطین کے لئے جو لفظ منہم فرمادیا، حالانکہ مؤمن اور منافق ایک دوسرے کے مغایر ہیں، ان کا آپس میں ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہے، تو یہ منافقوں کے دعوی کے مطابق ہے کہ وہ خود کو مؤمنوں میں داخل وشامل کیا کرتے تھے، جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے۔

﴿ فَقَاتِلۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّكُفَّ بَاۡسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّ اَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ۝ ﴾

ترجمہ: پس آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجئے آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے کوئی حکم نہیں اور مسلمانوں کو ترغیب دے دیجئے، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کافروں کے زورِ جنگ کو روک دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ زورِ جنگ میں زیادہ شدید ہیں اور سخت سزا دیتے ہیں۔

ربط: بہت اوپر سے جہاد کا مضمون چلا آرہا ہے، بیچ بیچ میں اس کی مناسبت سے دوسرے مضامین بھی آتے رہے، اب خاص طور سے حضور ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے پھر ایک خاص عنوان سے اسی طرف لوٹ رہے ہیں جس میں بیچ میں آنے والے ان مضامین کے ایک بڑے حصہ کو بھی چھیڑا ہے۔ چنانچہ فقرہ ﴿ لَا تُكَلَّفُ ﴾ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے سستی کا مظاہرہ کیا تھا، جس کی وجہ منافقوں میں پائی جانے والی بداعتقادی تھی اور بعض مؤمنوں میں طبعی خوف اور پست ہمتی تھی جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

جہاد کا خاص حکم:

پس آپ (اے محمد ﷺ) اللہ کی راہ میں (کافروں سے) قتال کیجئے (اور اگر بالفرض آپ کے ساتھ کوئی نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے، کیونکہ) آپ کو سوائے آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دے دیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ ہیں، آپ نہ تو باز پرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ بیان ہو چکی، اور نہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے، جس کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے جنگ کے زور کو روک دیں گے (اور انہیں مغلوب کر دیں گے) اور (اگرچہ یہ بڑے زورآور نظر آتے ہیں، لیکن) اللہ تعالیٰ جنگ کے زور میں (ان سے بیشمار درجوں میں) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں، اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

فائدہ: ممکن ہے کہ ﴿ اَشَدُّ بَاۡسًا ﴾ دنیا کے اعتبار سے ہو اور ﴿ اَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ﴾ آخرت کے اعتبار سے، اور اللہ

تعالیٰ کے 'زورِ جنگ' سے مراد کافروں کو مغلوب کرنے کا سامان فرما دینا ہے، جو زورِ جنگ کا نتیجہ ہوتا ہے، یا اس سے مطلق زور مراد لے لیا جائے، اور قوت کے معنی صادق آنے میں تو کوئی امر پوشیدہ ہے ہی نہیں، مقید کو مطلق پر اطلاق کیا گیا ہے، اور اس پیشین گوئی کا واقع ہونا ظاہر ہے، اگر خاص قریش مراد ہوں تب بھی اور ساری دنیا کے کفار مراد ہوں تب بھی، کیونکہ چند ہی روز میں تمام سلطنتیں مسلمانوں نے فتح کر لیں، البتہ بعض مفسرین نے ان آیتوں کو ایک خاص قصہ پر محمول فرمایا ہے، جس کا خلاصہ لباب سے ابن جریر کی تخریج اور ابن عباس کی روایت سے یہ ہے کہ جب شوال میں غزوۂ احد ہو چکا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے ذی قعدہ میں کفار کے اعلان کے تحت بدر میں مقابلہ کے لئے جانا چاہا، اس وقت بعض لوگوں نے ابھی ابھی زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہ پر مشتمل خبروں کی وجہ سے قدرے تامل کیا، چنانچہ اُس روایت میں یہ الفاظ ہیں: فابی علیه الناس أن یتبعوه: بعض لوگوں نے آپ کا اتباع کرنے سے انکار کیا تب آپ نے فرمایا: إني ذاهب وإن لم یتبعني احد: یعنی چاہے کوئی ایک آدمی بھی میرے ساتھ نہ چلے، مگر میں ضرور جاؤں گا، چنانچہ آپ ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے، مگر قریش کے کفار کے نہ آنے کی وجہ سے اس موقع پر جنگ نہیں ہوئی۔ روح المعانی میں ابن عباسؓ سے اس قصہ میں نقل کیا ہے کہ اس وقت آیت نازل ہوئی، اس وقت اس پیشین گوئی کا واقع ہونا ظاہر ہے کہ کفار مرعوب ہوگئے اور مقابلہ میں نہ آئے۔ چنانچہ آلِ عمران کی آیت ۱۷۲ کی تفسیر میں بھی اس کا کچھ بیان آچکا ہے، اس طرح خاص وہ کفار مراد ہوں گے، اور میرے نزدیک آیت کی تقریر میں یہ بہتر ہے کہ ﴿ عَسَى اللّٰهُ ﴾ رسول اللہ ﷺ کے تنہا قتال فرمانے کی صورت میں تھا۔ چونکہ یہ صورت واقع نہیں ہوئی، اس لئے اس پیشین گوئی کے واقع ہونے کی تحقیق اس مقام پر بالکل ضروری نہیں۔

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝﴾

ترجمہ: جو شخص اچھی سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

ربط: اوپر کی آیت میں جناب رسول اللہ ﷺ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیں، اب بیسویں حکم کے ضمن میں اس مناسبت سے شفاعت کرنے کی فضیلت بیان فرماتے ہیں، جس کو شفاعت حسنہ فرمایا ہے کہ اس میں بھی اس امر کی ترغیب ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا معاملہ کریں، اس طرح دونوں میں خیر و بھلائی کی ترغیب ہوئی (اور اگر ان ترغیبوں پر شوق و رغبت کا اثر بھی مرتب ہوگیا تو دونوں عمل خیر کے لئے سبب بننے میں بھی شریک ہیں، اور شفاعت حسنہ کے مقابلہ کے لئے شفاعت سیئہ کا بیان بھی فرما دیا کہ مقابلہ خود ایک مناسبت ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ اوپر منافقوں

کے اقوال واحوال کا ذکر تھا، جو اوروں کے لئے بھی ضرر کا سبب ہو سکتے تھے، اور شفاعت سیئہ بھی ضرر کا سبب ہے، تو اس تقریر سے اوپر کے مضمون کے ساتھ ایک مستقل مناسبت نکل آئے گی۔

بیسواں حکم: شفاعت حسنہ کی ترغیب اور شفاعت سیئہ کی ممانعت:

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی ایسی شفاعت جس کا طریقہ اور مقصود دونوں مشروع وجائز ہوں) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے (یعنی جس کا طریقہ یا غرض یا دونوں غیر مشروع ناجائز ہوں) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں)

فائدہ: طریقہ کے غیر مشروع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی غریب کی امداد کے لئے کسی امیر سے کہا مگر اس طرح کہ اس کو مجبور کیا جو اس کو ناگوار ہوا، اس میں اگرچہ غرض بری نہیں تھی، مگر طریقہ برا تھا، کہ مسلمانوں کو ایذا پہونچانا معصیت ہے، اور مقصود کے غیر مشروع ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی ظالم کی رعایت کے لئے کہا کہ اس میں غرض ہی حرام ہے، اس لئے جو سفارش برے طریقہ اور بری غرض دونوں سے پاک ہو، وہ عبادت ہے، کہیں واجب اور کہیں مستحب۔

مسئلہ: اور عبادت ہونے کی وجہ سے اس پر عوض لینا حرام ہے کہ عبادت اجرت کا محل نہیں، اور شفاعت سیئہ پر اس کے معصیت ہونے کی وجہ سے اجرت لینا حرام ہے، اور اگر کوشش کے مقابلہ میں اجرت سمجھی جائے تو غلط ہے، کیونکہ اگر کوئی غیر ذی اثر آدمی اس سے زیادہ کوشش کرے تو اس کو اجرت نہیں دی جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ مقام ومرتبہ کے مقابلہ میں ہے اور مقام ومرتبہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اس لئے وہ بھی حرام ہے۔

﴿ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور جب تم کو کوئی سلام کرے تو تم اس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو یا ویسے ہی الفاظ کہہ دو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حساب لیں گے۔

ربط: اوپر شفاعت حسنہ کا بیان تھا، آگے سلام کا جواب دینے کا طریقہ اس مناسبت سے بیان فرماتے ہیں کہ دونوں میں دوسرے شخص کے دل کو خوش کرنا ہے، اور جہاد کے احکام کے دوران اس کا آنا اس وجہ سے لطیف ہو گیا کہ مجاہد لوگ جس طرح کلمۂ اسلام کے تلفظ کو شمشیر سے حفاظت کرنے والا سمجھتے ہیں، اسی طرح لفظ سلام کے تکلم کو بھی اسلام کی علامت سمجھ کر ایسے شخص سے ہاتھ روک لیا کریں جہاں کہیں خاص اہل اسلام کا شعار ہو، دوسری قوموں میں استعمال نہ ہوتا ہو، جیسا کہ عنقریب آیت ۹۴ میں ایک قصہ میں آئے گا۔

اکیسواں حکم: سلام کے جواب کی تعلیم:

اور جب تمہیں کوئی (شریعت کے مطابق) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ویسے ہی الفاظ کہہ دو (تمہیں دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (یعنی ہر عمل کا) حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے، اور ویسے اپنے فضل سے معاف کردیں تو وہ اور بات ہے)

فائدہ (۱): امر کے صیغہ اور لفظ ''حسیب'' سے اس حکم کا ظاہراً وجوب معلوم ہوتا ہے اور یہی فقہاء کا مذہب ہے۔

مسئلہ (۲): یہ جو قید لگائی گئی کہ شریعت کے مطابق اس سے وہ سلام نکل گئے جو مکروہ ہیں، مثلاً پاخانہ کرنے والے کو سلام کرے یا کسی گناہ میں مبتلا ہونے کی حالت میں یا جو کسی طاعت میں مثلاً نماز وتلاوت میں مشغول ہو، اور زیادہ تفصیل درمختار میں بیان کی گئی ہے، ایسی حالت میں جواب دینا اس کے ذمہ نہیں، بلکہ بعض حالات میں جواب دینا مکروہ ہے۔

مسئلہ (۳): سلام کے جواب کا یہ وجوب علی الکفایہ ہے، اگر جماعت میں سے ایک شخص نے بھی جواب دیدیا تو سب کے ذمہ سے ادا ہوگیا۔

مسئلہ (۴): اصل نفس جواب واجب ہے، باقی ویسے ہی الفاظ یا ان سے احسن زیادہ بہتر اور بعض صورتوں میں ان سے کم یہ سب اختیار میں ہے۔ آیت میں جو لفظ ''أو'' اختیار دینے کے لئے ہے، وہ اس کے اعتبار سے ہے، اور امر کے صیغہ سے جو واجب ہونا ظاہر ہوتا ہے، وہ نفس تحیت کے اعتبار سے ہے، اس طرح جس کی قید لگائی گئی وہ واجب ہے اور قید میں اختیار ہے مثلاً ایک فقرہ یہ ہے السلام علیکم، دوسرا جس میں ورحمۃ اللہ زیادہ ہو، اور تیسرا جس میں وبرکاتہ بھی ہے، اس طرح جواب میں سمجھ لینا چاہئے، ان سب صیغوں میں اختیار ہے، چنانچہ اس جیسے اور احسن (اس سے بہتر) میں اختیار ہونے کے لئے تو یہ آیت نص موجود ہے، رہا کم کا اختیار ہونا اس پر اجماع ہے، جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے، مثلاً کسی نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور جواب میں کہہ دیا وعلیکم السلام تو اس پر اتفاق ہے کہ یہ کافی ہے، اور اگر آیت میں بھی ﴿ رُدُّوْهَا ﴾ کی تفسیر مقابلہ کے قرینہ سے اس طرح کی جائے: او لا تحیوا باحسن: اور ردوا کی تخصیص بطور تمثیل کہی جائے تو کوئی اختلاف کی صورت بھی نہ رہے۔

مسئلہ (۵): لفظ ﴿ حُيِّيْتُمْ ﴾ فعل مجہول ہے، مگر اس پر اجماع ہے کہ اس کا فاعل مسلمان ہے، قطعی طور پر یا احتمال کے طور پر، لہٰذا اگر کوئی ایسا شخص سلام کرے جس کے کافر ہونے کا یقین ہو تو جواب دینا واجب نہیں، اگرچہ جائز ہے، اور حدیث میں جو اس کے جواب کے لئے خاص لفظ آیا ہے کہ صرف علیکم کہے تو وہ اس وقت ہے جب احتمال ہو کہ اس نے شرارت سے سلام کیا ہے، ورنہ سلام کا پورا جواب دینا جائز ہے، بلکہ حسب ضرورت اپنی طرف سے پہل کر کے بھی سلام

کرنا جائز ہے (روح المعانی عن الحسن والشعبی وقتادہ وابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین)

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝ ﴾ ع

ترجمہ: اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں۔ وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن میں، اس میں کوئی شبہ نہیں اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

ربط: اوپر بہت سارے احکام کا ذکر ہوا ہے، اب ان کی تاکید کے لئے اپنی عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ حاکم کی عظمت کی وجہ سے اور ان کے دربار میں حاضری اور حساب کے خیال سے احکام پر عمل کرنے کا اہتمام بڑھ جائے۔

توحید اور قیامت:

اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور قیامت کے دن تم سب کو جمع کریں گے، اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی؟ (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے)

تفسیر: یہ ترکیب جس طرح اصدق ہونے کی نفی کرتی ہے، ایسے ہی محاورہ کے اعتبار سے سچائی میں برابر ہونے کی بھی نفی کرتی ہے، لہٰذا اصدقیت (زیادہ سچا ہونا) اللہ کے کلام کے لئے مفید ہے اور یہ اصدق ہونا کمیت یعنی مقدار کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ اول اس معنی میں کہ مخلوق کو علم غیب نہ ہونے کی وجہ سے خبروں میں جس کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس کو مطابقت اور عدم مطابقت پر اطلاع وعلم نہیں ہوتا اور صدق وسچائی کا دارومدار جس کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس کی مطابقت پر ہے اور وعدوں کو پورا کرنے میں کامل قدرت نہ ہونے کی وجہ سے عاجز ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہو اور اس کی طرف سے قدرت عطا کی جائے، اور حق تعالیٰ کا علم اور قدرت دونوں کامل ہیں، اس لئے ان کی ہر خبر بھی صادق ہے اور ہر وعدہ بھی سچا ہے، اور دوسرے اس معنی میں کہ دوسروں کی سچائی کلام کے لئے لازم نہیں کہ عقل کے اعتبار سے اس کا دور ہونا ناممکن ہو جائے، جبکہ اللہ کے کلام میں یہ لازم ہے کہ اس کا دور ہونا ناممکن ہے، اگرچہ یہ لازم اس وجہ سے کہ خود ملزوم مقدور ہے، قدرت کے تحت داخل ہے، اور اس کا مقدور ہونے سے اس کی ضد کا مقدور ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ قدرت کا تعلق دو ضدوں سے ہے، جیسے ضاحک بالقوۃ یعنی ہنسنے کی قوت رکھنے والا ہونا باوجود اس کے کہ یہ انسان کے لوازم میں سے ہے، اس وجہ سے کہ انسان مقدور ہے اور قدرت کے تحت داخل ہے، اسی طرح صدق کو سمجھنا چاہئے کہ لیکن اس کلام کا صدق مراد ہے، جو کہ افعال میں سے ہے، یعنی کلام لفظی۔ بخلاف اس کلام کے جو ذاتی صفات سے ہے یعنی کلام نفسی کہ وہ صدق: ذاتِ واجب کے لئے لازم سے ہے، اور وہ اور اس کی ضد مقدور ہونے سے پاک ہے، کیونکہ اس میں وجوب اور امتناع عقلی ہے۔

﴿ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

ترجمہ: پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم دو گروہ ہو گئے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الٹا پھیر دیا ان کے عمل کے سبب، کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے؟ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے، وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح کے ہو جاؤ۔ سو ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اور اگر وہ اعراض کریں تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ اور نہ ان میں سے کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ۔ مگر جو لوگ ایسے ہیں جو کہ ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے یا خود تمہارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے منقبض ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے، پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں۔ جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں، سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے۔

ربط: اوپر جہاد و قتال کے احکام کا بیان تھا، ان آیات میں بھی کفار کے بعض خاص خاص احوال کے اعتبار سے قتال و عدم قتال کے بعض خاص خاص احکام کا بیان ہے، مگر ان آیات کی تفسیر کا سمجھنا بعض روایات کو سامنے رکھنے پر موقوف ہے،

اس لئے یہاں ان کو نقل کیا جاتا ہے۔

پہلی روایت: عبد بن حمید نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ بعض مشرک مکہ سے مدینہ آئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے اور حضرت رسول مقبول ﷺ سے تجارت کا سامان واسباب لانے کا بہانہ کر کے پھر مکہ چل دیئے اور پھر نہ آئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی رایوں میں اختلاف پیدا ہوا، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے کہا مؤمن ہیں، اللہ نے ﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ الخ کے ذریعہ ان کا کافر ہونا بیان فرما دیا۔ اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

احقر کہتا ہے کہ ان کو کافر کہنا اس معنی میں ہے کہ جب اسلام کا دعوی کیا تھا، جب بھی وہ منافق تھے، دل سے ایمان نہ لائے تھے، اور منافق قتل نہ کئے جاتے تھے، لیکن اسی وقت تک کہ اپنا کفر چھپاتے ہوں اور ان لوگوں کا مرتد ہونا ظاہر ہو گیا تھا اور جنھوں نے مسلمان کہا شاید انھوں نے حسن ظن کی بنیاد پر ان کے مرتد ہونے کے دلائل میں کوئی تاویل کر لی ہو گی، اور اس تاویل کی بنیاد محض رائے ہو گی کوئی دلیل تائید کرنے والی نہ ہو گی، اس لئے ان کی رائے معتبر قرار نہیں پائی۔

دوسری روایت: ابن ابی شیبہ نے حسن سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے بدر اور احد کے واقعہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آ کر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپ نے حضرت خالد کو صلح کی تکمیل کے لئے وہاں بھیج دیا، صلح کا مضمون یہ تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں آنے والے کی مدد نہیں کریں گے، اور قریش مسلمان ہو جائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے اور جو قومیں ہمارے ساتھ اتحاد کر لیں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گی، اس پر آیت ﴿وَدُّوْا﴾ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ﴾ الخ نازل ہوئی۔

تیسری روایت: کلبی نے ابی صالح کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آیت ﴿سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ﴾ الخ میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان سے اسد اور غطفان مراد ہیں کہ مدینہ میں آتے اور بظاہر اسلام کا دعوی کرتے تھے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندر اور عقرب (بچھو) پر ایمان لائے ہیں اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ضحاک نے ابن عباسؓ سے یہی حالت بنی عبدالدار کی نقل کی ہے۔ پہلی اور دوسری روایت روح المعانی میں اور تیسری معالم میں ہے۔

احقر کہتا ہے کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت پہلی روایت والوں کی طرح ہوئی کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی مسلمان نہ ہونا ثابت ہو گیا، اس لئے ان کا حکم عام کفار کی طرح ہے یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے جنگ نہ کی جائے اور مصالحت نہ ہونے پر جنگ کی جائے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے بارے میں دوسری روایت میں پکڑنے اور قتل کرنے کا حکم اور تیسری آیت میں مصالحت کی حالت میں ان کا استثناء موجود ہے، جن کی مصالحت کا ذکر دوسری روایت میں ہے اور استثنا کی تاکید کے لئے ﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ﴾ کی تصریح ہے، اور یہ استثنا اس وجہ سے کہ یہ مرتد

لوگ دار الحرب میں چلے جانے کے سبب دوسرے کفار کی طرح ہو گئے استثناء متصل ہے، اگر چہ ان کا مستثنیٰ غیر مرتدین کیوں نہ ہوں، اور تیسری روایت والوں کے بارے میں چوتھی آیت میں کنارہ کشی اختیار نہ کرنے اور جنگ سے نہ رکنے کی حالت میں انہیں پکڑنے اور قتل کرنے کا واضح حکم ہے۔ اور مقابلہ کے قرینہ سے صلح کی حالت میں جنگ نہ کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح کل گروہ جن کا یہاں ذکر ہے تین ہیں، ایک: پہلی روایت والے، ایک کا ذکر پہلی اور دوسری روایت میں، ایک کا تیسری روایت میں اور ایک کا چوتھی روایت میں، اور حکم کل دو ہیں: صلح نہ ہونے کی صورت میں جنگ وقتال اور صلح کی صورت میں قتال نہ ہونا۔

رہی یہ بات کہ جو منافق مدینہ میں رہتے تھے باوجودیکہ دلائل سے ان کا کفر بھی ثابت تھا، پھر ان کے لئے امن کا حکم کیوں تھا؟ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ان کی حالت بھی عام کفار جیسی تھی، چونکہ وہ صلح کے ساتھ رہتے تھے، اس لئے مصالحت کرنے والے کفار کی طرح ان سے جنگ نہیں کی جاتی تھی، البتہ روح المعانی میں آیت ﴿ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ ﴾ کے تحت ابن عباسؓ سے آیت ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ﴾ سے ان آیتوں کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے، حالانکہ مصالحت والوں سے جنگ نہ کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں کے نازل ہونے کے وقت صلح چاہنے والوں کی درخواست کا منظور کرنا واجب ہوگا، اس اعتبار سے حکم منسوخ ہو سکتا ہے، چنانچہ اب امام کو اختیار ہونا شرعی مسئلہ ہے، یا ایک معین مدت کے بعد صلح کے ٹوٹنے کے اعلان کو صورت کے لحاظ سے نسخ کہہ دیا۔ لہٰذا امام کو اس وقت بھی اختیار تھا اگر چہ ظاہری طور پر اس کا ذکر نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اقرار کی طرح قدرت واستطاعت کی شرط کے ساتھ ہجرت بھی فرض تھی اور اسلام کے قبول کرنے اور احکام کے اجرا کی بنیاد تھا، جیسا کہ اب یہی حالت اقرار کی ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں تیسیر سے اس کی فرضیت کی تصریح کی ہے، لہٰذا جو منافق مدینہ میں رہتے تھے جو کہ دار الاسلام تھا وہ بظاہر اس فرض پر عمل کرتے تھے، اس لئے اقرار کرنے والے کی طرح ان سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا، برخلاف پہلی اور تیسری روایت والوں کے کہ وہ ہجرت کو ترک کرنے والے اور دار الاسلام میں قیام نہ کرنے والے تھے، اس لئے ان کا حکم عام کفار جیسا ہوا، اسی لئے دوسری آیت میں ولی نہ بنانے کے لئے جو کہ ایمان قبول نہ کرنے کے مرادف ہے کیونکہ ایمان ولی بنانے کے جواز کے شرائط میں سے ہے، اس لئے ﴿ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ﴾ کو غرض وغایت قرار دیا ہے، اور معالم سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت والوں کو جن لوگوں نے مسلمان کہا تھا، اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ کیا صرف اپنا وطن نہ چھوڑنے کی وجہ سے انہیں کافر کہا جائے گا؟ لیکن چونکہ اس وقت ہجرت کی حالت زبان سے اقرار جیسی تھی تو اس وجہ کا جواب ظاہر ہے کہ وہاں اس کو اقرار ترک کرنے والے کی طرح کافر کہا جائے گا۔ احقر نے جو پہلی روایت کے ذیل میں تاویل کو اور اس کے غیر معتبر

ہونے کو اجمال کے ساتھ لکھا تھا، اس سے دونوں کی تعیین اور بیان بھی ہوسکتا ہے، اور یہ تمہید موقوف علیہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ آیتوں سے پہلے لکھ دی گئی، لیکن آیتوں کی تفسیر کے مطالعہ کے بعد بھی اس کو دوبارہ دیکھ لینا مفید ہوگا۔

بعض خاص حالات میں جہاد کے بعض خاص احکام:

پہلے فرقہ کا بیان: (جب تم ان مرتد لوگوں کی حالت دیکھ چکے) پھر تمہیں کیا ہوا کہ ان منافقوں کے سلسلہ میں (آپس میں اختلاف کرکے) دو فریق ہوگئے (ایک گروہ ان کو بھی مسلمان کہتا ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے (برے) عمل کے سبب (ان کے اعلانیہ کفر کی طرف) الٹا پھیر دیا (بدعمل سے مراد ارتداد کی راہ اختیار کرکے قدرت کے باوجود دارالاسلام کو چھوڑ دینا ہے جو کہ اسلام کے اقرار کو ترک کرنے کی طرح کفر کی علامت تھی اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ جن کو دارالاسلام کا یہ ترک کرنا کفر کی علامت ہونا معلوم نہیں) ایسا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جبکہ ان لوگوں نے گمراہی اختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور عادت ہے کہ کسی فعل کے عزم کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ کہ گمراہ لوگوں کو جو مؤمن کہتے ہو، جبکہ مؤمن وہ ہے جس میں ایمان ہو، اور اس وقت تک ایمان ہے نہیں تو کیا اب تم ایمان پیدا کروگے؟ تاکہ اس کو مؤمن کہہ سکو، حالانکہ یہ محال ہے تو ان کا مؤمن اور ہدایت یافتہ ہونا محال ہے، اس لئے ان کو مؤمن کہنا محال کا حکم لگانے کی طرح ہے) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں، اس کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی راستہ نہیں پاؤگے، (لہٰذا ان لوگوں کو مؤمن نہیں کہنا چاہئے اور بھلا وہ خود تو کیا مؤمن ہوں گے، ان کے کفر میں غلو کرنے کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (اللہ نہ کرے) کافر بن جاؤ جس میں تم اور وہ سب ایک طرح کے ہوجاؤ (جب ان کی یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ مسلمانوں کی دوستی کے جواز کے لئے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی اسلام کی تکمیل کے لئے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو اب شہادتین کے اقرار کا ہے اور اسلام کی تکمیل کی قید اس لئے ہے کہ خالی دارالاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہل تجارت بھی آجاتے ہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی حیثیت میں آئیں، یعنی اسلام کو بھی ظاہر کریں، تاکہ اقرار اور ہجرت کے جامع ہوجائیں، اور رہی تصدیق تو وہ صرف اللہ کے نزدیک شرط ہے، اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو جہاں بھی انہیں پاؤ ان کو پکڑو اور قتل کرو (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لئے ہے یا غلام بنانے کے لئے ہے) اور ان سے کسی کو دوست مت بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی بھی حالت میں ان میں سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں مدد بلکہ بالکل الگ تھلگ رہو)

دوسرے فرقہ کا بیان:

مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو (کہ تمہارے ساتھ مصالحت سے رہنا چاہتے ہیں جس کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ صلح کے واسطہ سے ہو، یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی معاہدہ کر لیتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے (جیسے بنو مدلج کہ ان سے صلح ہوئی تو ان سے معاہدہ کرنے والے بھی اس استثنا میں آ گئے تو بنی مدلج درجۂ اولیٰ میں مستثنیٰ ہوئے) یا (دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بغیر صلح کے ہو اس طرح کہ) خود تمہارے پاس اس حالت میں آئیں کہ ان کے دل اس سے بچتے ہیں کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں (اس لئے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں، بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی۔ لہٰذا دونوں طریقوں میں سے جس طریقہ سے بھی کوئی مصالحت رکھے وہ پکڑنے اور قتل کرنے کے مذکورہ حکم سے مستثنیٰ ہے) اور (تم ان لوگوں کی صلح کی درخواست میں اللہ تعالیٰ کا احسان مانو کہ ان کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی، ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تمہارے اوپر مسلط (اور دلیر) کر دیتا، پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس پریشانی سے بچا لیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کریں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کئی الفاظ تاکید کے لئے فرما دیئے) تو (صلح کی اس حالت میں) اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں رکھی (یعنی اجازت نہیں دی)

تیسرے فرقہ کا بیان:

اور بعض لوگ تمہیں ایسے بھی ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہوگی) کہ (مکر و فریب کی خاطر) جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں (اور اس کے ساتھ ہی) جب کبھی ان کو (کھلے مخالفوں کی طرف سے) شرارت (وفساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ مکر و فریب کی صلح توڑ دیتے ہیں) تو اگر یہ لوگ (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ رہیں، اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب حسب سابق ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو جہاں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو اور ہم نے تمہیں ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے ان کے خون کا مباح ہونا ظاہر ہے، اور وہ حجت ان کا عہد توڑنا ہے)

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ

مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَإِنْ كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾

ترجمہ: اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے لیکن غلطی سے۔ اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کردے تو اس پر ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے اور خون بہا ہے جو اس کے خاندان والوں کو حوالہ کردی جاوے، مگر یہ کہ وہ لوگ معاف کردیں، اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو تو خون بہا ہے جو اس کے خاندان والوں کو حوالہ کردی جاوے اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا پھر جس شخص کو نہ ملے تو متواتر دو ماہ کے روزے ہیں، بطریق توبہ کے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں۔

ربط: اوپر سے قتل وقتال کا ذکر چلا آرہا ہے اور قتل کی ابتدائی طور پر آٹھ صورتیں ہیں کہ مقتول چار حال سے خالی نہیں، یا تو وہ (۱) مؤمن ہے یا (۲) ذمی یعنی جو جزیہ ادا کر کے دار الاسلام میں رہتا ہو اور اسلامی حکومت نے اس کی جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہو۔ (۳) یا مصالح ومستامن یعنی اسلامی حکومت کے ساتھ صلح کر کے پر امن طریقہ سے رہتا ہو یا (۴) حربی یعنی اسلامی حکومت سے لڑتا، جنگ کرتا ہو۔ اور قتل دو طرح کا ہے (۱) عمداً یعنی جان بوجھ کر اور قصداً یا (۲) خطأً یعنی غلطی سے قتل ہو گیا ہو، اس اعتبار سے قتل کی آٹھ صورتیں ہوئیں:

اول مؤمن کا قتل عمد، دوسرے: مؤمن کا قتل خطا، تیسرے ذمی کا قتل عمد، چوتھے ذمی کا قتل خطا، پانچویں مصالح کا قتل عمد، چھٹے مصالح کا قتل خطا، ساتویں حربی کا قتل عمد اور آٹھویں حربی کا قتل خطا۔ ان صورتوں میں سے بعض کا حکم تو اوپر معلوم ہو چکا، بعض کا ذکر آگے ہے، اور بعض کا حدیث میں موجود ہے، چنانچہ پہلی صورت کا دنیاوی حکم یعنی قصاص کا واجب ہونا سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے، اور آخرت سے متعلق حکم آگے آیت ﴿ وَمَن يَقْتُلْ ﴾ الخ میں آیا ہے اور دوسری صورت کا حکم اگلی آیت ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ﴾ سے ﴿ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ﴾ تک میں آرہا ہے، تیسری صورت کا حکم دار قطنی کی حدیث میں ہے، ذمی کے عوض میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے قصاص لیا (زیلعی تخریج الہدایہ) چوتھی صورت کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ﴾ میں آتا ہے۔ پانچویں صورت کا ذکر اوپر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴾ میں آچکا ہے، چھٹی صورت کا حکم چوتھی صورت کے حکم کے ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے، کیونکہ میثاق یعنی معاہدہ عام ہے خواہ دائمی یعنی ہمیشہ کے لئے ہو یا کچھ معین وقت کے لئے جس میں ذمی اور مستامن دونوں آگئے۔ درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں

مستأمن کی دیت کے واجب ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صورت کا حکم خود جہاد کا حکم دیئے جانے سے اوپر معلوم ہو چکا، کیونکہ جہاد میں لڑنے والے قصداً مقتول ہوتے ہیں ایسی صورت میں خطاء کا جواز اس سے بہتر طور پر ثابت ہو گیا۔

بائیسواں حکم: قتل کی بعض صورتوں کے احکام کی تفصیل:

اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو (پہل کر کے) قتل کرے لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر (شریعت کے مطابق) ایک مسلمان غلام یا باندی کا آزاد کرنا واجب) ہے اور خون بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں، وراثت کے حصوں کے بقدر) حوالہ کر دی جائے (اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کے وارثوں کے قائم مقام بیت المال ہے) مگر یہ کہ وہ لوگ (اس خون بہا کو) معاف کر دیں (خواہ کل یا بعض اتنی ہی معافی ہو جائے گی) اور اگر وہ (غلطی سے قتل ہونے والا) ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں (یعنی حربی ہیں اور انہی میں کسی وجہ سے رہتا تھا) اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان آزاد کرنا (پڑے گا اور دیت اس لئے نہیں کہ اگر اس مقتول کے وارث مسلمان ہیں تب تو وہ مسلم حاکم کی ولایت کے تحت نہ ہونے کی وجہ سے مستحق نہیں، لایقضی لھم ولا یقضی علیھم نہ ان کے حق میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی ہے، اور دار الحرب سے ترکہ بیت المال میں نہیں لایا جاتا) اور اگر وہ (مقتول خطا یعنی غلطی سے قتل ہونے والا) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ (صلح کا یا ذمہ کا) ہو (یعنی ذمی یا مصالح و مستأمن ہو) تو خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کر دی جائے (کیونکہ کافر، کافر کا وارث ہوتا ہے) اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کو آزاد کرنا پڑے گا) پھر (جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام، لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنی رقم ہو کہ خرید سکے) تو (اس کے ذمہ اس آزاد کرنے کے بجائے) متواتر (یعنی پے در پے، لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) توبہ کے طور پر جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوتی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، حکمت والے ہیں (اپنے علم و حکمت سے مصلحت کے مطابق احکام مقرر فرمائے ہیں، اگر چہ ہر جگہ حکمت بندہ کو معلوم نہ ہو)

فائدہ: یہاں چند مسائل کا لکھنا ضروری ہے۔

مسئلہ (۱): قتل کی تین قسمیں ہیں: (۱) عمد جو ظاہر اقصد سے ایسے آلہ کے ذریعہ واقع ہو جو آہنی یا جسم کے اعضاء کو الگ کرنے میں آہنی جیسا ہو، دھار والا بانس یا دھار والا پتھر یا آگ۔ دوسرے: شبہ عمد جو قصداً تو ہو مگر ایسے آلہ سے نہ ہو۔

تیسرے: خطاً یا تو قصد وگمان میں کہ دور سے آدمی کو شکار یا کافر حربی سمجھ کر نشانہ لگادیا یا فعل میں کہ نشانہ تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جالگا، اس آیت میں خطا سے مراد غیر عمد ہے، لہٰذا دوسری اور تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں، دونوں میں دیت بھی ہے اور گناہ بھی، مگر ان دونوں معاملوں میں دونوں قسموں میں فرق ہے۔ دوسری قسم کی دیت سو اونٹ ہیں چار قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے پچیس پچیس اور تیسری قسم کی دیت سو اونٹ ہیں پانچ قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے بیس بیس۔ البتہ اگر دیت میں نقد دیا جائے تو دونوں قسموں میں ایک ہزار دینار شرعی یا دس ہزار درہم شرعی ہیں، اور گناہ قصد کی وجہ سے دوسری قسم میں زیادہ ہے اور تیسری قسم میں کم، صرف بے احتیاطی کا (ہدایہ) چنانچہ رقبہ کی تحریر یعنی غلام یا لونڈی کے آزاد کرنے کا وجوب اور لفظ توبہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے، اور ان تینوں قسموں کی یہ حقیقت دنیا میں شرعی احکام کے وجوب کے اعتبار سے ہے اور گناہ کے اعتبار سے عمد و غیر عمد ہونے کا دارومدار اللہ کے نزدیک دل پر ہے، جس پر آئندہ کی وعید کا دارومدار ہے۔ وہ اللہ کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ اس اعتبار سے پہلی قسم غیر عمد اور دوسری قسم عمد ہو جائے، اسی لئے احقر نے تعریفوں میں ظاہراً کی قید لگائی جیسا کہ ہدایہ سے سمجھ میں آتا ہے اور وہ ظاہر ہے۔

مسئلہ (۲): دیت کی یہ مقدار جس کا ذکر کیا گیا، اس وقت ہے جب مقتول مرد ہو اور اگر مقتول عورت ہو تو اس کی دیت نصف ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے، اس کی دلیل بیہقی کی حدیث ہے: **قال رسول الله صلى الله عليه وسلم دية المرأة على النصف من دية الرجل**: یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلہ میں نصف ہے۔ اسی طرح شرح نقایہ میں ہے، اور قرآن مجید میں دیت مجمل ہے، چنانچہ حدیث سے تفصیل اور فرق کے ساتھ اس کا بیان ہو گیا اور اس کی تفسیر بھی ہو گئی۔

مسئلہ (۳): دیت مسلم اور ذمی کی برابر ہے، اس کی دلیل حدیث ہے: **قال عليه السلام دية كل ذي عهد في عهده الف دينار**: یعنی ہر معاہدہ والے کی دیت اس کے معاہدہ کی حالت میں ایک ہزار دینار ہے (جیسا کہ ہدایہ میں ہے، اس کو ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے جیسا کہ شرح نقایہ میں ہے، اور ظاہراً قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ دونوں جگہ دیت کو ایک ہی عنوان سے ذکر فرمایا ہے، اور ظاہراً کی قید اس لئے لگائی کہ فرق قرار دینے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں دلائل سے معلوم ہوا کہ دونوں عنوانوں کا مصداق مختلف ہے۔

مسئلہ (۴): کفارہ یعنی ﴿ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ﴾ یا صیام یعنی روزے خود قاتل کو ادا کرنے پڑتے ہیں اور دیت قاتل کے مددگاروں پر ہے، جن کو شریعت کی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں، اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: **قال عليه السلام لأولياء الجاني قوموا فدوه كذا في الهداية**: اس کو طبرانی نے اپنی معجم میں روایت کیا ہے جیسا کہ علی القاری نے کہا ہے۔ اور یہ قرآن مجید میں بیان امر کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اصل وجوب قاتل ہی پر ہے، لیکن اس وجہ سے کہ اس کے قاتل کا جرم خطا میں خطا ہونے کے اعتبار سے اور شبہ عمد میں آلہ کی طرف نظر سے کہ وہ قتل کے

لئے وضع نہیں کیا گیا، خفیف ہے، اس لئے اتنی بڑی رقم اس کے ذمہ ڈالنا مناسب نہیں، اور عاقلہ کی تخصیص اس لئے ہے کہ آدمی اپنے انصار کے زور پر ایسی بے احتیاطی کیا کرتا ہے۔ آئندہ وہ لوگ بھی اس کو روک کر رکھیں گے، اور اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے، اس طرح اس کے یہ مددگار وجود میں اس کے قائم مقام ہیں، اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود اس پر وجوب نہیں بلکہ قاتل بھی اس وصولیابی میں داخل ہوتا ہے (ہدایہ) اور اگر آیت میں لفظ علیہ مقدر نہ مانیں صرف فالواجب مقدر مانیں تو علیہ و علیہم دونوں اس میں شامل ہو جائیں گے اس طرح تنازعہ کا شبہ بھی نہ رہے گا۔ رہا آیت ﴿ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴾ یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا سے تعارض کا شبہ ہو تو وہ اس تقریر سے دور ہو گیا کہ ان کی جانب سے ایک طرح حفاظت میں کوتاہی رہی۔ یا ﴿ لَا تَزِرُ ﴾ کو گناہ کے ساتھ خاص قرار دیا جائے تو سرے سے شبہ ہی نہ رہے گا۔

مسئلہ (۵): کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہیں۔ لفظ رقبۃ مرد و عورت دونوں کے لئے عام ہے، البتہ اس کے اعضا صحیح و سالم ہوں، کیونکہ مطلق سے مراد کامل ہوتا ہے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مسئلہ (۶): مقتول کی دیت شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگی اور جو اپنا حصہ معاف کر دے گا، اس کے حصہ کی مقدار اس میں سے معاف ہو جائے گی، اگر سب نے معاف کر دیا تو سب معاف ہو جائے گی، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مسئلہ (۷): جس مقتول کا کوئی شرعی وارث نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دیت ترکہ ہے اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔

مسئلہ (۸): ﴿ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ ﴾ کے ترجمہ میں لفظ 'صرف' کہنے کی وجہ اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے کہ اس صورت میں دیت نہیں۔ اس کی دلیل بھی اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے، ایسے شخص کا ترکہ بیت المال میں لانے کا حکم کہیں نظر سے نہیں گذرا، اور بظاہر ولایت کے الگ ہو جانے کی وجہ سے اس کی نفی ہے، اور اسی میں یہ قید "وہیں رہتا تھا" اس لئے لگائی کہ اگر یہ شخص دارالاسلام میں ہو تو چونکہ اس کا ترکہ بیت المال کا حق ہے، لہٰذا اس کی دیت واجب ہوگی، جیسا کہ درمختار سے سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اگر ایسے مقتول کا کوئی وارث دارالحرب میں مسلمان ہو تو ظاہر یہ ہے کہ اس وقت بھی دیت واجب ہوگی، جیسا کہ الدر سے سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ مسلمان ان معاہدہ والے کافروں سے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے کم نہیں اور وہاں دیت تھی، لیکن اس کے بعد روح المعانی سورۂ فتح کی آیت ۲۵ کے ذیل میں یہ مسئلہ کافی سے منقول نظر سے گذرا کہ جو مسلمان دارالحرب میں رہتا ہو اور اس کو کوئی قتل کر دے اور اس کے وارث مسلمان بھی ہوں تو عمد میں صرف گناہ ہے اور خطا میں صرف کفارہ ہے، دیت نہیں۔ پھر درمختار قبیل فصل استیمان میں بھی یہی مسئلہ پایا گیا۔

مسئلہ (۹): اہل معاہدہ کے باب میں جو دیت واجب ہے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اہل کے پائے جانے کی صورت میں ہے اور اگر اہل نہ ہوں یا وہ اہل مسلمان ہونے نہ ہونے کے برابر ہیں تو اگر وہ ذمی ہے تو دیت ہوگی اور بیت المال میں آئے

گی، کیونکہ ذمی کا ترکہ جس میں دیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے۔ ورنہ واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ اس کے اہل کو سونپنا صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ (۱۰): ہندوستان (برصغیر ہند) میں رقبہ نہیں ملتا، ظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں لم یجد صادق آئے گا، اس لئے عرب میں دام بھیجنا واجب نہیں، اس لئے کہ اس میں دشواری لازم آتی ہے، یہی حال دوسرے کفاروں کا ہے جیسے قسم اور ظہار وغیرہ اس لئے صیام جائز ہے۔

مسئلہ (۱۱): صیام میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تتابع یعنی پے درپے یالگا تار نہ رہا تو نئے سرے سے رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض سے اس تتابع میں حرج لازم نہیں آتا، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مسئلہ (۱۲): اگر کسی وجہ سے صیام پر قدرت نہ ہو تو قدرت حاصل ہونے تک توبہ کیا کرے۔

مسئلہ (۱۳): قتل عمد میں یہ کفارہ نہیں اس لئے توبہ کرنی چاہئے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہے۔

تنبیہ: یہاں جن مسائل میں عموماً یا خصوصاً حوالوں کا ذکر نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس کتابیں کم ہیں، وہ حوالے نظر سے نہیں گذرے محض قواعد کی بنیاد پر لکھا ہے، اگر کسی کو غلطی کا پتہ چلے، درست فرمادیا جائے اور لکھنے کی ضرورت موقع ومحل کا تقاضا تھا کہ شقوں کی تکمیل اس پر موقوف تھی۔ واللہ اعلم

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہونگے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا کا سامان کریں گے۔

ربط: اوپر کی آیت کی تمہید میں قتل کی جن آٹھ صورتوں کا ذکر ہوا ان میں سے پہلی صورت کا بیان اب ہوتا ہے، چنانچہ یہ ماقبل کا تتمہ ہے۔

مؤمن کے قتل پر سخت وعید: سابق حکم کا تتمہ:

اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنا ہے (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصل سزا جاری نہ ہوگی، بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے، اور اس کو اپنی رحمت (خاص) سے دور کریں گے، اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی دوزخ کی سزا) کا سامان کریں گے۔

تفسیر: تمام اہل حق اس امر پر متفق ہیں کہ کفر اور شرک کے سوا کوئی امر جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے داخلہ کا سبب نہیں ہے،

اس دعویٰ پر بیشمار آیتیں اور حدیثیں دلالت کرتی ہیں، اس آیت کے بعض ظاہری الفاظ سے اس بیان کے خلاف شبہ ہوتا تھا، لیکن اس کا صحیح مطلب ترجمہ سے ظاہر ہونے کے بعد وہ شبہ دور ہوگیا۔

البتہ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ان ظاہری الفاظ کے مطابق مشہور ہے، اور ان کا قول سورۂ فرقان کی آیتوں ۶۷ و ۶۸ کے بعد ۶۹ میں جو قتل کے ذکر کے بعد ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ آیا ہے، اس کے تعارض کے جواب میں یہ منقول ہے کہ سورۂ فرقان مکی ہے اور سورۂ نساء مدنی، اس لئے وہ استثناء اس بعد والے مطلق سے مرتفع ہوگیا، اور دوسرا جواب یہ منقول ہے کہ وہ توبہ کی قبولیت مشرکوں کے لئے ہے، جو بعد میں مسلمان ہوجائیں، لیکن روح المعانی میں ابن حمید اور نحاس کی روایت سے سعید بن عبیدہ سے منقول ہے کہ حضرت ابن عباسؓ قاتل مؤمن کی توبہ قبول ہونے کے قائل تھے، چنانچہ ایک بار ایک شخص نے ان سے آکر پوچھا کہ کیا قاتل کی توبہ قبول ہوجاتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، بس اس کے لئے دوزخ ہی ہے، جب وہ شخص اٹھ کر چلا گیا تو حاضرین نے اس جواب پر جو ان کے پہلے فتویٰ کے خلاف تھا تعجب ظاہر کرتے ہوئے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ایسا گمان ہوا کہ وہ غصہ میں کسی مؤمن کو قتل کرنا چاہتا ہے، چنانچہ کسی کو تحقیق کے لئے اس کے پیچھے دوڑایا تو یہی بات نکلی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ کا مشہور قول مصلحت کی بنیاد پر تھا، اصل مذہب جمہور کے مطابق ہی تھا چنانچہ روح میں سفیان سے بھی نقل کیا ہے کہ اہل علم سے جب کوئی ابتداً اس کو پوچھتا تو جواب میں یہی کہتے کہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی، لیکن جب کوئی اس گناہ میں مبتلا ہوجاتا تو اس کو توبہ کا حکم فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ابن عباسؓ کے سوا دوسرے بزرگوں کا بھی یہی عمل تھا۔

یہ تو ان کے مذہب کی تحقیق تھی، رہ گیا سورۂ فرقان کے استثنا کا پہلے ہونا تو نسائی میں حضرت زید سے دو روایتیں پاس پاس منقول ہیں، ایک کا مضمون یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ فرقان کی آیت سے آٹھ مہینے بعد نازل ہوئی اور دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم بہت ڈرے، اس کے بعد سورۂ فرقان کی آیت نازل ہوئی، چونکہ دونوں حدیثوں کے راوی ثقہ، معتبر ہیں تو صحیح حدیثوں میں تعارض نہیں ہوسکتا، اس لئے ان کے درمیان تطبیق کے طور پر کہا جائے گا کہ سورۂ فرقان کی آیت کا جو حصہ استثنا سے پہلے ہے وہ تو پہلے نازل ہوا، اور اس کی تائید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، چونکہ اس آیت میں سورۂ فرقان کی آیت کے برخلاف صرف قتل پر وعید ہے، جبکہ اُس میں قتل کے ساتھ شرک کا بھی ذکر ہے کہ خلود کے حکم کا اس طور پر ہونے کا احتمال ہے، اس لئے اس آیت سے زیادہ خوف ہوا، اس وقت سورۂ فرقان کا استثنا والا حصہ نازل ہوا جس میں توبہ قبول ہونے کا وعدہ ہے، مگر چونکہ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ اور عامل کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے شاید پہلا حصہ دوبارہ نازل ہوا ہو، لہٰذا سورۂ فرقان کی آیت کا نزول میں پہلے اور بعد میں ہونا دونوں حکم صحیح ہوگئے، اور استثنا کا بعد میں ہونا قائم رہا، البتہ چونکہ ہر عمل کے توبہ کے شرائط جداگانہ ہیں، بہرحال ہمیشہ کے لئے داخل نہ ہونا جو اصل مقصود ہے، وہ ثابت ہوگیا۔ رہا مشرکوں کے بارے میں نازل ہونا تو چونکہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہے، اس لئے خاص مورد ہونے میں

کوئی ضرر نہیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے، یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں۔ اس طور پر تم دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو۔ کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں۔ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر مؤمن کے قتل پر سخت وعید فرمائی ہے، اب فرماتے ہیں کہ شرعی احکام کے جاری ہونے میں مؤمن کے مؤمن ہونے کے لئے صرف ظاہری اسلام کافی ہے، جو شخص اسلام کا اظہار کرے اس کے قتل سے ہاتھ روک لینا واجب ہے۔ قرائن سے باطن کی تفتیش کرنا اور اسلامی احکام کے جاری کرنے میں اس کے ثبوت کا منتظر رہنا جائز نہیں، جیسا کہ بعض صحابہ سے بعض غزوات میں غلطی سے واقع ہوا کہ بعض لوگوں کے اسلامی علامات کے اظہار کو تقیہ اور کذب پر محمول کر کے انہیں قتل کر ڈالا اور مقتول کا مالِ غنیمت میں لے لیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا دروازہ بند فرمایا، اور چونکہ اس وقت تک صحابہ کو یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ معلوم نہ تھا، اس لئے صرف فہمائش پر اکتفا فرمایا۔

تیئیسواں حکم: اسلام کے اظہار پر اکتفا کا واجب ہونا:

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو ہر کام کو خواہ قتل ہو یا کچھ اور) تحقیق کرنے کے بعد کیا کرو اور ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے اطاعت (کی علامت) ظاہر کرے (جیسے کلمہ پڑھنا یا مسلمانوں کے طرز پر سلام کرنا) یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو (دل سے) مسلمان نہیں (محض اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ موٹ اسلام کا اظہار کرتا ہے) اس طرح کہ تم دنیاوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو، کیونکہ اللہ کے پاس (یعنی ان کے علم وقدرت میں تمہارے لئے) غنیمت کے بہت مال ہیں (جو تمہیں حق کی مرضی کے طور پر ملیں گے، اور یاد تو کرو کہ) پہلے (ایک زمانہ میں) تم بھی ایسے ہی تھے (کہ تمہارے اسلام کے قبول کرنے کا دارومدار صرف تمہارا اظہار کا تھا) پھر اللہ نے تم پر احسان کیا (کہ اس ظاہری اسلام پر اکتفا کیا گیا اور باطن کی تفتیش پر موقوف نہ رکھا) تو (ذرا) غور (تو) کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (کہ اس حکم کے بعد کون اس پر عمل کرتا ہے اور کون نہیں کرتا)

فائدہ: یہ حکم سفر کے ساتھ خاص نہیں، لیکن چونکہ یہ غلطی اتفاق سے سفر میں ہوئی تھی، اس لئے ذکر میں سفر کی تخصیص

ہوگئی، اور سلام میں مسلمانوں کے طرز کی قید اس لئے ہے کہ اس وقت کفار کا سلام دوسرے طریقہ پر تھا، جیسے: أنعم صباحا اور حیاک اللہ وغیرہ اور ان علامات میں سے اذان اور نماز بھی ہے جو ان میں سے کسی میں مشغول ہو اس کو مسلمان سمجھنا چاہئے۔ اور احسان کرنے کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اب تمہارا اسلام لوگوں کے نزدیک معلوم اور مشہور ہوگیا ہے مگر پہلے سے تو ایسے نہ تھے (کشاف) اور دوسرے ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ کے ایک معنی وہ بھی ہوسکتے ہیں جو پہلے ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ کے تھے، لہٰذا اس صورت میں اسی کا اعادہ ہوگا، پہلا دعویٰ کے طور پر تھا۔ دوسری جگہ نتیجہ کے طور پر ہوگا۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾﴾

ع ۱۳ / ۱۰

ترجمہ: برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے۔ اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجر عظیم دیا ہے۔ یعنی بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

ربط: اوپر جہاد کی فرضیت کا ذکر تھا، اب یہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ جہاد اپنے آپ میں فرض عین نہیں، اور اس لئے اگر بعض لوگ نہ جائیں تو گناہ نہیں، جیسا کہ ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ سے معلوم ہوگا۔ اور ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً﴾ میں صراحت ہے پھر بھی اس کے جو مخصوص فضائل ہیں وہ کرنے ہی پر موقوف ہیں۔

گھر بیٹھے رہنے والوں پر مجاہدین کی فضیلت:

برابر نہیں وہ مسلمان جو کسی عذر کے بغیر گھر بیٹھے رہیں (یعنی جہاد میں نہ جائیں) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے (یعنی مالوں کو خرچ کر کے اور جانوں کو پیش کر کے) جہاد کریں (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر بیٹھنے والوں کی بہ نسبت ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اور اگرچہ فرض عین نہ ہونے کی وجہ سے ان بیٹھنے والوں پر گناہ نہیں، بلکہ ایمان اور دوسرے فرائض عینیہ بجالانے کی وجہ سے) سب سے (یعنی مجاہدین سے بھی اور گھر بیٹھنے والوں سے بھی) اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا (یعنی آخرت میں جنت کا) وعدہ کر رکھا ہے (اور اوپر جو مبہم یعنی اشاروں میں کہا گیا ہے کہ مجاہدوں کا بڑا درجہ ہے، اس کی تعیین یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (مذکورہ) مجاہدوں کو

گھر بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں بڑا اجر عظیم دیا ہے (وہ درجہ یہی اجر عظیم ہے، اس اجر عظیم کے اجمال کی تفصیل بیان فرماتے ہیں) یعنی (ان متعدد اعمال کی وجہ سے جو مجاہد سے صادر ہوتے ہیں ثواب کے) بہت درجے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملیں گے اور (گناہوں کی) مغفرت اور رحمت (یہ سب اجر عظیم کی تفصیل ہوئی، اور اجمال اور تفسیر سب مل کر اُس ابہام کی تفسیر ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

فائدہ: وہ متعدد اعمال سورۂ برأت کی آیت ۱۲۰ و ۱۲۱ میں مذکور ہیں اور مغفرت کی وجہ سورۂ ہود آیت ۱۱۴ میں ہے، چونکہ اس سے اعمالِ عظیمہ سرزد ہوئے، سیئات سے بھی زیادہ اور کیا عجب کہ قرض (حقوق العباد) کے علاوہ تمام سیئات معاف ہوگئی ہوں، اور رحمت کا سبب سورۂ اعراف کی آیت ۵۶ میں ہے۔ غرض فضیلت عطا کرنے کی عقلی دلیل کا بیان ہے کہ چونکہ اس سے عظیم اعمال صادر ہوئے اور ہر عمل ثواب اور درجہ کا سبب اور موجب مغفرت و موجب رحمت ہے، اس لئے فضیلت ثابت ہے، اور عذر کے بغیر کی قید اس لئے لگائی کہ حدیثوں میں صراحت ہے کہ اگر نیک کام کا عزم ہو اور کسی عذر سے نہ کر سکے تو بھی اس کام کا اجر ملتا ہے، چنانچہ فاعل (کام کو انجام دینے والا) اور عازم (عزم کرنے والا) ثواب کی کمیت میں دونوں برابر ہیں، جس کا ذکر کرنا یہاں زیادہ مقصود ہے اور کیفیت میں فرق کچھ دور نہیں، بلکہ عین ممکن ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۟ۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ۟ۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۟ ﴾

ترجمہ: بیشک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنھوں نے اپنے کو گنہ گار کر رکھا تھا تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے، وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکِ وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہئے تھا۔ سو ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور جانے کے لئے وہ بری جگہ ہے۔ لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ راستہ سے واقف ہیں، سو ان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے مغفرت کرنے والے ہیں۔

ربط: اوپر جہاد کے وجوب کا ذکر تھا، اب ہجرت کے وجوب کا ذکر ہے، دونوں میں مناسبت ظاہر ہے کہ دونوں سے غرض اقامت دین ہے، البتہ ایک میں کفار کے شر کا عمومی طور پر دور کرنا ہے، اور دوسرے میں کفار کے شر کا خصوصی طور پر یعنی خود اپنی ذات سے دور کرنا ہے۔

چوبیسواں حکم: ہجرت کا وجوب:

بیشک جب فرشتے ایسے لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جنہوں نے (ہجرت کی قدرت کے باوجود ہجرت کو ترک کرکے) خود کو گنہ گار کر رکھا تھا تو (اس وقت) وہ (فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دین کے) کس (کس) کام میں تھے (یعنی دین کے کیا کیا ضروری کام کیا کرتے تھے؟) وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنے رہن سہن کی سرزمین میں مغلوب تھے (اس لئے دین کی بہت سی ضروری باتوں پر عمل نہیں کر سکتے تھے، یعنی ان فرائض کو ترک کرنے پر مجبور و معذور تھے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہیں کر سکتے تھے تو) کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی، تمہیں وطن چھوڑ کر اس (سے کسی دوسرے حصہ) میں چلا جانا چاہئے تھا (کہ وہاں جا کر فرائض کو ادا کر سکتے، اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور ان کا جرم ثابت ہو جائے گا) لہٰذا ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کے لئے وہ بری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے (واقعی ہجرت پر بھی) قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہوں اور نہ راستے سے واقف ہوں تو ان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے مغفرت والے ہیں۔

فائدہ: ابتدائے اسلام میں ہجرت کی فرضیت کا بیان رواں سورت کی آیت ۸۸ کی تمہید میں گذر چکا ہے، یہ زجر و توبیخ، سرزنش اور عذاب کی بات اسی فرض کو ترک کرنے پر کہی گئی ہے اور یہاں روح قبض کرنے کو فرشتوں کی طرف منسوب فرمایا ہے جیسا کہ ایک اور آیت میں بھی ہے ﴿ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا ﴾ (الانعام ۶۱) اور ایک آیت میں ملک الموت یعنی موت کے فرشتہ کی طرف نسبت فرمائی ﴿ يَتَوَفّٰٮكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ ﴾ (سورۃ السجدۃ ۱۱) اور ایک آیت میں خود اپنی طرف نسبت فرمائی ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الۡاَنۡفُسَ حِيۡنَ مَوۡتِهَا ﴾ (الزمر ۴۲) ان آیتوں میں تطبیق یا مطابقت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ روح کے حقیقی طور پر قبض کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اور ظاہری ملک الموت اور دوسرے ملائکہ ان کے معین و شریک۔

اور یہاں دو شبے ہوا کرتے ہیں: ایک یہ کہ جب یہ مستثنیٰ لوگ گنہ گار ہی نہیں تو معافی کے کیا معنی؟ دوسرے معافی میں امید کیسی جس سے تردد ظاہر ہوتا ہے؟ پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ معافی اس لئے کہا کہ فی نفسہ یعنی اپنے آپ میں تو وہ گناہ ہے خواہ کسی خاص مستحق کے حق میں گناہ نہ لکھا جائے، کسی جگہ اس نہ لکھنے کو گناہ نہ ہونا قرار دیدیا اور کہیں معافی کے لفظ سے اس کا فی نفسہ گناہ ہونا بتادیا، اس وضاحت سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ بچے کو تو بالکل گناہ ہی نہیں ہوتا، اس شبہ کے دور ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ اگرچہ اس کو گناہ نہ ہو، لیکن وہ فعل تو اپنے آپ میں قبیح اور برا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ لفظ ولدان اس لئے ملادیا تاکہ اشارہ اس طرف ہو کہ ولدان یعنی بچوں کی طرح عاجز و مجبور ہونا چاہئے، تب مستثنیٰ ہوں گے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ کریم کا امید دلانا وعدہ ہے، جیسا کہ آیت ﴿فَقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ میں عسی کے ترجمہ کے ساتھ اس کا بیان آچکا ہے۔ باقی اس عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ گناہ اس درجہ سخت ہے کہ عذر

ہونے اور گناہ نہ ہونے کے باوجود اس کے مشابہ ہے کہ جب گناہ ہوا ہو، اگرچہ معاف ہو گیا ہو۔

﴿ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٠٠﴾ ﴾ ع

ترجمہ: اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی، اور بہت گنجائش۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرونگا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا، اللہ تعالیٰ کے ذمہ، اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں، بڑی رحمت والے ہیں۔

ربط: اوپر ہجرت ترک کرنے پر وعید تھی، اب ہجرت کی ترغیب اور اس پر سعادت دارین یعنی دونوں عالم دنیا و آخرت کی خوش قسمتی و نیک بختی کا وعدہ ہے۔

ہجرت کی فضیلت و ترغیب:

اور (جن لوگوں کے لئے شریعت نے ہجرت کا حکم دیا ہے، ان میں سے) جو شخص اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے لئے) ہجرت کرے گا اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی، اور (دین کے اظہار کی) بہت گنجائش ملے گی (لہٰذا اگر ایسی جگہ پہونچ گیا تب تو دنیا میں بھی اس سفر اور اظہار سے کامیابی ظاہر ہے) اور (اگر اتفاق سے یہ مذکورہ کامیابی نہ ہوئی تب بھی آخرت کی کامیابی میں تو کوئی شک ہی نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ و رسول (کے دین کو ظاہر کر سکنے کے موقع) کی طرف ہجرت کروں گا، پھر (مقصد کے حصول اور منزل تک پہنچنے سے پہلے) اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب (جس کا ہجرت پر وعدہ کیا گیا ہے) ثابت ہو گیا، (جو کہ وعدہ کی وجہ سے اللہ نے اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے اور اگرچہ ابھی اس سفر کو ہجرت نہیں کہہ سکتے، لیکن صرف اچھی نیت سے اس کو شروع کر دینے پر پورا صلہ عطا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (اس ہجرت کی برکت سے کہ اگرچہ ان کی ہجرت پوری نہیں ہوئی ناقص رہی پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کے بہت سے گناہ معاف فرما دیں گے جیسا کہ حدیث میں ہجرت کا سابق گناہوں کا کفارہ ہونا بیان کیا گیا ہے، اور بڑے رحمت والے ہیں (کہ عمل شروع کرنے کو حسن نیت کی وجہ سے ثواب میں کمال عمل کے برابر فرما دیا)

فائدہ (۱): روح المعانی میں ہجرت کی فرضیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے، البتہ یہ اب بھی مستحب ہے اور صحیح مسلم کی حدیث میں حضور ﷺ کے ایک اعرابی کو جس نے ہجرت کی اجازت چاہی تھی، یہ فرمانے سے إن شأن الهجرة لشديد یعنی ہجرت کا معاملہ بہت سخت ہے اور وطن میں رہنے کے لئے ارشاد فرمانے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس کے

ہجرت کے عزم سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دار الاسلام میں نہیں تھا۔

فائدہ (۲): گذشتہ آیتوں میں ہجرت کی بحث کئی مواقع پر آئی ہے، اس لئے اس کے متعلق ایک جامع ومختصر تحریر جس سے تمام مواقع کی اچھی طرح وضاحت ہوجائے لکھی جاتی ہے، جس کا ماخذ، روایات اور قواعد اور علماء کے اقوال اور نصوص کے اشارات ہیں، ان دلائل کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں ہجرت فرض تھی اور فرضیت کے ساتھ وہ ظاہری طور پر اسلام کا لازمی شعار تھی اور اسلام کا ثبوت اس پر موقوف تھا، لیکن عذر کی حالت میں اس کا فرض اور شعار ہونا ساقط ہوجاتا تھا، جیسا کہ کلمہ شہادت یعنی اللہ کے معبود اور محمدؐ کے رسول ہونے کے اعلان کی اب بھی یہی شان ہے اور رسول اللہ ﷺ کے دور میں صحابہ کے اقوال سے نماز کی بھی یہی شان معلوم ہوتی ہے، اور اس کے شعار ہونے کی وجہ سے اس کو بغیر کسی عذر کے نہ کرنا مرتد ہونے کی علامت تھی، اس بنا پر گذشتہ آیتوں میں ہجرت نہ کرنے والوں کو مسلمان سمجھنے سے صحابہ کو منع فرمایا، اگرچہ ہجرت نہ کرنے والے واقع میں بھی مرتد ہوگئے ہوں، مگر صحابہ سے تو اسی مذکورہ بنا پر کلام ہے اور دل کی تحقیق کا حکم نہیں ہے، اور عذر میں بلکہ عذر کے احتمال میں بھی شعار کے ساقط ہونے کی بنا پر دار الحرب میں قتل ہونے والے مؤمن کی دیت کے وجوب کا اور ﴿لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ﴾ جس نے تمہیں سلام کیا اس کے قتل کی حرمت کا حکم فرمایا۔ اور صرف دوسری علامات مثلاً اقرار وغیرہ پر اکتفا کو واجب کیا گیا، اور فرضیت کی بنا پر ہجرت ترک کرنے والوں پر وعید فرمائی اور عذر میں فرض کے ساقط ہونے پر مستضعفین کمزوروں کو مستثنیٰ کیا گیا، لہٰذا اس طرح پہلا مضمون نہ کرنے پر مبنی ہے، پھر شعار ہونے اور نہ ہونے پر اور آگے فرض ہونے اور نہ ہونے پر مبنی ہے، اور چونکہ یہ شعار ہونا غور وفکر کا محتاج ہے، اس لئے بعض صحابہ کو شبہ ہوگیا تھا اور چونکہ غور وتدبر کرنے سے شبہ خود ہی دور ہوسکتا تھا، اس لئے تنبیہ کردی گئی، جیسا کہ زکوٰۃ دینے سے منع کرنے والوں کے سلسلہ میں شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی گفتگو حدیث کی کتابوں میں درج ہے اور شعار کے لازم ہونے میں تبدیلی ہوسکتی ہے، اس بنا پر فقہاء نے لباس کی بعض وضع کو کفر فرمایا ہے۔ فقط۔

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝۱۰۱﴾

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کردو، اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے، بلاشبہ کافر لوگ تمہارے صریح دشمن ہیں۔

ربط: اوپر جہاد اور ہجرت کا ذکر تھا، اور چونکہ اکثر حالات میں جہاد اور ہجرت کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے اور ایسے سفر میں اکثر مخالف کی طرف سے اندیشہ بھی ہوتا ہے، اس لئے سفر اور خوف کی رعایت سے نماز میں جو بعض خاص سہولتیں اور

تخفیفیں کی گئی ہیں۔ آگے ان کا ذکر فرماتے ہیں۔

چوبیسواں حکم: سفر کی نماز:

اور جب تم زمین میں سفر کرو (جس کی مقدار کم سے کم تین منزل ہو) تو تمہیں اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا (بلکہ ضروری ہے) کہ تم (ظہر، عصر اور عشاء کے فرض) نماز کی (رکعتوں) کو کم کردو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تمہیں کافر لوگ پریشان کریں گے (اور اس اندیشہ کی وجہ سے ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا جائے، کیونکہ) بلاشبہ کافر لوگ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

مسئلہ (۱): جو سفر تین منزل سے کم ہو اس میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے، یہ آیت مجمل ہے حدیث میں اس کی تفسیر ہے۔

مسئلہ (۲): اور جب سفر میں کسی منزل پر جا پہونچے تو اگر وہاں پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تب وہ سفر کے حکم میں ہے، چار رکعت والی نماز آدھی پڑھی جائے گی، اس کو قصر کہتے ہیں اور اگر پندرہ دن یا زیادہ قیام کا قصد ہو تو وہ مقام وطن اقامت کہلائے گا، وطن اقامت اور وطن اصلی میں قصر نہیں ہوتا، پوری نماز پڑھی جائے گی۔

مسئلہ (۳): قصر صرف تین وقت کے فرائض میں ہے، مغرب اور فجر اور سنتوں اور وتروں میں قصر نہیں ہے۔

مسئلہ (۴): اگر سفر میں خوف نہ ہو تب بھی تمام علماء کا اجماع ہے کہ شریعت میں قصر ہی کا حکم ہے۔ آیت میں جو خوف کی قید ہے، وہ ان آیتوں کے نزول کے زمانہ کے اعتبار سے ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے خوف کا زمانہ تھا، پھر حدیثوں سے عموم ثابت ہوگیا۔

مسئلہ (۵): قصر واجب ہے اور قرآن میں جو اس طرح فرمایا گیا ہے کہ تمہیں گناہ نہیں ہوگا، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ قصر نہ کرنا بھی جائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری نماز کی جگہ نصف پڑھنے میں بظاہر گناہ کا خیال ہوتا تھا، اس لئے اس کی نفی فرمادی، لہٰذا یہ وجوب کے منافی نہیں ہے، جو کہ دوسری دلیل سے ثابت ہے۔

مسئلہ (۶): کشتی کے ذریعہ دریا کا سفر بھی زمین ہی کا سفر ہے، اس میں بھی قصر ہوتا ہے، ہوا کے اعتدال کے ساتھ چلنے کی حالت میں کشتی کے ذریعہ جتنا سفر تین دن میں کرسکے، اس کا اعتبار ہے۔

﴿ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ ﴾

ترجمہ: اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں تو یوں چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ کھڑے ہو جاویں اور وہ لوگ ہتھیار لے لیں، پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو یہ لوگ تمہارے پیچھے ہو جاویں۔ اور دوسرا گروہ جنھوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی آ جاوے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لیں، کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ تو تم پر ایک بارگی حملہ کر بیٹھیں، اور اگر تم کو بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم کو اس میں کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور اپنا بچاؤ لے لو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزا اہانت آمیز مہیا کر رکھی ہے۔

ربط: اوپر والی آیت کی تمہید میں مناسبت کی وجہ بیان ہو چکی ہے۔

پچیسواں حکم: خوف کے وقت نماز پڑھنے کا طریقہ:

اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں (اور اسی طرح آپ کے بعد جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانے کھڑے ہوں (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جائیں گے تو کوئی دشمن موقع پا کر حملہ کر بیٹھے گا) تو (ایسی حالت میں) چاہئے کہ جماعت کے دو گروہ ہو جائیں پھر) ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑا ہو جائے (اور دوسرا نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابلہ میں کھڑا ہو جائے، تا کہ دشمن کو دیکھتے رہیں) اور وہ لوگ (جو آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہوں وہ بھی مختصر مختصر) ہتھیار لئے رہیں (یعنی نماز سے پہلے لے کر ہمراہ رکھیں، شاید مقابلہ کی ضرورت پڑ جائے، تو ہتھیار لینے میں دیر نہ لگے، فوراً جنگ کرنے لگیں، اگر چہ ایسی صورت میں نماز جنگ کی وجہ سے ٹوٹ جائے گی، لیکن اس سے کوئی گناہ نہیں ہوگا) پھر جب یہ لوگ (آپ کے ساتھ سجدہ کر چکیں (یعنی ایک رکعت پوری کر لیں) تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے تمہارے پیچھے ہو جائیں (یعنی رسول اللہ ﷺ کے اور دوسرے گروہ کے جو کہ اب نماز میں شامل ہوں گے، جن کا بیان آگے آتا ہے، یہ پہلا گروہ ان سب کے پیچھے ہو جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی (یعنی شروع بھی نہیں کی، وہ اس پہلے گروہ کی جگہ امام کے قریب) آ جائے، اور آپ کے ساتھ نماز (کی ایک رکعت جو باقی رہی ہے اس کو) پڑھ لیں، اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لئے رہیں (اور سامان اور ہتھیار ہمراہ لینے کا سب کو حکم اس لئے کیا ہے کہ) کافر لوگ تو یہی چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو تم پر ایک ہی بار میں ٹوٹ پڑیں (لہٰذا ایسی حالت میں احتیاط اور ہوشیاری ضروری ہے) اور (اگر تمہیں بارش وغیرہ) کی وجہ سے (ہتھیار لے کر چلنے میں) تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اور اس وجہ سے ہتھیار نہ باندھ سکو) تو تمہیں اس میں (بھی) کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور (پھر بھی) بچاؤ کا سامان (ضرور) لے لو (اور یہ خیال نہ کرو کہ کفار کی دشمنی کا علاج صرف دنیا ہی میں کیا گیا ہے، بلکہ آخرت میں ان کا علاج اس سے بڑھ کر ہوگا، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔

مسئلہ(۱): صلوٰۃ الخوف کے بارے میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی مشروع ہے اور یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ جب آپ ان میں ہوں، یہ اس وقت کی حالت کے اعتبار سے فرمادیا کہ آپ تشریف فرما تھے، اب جو امام ہو، وہ اس میں آپ کا قائم مقام ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ ﴾ یعنی آپ اُن کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے جو انہیں پاکیزہ کردے (التوبہ ۱۰۳) حالانکہ تمام ائمہ اور خلفا کے لئے بھی یہی حکم ہے۔

مسئلہ(۲): جیسے آدمی سے خوف کے وقت یہ نماز مشروع ہے، ایسے ہی اگر کسی شیر یا اژدہا وغیرہ کا خوف ہو اور نماز کا وقت تنگ ہو اس وقت بھی جائز ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے۔

مسئلہ(۳): یہ حکم اس صورت میں ہے جب سارے لوگ ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں ورنہ دونوں گروہ الگ الگ دو اماموں کے ساتھ پڑھ لیں، جیسا کہ درمختار میں ہے، اور اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ﴿ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ ﴾ کی قید میں یہی نکتہ ہو، کیونکہ آپ کے ساتھ نماز پڑھنا سب کو محبوب تھا، تو یہ کلام اس سے کنایہ ہوگا کہ إذا كان فيهم من تنازعوا في الصلوٰة خلفه وحده۔

مسئلہ(۴): یہ نماز صرف اتنے خوف کے وقت ہے کہ اس کا انتظام ممکن ہو اور اگر انتظام نہ ہو سکے تو اس کا حکم سورۂ بقرہ کے چونتیسویں حکم میں بیان ہو چکا ہے اور عین قتال کے وقت نماز کو قضا کر دیا جائے گا۔

مسئلہ(۵): آیت میں دونوں گروہوں کے صرف ایک ایک رکعت پڑھنے کا ذکر فرمایا، دوسری رکعت کا طریقہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو دونوں گروہوں نے اپنی ایک ایک رکعت خود اپنے طور پر پڑھی، جیسا کہ شیخین یعنی امام بخاری و امام مسلم اور ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے عن سالم عن ابیہ روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں یہ بھی اضافہ ہے کہ آگے پیچھے دونوں گروہوں نے یہ باقی رکعت پڑھی، اور یہ حنفیہ کا مذہب ہے۔

مسئلہ(۶): یہ صورت اس وقت ہے جب کہ امام مسافر ہو جیسا کہ غزوات میں اکثر ہوتا ہے، ورنہ امام ہر گروہ کو دو دو رکعت پڑھاوے اور امام کے فارغ ہونے کے بعد دو دو رکعت اپنے طور پر پڑھیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے اور ابوداؤد نے مرفوعاً روایت کیا ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

مسئلہ(۷): اور مغرب میں ایک گروہ امام کے ساتھ دو رکعت پڑھے اور دوسرا گروہ ایک رکعت۔

مسئلہ(۸): حدیثوں میں اور طریقے بھی آئے ہیں، جس طرح ممکن ہو پڑھ لینا سب جائز ہے جیسا ردالمحتار میں ہے۔

مسئلہ(۹): ہتھیار وغیرہ ہمراہ رکھنے کا استحباب حنفیہ کے نزدیک تفسیر احمدی اور شامی میں ہے، لہٰذا یہ ﴿ لَا جُنَاحَ ﴾ ایسا ہوگا جیسا کہ یہ ارشاد ہے ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ﴾ (البقرۃ ۲۳۶) یعنی کوئی کلفت نہ ہو، اس طرح یہاں ہتھیار اپنے ہمراہ نہ رکھنے میں جان کا خطرہ ہے جبکہ ساتھ رکھنے میں زیادہ پریشانی نہیں۔ فقط

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾

ترجمہ: پھر جب تم اس نماز کو ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی، پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو، یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔

ربط: اوپر صلوٰۃ السفر اور صلوٰۃ الخوف کا بیان تھا، جن میں ایک لحاظ سے نماز کی اصلی ہیئت میں تبدیلی ہو گئی ہے، اب ذکر میں کبھی تبدیلی نہ ہونا اور سفر وخوف کے ختم ہونے اور زائل ہونے کے بعد نماز کی اس تبدیلی کا بھی زائل ہو جانا اور خاص حالات میں اس تبدیلی کو گوارا کرنے کا سبب بیان فرماتے ہیں۔

ذکر کی ہمیشہ پابندی کرنا اور نماز قائم کرنا اوقات کی پابندی کے ساتھ:

پھر جب تم اس نماز (خوف) کو ادا کر چکو تو (بدستور) اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ، کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی (یعنی ہر حالت میں حتیٰ کہ عین جنگ وقتال کے وقت بھی دل سے بھی اور احکام پر عمل کر کے بھی کہ وہ بھی ذکر ہے۔ چنانچہ قتال میں بھی شریعت کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ناجائز ہے، غرض نماز تو ختم ہوئی، لیکن ذکر ختم نہیں ہوتا، نماز میں تو تخفیف ہو گئی تھی، لیکن یہ اپنے حال پر ہے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ (یعنی سفر ختم کر کے مقیم ہو جاؤ اور اس طرح خوف کے زائل ہونے کے بعد مامون ومحفوظ ہو جاؤ) تو (رسول اللہ کے بتائے ہوئے) قاعدہ کے مطابق پڑھنے لگو (یعنی نماز میں چلنا وغیرہ چھوڑ دو، کیونکہ اس کو عارض پیش آنے کی وجہ سے اس لئے جائز رکھا گیا تھا کہ) یقیناً نماز ایسا فرض ہے جو وقت کی پابندی کے ساتھ مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے (لہٰذا فرض ہونے کی وجہ سے اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اور وقت کی پابندی کی وجہ سے وقت ہی پر ادا کرنا ضروری ہے، عذر میں اس کی کچھ ہیئت تبدیل کر دی گئی تھی، ورنہ اس کی وہی اصل ہیئت مقصود ہے، لہٰذا عارض کے زائل ہونے کے بعد اس کی اصل ہیئت کی حفاظت کرنا واجب ہو گیا)

فائدہ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس علت کے بیان کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ عین جنگ وقتال کے وقت بھی مؤخر (قضاء) نہ کی جاتی، کوئی اور آسان طریقہ مقرر ہو جاتا جو اس وقت بھی ممکن ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ تمام احکام عام طور سے پائے جانے والے امکانات کے ساتھ مشروع ہوتے ہیں، اور وہ عین قتال کے وقت مفقود ہے، کیونکہ نماز کی ہیئت جو اس کا ادنیٰ مقتضا ہے، شرعی طور پر وہی معتبر ہے، جو سورۂ بقرہ میں چونتیسویں حکم میں بیان ہو چکا ہے، جب اتنا بھی نہ ہو سکے تو اس سے کم صلوٰۃ ہی نہیں، اس لئے مؤخر کی گئی۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾

ع ۱۵ ۱۲

ترجمہ: اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں، اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی الم رسیدہ ہیں، جیسے تم الم رسیدہ ہو، اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں، بڑی رحمت والے ہیں۔

ربط: اوپر اصل مقصود جہاد کا ذکر تھا، اور دوسرے مضامین اس کی مناسبت سے ذکر کردیئے گئے تھے۔ اب پھر جہاد ہی سے متعلق مضمون ارشاد ہے کہ جہاد میں سستی ناجائز ہے۔ روح المعانی میں عکرمہ سے اور معالم میں اس کا نزول غزوۂ حمراء الاسد کے بارے میں نقل کیا ہے جس کا قصہ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۷۲ میں بیان ہوا ہے، اس وقت کی حالت آیت میں بیان کی گئی ہے۔

جہاد میں کم ہمتی کی ممانعت:

اور اس مخالف قوم کا تعاقب کرنے میں ہمت مت ہارو (جبکہ اس کی ضرورت ہے) اگر تم (زخموں سے) تکلیف اٹھا رہے ہو تو (کیا ہوا) وہ بھی تو تکلیف اٹھا رہے ہیں، جیسی تکلیف تم اٹھا رہے ہو (وہ تم سے زیادہ طاقت وقوت تو نہیں رکھتے، پھر تم کیوں ڈرتے ہو؟) اور (تم میں ان سے زیادہ ایک بات یہ ہے کہ) تم اللہ سے ایسی ایسی چیزوں (ثواب وغیرہ) کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ (ان کی) امید نہیں رکھتے (تو دل کی قوت میں تم زیادہ ہوئے اور بدن کے ضعف میں دونوں مشترک تو تمہیں زیادہ مستعد ہونا چاہئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (انہیں کافروں کے بدن کا ضعف اور دل کا ضعف معلوم ہے) بڑے حکمت والے ہیں (تمہارے تحمل سے زیادہ کا حکم نہیں فرمایا)

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿١١٢﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ ۖ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِن شَيْءٍ ۚ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن

ع ۱۶

تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيۡرَ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰٮهُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ اَوۡ اِصۡلَاحٍۢ بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ فَسَوۡفَ نُـؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق تا کہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے اور آپ ان خائنوں کی طرفداری کی بات نہ کیجئے، اور آپ استغفار فرمائیے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑی رحمت والے ہیں۔ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے جو کہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے جو بڑا خیانت کرنے ولا بڑا گناہ کرنے والا ہو۔ جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ آدمیوں سے تو چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ اس وقت ان کے پاس ہے جب کہ وہ خلاف مرضی الٰہی گفتگو کے متعلق تدبیریں کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہاں تم ایسے ہو کہ تم نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں، سو خدا تعالیٰ کے روبرو قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جواب دہی کرے گا یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا۔ اور جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان کا ضرر کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پاوے گا۔ اور جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات پر اس کا اثر پہنچاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔ اور جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاوے سو اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لادا۔ اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا، اور غلطی میں نہیں ڈال سکتے لیکن اپنی جانوں کو اور آپ کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ وہ باتیں بتلائی ہیں جو آپ نہ جانتے تھے۔ اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی، ہاں! مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں، اور جو شخص یہ کام کرے گا حق تعالیٰ کی رضاجوئی کے واسطے سو ہم عنقریب اجر عظیم عطا فرمادیں گے اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ ہو لیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔

ربط: اوپر کھلے عام کفر کا مظاہرہ کرنے والوں کے معاملات کے ضمن میں چند دیگر منافقوں کا ذکر آیا ہے کہ کفر دونوں

میں مشترک ہے، ابعض منافقوں کے ایک خاص قصہ سے متعلق مضمون بیان کیا جاتا ہے، جس کا خلاصہ ترمذی اور حاکم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ بنوابیرق نامی خاندان میں بشیر نام کا ایک منافق تھا، اس نے حضرت رفاعہ کے گودام میں نقب لگا کر کچھ آٹا اور کچھ ہتھیار چرالئے، صبح کو آس پاس تلاش کیا گیا اور بعض قوی قرائن سے بشیر پر شبہ ہوا، لیکن بنوابیرق نے جو بشیر کے شریک حال تھے، اپنی برأت کے لئے حضرت لبید کا نام لے دیا۔ غرض حضرت رفاعہ نے اپنے برادرزادہ یعنی بھتیجے حضرت قتادہ کو جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیج کر آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی، آپ نے تحقیقات کا وعدہ فرمایا، بنوابیرق کو اس کی خبر ہوئی، تو اسیر نام کے ایک شخص کے پاس جمع ہوئے جو اسی خاندان کا تھا اور پھر سب مشورہ کرکے مع بعض اہل محلہ کے جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت قتادہ اور حضرت رفاعہ کی شکایت کی کہ بغیر گواہوں اور ثبوت کے ایک دیندار مسلمان گھرانے پر چوری کی تہمت لگا رہے ہیں، جبکہ ان کا مقصود یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس مقدمہ میں ان کی طرف داری کریں، آپ نے یہ تو نہیں کیا اتنا ہوا کہ جب حضرت قتادہ پھر حاضر ہوئے تو ان سے ارشاد فرمایا کہ تم ایسے لوگوں پر بغیر ثبوت کے تہمت کیوں لگاتے ہو، انھوں نے واپس جا کر اپنے چچا حضرت رفاعہ سے کہا۔ وہ اللہ پر بھروسہ کرکے خاموش ہوگئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ غرض چوری ثابت ہوئی اور مال برآمد ہوا، اور مالک کو دلایا گیا تو بشیر ناخوش ہوکر مرتد ہوگیا اور مکہ جا کر مشرکوں سے مل گیا، اس پر آخر کی آیتیں ﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ﴾ الخ نازل ہوئیں۔

بعض منافقوں کا قصہ ان کے احکام کے ساتھ:

بیشک ہم نے آپ کے پاس حق کے ساتھ یہ کتاب بھیجی ہے (جس سے) واقعہ کے موافق (حال معلوم ہوگا) تاکہ آپ (اس واقعہ میں) ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعہ سے) آپ کو (اصل حال) بتادیا ہے (وہ وحی یہ کہ واقع میں بشیر چور ہے اور بنوابیرق جو اس کے حامی ہیں سب جھوٹے ہیں) اور (جب اصل حال معلوم ہوگیا تو آپ ان بددیانتی کرنے والوں کی طرف داری کی بات نہ کیجئے (جیسا کہ بنوابیرق کی اصل خواہش یہی تھی۔ چنانچہ آگے آتا ہے ﴿لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ﴾ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، چنانچہ اسی آیت سے آپ کا نہ کرنا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے فضل نے آپ کو غلطی سے بچالیا جس سے ہر غلطی کی نفی ہوگئی، اور نہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فعل ماضی میں واقع ہوا ہو، بلکہ نہی کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آئندہ کے لئے حقیقت حال سے آگاہ کرکے اس کے ارتکاب کا راستہ بند کردیا جائے، لہٰذا آپ کی حالت اور نہی کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوگا کہ جس طرح اب تک طرف داری نہیں کی، آئندہ بھی نہ کیجئے، اور یہ انتظامات بھی نبی کے مکمل طور پر معصوم ہونے کے لئے ہیں، اور ایک خائن بددیانت کے سبب سب کو بددیانت اس لئے فرمایا کہ بددیانت کی بددیانتی میں شرکت اور اعانت بلکہ علم کے

باوجود پوشیدہ رکھنا بھی خیانت و بددیانتی ہے، لہٰذا شرعی طور پر سب خائن اور بددیانت ہوئے) اور (لوگوں کے کہنے سے حسن ظن کی بنیاد پر جو بنو ابیرق کو آپ نے دین دار سمجھ لیا، اگرچہ بغیر صحیح دلیل اور معتبر ثبوت وسند کے کسی کو دین دار سمجھنا گناہ نہیں، بلکہ یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حسن ظن کی وجہ سے اپنے آپ میں نیک ہی ہو، لیکن چونکہ اس موقع پر اتنا فرمادینے سے اہل حق کا اپنے حق کو چھوڑ بیٹھنے کا احتمال تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا بھی کہ حضرت رفاعہ خاموش بیٹھ رہے، لہٰذا بالواسطہ طور پر یہ امر نامناسب ہوا، اس لئے آپ (اس سے) استغفار فرمائیے (کہ آپ کی شان عظیم ہے، اتنا معاملہ بھی آپ کی شان نبوت کی وجہ سے آپ کی ذات کے لئے قابل استغفار ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحمت والے ہیں، اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے (جیسا کہ وہ لوگ آپ سے چاہتے تھے) جو کہ (لوگوں کی خیانت اور نقصان کر کے وبال اور ضرر کے اعتبار سے درحقیقت) وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے (بلکہ اس کو مبغوض رکھتے ہیں) جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنے والا ہو (جیسا کہ تھوڑی خیانت کرنے والے کو بھی محبوب نہیں رکھتے، لیکن چونکہ بشیر کا بڑا خائن ہونا بتانا مقصود ہے، اس لئے یہ فقرہ لایا گیا) جن لوگوں کی یہ حالت ہے کہ (اپنی خیانت کو) آدمیوں سے تو (شرما کر) چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے۔ حالانکہ وہ (ہر وقت کی طرح) اس وقت (بھی) ان کے پاس ہے جبکہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو سے متعلق تدبیریں کیا کرتے ہیں (جیسا کہ اس کے پاس جمع ہو کر مشورہ کیا گیا تھا کہ حضور سے یوں گفتگو کریں گے) اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے (علمی) احاطہ میں لئے ہوئے ہیں، ہاں (جو لوگ بشیر وغیرہ کی حمایت میں بعض اہل محلّہ جمع ہو کر آئے تھے وہ سن لیں کہ) تم ایسے ہو کہ تم نے دنیاوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں تو (یہ تو بتاؤ کہ) اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن ان کی طرف سے کون جواب دہی کرے گا، یا وہ کون شخص ہے جو ان کا کام بنانے والا ہوگا (یعنی نہ کوئی زبانی جواب دہی کر سکے گا اور نہ ہی کوئی مقدمہ کو عملی طور پر درست کر سکے گا) اور (یہ بددیانت وہ خائن لوگ اگر ابھی شرعی قاعدہ کے مطابق توبہ کر لیتے تو معافی ہو جاتی، کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (دوسرے کو متاثر کرنے والی) کوئی برائی کرے یا (صرف) اپنی جان پر ظلم کرے (یعنی ایسا گناہ کرے جو دوسروں کو متاثر کرنے والا نہ ہو۔ اور) پھر اللہ تعالیٰ سے (شرعی قاعدہ کے مطابق) معافی چاہے (مثلاً حقوق العباد میں ادائیگی یا معافی بھی ضروری ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا پائے گا، اور (لازمی طور پر گنہ گاروں کو اس کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ) جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنا ہی نقصان کرتا ہے (وہ نقصان گناہ اور سزا ہے، جب گناہ کے کام کا انجام یہ ہے تو توبہ کر لینا بہت ضروری ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (انہیں سب کے گناہوں کی خبر ہے) بڑی حکمت والے ہیں (مناسب مناسب سزا تجویز فرماتے ہیں) اور (یہ تو خود گناہ کرنے کا انجام ہوا اور جو گناہ کا دوسروں پر الزام لگا دے اس کا حال سنو کہ) جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا کرے، پھر (بجائے اس کے کہ خود ہی توبہ کر لے، طرہ یہ کہ) اس (گناہ)

کی تہمت کسی بے گناہ پر لگادے تو اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ اپنے (سر کے) اوپر لادا (جیسا کہ بشیر نے کیا کہ خود تو چوری کی اور ایک نیک بخت بزرگ لبید کے ذمہ لگادی) اور اگر اس مقدمہ میں آپ پر (اے محمد ﷺ) اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہو (جو کہ ہمیشہ آپ پر رہتا ہے) تو ان (چالاک) لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی میں ڈالنے ہی کا ارادہ کرلیا تھا (لیکن اللہ کے فضل سے ان کی رنگ آمیز باتوں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آئندہ بھی نہ ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں) اور (کبھی آپ کو) غلطی میں نہیں ڈال سکتے لیکن (اس ارادہ سے) اپنی جانوں کو گناہ میں مبتلا اور عقوبت کا مستحق بنارہے ہیں) اور آپ کو ذرہ برابر (اس قسم کا) ضرر نہیں پہونچا سکتے اور (آپ کو غلطی کا ضرر پہونچانا کب ممکن ہے جبکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں (جس کے ایک حصہ میں اس قصہ کی حقیقت کی اطلاع بھی دیدی) اور آپ کو وہ مفید اور عالی (باتیں بتائیں جو آپ (پہلے سے) نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے (پھر اللہ کے فضل کے ساتھ کس کا قابو چل سکتا ہے؟) عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب اور برکت) نہیں ہوتی (جیسا کہ اسیر کے پاس جمع ہو کر خفیہ مشورہ کیا گیا تھا) ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا کسی اور نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کردینے کی ترغیب دیتے ہیں (اور اس تعلیم وترغیب کی تکمیل وانتظام کے لئے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں یا خود ہی صدقہ وغیرہ کی دوسروں کو خفیہ طور پر ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بعض اوقات خفیہ طور سے کہنا ہی مصلحت ہوتا ہے، ان کے مشوروں میں البتہ خیر یعنی ثواب اور برکت ہے) اور جو شخص حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے (نہ کہ ریاست وشہرت کی غرض سے) یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) تو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے (یعنی آخرت میں لیکن ان بددیانت لوگوں کے مشورے تو ایسے نہیں ہیں اس لئے ناپسندیدہ ہیں) اور جو شخص اس کے بعد رسول (مقبول ﷺ) کی مخالفت کرے گا کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا دینی راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا (جیسا بشیر مرتد ہو گیا، حالانکہ اسلام کا حق ہونا اور خاص اس واقعہ میں بھی رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کا خود اس کے معائنہ میں بھی حق ہونا معلوم تھا، پھر بدبختی نے آگھیرا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ جانے کی بری جگہ ہے۔

فائدہ: نیک کام میں جو کہ "معروف" کا ترجمہ ہے، وہ تمام امور آگئے جو نفع بخش ہوں، خواہ دینی ہوں یا دنیاوی ہو، مگر مشروع ہوں اور اگرچہ اس میں صدقہ بھی داخل تھا، لیکن نفس پر گراں گذرنے کی وجہ سے اس کا زیادہ اہتمام فرمایا، اور خاص اس مقام میں اس لئے بہت ہی مناسب ہوا کہ بشیر نے چوری کرکے غیر کا مال لیا تھا، اس لئے مقابلہ میں ان کا مال غیر کو دینے کی فضیلت بیان فرمادی، اور اس طرح لوگوں میں صلح کرادینا بھی معروف میں داخل ہے، لیکن چونکہ نااتفاقی بہت سارے عظیم مضرات کا سبب ہے اور صلاح میں ان کا دروازہ بند کیا گیا ہے اس لئے اس کو بھی صراحت کے ساتھ ذکر فرمادیا، لہٰذا صدقہ عظیم منافع کو کھینچنے والا تھا اور اصلاح عظیم مضرات کا دفاع کرنے والا تھا، ان دونوں کی معروف ہونے

کے باوجود صراحت فرمادی، لہٰذا اصلاح کا فاعل اور الناس کا مصداق ایک ہی ہے، جیسے ﴿ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ﴾ میں اور معنی یہ ہیں کہ أو أمر الناس باصلاحهم ما بينهم مظہر کو مضمر کی جگہ رکھنے کے طریق پر اور ﴿ یُشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ ﴾ باوجودیکہ مقصود پر دلالت میں کافی ہے، مگر ﴿ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴾ کے زائد کرنے میں یہ فائدہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی علامت جس کو دلیل انّی کہتے ہیں بتادی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا علم مشاہدہ کے طور پر ہر وقت تو دشوار اور متعذر ہے، اس وقت بھی بوجہ اکثروں کے غائب ہونے کے اور بعد میں وفات کی وجہ سے روایت کے طور پر منصوص میں اور درایت یعنی اجتہاد کے طور پر غیر منصوص میں وہ مسلم راویوں اور ہادیوں کے توسط کا محتاج ہے، اس لئے زیادہ موافقت و مخالفت رسول کے طریقہ کا اتباع اور عدم اتباع مؤمنوں کے طریقہ کا ہوا، فافہم یعنی اچھی طرح سمجھ لو، یہ اپنی کوشش سے حاصل ہونے والا علم نہیں، بلکہ اللہ کے ہبہ کرنے سے ہے۔ واللہ اعلم

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیۡدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِكَ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمۡ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمۡ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ یَّتَّخِذِ الشَّیۡطٰنَ وَلِیًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۹﴾ یَعِدُهُمۡ وَیُمَنِّیۡهِمۡ ؕ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا یَجِدُوۡنَ عَنۡهَا مَحِیۡصًا ﴿۱۲۱﴾ ﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا، یہ لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، اور صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ حکم سے باہر ہے، جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور ڈال رکھا ہے اور جس نے یوں کہا تھا کہ میں ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقررہ حصہ اطاعت کا لوں گا اور میں ان کو گمراہ کرونگا اور میں ان کو ہوسیں دلاؤنگا اور میں ان کو تعلیم دونگا جس سے وہ چار پایوں کے کانوں کو تراشا کریں گے اور میں ان کو تعلیم دونگا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بناوے گا وہ صریح نقصان میں واقع ہوگا، شیطان ان لوگوں سے وعدے کیا کرتا ہے اور ان کو ہوسیں دلاتا ہے اور شیطان ان سے صرف جھوٹے وعدے کرتا ہے، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پاویں گے۔

ربط: اوپر جہاد کے ذکر میں اگرچہ تمام مخالف لوگ داخل ہیں، لیکن اس سورت میں صرف یہود اور منافقوں کے

حالات بیان ہوئے ہیں، مخالفوں میں ایک جماعت بلکہ دوسروں سے بڑی جماعت مشرکوں کی تھی، اب کچھ ان کے عقائد کی حالت اور مذمت کے طریقے اور اس کی سزا کا ذکر ہے، اور اس مقام پر یہ سب اس لئے اور زیادہ مناسب ہو گیا کہ اوپر اس چور کے مرتد ہونے کا ذکر ہے، لہٰذا اس سے اس کی دائمی سزا کا حال معلوم ہو گیا، اور اوپر توبہ کی ترغیب بھی تھی یہاں کفر اور شرک کے سوا دوسرے گناہوں کے بخش دیئے جانے کی بیان سے توبہ کی مزید ترغیب ہو گئی۔

مشرکوں کے طریقہ کی مذمت اور سزا:

یقیناً اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہیں بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ ہمیشہ کی سزا میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا دوسرے جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ یا کبیرہ) جس کو چاہیں گے بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا، اب وہ ہمیشہ کی سزا بھی نہ رہے گی) اور (اس شرک کے نہ بخشنے کی وجہ یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے، وہ امر حق سے بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا (وہ امر حق توحید ہے جو عقلاً بھی واجب اور پیدا کرنے والے کی تعظیم کے حقوق میں سے ہے، چنانچہ مشرک نے حضرت خالق وصانع کی اہانت کی اس لئے وہ ایسی سزا کا مستحق ہوگا، بخلاف دوسرے گناہوں کے کہ کچھ تو گمراہی ہے مگر وہ توحید کے خلاف اور اس سے دور نہیں، اس لئے مغفرت کے قابل قرار دیا گیا، اور شرک کے قابلِ مغفرت نہ ہونے کی علت کفر میں بھی مشترک ہے، کیونکہ اس میں بھی خالق کی کسی بتائی ہوئی بات کا انکار ہوتا ہے، اس لئے وہ اس صفتِ صدق کی نفی کرتا ہے اور کوئی کافر خود ذاتِ خداوندی کا بھی منکر ہے، اور صفت اور ذات دونوں میں سے جس کی نفی ہو وہ توحید کا انکار اور اس سے دوری ہے، چنانچہ کفر اور شرک دونوں نا قابلِ بخشش ہیں، آگے مشرکوں کی حماقت ان کے مذہبی طریقہ میں بیان فرماتے ہیں کہ) یہ (مشرک) لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر (ایک تو) صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، اور (دوسرے) صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ (اللہ تعالیٰ کا) نافرمان ہے (اور) جس کو اس نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت سے دور ڈال رکھا ہے اور جس نے (جس وقت وہ کہ خصوصی رحمت سے دور اور ملعون ہونے لگا) یوں کہا تھا (جس سے اس کی دشمنی صاف ظاہر ہے) کہ میں (پوری کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ) ضرور تیرے بندوں سے اپنا اطاعت کا مقررہ حصہ لوں گا، اور (اس حصہ کی تفصیل یہ ہے کہ) میں ان کو (عقائد میں) گمراہ کروں گا اور میں ان کو (خیالات میں) ہوس دلاؤں گا (جس سے معاصی کی طرف میلان ہو اور ان کا نقصان نظر میں نہ رہے) اور میں ان کو (برے اعمال فسق وکفر کے کرنے کی) تعلیم دوں گا، جس سے وہ (بتوں کے نام پر) چوپایوں کے کانوں کو تراشا کریں گے (یہ کفر کے اعمال میں سے ہے) اور میں ان کو (اور بھی) تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے (اور یہ فسق کے اعمال میں سے ہے، جیسے ڈاڑھی منڈانا اور بدن گدانا وغیرہ) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر

شیطان کو اپنا رفیق بنائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرے اور شیطان کی اطاعت کرے) وہ (شخص) کھلے نقصان میں واقع ہوگا (وہ نقصان جہنم میں جانا ہے) شیطان ان لوگوں سے (عقائد سے متعلق) جھوٹے وعدے کیا کرتا ہے (کہ تم بے فکر رہو، نہ کہیں حساب ہے نہ کتاب ہے) اور (خیالات میں) ان کو ہوس دلاتا ہے (کہ اس گناہ میں ایسی لذت ہے، اس حرام ذریعہ میں ایسی آمدنی ہے اور شیطانی اعمال کا وجود اور لغویت اور مضرت خود ظاہر ہے) اور شیطان ان سے صرف جھوٹے (فریب آمیز) وعدے کرتا ہے (کیونکہ واقع میں حساب کتاب حق ہے اور اس کی ہوسوں کا فریب ہونا تو بہت جلدی کھل جاتا ہے) ایسے لوگوں کا ٹھکانا (جو کہ شیطان کی راہ پر چلتے ہیں جہنم ہے اور وہ خسران مبین کھلا نقصان یہی ہے) اور اس (جہنم) سے بچنے کے لئے کہیں جگہ نہ پائیں گے (کہ وہاں جا کر پناہ لے لیں)

فائدہ: شرک سے متعلق ایک مفید بحث اسی سورۃ کی آیت ۴۸ کے ذیل میں گذر چکی ہے، اور زنانی چیزوں سے مراد بعض بت ہیں جن کے نام اور صورتیں دیویوں کی طرح عورتوں جیسی تھیں اور انہیں زیور وغیرہ بھی پہناتے تھے، جیسا کہ روح المعانی میں حسنؒ سے منقول ہے کہ ہر قبیلہ میں ایسے بہت تھے جن کو وہ انثی بنی فلاں (فلاں قبیلہ کی دیوی) کا لقب دیتے تھے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے تھے، چنانچہ بعض بت نام اور شکل میں مردوں کی طرح بھی تھے، بلکہ یہاں دو چیزیں مستثنیٰ ہیں اور حصر مجموعہ کے اعتبار سے ہے جس کا دوسرے جز یعنی شیطان میں اللہ کے سوا تمام معبود شامل ہیں کہ شیطان کے کہنے سے عبادت کرنا گویا شیطان کی عبادت کرنا ہے، جیسے محاوروں میں کہتے ہیں کہ میں نے زید کے کہنے سے فلاں شخص کو روپیہ دیا ہے تو میں نے تو زید ہی کو دیا ہے، اس عام میں سے مؤنث معبودوں (دیویوں) کو الگ کرنا ان کی حماقت کو بڑھا کر کہنے کے لئے ہے کہ وہ مؤنث کے اوصاف کو ناقص بھی مانتے ہیں اور پھر ان کی عبادت کرتے ہیں، چنانچہ کوئی باطل معبود ایسا نہیں ہے جو اس مجموعہ کے حصر سے باہر ہو، بلکہ دوسرے جز میں تو سب داخل ہیں، اور بعض پہلے جز میں بھی ہیں، اس طرح نہ حصر میں شبہ ہے اور نہ ہی دونوں حصوں میں ایک دوسرے کی نفی ہے، کیونکہ مقصود ایک ہی حصر ہے۔ حالانکہ ﴿ یَدْعُوْنَ ﴾ مکرر عامل آیا ہے اور شیطان کی چند صفتیں مقصود کی تاکید کے لئے لائے ہیں یعنی ایسے شیطان کی اطاعت کرتے ہیں جو اولاً سرکش ہے، دوسرے سرکشی کی وجہ سے ملعون ہے، تیسرے انسان کا دشمن ہے جیسا کہ اس کے اقوال سے ظاہر ہے۔ آگے وہ اقوال اس کی دشمنی پر دلالت کرنے کے لئے نقل فرمائے۔ چنانچہ یہ لازم نہیں کہ یہاں جتنے امور کا ذکر ہوا ہے، وہ سب شرک و کفر ہی ہوں، چنانچہ بعض امور صرف فسق ہیں، اور یہاں جس تبدیلی کی مذمت کا ذکر ہے وہ ہر تبدیلی نہیں بلکہ جس میں فساد و بگاڑ ہو اور جس میں فساد و بگاڑ نہ ہو وہ مذموم نہیں بلکہ اگر فساد نہ ہونے کے ساتھ اصلاح بھی ہو جیسے ختنہ کرنا اور ناخنوں کا کاٹنا تو اس کی تاکید ہے اور جس میں دونوں نہ ہوں جیسے مویشیوں کا خصی کرنا اور مسنون مقدار سے زیادہ ڈاڑھی کا تراشنا جائز ہے اور بگاڑ کے پائے جانے اور نہ پائے جانے کا مدار

شریعت کے اعتبار سے ہے نہ کہ عرف عام سے جس میں اس کے علاوہ کہ اس کی نظر حضرت شارع علیہ السلام کے برابر نہیں خود عرف میں بھی آپس میں ضد اور ٹکراؤ ہوا کرتا ہے، خوب سمجھ لو۔ اور خلق اللہ کی تفسیر حق تعالیٰ کی پسندیدہ وضع بھی ہوسکتی ہے، لہٰذا متن کی تفسیر میں خلق تکوینی ہے اور اس تفسیر میں خلق تشریعی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہونگی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے، اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا۔

ربط: اوپر کفار و مشرکین کے لئے وعید تھی، اب مؤمنوں کے لئے وعدہ اور بشارت ہے جیسا کہ اکثر قرآن مجید کا انداز ہے۔

مؤمنوں کا ثواب:

اور جو لوگ ایمان لائے اور (انھوں نے) اچھے کام کیے، ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا۔

فائدہ: اسی سورۃ النساء کی آیت ۸۷ کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے اس موقع پر ایک بار پھر ملاحظہ کرلیا جائے۔

﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝﴾ ع

ترجمہ: نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے۔ جو شخص کوئی برا کام کرے گا، وہ اس کے عوض میں سزا دیا جاوے گا، اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا نہ مددگار ملے گا، اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہونگے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا، اور ایسے شخص سے زیادہ

اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور وہ ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خالص دوست بنایا تھا اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو احاطہ فرمائے ہوئے ہیں۔

ربط: اوپر ہوسناک خیالات کا شیطانی دھوکا اور غیر معتبر ہونا ﴿ یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ ﴾ الخ میں اور ایمان و اعمال کا قابل اعتبار ہونا ﴿ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ میں بیان ہوا تھا، اب بھی یہی دو مضمون ہیں، پہلی آیت میں پہلا مضمون اور بعد کی آیتوں میں دوسرا مضمون ہے، اور اہل کتاب کا ذکر اس مضمون میں اس لئے آیا ہے کہ ان میں اور مسلمانوں میں ایک بار اپنے اپنے دین پر فخر کی بحث ہوئی تھی جیسا کہ اللباب میں ہے۔

بیکار ہوس کا لغو ہونا اور اعمال اسلام کا معتبر ہونا:

نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی اپنے منہ سے اپنی تعریف و فضائل بیان کریں بلکہ اصل دار و مدار اطاعت پر ہے، لہٰذا) جو شخص (اطاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی برا کام کرے گا، خواہ وہ عقائد سے متعلق ہو یا اعمال کی قسم سے) اس کو اس کے بدلہ میں سزا دی جائے گی (اگر وہ برائی کفر کے عقیدہ تک ہے تو اس کو سزا ہمیشہ کی اور قطعی اور اگر اس سے کم ہے تو سزا اس کی برائی کے مطابق اور اس میں بھی توبہ نہ کرنے اور معاف نہ ہونے پر) اور اس شخص کو اللہ کے سوا نہ کوئی حامی ملے گا نہ مددگار (کہ اسے اللہ تعالیٰ سے چھڑا لے) اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ ان کی کوئی نیکی ضائع کردی جائے) اور (اوپر جو مؤمن کی قید لگائی گئی اس کا مصداق ہر فرقہ نہیں بلکہ صرف وہ فرقہ ہے جس کا دین اللہ کے نزدیک مقبولیت میں سب سے اچھا ہو اور ایسا فرقہ صرف اہل اسلام ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں یہ صفات ہیں: مکمل اطاعت، اخلاص، ملت ابراہیم کی اتباع اور ایسے شخص (کے دین) سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی فرماں برداری اختیار کرے، عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ دل سے فرماں برداری اختیاری کی ہو، خالی مصلحت کے تحت ظاہر داری نہ ہو) اور وہ ملت ابراہیم (یعنی اسلام کا اتباع کرے، جس میں کجی کا نام نہیں اور (ملت ابراہیم ضرور قابل اتباع و پیروی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خالص دوست بنایا تھا (تو ظاہر ہے کہ دوست کے طریقہ پر چلنے والا بھی محبوب و مقبول ہوگا۔ چنانچہ اسلام کا طریقہ مقبول ہوا۔ لہٰذا اہل اسلام ہی مؤمن کے لقب کے مصداق ٹھہرے اور دوسرے فرقوں نے ابراہیمی اتباع چھوڑ دی کہ اسلام کو قبول نہ کیا، اس لئے صرف مسلمان ہی ایسا فرقہ ثابت ہوئے کہ محض خواہشات پر ان کا دار و مدار نہیں بلکہ وہ اطاعت گذار ہیں، لہٰذا کام انہی کا چلے گا) اور (اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت کرنا تو لازمی ہے، کیونکہ ان کی سلطنت اور ان کی اطلاع دونوں مکمل ہیں، اور

یہی اعمال اطاعت کے وجوب کی بنیاد ہیں، چنانچہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یہ تو کمال سلطنت ہوا) اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو (اپنے علم میں) احاطہ فرمائے ہوئے ہیں (یہ کمال علمی ہوا)

فائدہ (۱): خلاصہ یہ ہوا کہ خالی تمناؤں سے کام نہیں چلتا، اور مسلمان محض تمناؤں پر نہیں ہیں، بلکہ کام کرتے ہیں اور دوسرے فرقوں نے جب اسلام کو قبول واختیار نہیں کیا جس پر سارا معاملہ موقوف ہے تو وہ محض تمناؤں کے سہارے زندگی گذارنے والے ہوئے، اور ملت ابراہیمی کی تحقیق اور اس کا مصداق اسلام ہونا اور اتباع کے معنی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔

فائدہ (۲): خلیل ہونا اعلیٰ درجہ کا تقرب اور مقبولیت ہے اور روح المعانی میں حاکم کی سند اور تصحیح کے ساتھ حضرت جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی خلیل بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کو بنایا تھا اور صحیح مسلم میں ہے: وقد اتخذ اللہ صاحبکم خلیلا: یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے صاحب یعنی خود آنحضرت ﷺ کو بھی خلیل بنایا ہے اور حبیب اللہ ہونا اس سے برتر واعلیٰ ہے۔ ترمذی

﴿ وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ ﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے عورتوں کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارہ میں تم کو حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی جو کہ قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں جو کہ ان یتیم عورتوں کے باب میں ہیں جن کو جو ان کا حق مقرر ہے نہیں دیتے ہو اور ان کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو اور کمزور بچوں کے باب میں اور اس باب میں کہ یتیموں کی کارگزاری انصاف کے ساتھ کرو، اور جو نیک کام کرو گے سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: اس سورت کے شروع میں یتیموں اور عورتوں کے احکام میں ان کے حقوق کی ادائیگی کے وجوب کا ذکر تھا، کیونکہ دور جہالت میں بعض ان کو میراث ہی نہیں دیتے تھے، بعض اس مال کو کھا جاتے جو انہیں میراث میں یا کسی اور طریقہ سے ملتا تھا، بعض ان سے نکاح کر کے ان کو پورا مہر نہیں دیتے تھے۔ سورت کے شروع میں ان باتوں کی ممانعت کی گئی تھی، اس سلسلہ میں مختلف واقعات پیش آئے، بعض کو خیال ہوا کہ عورتیں اور بچے بذاتِ خود میراث کے قابل نہیں، کسی مصلحت سے یہ حکم کچھ دن کے لئے ہو گیا ہے، امید ہے کہ منسوخ ہو جائے گا، بعض اس کے منتظر رہے جب یہ حکم منسوخ نہ ہوا تو یہ مشورہ ہوا کہ خود پوچھنا چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن جبیر سے

اس آیت کا سبب نزول اس سوال کو نقل کیا ہے۔ اور بعض کو یہ اتفاق ہوا کہ ان کے زیر پرورش کوئی بدصورت یتیم لڑکی تھی، اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس سے خود تو نکاح نہیں کیا اور دوسرے سے نکاح کو اس لئے ٹالا کہ اس کے ساتھ مال بھی جائے گا، اور اس باب میں حضور ﷺ سے سوال کیا جیسا کہ لباب میں حضرت جابر کے قصہ میں السدی سے ابن ابی حاتم کی روایت سے ہے۔ غالباً سوال کی غرض یہ ہوگی کہ کوئی آسان حکم آجائے، مثلاً یہی کہ حق پرورش میں مال کا اتنا حصہ سوال کرنے والے کو مل سکتا ہے اور بعض نے جب یہ حکم سنا کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں مہر کم کرنا درست نہیں تو پھر حضور ﷺ سے پوچھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح ان کی بدصورتی کی وجہ سے اپنی فاسد غرض کے لئے ان سے نکاح نہیں کرتے، ان کے مرغوب اور خوبصورت ہونے پر بھی نکاح کیوں نہیں کرتے ہو؟ ہاں! مہر پورا دو، اس صورت میں کوئی حرج نہیں (بخاری عن عائشہ) غالباً اس سوال سے مقصود یہ ہوگا کہ شاید اس صورت میں مہر کے پورا ہونے میں کوئی معافی کی صورت نکل آئے، جبکہ وہ عورت خود کمی پر رضامند ہو جائے، لیکن چونکہ اپنے ہاتھ کے نیچے دبے ہوئے مجبور شخص کی ایسی رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں، اس لئے حکم نہیں بدلا۔ اس طرح اس آیت کا ربط سورۃ کے شروع کی آیتوں سے ہوا اور درمیان میں دوسرے مختلف اور باہم ملے جلے مضامین آتے گئے، تفسیر کبیر میں ہے کہ یہ طرز کہ ایک حکم بیان کر دیا پھر وعدہ وعید آ گیا، پھر اللہ کی عظمت کا بیان ہونے لگا، نہایت وقعت رکھتا ہے اور دلوں میں تاثیر پیدا کرتا ہے کہ حکم کے ساتھ ساتھ ترغیب و ترہیب یعنی خوف دلانا و ڈرانا بھی ہوتا رہے، حاکم حقیقی کی یاد بھی ہوتی رہے، قرآن مجید کا یہی طرز ہے۔ واللہ اعلم

عورتوں اور یتیموں کے بعض احکام کی طرف رجوع:

اور لوگ آپ سے عورتوں کی میراث اور مہر کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تمہیں (وہی سابق) حکم دیتے ہیں اور وہ آیتیں بھی (تمہیں حکم دیتی ہیں) جو کہ (اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور) قرآن میں تمہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں (کیونکہ ظاہر ہے قرآن کی تلاوت میں ان کی تلاوت بھی ہوتی ہی تھی) جو کہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں (نازل ہو چکی) ہیں جن (کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے کہ اگر وہ صاحب مال اور صاحب جمال ہوں تو ان سے نکاح کرتے ہو، مگر ان) کو (شریعت میں) ان کا (میراث و مہر کا) مقررہ حق نہیں دیتے ہو۔ اور (اگر صاحب جمال نہ ہوں صرف صاحب مال ہوں تو) ان کے ساتھ (خوش جمال نہ ہونے کی وجہ سے) نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو (لیکن صاحب مال ہونے کی وجہ سے اس خوف سے کہ مال کہیں اور جگہ نہ چلا جائے، کسی دوسرے سے بھی نکاح نہیں کرنے دیتے) اور (جو آیتیں) کمزور بچوں کے بارے میں (ہیں) اور (جو آیتیں کہ) اس بارے میں (ہیں) کہ یتیموں کے (تمام معاملے (عام اس سے کہ مہر اور میراث سے متعلق ہو یا کچھ اور ہو) انصاف کے ساتھ کرو (یہ مضمون

سابق آیتوں کا ہے۔ چنانچہ وہ آیتیں اب بھی اپنا مضمون تمہارے ذمہ واجب کر رہی ہیں اور ان کا حکم بعینہ باقی ہے، تم انہی کے مطابق عمل کرو) اور جو نیک کام کرو گے (عورتوں اور یتیموں کے بارے میں بھی اور دوسرے امور میں بھی) تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (تمہیں اس کی جزائے خیر دیں گے اور ویسے تو وہ غیر خیر کو بھی جانتے ہیں، لیکن یہاں خیر کی ترغیب مقصود ہے، اس لئے تخصیص کی گئی)

فائدہ: مطلب یہ ہوا کہ جو آیتیں اس بارے میں پہلے آچکی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً سنتے رہتے ہو، ان پر ان احکام کے بارے میں اب بھی عمل واجب ہے، کوئی نیا حکم نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ یتیم عورتوں کے بارے میں یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى ﴾ الایۃ جس کی شان نزول یہی مہر سے متعلق ناانصافی تھی جس کو ﴿ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ ﴾ فرمایا اور اس کے مقابلہ سے غیر مرغوب عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرنا بھی سمجھا جاسکتا ہے، جس کو یہاں ﴿ تَرْغَبُوْنَ ﴾ میں فرمایا، لہٰذا دونوں کا حوالہ اس آیت پر صحیح ہوا اور مستضعفین کمزوروں کے بارے میں آیت ﴿ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ ﴾ الخ ہے، اور قیام بالقسط یعنی انصاف کرنا اس سے بھی سمجھ میں آیا، اور آگے مزید تصریح ہے، ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا ﴾ الخ اور ان سب کی میراث اجمالی طور پر ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ ﴾ الخ میں اور تفصیل کے ساتھ اس کے بعد ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ ﴾ میں بیان ہوئی ہے اور اس کے بعد نکاح سے روکنے کے لئے آیت ﴿ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ میں تصریح ہے، جس کے عموم میں وہ صورت بھی آگئی جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اور شانِ نزول سے متعلق تمام سوالات کا جواب اس وضاحت سے سمجھ میں آگئے۔

﴿ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی یا بے پروائی کا ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کرلیں، اور یہ صلح بہتر ہے۔ اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے، اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر کی آیت میں سابق آیتوں کا حوالہ تھا جس میں عورتوں سے متعلق احکام بھی شامل تھے، اب بھی خاص عورتوں یعنی بیویوں سے متعلق بعض احکام کا بیان ہے، جس کی تفصیل پندرھویں حکم میں اصلاح کے عنوان کے تحت ہوچکی ہے، لہٰذا گویا یہ اس کا تتمہ اور اصلاح کے بعض طریقوں کی تعیین ہے، اور ﴿ بَيْنَهُمَا ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ دونوں حکم کا ہونا شرط نہیں ہے۔

میاں بیوی کے درمیان صلح کا جواز:

اور اگر عورت کو (قرائن سے) اپنے شوہر سے بدمزاجی، بے پروائی (اور بے رخی) کا غالب احتمال ہو تو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں آپس میں ایک خاص طور سے صلح کرلیں (یعنی اگر عورت ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو اس کے پورے حقوق ادا کرنا نہیں چاہتا اور اس لئے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے مثلاً نان ونفقہ معاف کردے یا مقدار کم کردے اور اپنی باری معاف کردے تا کہ وہ چھوڑے نہیں اور شوہر کو جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کرلے اور جھگڑے یا علاحدگی سے تو) یہ صلح (ہی) بہتر ہے اور (ایسی صلح ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ) لوگوں کو (فطری طور پر) حرص کی طرف میلان ہوتا ہے (جب اس کی حرص پوری ہو جاتی ہے تو راضی ہو جاتا ہے، لہٰذا جب شوہر دیکھے گا کہ میری مالی اور جانی آزادی میں جس کی کہ طبعی طور پر حرص ہے کچھ خلل نہیں آتا اور عورت مفت میں ملتی ہے تو وہ غالباً نکاح میں رکھنے پر راضی ہو جائے گا، اور عورت کی نکاح میں رہنے کی حرص وخواہش خواہ کسی بھی وجہ سے ہو ظاہر ہے کہ صلح کا اصلی سبب ہے، لہٰذا دونوں فریق کی خاص خاص حرص نے اس صلح کی تکمیل کردی) اور (اے مردو) اگر تم (خود عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ رکھو (اور ان سے حقوق معاف کرانے کی کوشش نہ کرو) اور ان کے ساتھ (کج روی اور بے رخی کرنے سے) احتیاط رکھو تو (تمہیں بڑا ثواب ملے گا کیونکہ) بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اور نیک اعمال پر ثواب دیا کرتے ہیں)

فائدہ: ﴿ أُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ ﴾ کی تقریر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ اور (اگرچہ یہ صلح تو ہوگئی لیکن اگر ایسی صلح کم ہی باقی رہتی ہے کیونکہ) لوگوں کا حرص کی طرف میلان ہے (اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ چند دن کے بعد عورت کے دل میں اپنے حقوق کی حرص کا جوش پیدا ہو اور ادھر مرد کو اپنی آزادی کی حرص ہے ہی اس لئے عورت پھر اپنے حقوق کا مطالبہ کرے جیسا کہ شرعی طور پر اس کی اجازت بھی ہے اور مرد ادا کرنا نہ چاہے نتیجہ میں جھگڑا برپا ہو جس کا انجام پھر وہی علاحدگی اور جدائی ہو) اور یہ فرمانا کہ گناہ نہیں اس لئے ہے کہ بظاہر اس صلح میں شبہ ہوتا تھا کہ رشوت کے مشابہ ہے جس میں لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہوتے ہیں، اس لئے دونوں سے گناہ کی نفی کردی۔

مسئلہ (۱): اگر صلح میں کوئی ایسی شرط طے کردی جو شریعت کی رو سے ناجائز ہو تو صلح بھی ناجائز ہوگی، مثلاً عورت سے کہا کہ اس شرط پر تجھے نکاح میں رکھتا ہوں کہ تیری بہن بھی میرے نکاح میں رہے گی تو یہ بالکل حرام اور باطل ہے، اس لئے احقر نے صلح کے ترجمہ میں ''خاص طور پر'' کی قید لگادی ہے۔

مسئلہ (۲): نان ونفقہ اور باری کی تقسیم کے جو حقوق عورت نے معاف کئے ہیں عورت کو ہر وقت اختیار ہے کہ ان حقوق کا پھر مطالبہ کرنے لگے اور اگر شوہر نکاح میں رکھنا چاہے گا تو ان حقوق کا ادا کرنا واجب ہوگا، ماضی میں حق ساقط

کرنے یا ہونے سے مستقبل میں سقوط لازم نہیں آتا۔

﴿ وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ ‌ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہوسکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے تو تم بالکل تو ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ جس سے اس کو ایسا کردو جیسے کوئی ادھر میں لٹکی ہو۔ اور اگر اصلاح کرلو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

ربط: اوپر شوہر کی بدمزاجی اور لاپرواہی سے متعلق مضمون بیان ہوا تھا، اور اس کے بعد چند صورتوں کا احتمال ہے، ایک یہ کہ دونوں طرف سے صلح ہوجائے جو مندرجہ بالا آیت کا اصل مقصد تھا، دوسرے یہ کہ مرد اپنی بدمزاجی اور لاپروائی سے باز آجائے، جس کی ترغیب ﴿ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا ﴾ میں تھی، تیسرے یہ کہ نہ تو صلح ہو اور نہ ہی مرد باز آئے، بلکہ علاحدگی ہوجائے لہٰذا اب ان آخر کے باقی دونوں احتمالوں سے متعلق مضمون ہے، دوسرے احتمال سے متعلق تو آیت ﴿ وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا ﴾ الخ میں کہ اگر دلی رغبت پر اختیار نہیں تو اختیاری حقوق کا ادا کرنا تو ضروری ہے اور چونکہ اکثر بے رغبتی کا سبب دوسری بیوی کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے، اس لئے اس آیت میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ ورنہ مذکورہ بالا حکم عام ہے، اور تیسرے احتمال سے متعلق آیت ﴿ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا ﴾ الخ میں ہے۔

بیوی کے شرعی حقوق کا واجب ہونا:

اور تم سے (عام طور سے) تو یہ کبھی نہ ہوسکے گا کہ سب بیویوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتیٰ کہ دلی رغبت میں بھی) اگرچہ (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے (اور تم اس میں کتنی ہی کوشش کرو، لیکن چونکہ دل کا میلان غیر اختیاری ہے، اس لئے اس پر قدرت نہیں، خواہ اتفاقاً بلا اختیار کہیں برابری ہوجائے تو آیت میں اس کی نفی مقصود نہیں، غرض جب یہ اختیار میں نہیں تو تم اس کے مکلف نہیں، لیکن اس کے غیر اختیاری ہونے سے تو لازم نہیں آتا کہ ظاہری حقوق بھی اختیاری نہ رہیں، بلکہ وہ اختیاری ہیں، جب وہ اختیاری ہیں) تو (تم پر واجب ہے کہ) تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ (بالکل کا مطلب یہ ہے کہ جس میں باطن سے بھی معذور تھے اور جس میں ظاہر سے بھی مختار ہو یعنی شرعی حقوق میں اس سے بدمزاجی ولاپروائی نہ کرو) جس سے اس (مظلومہ) کو ایسا کردو کہ جیسے کوئی بیچ میں لٹکی ہو (یعنی نہ تو اس کے حقوق ادا کیے جائیں کہ وہ خاوند والی سہاگن سمجھی جائے اور نہ اس کو طلاق دی جائے کہ بغیر خاوند کی کہی جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر رکھو تو اس کو اچھی طرح رکھو) اور (رکھنے کی صورت میں جو گذشتہ زمانہ میں ان سے کچھ ناروا سلوک کیا گیا تو) اگر (فی الحال ان معاملات کی) اصلاح کرلو (اور آئندہ ایسے معاملات سے) احتیاط رکھو تو (وہ گذشتہ معاملات معاف کردیئے جائیں گے

کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں (چونکہ حقوق العباد سے متعلق گناہوں کی اصلاح ان بندوں کے معاف کرنے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اصلاح میں یہ معافی بھی آ گئی تو اس کے واقع ہونے کے بعد توبہ شرعی طور پر صحیح ہوگئی، اس لئے مقبول ہوگئی)

فائدہ: اس آیت سے متعلق اس سورت کے شروع میں آیت ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ الخ کے ذیل میں کچھ بحث گذر چکی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیا جائے۔

﴿وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا ۝﴾

ترجمہ: اور اگر دونوں میاں بیوی جدا ہو جاویں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاج کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔

ربط: اس سے پہلے والی آیت میں بیان ہو چکا۔

علاحدگی کا انجام:

اور اگر دونوں میاں بیوی (میں کسی طرح بھی موافقت نہ ہوئی اور دونوں) جدا ہو جائیں (یعنی خلع یا طلاق ہو جائے) تو (کوئی ان میں سے خواہ مرد اگر اس کی زیادتی ہے یا عورت اگر اس کی کوتاہی ہے، یوں نہ سمجھے کہ میرے بغیر اس دوسرے کا کام ہی نہ چلے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (قدرت) سے (دونوں میں سے) ہر ایک کو (دوسرے سے) بے نیاز کر دے گا (یعنی ہر ایک کا وہ کام تو دوسرے کے بغیر چل ہی جائے گا جو اس کے مقدر میں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑے حکمت والے ہیں ہر ایک کے لئے مناسب راستہ نکال دیتے ہیں)

﴿وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ ۭ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ۝ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ اِنْ یَّشَاْ یُذْہِبْکُمْ اَیُّہَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا ۝ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی مِلک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں، اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور اگر تم ناسپاسی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی مِلک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کے حاجت مند نہیں اور خود اپنی

ذات میں محمود ہیں۔اور اللہ ہی کی مِلک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں۔اگر ان کو منظور ہو تو اے لوگو تم کو فنا کردیں اور دوسروں کو موجود کردیں۔اور اللہ تعالیٰ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں، جو شخص دنیا کا معاوضہ چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے، بڑے دیکھنے والے ہیں۔

ربط: یہاں تک مختلف احکام بیان فرما کر اب ان احکام پر عمل کی تاکید خاص اہتمام سے فرماتے ہیں کہ اول موافقت کا حکم ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ میں فرمایا اور اس کو سہل کرنے کے لئے ﴿ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ کو یاد دلایا، پھر ﴿ وَاِنْ تَكْفُرُوْا ﴾ میں جزا کو حذف کر کے مخالفت سے روکا۔پھر ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ میں غیر اللہ کا اندیشہ دور کیا کہ بعض اوقات وہ بھی احکام میں کوتاہی کا سبب ہوتا ہے اور تینوں مضمونوں پر اپنے آسمانوں اور زمین کے مالک ہونے سے استدلال فرمایا کیونکہ ایسے مالک کی موافقت واجب ہوگی اور مخالفت حرام ہوگی۔اور اس پر توکل و بھروسہ کرنا واجب ہوگا، اور ﴿ وَاِنْ تَكْفُرُوْا ﴾ کے بعد محذوف جزا کے مضمون پر ﴿ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴾ سے دلالت فرمائی گئی، پھر دین کی خدمت کو غنیمت سمجھنا احسان کی شکل میں ﴿ اِنْ يَّشَاْ ﴾ الخ میں ارشاد فرمایا تاکہ اس خوف سے کہ کہیں کسی دوسرے سے یہ کام نہ لے لیا جائے، دوڑیں گے پھر دین کے اصلی ثمرہ کے آخرت میں ملنے کے بارے میں ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ﴾ میں ارشاد فرمایا، کیونکہ بعض اوقات دنیا میں ثمرہ نہ ملنے سے بھی احکام میں سستی ہوجاتی ہے۔اس طرح یہ کل پانچ مضمون ایک ساتھ ہوئے جن سے نہایت اہتمام کے ساتھ احکام پر عمل کی تاکید ہوگئی۔

احکام پر عمل کی پوری تاکید اور مکمل اہتمام:

اور جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں (تو ایسے مالک کے احکام کا ماننا بہت ہی ضروری ہے) اور (احکام پر عمل کا خطاب خاص طور سے تم سے ہی نہیں ہوا بلکہ) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا، جن کو تم سے پہلے (آسمانی) کتاب (یعنی توریت و انجیل) ملی تھی اور تمہیں بھی (حکم دیا ہے) کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو (جس کو تقوی کہتے ہیں، جس میں تمام احکام کی موافقت داخل ہے، اس لئے اس سورت کو تقوی سے شروع کر کے اس کی تفصیل میں مختلف احکام لائے ہیں) اور (انہیں اور تمہیں یہ بھی سنایا گیا کہ) اگر تم ناشکری کرو گے تو (اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، ہاں تمہارا ہی نقصان ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی (تو) ملکیت ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (ایسے بڑے سلطان کا کیا نقصان ہوگا، البتہ ایسے بڑے سلطان کی مخالفت میں یقیناً نقصان ہے) اور اللہ تعالیٰ کسی (کی اطاعت) کے محتاج نہیں (اور) خود اپنی ذات میں تمام تعریفوں کے مستحق (اور مکمل صفات کے مالک) ہیں (اس لئے کسی کی مخالفت سے ان کی صفات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا) اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں جو چیزیں کہ

آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور (جب وہ ایسے قادر ومختار ہیں تو اپنے اطاعت گذار بندوں کے) اللہ تعالیٰ ہی صحیح کام بنانے والے ہیں (لہٰذا ان کی کارسازی کے ہوتے ہوئے ان کی اطاعت کرنے والوں کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ جو تمہیں دین کے کام بتارہے ہیں، وہ سب تمہاری ہی سعادت کے لئے ہیں، ورنہ وہ دوسروں سے بھی کام لے سکتے ہیں، کیونکہ ان کی ایسی قدرت ہے کہ) اے لوگو! اگر وہ چاہیں تو تم سب کو فنا کردیں، اور دوسروں کو لے آئیں (اوران سے کام لے لیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ (سورۃ محمد ۳۸) اور اللہ تعالیٰ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں (پھر بھی ایسا نہیں کیا تو ان کی عنایت ہے، حکم پر عمل کو غنیمت سمجھ کر سعادت حاصل کرو اور دیکھو دین کے کام کا اصلی ثمرہ آخرت میں ہے، دنیا میں نہ ملنے سے بددل نہ ہونا بلکہ) جو شخص (دین کے کام میں) دنیا کا معاوضہ چاہتا ہو تو (وہ بڑی غلطی پر ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی ان کی قدرت میں) تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ (موجود) ہے (جب ادنی، اعلیٰ دونوں پر ان کی قدرت ہے تو اعلیٰ ہر چیز کیوں نہ مانگی جائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (سب کی باتوں، اقوال اور درخواستوں کو سنتے ہیں اور سب کی نیتوں کو دیکھتے ہیں، چاہے وہ دنیا کی ہوں یا دین کی، لہٰذا آخرت طلب کرنے والوں کو ثواب دیں گے اور دنیا کے طالبوں کو آخرت سے محروم رکھیں گے، لہٰذا آخرت ہی کی نیت اور درخواست کرنی چاہئے، البتہ دنیا کی حاجت مستقل طور پر مانگنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن عبادت میں یہ نیت نہ کرے)

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۞ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے، سو تم خواہش نفس کا اتباع مت کرنا کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم کج بیانی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

ربط: اوپر مختلف احکام کا بیان ہوا ہے، جن میں بعض معاملات بھی تھے، جن میں صاحب معاملہ کو بھی اور اگر کبھی کوئی اختلاف واقع ہو تو فیصلہ کرنے والوں کو بھی عدل وانصاف کی رعایت کرنے اور دوسرے جو لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں ان کو گواہی میں حق بات ظاہر کرنے کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے، اس لئے اب عدل وانصاف قائم کرنے اور حق کی گواہی دینے کو واجب قرار دیتے ہیں، اس طرح گویا یہ مضمون تمام سابق احکام کی تاکید کرنے والا اور تکمیل کرنے والا ہے،

اور یتیموں کے بارے میں بھی انصاف اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت بھی عدل وانصاف اور یتیموں کے مال انہیں سپرد کرنے کے وقت گواہ بنانے اور بنوابیرق کے قصہ میں بعض لوگوں کی ناحق طرف داری کے مضامین بیان ہو چکے ہیں، ان مضامین کے ساتھ اس آیت کو خاص مناسبت ہے۔

اظہار حق اور انصاف کا واجب ہونا:

اے ایمان والو! (لین دین کے تمام معاملوں میں ادائیگی کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی) انصاف پر خوب قائم رہنے والے (اور اقرار یا شہادت کی نوبت آئے تو) اللہ کی خوشنودی کے لئے (سچی) گواہی دینے والے بنو، اگرچہ (وہ گواہی) اپنی ہی ذات پر ہو (جس کو اقرار کہتے ہیں) یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو (اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہیں، یہ امیر ہے اس کو نفع پہونچانا چاہئے، تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ کہ یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کریں، تم کسی کی امیری، غریبی کو نہ دیکھو، کیونکہ) وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی) اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے (اتنا تعلق تمہیں نہیں کیوں کہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر جب باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی کہ حق کا اظہار کیا جائے تو تم ضعیف تعلق پر ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو؟) تو تم (اس شہادت میں) نفس کی خواہش کی پیروی مت کرنا، کہ کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کروگے (یعنی غلط گواہی دوگے) یا رخ پھیروگے (یعنی گواہی میں ٹال مٹول کروگے) تو (یاد رکھنا کہ) یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا انکار کرے اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روزِ قیامت کا تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔

ربط: اوپر زیادہ حصہ فروعی احکام کا مذکور ہوا ہے، اور ایمان وکفر کے مباحث: مخالفین کے ساتھ معاملات کے ضمن کہیں آگئے ہیں، اب یہ مباحث کسی قدر تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اور ختم سورت کے بالکل قریب تک چلے گئے ہیں، ترتیب اس طرح ہے: پہلے شریعت میں معتبر ایمان کا بیان ہے، پھر کفار کے مختلف فرقوں کی عقائد میں بھی اور بعض اعمال

میں بھی جو کہ عقائد کے فساد پر دلالت کرتے ہیں: مذمت ہے۔

شریعت میں معتبر ایمان:

اے ایمان والو! (یعنی جو اجمالی ایمان لا کر مؤمنوں کے اس زمرہ میں داخل ہو چکے ہیں) تم ضروری عقائد کی تفصیل سن لو کہ) ایمان رکھو اللہ (کی ذات وصفات) کے ساتھ اور اس کے رسول (محمد ﷺ کی رسالت) کے ساتھ اور اس کتاب) کے حق ہونے کے ساتھ جو اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) اپنے رسول (یعنی محمد ﷺ) پر نازل فرمائی اور ان کتابوں (کے حق ہونے) کے ساتھ (بھی) جو کہ (رسول اللہ ﷺ سے) پہلے (دوسرے نبیوں پر) نازل ہو چکی ہیں (اور رسول اللہ ﷺ اور گذشتہ کتابوں پر ایمان لانے میں ملائکہ اور باقی انبیاء علیہم السلام اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنا بھی داخل ہو گیا) اور جو شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات یا صفات) کا انکار کرے اور (اسی طرح جو) اس کے فرشتوں کا (انکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کی کتابوں کا (جن میں قرآن مجید بھی آ گیا) انکار کرے (اور اسی طرح) جو اس کے رسولوں کا (جن میں رسول اللہ ﷺ بھی داخل ہیں) انکار کرے، (اور اسی طرح جو) قیامت کے دن کا (انکار کرے) تو وہ شخص گمراہی میں (حق یعنی واقعی سے اور مقصد یعنی نجات سے بھی) بہت دور جا پڑا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿۱۳۷﴾﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے۔ اور نہ ان کو راستہ دکھائیں گے۔

ربط: اوپر اہل کفر کی مذمت اجمالی طور پر بیان ہوئی ہے، اب تفصیل ہے، چنانچہ ان میں ایک فرقہ مرتد لوگوں کا ہے اس کا پہلے بیان ہوا ہے۔

مرتد لوگوں کی مذمت:

بلاشبہ جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے، پھر مسلمان ہوئے (اور اس بار بھی اسلام پر قائم نہ رہے، ورنہ پہلی بار مرتد ہو جانا معاف ہو جاتا بلکہ) پھر کافر ہو گئے پھر (مسلمان نہ ہوئے ورنہ پھر بھی ایمان قبول ہو جاتا بلکہ) کفر میں بڑھتے چلے گئے (یعنی کفر پر مرتے دم تک ثابت اور قائم رہے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو منزل مقصود یعنی جنت کا راستہ دکھائیں گے (کیونکہ مغفرت اور جنت کے لئے ایمان پر موت ہونا شرط ہے)

فائدہ: جو ایک بار مرتد ہوا اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اس پر قائم رہنے سے مغفرت و جنت سے محروم ہے، یہاں دوسری

بار ارتداد یعنی مرتد ہونے کا ذکر کسی قید کے طور پر نہیں بلکہ بعض لوگوں نے آیت کے نزول کے زمانہ میں ایسا کیا تھا، اس لئے اس عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

﴿ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾

ترجمہ: منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے جن کی یہ حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔

ربط: اوپر مرتد لوگوں کا ذکر تھا، اہل کفر میں ایک فرقہ منافقوں کا تھا، اب ان کا ذکر ہے۔

منافقوں کی مذمت:

منافقوں کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے (آخرت میں) بڑی دردناک سزا (تجویز کی گئی) ہے جن کی یہ حالت ہے کہ (عقائد تو اہل ایمان کے نہ رکھتے تھے، مگر وضع قطع بھی اہل ایمان کی نہ رکھ سکے، چنانچہ) مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا ان کے پاس (جا کر) معزز رہنا چاہتے ہیں تو (خوب سمجھ لو کہ) اعزاز تو سارا اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے (وہ جس کو چاہیں دیں، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ان کو یا جن سے جا جا کر وہ دوستی کرتے ہیں ان کو اعزاز نہ دیں تو کہاں سے معزز بن جائیں گے)

فائدہ: چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جلدی ہی مسلمانوں کے ہاتھوں سے سب کو ذلیل وخوار کر دیا۔ منافقوں کا کفار سے ملنا اس غرض سے تھا کہ انہیں مسلمانوں کے اس طرح غالب آنے کی توقع نہیں تھی، وہ سوچتے تھے کہ ہمیشہ تو ان یہود یا مشرکوں کے ساتھ رہنا ہوگا، پھر ان سے کیوں بگاڑ کریں؟

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَاۨ ۝ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ ع

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں کہ اس حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقیناً

اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے، وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں، پھر اگر تمہاری فتح من جانب اللہ ہو گئی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا۔ سو اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں فیصلہ فرما دیں گے۔ اور ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرماویں گے۔

ربط: اوپر کی آیتوں میں منافقوں کا کافروں سے دوستی کرنے کا ذکر تھا، اب مسلمانوں کو کفار کے ساتھ دوستی رکھنے سے مطلق طور پر آیت ﴿ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ ﴾ میں اور ان کے کفریات کے مشغلہ کے وقت ظاہری طور پر ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے بھی جو کہ زیادہ معصیت کا سبب ہے ﴿ فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ ﴾ میں ممانعت فرماتے ہیں اور کھلے کافروں کے ساتھ منافقوں کو بھی آیت ﴿ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ ﴾ میں شامل فرماتے ہیں اور ساتھ ساتھ منافقوں کی قباحتوں کا بھی اظہار فرماتے جاتے ہیں، تاکہ موقع و محل کے مقصود کی اور زیادہ تاکید ہو جائے۔

کفریہ باتوں کے تذکرہ کے وقت کفار کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت:

اور (اے مسلمانو! دیکھو تم منافقوں کی طرح کفار کے ساتھ خصوصی تعلق مت رکھنا، خاص طور سے جس وقت وہ کفریہ باتوں کا تذکرہ کرتے ہوں، چنانچہ اس مدنی سورت سے پہلے بھی) اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان (سورۂ انعام میں جو کمی ہے) بھیج چکا ہے (جس کا حاصل یہ ہے) کہ جب (کسی مجمع میں) اللہ کے احکام کے ساتھ استہزا اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو، جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں (اور یہ مضمون اس آیت کا حاصل ہے: ﴿ وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ ﴾ الخ یہ استہزاء کرنے والے مکہ میں مشرک لوگ تھے اور مدینہ میں یہود تو اعلانیہ اور منافق صرف غریب و کمزور مسلمانوں کے سامنے، تو جس طرح وہاں مشرکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ممنوع تھا، یہاں یہود اور منافقوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ممنوع ہے، اور یہ ممانعت ہم اس لئے کرتے ہیں) کہ اس حالت میں تم بھی (گناہ میں) انہی جیسے ہو جاؤ گے (اگرچہ دونوں کی خصوصیت میں فرق ہو کہ ایک گناہ کفر کا ہے، دوسرا فسق کا، اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی اس ممانعت میں سب برابر ہیں، کیونکہ اس کی علت کفر میں غور و فکر اور خوض ہے۔ اور اس غور و فکر کا منشا کفر ہے، اور اس میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ کفر کی سزا یعنی جہنم کا آئندہ (حصہ) بننے میں بھی دونوں برابر ہوں گے، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو جہنم میں جمع کر دیں گے (اور) وہ (منافق) ایسے ہیں کہ تمہارے اوپر مصیبت آنے کے منتظر اور آرزومند رہتے ہیں، پھر (ان کے اس انتظار کے بعد) اگر اللہ کی مدد سے تمہاری فتح ہو گئی تو (تم سے آکر) باتیں بناتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ (جہاد میں شریک) نہیں تھے (کیونکہ نام کرنے کو تو مسلمانوں میں گھسے ہی رہتے تھے، مطلب یہ تھا کہ ہمیں بھی مال غنیمت میں سے حصہ دو) اور اگر کافروں کو (غلبہ کا) کچھ حصہ مل گیا (یعنی وہ اتفاق سے غالب آئے) تو (ان

سے جا کر) باتیں بناتے کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے (مگر ہم نے قصداً تمہارے غالب آنے کی غرض سے مسلمانوں کی مدد نہ کی اور ایسی تدبیر کی کہ لڑائی کا نقشہ بدل گیا) اور کیا ہم نے (جب تم مغلوب ہونے لگے تھے تو) تمہیں مسلمانوں سے بچا نہیں لیا (اس طرح کہ ان کی مدد نہ کی اور اپنی تدبیر کے ذریعہ لڑائی کا نقشہ بدل دیا، مطلب یہ کہ ہمارا احسان مانو اور جو کچھ تمہارے ہاتھ آیا ہے ہمیں بھی کچھ دلاؤ، غرض دونوں طرف ہاتھ مارتے ہیں) تو (دنیا میں اگرچہ اسلام کے اظہار کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن) اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرمادیں گے، اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے (بلکہ کفار مجرم قرار پا کر جہنم میں جائیں گے اور مسلمان اہل حق ثابت ہو کر جنت میں جائیں گے، اور عملی فیصلہ یہی ہے)

فائدہ: اس کو فیصلہ فرمایا حالانکہ فیصلہ اختلاف کی صورت میں ہوتا ہے، تو وہ اختلاف اگرچہ نفاق کی وجہ سے گفتگو میں کم آتا تھا، لیکن عقائد اور مسلک تو الگ تھے ہی، اور وہ اس مسلک پر اس لئے نازاں تھے کہ ہمیں دنیا میں بھی امن حاصل ہے اور آخرت میں بھی نجات مل جائے گی، لیکن اس کا عملی فیصلہ وہاں ہوجائے گا۔ اور ''عملی'' کی قید اس لئے لگائی کہ حق وباطل کے دلائل تو یہاں بھی واضح ہیں، اور ﴿ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ ﴾ الخ میں یہ قید ظاہر کردی کہ اس فیصلہ میں، اس سے یہ شبہ دور ہوگیا کہ دنیا میں تو کفار کبھی کبھی مسلمانوں پر غالب ہوجاتے ہیں۔

مسئلہ: اہل باطل کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی چند صورتیں ہیں: اول ان کی کفریات پر رضامندی کے ساتھ تو یہ کفر ہے، دوسرے کفریات کے اظہار کے وقت کراہت کے ساتھ یہ بلا عذر فسق ہے، تیسرے کسی دنیوی ضرورت کے واسطے سے یہ مباح ہے، چوتھے احکام کی تبلیغ کے لئے تو یہ عبادت ہے، پانچویں مجبوری اور معذوری اور غیر اختیاری طور پر اس میں معذور ہے۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۝﴾

ترجمہ: بلاشبہ منافق لوگ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں، اور جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں صرف آدمیوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر، معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان میں، نہ ادھر نہ اُدھر۔ اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں ایسے شخص کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔

ربط: یہ آیت بھی منافقین کی برائیوں کا تتمہ ہے۔

منافقین کی برائیوں کا تتمہ:

بلاشبہ منافق لوگ (ایمان کے اظہار میں) اللہ سے چالبازی کرتے ہیں (اگرچہ ان کی چال اللہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور اگرچہ ان کا یہ عقیدہ نہ ہو مگر ان کی یہ کارروائی اسی کے مشابہ ہے کہ جیسے یہی ان کا عقیدہ ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں، اور (چونکہ ان کے دل میں ایمان تو ہے نہیں اور اس لئے نہ نماز کو فرض سمجھیں، نہ اس میں ثواب کا عقیدہ رکھیں اس لئے) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی (مرے دل) کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں (کیونکہ نشاط تو اعتقاد اور امید سے پیدا ہوتا ہے) صرف لوگوں کو (اپنا نمازی ہونا دکھاتے ہیں تاکہ لوگ مسلمان سمجھیں) اور (چونکہ محض نام ہی کرنا ہے، اس لئے اس نماز میں) اللہ تعالیٰ کا ذکر دل کی گہرائی سے تو کیا (زبانی) بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر (یعنی صرف صورت نماز کی بنا لیتے ہیں، جس سے نماز کا نام ہو جائے، اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صرف اٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو، کیونکہ جہر یعنی آواز سے پڑھنے کی ضرورت تو بعض نمازوں میں امام کو ہوتی ہے، انہیں امامت تو کہاں نصیب ہوتی، مقتدی ہونے کی حالت میں اگر کوئی بالکل نہ پڑھے صرف ہونٹ ہلاتا رہے تو کسی کو کیا خبر ہو، اور ایسے بدعقیدہ لوگوں سے کیا بعید ہے کہ زبان نہ ہلتی ہو وہ کافروں اور مؤمنوں کے بیچ میں) لٹکے ہوئے ہیں نہ (پورے) اِدھر نہ (پورے) اُدھر (کیونکہ خود کو مؤمن ظاہر کرتے ہیں تو کافروں سے الگ اور اندر سے کافر ہیں تو مؤمنوں سے الگ) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (جیسا کہ ان کی عادت ہے، وہ فعل کے عزم کے وقت فعل کو پیدا کر دیتے ہیں) ایسے شخص کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی راستہ نہ پاؤ گے (مطلب یہ کہ ان منافقوں کی راہ پر آنے کی امید مت رکھو، اس فقرہ میں منافقوں کی برائی ہے اور مؤمنوں کو تسلی کہ ان کی شرارتوں کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہوں)

فائدہ: جس سستی و کاہلی کی یہاں مذمت ہے، وہ عقیدہ کی کاہلی ہے اور جو کاہلی صحیح عقیدہ کے باوجود ہو، وہ اس سے خارج ہے۔ پھر اگر کسی عذر کی وجہ سے ہو جیسے مرض و تکان اور نیند کا غلبہ تب تو ملامت کی بات بھی نہیں، البتہ اگر بغیر کسی عذر کے ہو تو قابل ملامت ہے۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم یوں چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم کر لو۔

ربط: آگے کفار کے ساتھ خصوصیت و تعلق رکھنے کی ممانعت کے مضمون کا تتمہ ہے، جس پر آیت ﴿ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ ﴾ سے دلالت ہوئی ہے۔

چھبیسواں حکم: کفار کے ساتھ دوستی کی ممانعت:

اے ایمان والو! تم مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو (چاہے منافق ہوں یا کھلے کافر) دوست مت بناؤ (جیسا کہ منافقوں کا طریقہ ہے، کیونکہ تمہیں ان کے کفر اور دشمنی کی حالت معلوم ہو چکی) کیا تم (ان سے دوستی کر کے) یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر (یعنی اپنے مجرم اور عذاب کے مستحق ہونے پر) اللہ تعالیٰ کی کھلی واضح حجت قائم کرلو (کھلی حجت یہی ہے کہ جب ہم نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا تو پھر کیوں کیا؟)

حوالہ: دوستی اور تعلقات کی تحقیق سورۃ آل عمران آیت ۲۸ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

﴿ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿﴾ ﴾

ترجمہ: بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جاویں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پاوے گا، لیکن جو لوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور اللہ تعالیٰ پر وثوق رکھیں اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لئے کیا کریں، تو یہ لوگ مؤمنین کے ساتھ ہونگے۔ اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرماویں گے، اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم سپاس گزاری کرو، اور ایمان لے آؤ، اور اللہ تعالیٰ بڑے قدر کرنے والے خوب جاننے والے ہیں۔

ربط: اوپر منافقوں کی قبیح اور بری خصلتوں کا بیان تھا، اگرچہ ایک مضمون کے ضمن میں انہیں جہنم کی سزا دینے کا ذکر بھی آ گیا تھا، اب اصلاً ان کی سزا کا بیان مقصود ہے، اور چونکہ سزا کے بیان کا اثر اپنے طور پر یہ ہے کہ سلیم مزاج والے آدمی کو اس سے خوف پیدا ہو جاتا ہے جو توبہ کا سبب ہو جاتا ہے اس لئے توبہ کرنے والوں کا سزا سے مستثنیٰ ہونا اور ان کی نیک جزا کا بیان بھی فرمایا۔

منافقوں کی سزا اور توبہ کرنے والوں کی جزا:

بلاشبہ منافق لوگ جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے اور (اے مخاطب) تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پاوے گا (جو ان کو اس سزا سے بچا سکے) لیکن (ان میں سے) جو لوگ (نفاق سے) توبہ کرلیں اور (مسلمانوں کے ساتھ جو ان کے ایذا پہنچانے کے معاملے تھے، ان کی) اصلاح کرلیں (یعنی پھر ایسی باتیں نہ کریں) اور (کفار سے جو ان کی میں رہنے کی غرض سے دوستی کرتے ہیں، اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ پر) بھروسہ رکھیں اور (ریاکاری و دکھاوے کو چھوڑ کر)

اپنے دین (کے اعمال) کو خالص اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کیا کریں (غرض اپنے عقائد، معاملات، اخلاق باطنی اور اعمال سب کی اصلاح کرلیں) تو یہ (توبہ کرنے والے) لوگ (ان) مؤمنوں کے ساتھ (جنت کے درجوں میں) ہوں گے (جو کہ پہلے سے کامل ایمان رکھتے ہیں) اور (ان) مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ (آخرت میں) اجر عظیم عطا فرمائیں گے (لہٰذا جب یہ مؤمنوں کے ساتھ ہوں گے، تو ان کو بھی اجر عظیم ملے گا اور اے منافقو!) اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم (ان نعمتوں کی جو تم پر ہیں) شکر گذاری کرو اور (اس شکر گذاری کا ہمارا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ تم) ایمان لے آؤ (یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا جو تمہیں سزا دینے سے نکل جائے، تمہارا کفر جو انتہائی سخت درجہ کا کفران نعمت ہے، تمہاری عقوبت وسزا کا سبب ہے، اگر اس کو چھوڑ دو تو پھر رحمت ہی رحمت ہے، اور اللہ تعالیٰ (تو شکر گذاروں کی) بڑی قدر کرنے والے (اور شکر گذاروں کے خلوص وغیرہ کو) خوب جاننے والے ہیں (لہٰذا جو شخص اطاعت اور خلوص کے ساتھ رہے، اس کو بہت کچھ دیتے ہیں)

فائدہ: توبہ کے ساتھ ﴿ اَصْلَحُوْا ﴾ (یعنی وہ لوگ جو اصلاح کرلیں) ﴿ وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ (اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں) اور ﴿ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ ﴾ (اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کرلیا کریں) کا اضافہ فرمایا، ان کی جو تفسیر احقر نے اختیار کی ہے، اس کے اعتبار سے یہ قیدیں مؤمنوں کا پوری طرح ساتھ دینے کے لئے ہیں، کیونکہ ان میں کمی وخلل گناہ ہے جس میں معیت ناقص ہو جاتی ہے اور اگر ایسی تفسیر کی جائے کہ ان سب کا حاصل ایمان ہی سمجھا جائے تو یہ ایسی قیدیں ہوں گی کہ نفس معیت یعنی خاص طور سے ساتھ دینا یعنی نجات ان پر موقوف ہوگی۔ فقط

﴿ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ۝ ﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب جانتے ہیں۔ اگر نیک کام علانیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو یا کسی برائی کو معاف کردو تو اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں، پوری قدرت والے ہیں۔

ربط: اوپر منافقوں اور کافروں کے احوال میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ عداوت رکھنے کا ذکر تھا، چنانچہ عداوت ودشمنی میں اکثر ایذا رسانی کی نوبت بھی آتی رہتی ہے اور جس کو ایذا پہنچتی ہے، اکثر اس کی زبان سے شکایت بھی نکل جاتی ہے، اس مناسبت سے اب اس کے جواز وعدم جواز کی تحقیق مع معافی کی فضیلت کے بیان فرماتے ہیں۔

ستائیسواں حکم: شکایت کے جواز وعدم جواز کی تحقیق اور معافی کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو کسی کے لئے پسند نہیں کرتے، سوائے مظلوم کے (کہ وہ اپنی مظلومیت کی کہانی

بیان کرنے اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کی شکایت کرنے لگے تو اس میں گناہ نہیں) اور اللہ تعالیٰ (مظلوم کی) بات خوب سنتے ہیں (اور ظالم کے ظلم کی حالت) خوب جانتے ہیں (اس میں اشارہ ہے کہ مظلوم کو بھی خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت نہیں اور باوجودیکہ ایسی شکایت جائز تو ہے، لیکن) اگر نیک کام علانیہ کرو یا اس کو خفیہ طور پر کرو (جس میں معاف کرنا بھی آگیا) یا (خاص طور سے) کسی (کی) برائی کو معاف کر دو تو (زیادہ افضل ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں (اس کے باوجود کہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح انتقام لے سکتے ہیں، پھر بھی اکثر معاف ہی کر دیتے ہیں، لہٰذا اگر تم ایسا کرو تو اول تو یہ اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنانا ہے، پھر تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کرنے کی امید ہوگی)

فائدہ: ﴿لَا یُحِبُّ اللّٰہُ﴾ کی نفی اور ﴿اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ﴾ کے استثناء سے جو حصر ہوا ہے، یہ حصر اس شخص کے اعتبار سے اضافی ہے جو کسی معتبر شرعی مصلحت کے بغیر دوسرے شخص کی شکایت کرے، اس طرح یہ حصر حقیقی نہیں، کیونکہ ظالم کے سوا اور بھی بعض کی برائی کا اظہار جائز ہے، مثلاً جس شخص سے کسی دینی یا دنیاوی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ ہو، اس کے حال سے لوگوں کو مطلع کر دینا جائز ہے، بلکہ واجب ہے۔ مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کسی مصلحت اور ضرورت کے کسی کے عیب کو بیان کرنا جائز نہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾٪﴾

ع ۲۱

ترجمہ: جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں فرق رکھیں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں، اور بعضوں کے منکر ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں، ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں، اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار رکھی ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کے ثواب دیں گے، اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے، بڑے رحمت والے ہیں۔

ربط: یہاں تک منافقوں کا بیان ہو چکا، کافروں میں ایک فرقہ یہود کا ہے، اب ان کا بیان ہے، اس تقسیم کا بیان پیچھے آیت ﴿بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ﴾ اور اس سے پہلے کی دو آیتوں کی تمہید میں دیکھ لیا جائے سو یہود کی بعض قبیح خصلتوں کا اس جگہ ذکر ہوتا ہے۔

یہود کی پہلی مذمت:

جو لوگ کفر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ (جیسا کہ ان کے اگلے عقیدہ اور قول سے صاف لازم آتا ہے) اور (کفر کرتے ہیں) اس کے رسولوں کے ساتھ (یعنی بعض کے ساتھ صراحتاً کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کی نبوت کے منکر تھے، اور سب کے ساتھ لزوماً جیسا آگے آتا ہے) اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں (ایمان لانے کے اعتبار سے) فرق رکھیں اور (اپنے اس عقیدہ کو زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعض پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کے منکر ہیں، (اس قول سے اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کفر لازم آگیا، اور رسولوں کے ساتھ بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اور ہر رسول نے سارے رسولوں کو رسول کہا ہے۔ جب بعض کا انکار ہوا تو اللہ تعالیٰ کے دوسرے رسولوں کی بھی تکذیب ہوگئی جو کہ تصدیق اور ایمان کی ضد ہے اور یوں چاہتے ہیں کہ بیچ کی ایک راہ تجویز کریں (کہ نہ سب پر ایمان ہے جیسے مسلمان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ سب کا انکار ہے جیسا کہ مشرک کرتے تھے) ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں (کیونکہ بعض کے ساتھ کفر بھی کفر ہے اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی چیز نہیں جب سب پر ایمان نہیں ہوا تو کفر ہی ہوا) اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے (وہی ان کے لئے بھی ہوگی) اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر (بھی) اور ان میں سے کسی میں (ایمان لانے کے اعتبار سے) فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کے ثواب دیں گے اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں (اس لئے ایمان لانے سے پہلے جتنے گناہ ہو چکے ہیں، سب بخش دیں گے اور چونکہ وہ بڑے رحمت والے ہیں، اس لئے ایمان کی برکت سے ان کے حسنات کو بڑھا کر خوب ثواب دیں گے)

فائدہ: بعض مفسرین نے اس آیت کو یہود و نصاریٰ دونوں کی شان میں قرار دیا ہے کیونکہ نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے جیسا کہ عبد بن حمید اور ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے، لیکن آگے پیچھے یہود کا ذکر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس آیت کا یہود کی شان میں ہونا زیادہ مہتم بالشان ہو، اگرچہ ان کے تابع ہو کر نصاریٰ بھی لفظ کے عموم میں داخل ہو جائیں۔

﴿ یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَیْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ۝ ﴾

ترجمہ: آپ سے اہل کتاب یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوا دیں سو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی اور یوں کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دکھلا دو،

جس پر ان کی اس گستاخی کے سبب ان پر کڑک بجلی آپڑی، پھر انھوں نے گؤسالہ کو تجویز کیا تھا، بعد اس کے کہ بہت سے دلائل ان کو پہنچ چکے تھے پھر ہم نے اس سے درگزر کر دیا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بڑا رعب دیا تھا۔

ربط: اوپر یہود کی مذمت تھی، آگے دوسری مذمت ہے۔

یہود کی دوسری مذمت:

(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے اہل کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص تحریر آسمان سے منگا دیں، تو (آپ ان لوگوں سے اس درخواست کو عجیب مت سمجھئے، کیونکہ یہ فرقہ ایسا عناد رکھنے والا ہے کہ) انھوں نے (یعنی اس فرقہ میں جو لوگ اس وقت تھے) موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی، اور یوں کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا (بغیر حجاب کے) دکھا دو، چنانچہ ان کی اس گستاخی کے سبب ان پر بجلی ٹوٹ پڑی، پھر (اس سے بھی بڑھ کر ان کی یہ حرکت ہو چکی ہے کہ) انھوں نے گؤسالہ کو (عبادت کے لئے) تجویز کیا تھا، جبکہ اس سے پہلے ان کے پاس بہت سے دلائل (حق و باطل کی تعیین کے) پہونچ چکے تھے (ان دلائل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے مراد ہیں، جن میں سے فرعون کے غرق ہونے تک بہتوں کا مشاہدہ ہو چکا تھا) پھر ہم نے اس سے درگذر کر دیا تھا، اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بڑا رعب دیا تھا، اور (اس رعب پر اور ہمارے درگذر اور عنایت پر ان لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ نہ عنایت سے متاثر ہوتے تھے نہ رعب سے)

فائدہ: روح المعانی میں ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ عناد) یہ درخواست کی کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحریر اس مضمون کی آئے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے فلاں یہودی کے نام کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اسی طرح ہر یہودی کے نام خطوط ہوں، اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی کہ یہ لوگ ہمیشہ سے ایسی جہالتیں کرتے رہے ہیں، آپ اپنا دل تھوڑا نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ اس سے بڑھ کر اس لئے ہے کہ اللہ کی کتابیں تو دنیا میں نازل ہوتی آئی ہیں، اگرچہ غیر انبیاء علیہم السلام کے پاس نہیں آئیں، جیسا وہ چاہتے تھے، مگر اللہ کو دیکھنے کا معاملہ تو دنیا میں کبھی بھی نہیں ہوا، اور گؤسالہ گائے کے بچھڑے کی عبادت اس سے بڑھ کر اس لئے ہے کہ اللہ کو دیکھنے کا واقعہ اگرچہ دنیا میں کبھی نہیں ہوا، مگر آخرت میں تو بعض حضرات دیکھیں گے، لیکن غیر اللہ کا عبادت کے قابل ہونا عقلاً محالات میں سے ہے کہ کسی بھی جگہ زمانہ میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا اور گائے کے بچھڑے کی عبادت کا قصہ مشہور روایتوں میں اللہ کو دیکھنے سے متعلق سوال سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن یہاں لفظ 'پھر' جو کہ لفظ ثم کا ترجمہ ہے، زمانہ کے لحاظ سے بعد میں ہونے کے لئے نہیں بلکہ اس کو بہت دور کی بات قرار دینے کے مفہوم میں ہے، جیسا کہ لفظ 'بڑھ کر' سے ظاہر ہے، اور ان قصوں کی تفصیل یعنی اللہ کو دیکھنے کا سوال اور بجلی کا گرنا اور گؤسالہ کو معبود بنانا اور معافی اور اسی

طرح بعد میں بیان ہونے والے قصوں جیسے طور کا اٹھا کر معلق کرنا، اور دروازہ میں داخل ہونا اور یوم السبت کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا اور انبیاء علیہم السلام کا قتل اور ان کے عہد اور ان کے قول ﴿ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے متعلق قصوں میں گذر چکی ہے، اس لئے ان کو یہاں نہیں دہرایا گیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اور مریم رضی اللہ عنہا سے متعلق بعض اقوال کا ذکر اجمالی طور پر سورۂ آلِ عمران میں گذر چکا ہے، اور کچھ تفصیل آگے آجائے گی۔

﴿ وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ ﴾

ترجمہ: اور ہم نے ان سے قول وقرار لینے کے واسطے کوہ طور کو اٹھا کر ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی سے داخل ہونا، اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم ہفتہ کے بارے میں تجاوز مت کرنا، اور ہم نے ان سے قول وقرار نہایت شدید لئے، سو ہم نے سزا میں مبتلا کیا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر کی وجہ سے احکام الٰہیہ کے ساتھ اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو ناحق اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے، سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل۔

ربط: اوپر یہود کی بعض جہالتوں اور عناد کا بیان تھا، اب بعض اور جہالتوں کا بیان ہے، جس سے ان کی مذمت بھی مقصود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور زیادہ تسلی کا بھی ذکر ہے، اور اس مزید فائدہ سے ان قصوں میں تکرار نہیں رہی۔

یہود کی جہالت کے بعض اقوال واحوال:

اور ہم نے ان لوگوں سے (توریت پر عمل کرنے کا) عہد لینے کے واسطے کوہ طور اٹھا کر ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی کے ساتھ داخل ہونا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم السبت (ہفتہ کے دن) کے بارے میں (جو حکم تمہیں ملا ہے، اس میں شکار نہ کریں اور شریعت کی حد سے مت بڑھنا) اور (اس کے علاوہ اور بھی) ہم نے ان سے عہد نہایت سخت لئے (جس کا بیان آیت ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ میں ذکر ہے، لیکن ان لوگوں نے اس قدر اہتمام کے باوجود پھر اپنے عہدوں کو توڑ ڈالا) تو ہم نے (ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے لعنت وغضب اور ذلت ومسخ وغیرہ کی) سزا میں مبتلا کیا (یعنی) ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے اور ان کے انبیاء کو ناحق قتل کرنے کی وجہ سے (جو ان کے نزدیک بھی ناحق تھا) اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب کا جو کہ اسلام ہے، اثر نہیں ہوتا، کہ ہم اپنے مذہب میں خوب پختہ ہیں۔ حق تعالیٰ اس پر رد فرماتے ہیں کہ یہ مضبوطی اور پختگی نہیں ہے بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر (اللہ تعالیٰ نے بند

لگا دیا ہے (کہ ان میں حق بات کا اثر نہیں ہوتا) تو ان میں ایمان نہیں مگر تھوڑا سا (اور تھوڑا سا ایمان مقبول نہیں، لہٰذا یہ کافر ہی ٹھہرے)

فائدہ: عہد شکنی میں بعد کا سارا مضمون داخل ہے، لیکن زیادہ برا قرار دینے کے لئے سب معاملات کو الگ الگ بھی بیان فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے کہ ان کے احکام کے منکر ہیں، انبیا علیہم السلام کے ساتھ یہ سلوک ہے کہ تکذیب سے گذر کر انہیں قتل کر دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے حق پر ہونے کے دعویدار ہیں، اور یہ سب کفر کی صورتیں ہیں۔

﴿وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝﴾

ترجمہ: اور ان کے کفر کی وجہ سے اور حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے، قتل کر دیا حالانکہ انھوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا۔ اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انھوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں، اور کوئی شخص اہل کتاب سے نہ رہے گا مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے مرنے سے پہلے ضرور تصدیق کرے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے۔

ربط: اوپر یہود پر لعنت وغیرہ کے کچھ اسباب بیان فرمائے تھے، بعض وجوہ کا ذکر اب ہے۔

سابق مضمون کا تتمہ:

اور (ہم نے ان کو لعنت کی سزا وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مبتلا کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے (اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ) حضرت مریم رضی اللہ عنہا پر ان کے بڑا بھاری بہتان لگانے کی وجہ سے (جس سے عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب لازم آتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ کے ذریعہ ان کا بہتان سے پاک اور بری ہونا ظاہر فرما چکے ہیں) اور (ان کے فخر کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے) یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا جو کہ اللہ تعالیٰ

کے رسول ہیں (ان کا یہ کہنا عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دین سے ان کی دشمنی کی دلیل ہے اور انبیاء کے ساتھ دشمنی کفر ہے، اور اس میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے انہیں قتل کرنے کا دعوی ہے اور نبی کا قتل کفر ہے اور کفر کا دعوی بھی کفر ہے) حالانکہ (کفر ہونے کے علاوہ خود دعوی بھی غلط ہے، کیونکہ) انھوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھا دیا لیکن ان کو (یعنی یہود کو) شبہ میں ڈال دیا گیا، اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں سوائے خیال وگمان کی باتوں پر عمل کرنے کے اور انھوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعوی کرتے ہیں) بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھا لیا (اور ایک دوسرے شخص کو ان کا ہم شکل بنا دیا اور اس کو سولی پر چڑھایا اور قتل کیا، اور یہی یہود کے شبہ میں پڑنے کا سبب ہوا اور اس اشتباہ سے اہل کتاب میں اختلاف پیدا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی قوت والے) حکمت والے ہیں (کہ اپنی قدرت وحکمت سے عیسیٰ علیہ السلام کو بچا لیا اور اٹھا لیا اور یہود کو مشابہ ہونے کی وجہ سے پتہ بھی نہ چلا) اور (یہود کو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے انکار میں اپنا جھوٹا اور باطل ہونا بہت جلد دنیا ہی میں ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ آیت کے نازل ہونے کے وقت سے لے کر کسی بھی زمانہ میں) کوئی شخص اہل کتاب (یعنی یہود میں) سے (باقی نہ رہے گا مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) کی اپنے مرنے سے (ذرا) پہلے (جبکہ عالم برزخ نظر آنے لگتا ہے) ضرور تصدیق کرے گا (اگرچہ اس وقت کی تصدیق کوئی فائدہ نہیں دیتی، مگر باطل کو ظاہر کرنے کے لئے تو کافی ہے تو اس کے مقابلہ میں اگر اب بھی ایمان لے آئیں تو فائدہ ہو جائے) اور (جب دنیا اور برزخ دونوں ختم ہو چکیں گی، یعنی قیامت کے دن وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان (منکروں کے انکار) پر گواہی دیں گے۔

فائدہ (۱): عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھائے جانے سے متعلق بحث اور اہل کتاب کے مختلف اقوال کا بیان سورۂ آلِ عمران میں اور انبیاء کا گواہی دینا سورۃ النساء میں اور موت کے قریب ایمان کا نافع نہ ہونا بھی سورۃ النساء میں بیان ہو چکا ہے۔ دوبارہ دیکھ لیا جائے اور عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور موت کی بحث میں کتاب 'سیف چشتیائی' قابل مطالعہ ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ جو رسول اللہ آیا ہے یہ یہود کا نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ دیکھو ایسی شخصیت کے بارے میں ایسا کہتے ہیں۔

فائدہ (۲): ﴿ لَيُؤْمِنَنَّ ﴾ میں جو مستقبل کا حکم لیا گیا ہے وہ وقوع کے وقت حال ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ دونوں تو آیت کے مدلول ہو گئے اور اس میں ماضی سے سکوت اختیار کیا گیا ہے مگر فرق کرنے والی بات نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بھی یہی عیسیٰ پر ایمان کا حکم ثابت ہوگا۔

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝﴾

ترجمہ: سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام کردیں، اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے مانع بن جاتے تھے اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی، اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ سے کھا جاتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے۔

ربط: اوپر یہود کی بعض شرارتوں اور کچھ سزاؤں وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے جو کہ تکوینی امور کی قسم سے ہیں، اور دنیا میں واقع ہونے والے ہیں۔ اب ان کی بعض شرارتوں کا جو تشریعی امور کے قبیل سے ہیں، اور دنیا میں واقع ہونے والی بعض سزاؤں کا جیسے: ان کے اوپر پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنا، اخروی سزاؤں کے ساتھ جو کہ دردناک عذاب ہے تذکرہ فرماتے ہیں، اور چونکہ اصل سزا یہی (اخروی سزا) ہے، اس لئے یہود کے ذکر کے شروع میں بھی اس کو عذاب مھین یعنی اہانت آمیز سزا کے عنوان سے بیان فرمایا تھا، اس طرح شروع میں بھی اور آخر میں بھی دونوں طرف سے زیادہ تاکید ہوگئی۔

سابق مضمون کا دوسرا تتمہ:

تو یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب (جن میں سے بہت سے امور سورۂ بقرہ میں بیان کئے گئے ہیں) ہم نے بہت سی پاکیزہ (یعنی حلال اور نفع بخش اور لذیذ) چیزیں جو (پہلے سے) ان کے لئے (بھی) حلال تھیں (جیسا کہ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۹۳ میں گذر چکا ہے) ان پر (موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں) حرام کردیں (جن کا بیان سورۂ انعام کی آیت ۱۴۶ میں ہے اور حرام قرار دئے جانے کا سبب معصیت ہونا وہاں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ﴾ الخ) اور (شریعت موسویہ میں بھی بعد کے نبیوں کے زمانوں میں بھی وہ سب حرام ہی رہیں کوئی حلال نہ ہوئی) اس سبب سے کہ (وہ آئندہ بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے، مثلاً یہی کہ) وہ (احکام میں تحریف کرکے اور انہیں چھپا کر بہت سے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی دین حق کے قبول کرنے کی راہ میں) رکاوٹ بن جاتے تھے (کیونکہ ان کی اسی کارروائی سے عوام کو خواہ مخواہ شک وشبہ ہوتا تھا، اگرچہ طلب صادق ہونے سے وہ شک وشبہ دور ہوسکتا تھا) اور اس سبب سے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو (توریت میں) اس سے منع کردیا گیا تھا، اور اس سبب سے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ (یعنی خلاف شریعت طریقوں) سے کھا جاتے تھے، لہٰذا اس طرح رکاوٹ بننے، سود لینے اور ناحق طریقہ سے مال کھانے کی وجہ سے اس شریعت کی بقا تک تخفیف نہیں ہوئی، البتہ نئی شریعت عیسوی میں کچھ احکام بدلے تھے، جیسا کہ

سورۃ آلِ عمران کی آیت ۵۰ میں حضرت عیسیٰ کے قول ﴿ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے اور شریعت محمدیہ میں بہت زیادہ تخفیف ہوگئی، جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ میں ﴿ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ سے ثابت ہے، یہ تو دنیاوی سزا تھی) اور (آخرت میں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے (البتہ جو قاعدہ شرعیہ کے مطابق ایمان لے آئے اس کے پچھلے گناہ سب معاف ہو جائیں گے)

فائدہ (۱): جرائم سے جو تحریم (حرام قرار دینے کا حکم) ہوئی وہ تحریم عام تھی، اگر چہ جرائم سے بعض نیک وصالح لوگ محفوظ بھی تھے، کیونکہ بہت سی حکمتوں کے تقاضہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت وعادت یوں ہی جاری رہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے ﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ سورۃ الانفال آیت ۲۵۔ اور حدیث میں بھی ہے کہ بڑا مجرم وہ ہے جس کے بغیر ضرورت سوال کرنے سے کوئی شے سب کے لئے حرام ہو جائے، یعنی وحی کے زمانہ میں (مشکوٰۃ عن الشیخین)

فائدہ (۲): اور شریعت محمدیہ میں جو چیزیں حرام ہیں، وہ کسی جسمانی یا روحانی مضرت کی وجہ سے حرام ہیں کہ اس حیثیت سے غیر طیب ہیں، لہٰذا طیبات یعنی پاکیزہ ونافع چیزوں کی تحریم عقوبت وسیاست یعنی سزا کے طور پر ہے، اور غیر طیبات نقصان پہنچانے والی شے کی تحریم رحمت وحفاظت کے لئے ہے۔

﴿ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

ترجمہ: لیکن ان میں جو لوگ علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان لے آنے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے بھیجی گئی اور جو نماز کی پابندی کرنے والے ہیں اور جو زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں، ایسے لوگوں کو ہم ضرور ثواب عظیم عطا فرماویں گے۔

ربط: اوپر کفار یہود کا ذکر تھا، اب ان میں سے جو لوگ ایمان لے آئے تھے ان کا بیان ہے اور اگر چہ ﴿ يَسْئَلُكَ ﴾ سے پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے، لیکن یہاں دوسرے عنوان سے اور کسی قدر تفصیل ہے۔

مؤمنوں کی جزا اور مدح:

لیکن ان (یہود) میں جو لوگ علم (دین) میں پختہ (یعنی اس کے مطابق عمل کرنے میں مضبوط) ہیں (اور اسی آمادگی

نے ان پر حق کو واضح اور قبول حق کو سہل کر دیا جس کا آگے اصل کے اور فرع کے اعتبار سے ذکر ہے) اور جو (ان میں) ایمان لے آنے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے (نبیوں کے پاس) بھیجی گئی (جیسے توریت وانجیل اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں اور جو (ان میں) زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں (تو) ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔

فائدہ: ان سے عبداللہ بن سلام واسید اور ثعلبہ اور ان جیسے دوسرے لوگ مراد ہیں، اور آیت کا یہی شان نزول ہے (جیسا کہ روح المعانی میں الدلائل میں بیہقی کی روایت سے ابن عباسؓ سے منقول ہے) اور آیت میں اجر کامل کا تعلق ان مذکورہ امور پر مقصود ہے اور نفس اجر اور مطلق نجات صرف ضروری عقائد کی تصحیح سے وابستہ ہے۔

﴿ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ ﴾

ترجمہ: ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی، اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس، اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کے پاس وحی بھیجی تھی اور ہم نے داؤد کو زبور دی تھی، اور ایسے پیغمبروں کو صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں، اور ایسے پیغمبروں کو جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔ ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ پورے زور والے ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجا بھی اپنے علمی کمال کے ساتھ، شہادت دے رہے ہیں، اور فرشتے تصدیق کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت کافی ہے۔ جو لوگ منکر ہیں اور خدائی دین سے مانع ہوتے ہیں

بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں، بلاشبہ جو لوگ منکر ہیں اور دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوا جہنم کی راہ کے اور کوئی راہ دکھلاویں گے اس طرح پر کہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہا کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے۔

ربط: اوپر یہود کے اس سوال کا منشا بیان کیا گیا تھا جو ﴿یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ میں منقول ہے اور جس کا منشا جہالت اور عناد ہے، اور اس کے ثبوت میں بعد کے دوسرے مضامین تھے، آگے اس سوال کا جواب ارشاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے اثبات کے لئے یہ درخواست پوری طرح لغو ہے، ان نبی سے پہلے اور بھی اہل وحی یعنی انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں جن کی نبوت تمہارے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اگر نبوت کا اثبات اس پر موقوف ہے تو تمام انبیاء میں اس کا اثبات لازم آئے گا اور لازم پایا نہیں جارہا تو موقوف ہونا بھی باطل ہے، تو جس طرح کی دلیل سے دوسرے کی نبوت ثابت ہے، ایسی ہی دلیل یہاں بھی موجود ہے یعنی معجزے، پھر ایسی فرمائش اگر عناد نہیں تو اور کیا ہے؟ اس جواب کے لئے بہت سے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی خبر دیتے ہیں اور اس میں رسولوں کی بعثت کی حکمت ﴿لِئَلَّا یَكُوْنَ﴾ میں اور ختم پر مقصود کی تصریح یعنی نبوت محمدیہ کی جو کہ موقع ومحل کا نتیجہ ہے ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ﴾ میں اور اس کے بعد دلائل کے قیام اور حق کی وضاحت کے باوجود بھی انکار کرنے والوں کی بدحالی ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ سے ﴿یَسِیْرًا﴾ تک مذکورہ ہے۔

بہت سارے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی خبر اور نبوت محمدیہ کا اثبات اور منکر کے لئے وعید:

ہم نے (آپ کو کچھ انوکھا رسول نہیں بنایا جو یہ لوگ ایسی بے تکی فرمائشیں کرتے ہیں، بلکہ) آپ کے پاس (بھی ایسی ہی) وحی بھیجی ہے جیسی (حضرت) نوح (علیہ السلام) کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد دوسرے پیغمبروں کے پاس (بھیجی تھی) اور (ان میں سے بعض کے نام بھی بتا دیتے ہیں کہ) ہم نے (حضرات) ابراہیم واسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور یعقوب کی اولاد (میں جو نبی گذرے ہیں) اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے پاس وحی بھیجی تھی، اور (اسی طرح) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، چنانچہ ان کو (کتاب) زبور دی تھی اور (ان کے علاوہ) اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (بھی) صاحب وحی بنایا جن کا حال اس سے پہلے (سورۂ انعام وغیرہ کی مکی سورتوں میں) ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (صاحب وحی بنایا) جن کا حال (ابھی تک) ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام کو بھی صاحب وحی بنایا چنانچہ ان) سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے کلام فرمایا (اور) ان سب کو (ایمان پر نجات کی خوشخبری) دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے (آنے کے بعد) کوئی عذر (ظاہراً بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی اشیاء کا حسن وقبح (اچھائی برائی) عقل سے معلوم نہ ہوسکتا تھا،

پھر ہماری کیا خطا) اور (یوں) اللہ تعالیٰ پورے زور (اور اختیار) والے ہیں (کہ رسولوں کو بھیجے بغیر بھی سزا دیتے تو اس وجہ سے کہ مالک حقیقی ہونے میں منفرد ہیں ظلم نہ ہوتا اور حقیقت میں عذر کا حق کسی کو نہ تھا، لیکن چونکہ) بڑے حکمت والے (بھی) ہیں (اس لئے حکمت ہی کا تقاضہ رسولوں کو بھیجنے کا ہوا تا کہ ظاہری عذر بھی نہ رہے۔ حکمت کا یہ بیان درمیان میں ضمنی طور پر آ گیا تھا، آگے نبوت محمدیہ کو ثابت کر کے جواب کی تکمیل فرماتے ہیں کہ اگر چہ وہ اپنے اس شبہ کے دور ہونے پر بھی نبوت کو تسلیم نہ کریں لیکن واقع میں تو ثابت ہے اور اس کے ثبوت پر صحیح دلیل قائم ہے، چنانچہ) اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجا بھی (کس طرح) اپنے علمی کمال کے ساتھ (جس سے وہ کتاب عظیم معجزہ ہوگئی جو کہ نبوت کی قطعی دلیل ہے، ایسی معجزہ والی کتاب کے ذریعہ سے آپ کی نبوت کی) شہادت دے رہے ہیں (یعنی دلیل قائم کر رہے ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ معجزہ والی کتاب نازل فرمائی اور اعجاز یعنی اس جیسی دوسری کتاب لانے کا چیلنج کر کے بے بس و عاجز ثابت کرنا نبوت کی دلیل ہے، لہٰذا دلیل سے تو واقع میں نبوت ثابت ہے، رہا کسی کا ماننا نہ ماننا تو اول تو اس کا خیال ہی کیا) اور (اگر طبعی طور پر اس کو جی چاہتا ہو تو ان سے افضل مخلوق یعنی) فرشتے (آپ کی نبوت کی) تصدیق کر رہے ہیں (اور مؤمنوں کی تصدیق تو سامنے دیکھی ہی جا رہی تھی، لہٰذا اگر چہ احمق لوگوں نے نہ مانا تو نہ سہی) اور (اصل بات تو وہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت (یعنی واقع میں دلیل کا قائم ہونا) کافی ہے (آپ کو کسی کی تصدیق و تسلیم کی ضرورت ہی نہیں) جو لوگ (ان قطعی حجتوں کے بعد بھی) منکر ہیں اور (اس پر مزید طرہ یہ کہ دوسروں کو بھی) اللہ کے دین سے روکتے ہیں تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں (یہ تو دنیا میں ان کے مذہب کا حاصل ہے اور آخرت میں اس کا ثمرہ آگے سنو کہ) بلا شبہ جو لوگ (حق کے) منکر ہیں اور (حق کے) راستہ میں رکاوٹ بن کر دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو جہنم کی راہ کے سوا کوئی دوسری راہ (یعنی جنت کی راہ) دکھائیں گے، اس طرح کہ اس (جہنم) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے (اس کے لئے کچھ سامان نہیں کرنا پڑتا)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ ۚ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝﴾

ترجمہ: اے تمام لوگو! تمہارے پاس یہ رسول سچی بات لے کر تمہارے پروردگار کی طرف سے تشریف لائے ہیں، سو تم یقین رکھو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا، اور اگر تم منکر رہے تو خدا تعالیٰ کی ملک ہے، یہ سب جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ پوری اطلاع رکھتے ہیں، کامل حکمت والے ہیں۔

ربط: اوپر یہود کے شبہ کا جواب جو کہ نبوت محمدیہ سے متعلق تھا اور نبوت کا اثبات اور انکار کرنے والوں کے لئے وعید

کے ساتھ نہایت بلاغت اور وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا، اب عام خطاب سے نبوت کی تصدیق کا وجوب فرماتے ہیں۔

عام خطاب: رسالت محمدیہ کی تصدیق کا وجوب:

اے تمام (ساری دنیا کے) لوگو! تمہارے پاس یہ رسول (ﷺ) سچی بات (یعنی سچا دعوی اور سچی دلیل) لے کر تمہارے رب کی طرف سے تشریف لائے ہیں تو (صحیح دلیل کے ساتھ دعوی کے اثبات کا تقاضا یہ ہے کہ) تم (ان پر اور جو جو وہ فرمائیں سب پر) یقین رکھو (جو پہلے سے ایمان لائے ہوئے ہیں وہ اس پر قائم رہیں اور جو نہیں لائے وہ اب اختیار کرلیں) یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (کیونکہ اسی بنیاد پر نجات ہوگی) اور اگر تم منکر رہے تو (تمہارا ہی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی (تو) ملکیت ہے، یہ سب جو کچھ (بھی) آسمانوں اور زمین میں (موجود) ہے (تو ایسے بڑے عظیم الشان مالک قادر کو کیا نقصان پہونچا سکتے ہو؟ مگر اپنی خیر منالو) اور اللہ تعالیٰ (سب کے ایمان اور کفر کی) پوری خبر رکھتے ہیں (اور دنیا میں جو پوری سزا نہیں دیتے تو اس لئے کہ) کامل حکمت والے (بھی) ہیں (ان کی حکمت اسی کا تقاضا کرتی ہے)

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ﴾

ع ۲۳

ترجمہ: اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو اور خدا تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو، مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اور کچھ بھی نہیں، البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچایا تھا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہیں، سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور یوں مت کہو کہ تین ہیں باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے، وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں سب اس کی ملک ہیں اور اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں۔

ربط: اوپر یہود کو خطاب تھا، اب نصاریٰ کو خطاب ہے۔

نصاریٰ سے خطاب:

اے اہل کتاب (یعنی انجیل والو!) تم اپنے دین (کے بارے) میں (صحیح اور حق عقیدہ کی) حد سے مت نکلو، اور اللہ تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو (کہ نعوذ باللہ وہ صاحب اولاد ہے، جیسا کہ بعض کہتے تھے المسیح ابن اللہ یا وہ

خداؤں کے مجموعہ کا ایک جزء ہے، جیسا کہ بعض کہتے تھے إن الله ثالث ثلاثة اور باقی دو جز ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے اور ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جیسا کہ اگلی آیت میں ﴿ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ کے بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے اور بعض حضرت مریم کو جیسا کہ ﴿ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ عین مسیح ہے جیسا کہ بعض کہتے تھے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ غرض یہ سب عقیدے باطل ہیں) مسیح عیسیٰ بن مریم تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ صرف اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ (کی پیدائش) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) مریم تک (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) پہونچایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں (کہ اس جان کو حضرت مریم کے جسم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پھونک کے واسطہ سے پہونچا دیا تھا، باقی نہ وہ ابن اللہ (یعنی اللہ کے بیٹے ہیں نہ وہ خود) اللہ ہیں، نہ تین میں کے ایک ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا عقائد میں لازم آتا ہے) تو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (اور وہ توحید پر موقوف ہے تو صرف توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ (خدا) تین ہیں (مقصود شرک سے منع کرنا ہے جو سب مندرجہ بالا عقیدوں میں مشترک ہے، اس شرک سے) باز آجاؤ (یہی) تمہارے لئے بہتر ہوگا (اور توحید کے قائل ہو جاؤ، کیونکہ) حقیقی معبود تو ایک ہی معبود ہے (اور) وہ صاحب اولاد ہونے سے پاک و بری ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں، سب اس کی ملکیت ہیں (اور ان کا اپنی خدائی میں تمام شریکوں سے پاک ہونا اور مطلق مالک ہونا توحید کی دلیل ہے جس کی تفصیل و وضاحت سورۂ بقرہ کے انتالیسویں معاملہ میں گذر چکی ہے) اور (ایک دلیل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں (اور ان کے سوا سب کارساز ہونے میں ناکافی اور دوسرے کے محتاج اور ایک حد پر جا کر عاجز ہیں) اور یہ کفایت کمال والی صفات میں سے ہے اور صفات کا کمال الوہیت یعنی خدائی کے لئے لازمی باتوں سے ہے اور جب یہ بات اللہ کے علاوہ میں نہیں پائی جاتی تو ان سب کی الوہیت یعنی خدائی کی بھی نفی ہے، لہٰذا توحید ثابت ہے)

فائدہ: روح المعانی میں نصاریٰ کے اقوال مع رد کے تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان اقوال میں سے بعض کا اس وقت نصاریٰ کو انکار ہے تو یا تو وہ اس وقت ان اقوال کے قائل ہوں گے، آگے یہ سلسلہ بند ہو گیا یعنی وہ ان اقوال کے قائل نہ رہے، ایسے عقیدے چھوڑ دیئے یا ان کے اقوال سے یہ عقیدے لازم آتے ہیں اور کھلا لازم ملزوم کی مانند ہوتا ہے۔

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

ترجمہ: مسیح ہرگز خدا کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے۔ اور جو شخص خدا تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو خدا تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس جمع کریں گے، پھر جو لوگ ایمان لائے ہونگے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہونگے تو ان کو ان کا پورا ثواب دیں گے، اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں گے۔ اور جن لوگوں نے عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے۔ اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پاویں گے۔

ربط: اوپر حق تعالیٰ کی شرک سے پاکیزگی کو ثابت اور عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت یعنی خدائی کو باطل کیا ہے، اب اسی مضمون کی تقریر و تاکید کے لئے عیسیٰ علیہ السلام و ملائکہ کا خود عبد یعنی بندہ ہونے کا اقرار ہے۔ انکار کرنے والوں کے لئے وعید اور اقرار کرنے والوں کے لئے وعدہ کے بیان فرماتے ہیں کہ جن کو خدائی میں شریک کیا جاتا ہے، وہ خود عبد و بندہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کا عبدیت و بندگی کا اقرار اور اقرار و انکار کا بدلہ:

(نصاریٰ خواہ مخواہ حضرت مسیح علیہ السلام کو معبود یا معبودوں کے مجموعہ کا ایک جز یا حصہ بنا رہے ہیں، حالانکہ خود حضرت) مسیح (کا یہ معاملہ ہے کہ زمین پر رہائش کے زمانہ میں تو ان کا عبد یا بندہ ہونے کا اقرار جو کہ الوہیت یا خدا ہونے کو باطل قرار دینے والا ہے، مشہور اور سب کو معلوم ہی ہے، لیکن اب بھی آسمانوں پر رہنے کی حالت میں جو کہ زمین میں رہائش کے مقابلہ میں زیادہ بلند و ارفع اور فخر و خوشی کا باعث ہے یا قیامت تک وہ جس حالت میں بھی ہوں، ان سے کوئی پوچھ کر دیکھ لے کہ وہ اس حالت میں بھی) ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے (عار اور انکار نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے) کبھی عار کریں گے جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی شامل ہیں، جن کو خداؤں کے مجموعہ کا ایک حصہ مانتے ہیں، خود ان سے کوئی پوچھ کر دیکھ لے) اور (وہ عار کریں کیسے؟ عار کرنے کا تو ایسا برا انجام ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار اور تکبر کرے گا تو (اس کا انجام سن لو) اللہ تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس (یعنی حساب کے موقع پر جمع کریں گے، پھر جو لوگ (دنیا میں) ایمان لائے ہوں گے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہوں گے (یعنی عبد بنے رہے ہوں گے، کیونکہ عبدیت کا حاصل یہی ایمان اور اعمال ہیں) تو ان کو ان کا پورا ثواب (بھی) دیں گے (جس کا ایمان اور اعمال پر نص کے ذریعہ وعدہ ہے) اور (اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں گے (جس کی تفصیل نص میں بیان کی گئی) اور جن لوگوں نے (عبد بننے سے) عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے اور وہ لوگ اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔

فائدہ(۱): بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہ عار تھا نہ تکبر، مگر عیسائیوں کو خود اس مذکورہ مضمون کے عبادت کا جزا اور اللہ کی طرف سے ہونے میں ''کلام'' تھا۔ جواب یہ ہے کہ ان احوال کے مجموعہ سے یہ امر ثابت ہے کہ ان پر حق واضح ہو گیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ﴾ مگر رسول اللہ ﷺ کا اتباع ناگوار تھا اور آپ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور ہر وہ امر جس کا حکم دیا گیا ہو، وہ عبادت ہے، لہٰذا آپ کے اتباع سے عار ہونا یقیناً اللہ کی عبادت سے عار ہے۔

فائدہ(۲): ﴿ لَنْ يَسْتَنْكِفَ ﴾ کا ترجمہ مضارع مستقبل میں کیا گیا ہے، یہ حقیقی معنی کے اعتبار سے ہے، اگر یہ کہا جائے کہ مقصود ماضی ہے جس کو مجاز کے طور پر مستقبل سے تعبیر کر دیا گیا تو بھی گنجائش ہے اور اس میں مبالغہ کا نکتہ ہوگا، یعنی ان کو اس عار سے اسی قدر دوری ہے کہ جس زمانہ میں یعنی ماضی میں اس کا واقع نہ ہونا محقق ہو چکا ہے، اس میں تو واقع ہونے کا کیا احتمال ہے؟ البتہ ابھی اس کا واقع نہ ہونا محقق نہیں ہوا اس میں بھی احتمال نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو۔

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ ﴾

ترجمہ: اے لوگو یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے، سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کو مضبوط پکڑا، سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کریں گے اور اپنے فضل میں۔ اور اپنے تک ان کو سیدھا راستہ بتلادیں گے۔

ربط: اوپر نصاریٰ کے عقائد کا باطل ہونا اقرار اور انکار کرنے والوں کے جزاء و سزا سمیت بیان ہو چکا، اب خطاب عام کے ذریعہ ان مضامین کا اور ان مضامین کی تعلیم دینے والے رسول اور قرآن کا سچ ہونا اور تصدیق کرنے والوں کی فضیلت بیان فرماتے ہیں جس طرح یہود کے ساتھ بحث و دلائل کے ختم پر اس طرح خطاب عام فرمایا تھا ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ ﴾ الخ۔

رسول اور قرآن کی تصدیق کے تعلق سے عام خطاب:

اے (تمام) لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک (کافی) دلیل آچکی ہے (وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک ہے) اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے (وہ قرآن مجید ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ تمہیں بتایا جائے وہ سب حق ہے، جن میں مذکورہ بالا مضامین بھی داخل ہیں) تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے (جس کے لئے توحید اور پاکیزہ ہونے کا اعتقاد لازم ہے) اور انھوں نے اللہ (کے دین) کو (یعنی اسلام کو) مضبوط پکڑا (جس کے لئے رسول اور قرآن کی تصدیق لازم ہے) تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (یعنی جنت) میں

داخل کریں گے۔ اور اپنے فضل میں (لے لیں گے یعنی جنت میں داخلہ کے علاوہ اور بھی عظیم نعمتیں دیں گے، جن میں دیدارِ الٰہی بھی داخل ہے) اور اپنے تک (پہونچنے کا) ان کو سیدھا راستہ بتادیں گے (یعنی دنیا میں انہیں رضا وخوشنودی کے طریقہ پر قائم وثابت رکھیں گے اور اس سے ایمان واعمالِ صالحہ ترک کرنے والوں کی حالت معلوم ہوگئی کہ ان کو یہ ثمرات نہیں ملیں گے)

فائدہ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ رضا کا وہ طریقہ عین ایمان اور اعمال ہیں پھر اس کو ثمرہ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان اور زمانۂ گذشتہ کا عمل سبب ہے اور ایمان اور مستقبل کا عمل مسبب ہے، اس لئے تحصیل حاصل لازم نہیں آیا، حاصل یہ ہے کہ اطاعت کی برکت اطاعت پر ثابت قدمی کی توفیق عطا ہوتی ہے۔

﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ ﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے، اگر کوئی شخص مرجاوے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا، اور وہ شخص اس کا وارث ہوگا اگر اس کے اولاد نہ ہو، اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دوتہائی ملیں گے۔ اور اگر وارث چند بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر۔

ربط: سورت کے شروع میں میراث کے احکام بیان ہوئے تھے، پھر وہاں سے کافی آگے چل کر دوسرے احکام کے ساتھ میراث کے حکم کی طرف پھر لوٹے تھے اور اس سورت کے ختم پر پھر اسی طرف لوٹے ہیں۔ ان مسائل واحکام کے تین جگہ کرنے کی شاید یہ مصلحت ہو کہ اسلام سے پہلے میراث کے بارے میں بہت ظلم وزیادتی ہوتی تھی، لہٰذا سورت کے شروع میں درمیان میں اور آخر میں اس کا ذکر فرمانے سے مخاطب لوگوں کو اس بارے میں بلیغ یعنی کافی اہتمام اور مزید توجہ ہوگی، جس سے وہ بھی زیادہ اہتمام کریں گے۔ واللہ اعلم۔ اور اس کا شانِ نزول حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا استفتا ہے کہ اس وقت صرف ان کی بہنیں وارث تھیں، اس کو نسائی نے روایت کیا ہے اور لباب میں ابن مردویہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال کرنا بھی شانِ نزول کے طور پر نقل کیا ہے۔

میراث کی طرف واپسی:

لوگ آپ سے (کلالہ کی میراث کے بارے میں یعنی جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت کرتے ہیں، آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مرجائے جس کے اولاد

نہ ہو (یعنی نہ مذکر نہ مؤنث اور نہ ہی ماں باپ ہوں) اور اس کی ایک حقیقی یا علاتی بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی پہلے کے حقوق کے بعد اور اگر کوئی عصبہ ہو تو باقی نصف اس کو دیا جائے گا، ورنہ پھر اسی کو دے دیا جائے گا) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہوگا اگر وہ بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر (ایسی) بہنیں دو (یا زیادہ ہوں) تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے (اور ایک تہائی عصبہ کو ورنہ باقی بھی انہی کو مل جائے گا) اور اگر (ایسی میت کے جس کے نہ اولاد ہے نہ والدین خواہ وہ میت مذکر ہو یا مؤنث) چند وارث (یعنی ایسے ہی ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں، مرد و عورت تو، ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دوہرا اور بہن کو اکہرا لیکن عینی بھائی سے علاتی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں، اور عینی بہن سے کبھی وہ ساقط ہو جاتے ہیں، کبھی حصہ گھٹ جاتا ہے، جس کی تفصیل فرائض و میراث کی کتابوں میں ہے)

﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ ع ۲۴

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم گمراہی میں نہ پڑو، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

ربط: چونکہ اس سورت میں یہاں تک بہت سارے اصول و فروع کی تفصیل ہے، اس لئے آخر میں ایک مجمل عنوان کے تحت تمام تر تفصیل کو دوبارہ یاد دلا کر شریعتوں کے بیان میں اور ان شریعتوں کی حکمت کی رعایت میں اپنے احسان کا ذکر فرما کر سورت کو ختم فرماتے ہیں۔

شریعتوں میں حکمت اور احسان کا اظہار:

اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان فرماتے ہیں کہ تم (واقف نہ ہونے کی وجہ سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو یاد دہانی اور احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (چنانچہ احکام کی مصلحتوں سے بھی باخبر ہیں اور احکام میں ان کی رعایت کی جاتی ہے، یہ حکمت کا بیان ہے)

تفسیر ہدایت القرآن منظر عام پر آگئی ہے

اللہ کی توفیق سے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیو بند کی مایۂ ناز تصنیف "تفسیر ہدایت القرآن" ۸ جلدوں میں منظر عام پر آگئی ہے، ہندوستان میں مکتبہ حجاز دیو بند اور پاکستان میں مکتبہ غزنوی کراچی نے اُسے شائع کر دیا ہے۔ واضح رہے! حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے تدریس وتصنیف اور تحقیق ومطالعہ کے میدان میں تقریباً پچپن سالہ تجربہ کے بعد تفسیر ہدایت القرآن تحریر فرمائی ہے، اس تفسیر میں ہر سورت کے شروع میں اُس کا تعارف وخلاصہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آیات وسورتوں کے درمیان ربط اور ہر لفظ کے سامنے اس کا لفظی واضح ترجمہ، پھر تفسیر اور آخر میں بامحاورہ ترجمہ کا اہتمام کیا گیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی لغوی، صرفی اور نحوی تحقیق بھی اختصار کے ساتھ شامل کی گئی ہے۔

امید قوی ہے کہ اس تفسیر سے اساتذۂ کرام، ائمۂ مساجد، عزیز طلبہ اور عام مسلمان بھائی سب استفادہ کر سکیں گے۔ واللہ ولیّ التوفیق۔

عبد الرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ
خادم حدیث نبوی
جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
۱۴۴۰/۷/۲۲ھ
۲۰۱۹/۳/۳۰ء